ایوی ڈرامجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 7

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اسے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا تھا اور انہیں "انصاف" کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دنیا ہی بدل گئی شاؤلن نیمپل میں فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پائوں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہوگئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور انہیں حرف غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا

طلوع جبریل کی دعا میں مانگنے والے ایک مسلمان کا ایمان افروز اور سبق آموز واقعہ

اس عورت نے پہلے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی اندر آگئی۔ دروازہ بند ہوگیا۔ اس طرف بھی دیوار کے ساتھ قد آدم جھاڑیاں تھیں اور دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ایک عورت کھڑی تھی۔ مجھے اندر آنے کے فوراً ہی بعد اس نے دروازہ بند کردیا تھا اور دوسری طرف چلی گئی تھی۔

میرے ساتھ آنے والی عورت نے اشارہ کیا اور میں ایک بار پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

حویلی کی عمارت خاصی بڑی تھی۔ آگے کو نکلے ہوئے برآمدے میں ایک مشعل جل رہی تھی اور ایک عورت نیزہ سنبھالے وہاں بھی کھڑی تھی۔

ہم اندر داخل ہو کر ایک راہداری میں مڑ گئے۔ یہ راہداری خاصی طویل تھی۔ اس کے اختتام پر دائیں بائیں دو اور راہداریاں تھیں۔ یہاں بھی ایک عورت نیزہ سنبھالے کھڑی تھی۔ ہم اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بائیں طرف مڑ گئے۔

یہ راہداری زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر ایک اونچا دروازہ تھا۔ دائیں طرف دس فٹ طویل ایک اور کشادہ راہداری تھی۔ اس کے اختتام پر بھی ایک محرابی دروازہ تھا۔ ہر راہداری کے موڑ پر مشعلیں جل رہی تھیں۔

ہم اس محرابی دروازے کے سامنے رک گئے۔ اس عورت نے ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اسے واپس آنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جھونپڑوں پر مشتمل اس بستی کے پہلو میں پکی اینٹوں کی اس حویلی کو دیکھ کر ہی مجھے حیرت ہوئی تھی اور اندر آکر تو یہ حیرت دوچند ہوگئی تھی۔

ہمیں اس بستی میں آئے ہوئے صرف چند گھنٹے ہوئے تھے۔ ہم نے صرف رات ہی چند لوگوں کو دیکھا تھا جو ہم سے ملنے کے لیے جھونپڑے میں آئے تھے۔ میں نے ہر مرد اور عورت کے جسم پر پاک کی کھال کا مختصر سا لباس دیکھا تھا لیکن اس کمرے میں آکر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں قدیم بغداد کے کسی محل میں آگیا ہوں۔

اس وسیع و عریض کمرے کی بلند دیواروں کے ساتھ رنگ برنگے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ پچھلی طرف دو بڑی بڑی محرابی کھڑکیاں تھیں۔ ان کے سامنے بھی باریک ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں لہراتے ہوئے رنگ برنگے یہ ریشمی پردے بڑا دل فریب منظر پیش کررہے تھے۔

میں دروازے کے قریب ہی کھڑا متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کوئی ذی نفس ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ اچانک ایک سریلی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔

"میں یہاں ہوں۔"

یہ آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ میں نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ کمرے کا ایک حصہ کشادہ محراب کی طرف پیچھے کو نکلا ہوا تھا جہاں غالباً لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تہ در تہ پاک کی کئی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی ایک سلکی چادر تھی۔ کاشی تخت پر نیم دراز تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ فلم یاد آگئی جو میں نے بچپن میں سنگاپور میں دیکھی تھی۔ ملکہ کلوپطرہ کے لیٹنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

اس محراب کے سامنے ایک باریک سفید پردہ ہوا کے جھونکوں سے ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹادیا اور اس کے ساتھ ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

کاشی نے لباس تو ضرور پہنا ہوا تھا لیکن اس لباس میں بھی وہ برہنہ تھی۔ اسے دیکھ کر میری نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس محراب میں کاشی اکیلی نہیں تھی۔ تخت کی پچھلی طرف دو اور عورتیں بھی کھڑی تھیں جنہیں میں پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔ کاشی نے انہیں اشارہ کیا اور وہ محراب کے پچھلی طرف کسی دروازے میں غائب ہوگئیں۔

"آؤ۔ رک کیوں گئے ہمت سنگھ؟"

کاشی کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ شام کو جب یہ ہمارے جھونپڑے میں آئی تھی تو رستوگی نے اجنبی کہہ کر میرا تعارف کرایا تھا اور یہ مجھے اجنبی کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہی تھی اور اب اپنا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھا پھر رک گیا۔ یہاں اس تخت کے سوا ایسی کوئی اور جگہ نہیں تھی جہاں میں بیٹھ سکتا اور تخت پر کاشی اس طرح نیم دراز تھی کہ میں اپنے اندر اس کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"سمجھ گئی۔" کاشی اٹھ کر تخت سے اتر آئی "تم یہاں میرے ساتھ بیٹھنے سے ہچکچا رہے ہو۔ آؤ۔ مہمان خانے میں بیٹھتے ہیں۔"

اس نے دائیں طرف کی دیوار کا ایک پردہ ہٹا دیا۔ دوسری طرف بھی ایک وسیع کمرا تھا۔ فرش پر پاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی دیواروں پر ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ مشعلوں کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں یہ منظر بھی بڑا پراسرار اور خواب آگیں سا تھا۔

کمرے کے وسط میں پرانی طرز کی ایک گول میز پڑی ہوئی تھی جس پر خوب صورت طشتریوں میں پھل سجے ہوئے تھے۔ بعض پھل تو ایسے تھے جو اس علاقے (نیپال) اور اس سیزن میں نہیں ہوتے تھے۔ میز کافی بڑی تھی۔ اس کے اردگرد پرانی طرز کی مگر آرام دہ کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

کاشی نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک دیوار کی طرف دیکھ کر تالی بجائی۔ دیوار کے پردے میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک خوب صورت لڑکی ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس میں وہ گلاس اور شیشے کی خم دار گردن والی ایک خوب صورت صراحی رکھی ہوئی تھی جس میں عنابی رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔

کاشی بھی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیچ میں میز حائل ہونے کے باوجود کاشی کے بدن کا ایک حصہ مجھے صاف نظر آرہا تھا۔

کاشی نے صراحی اٹھا کر دونوں گلاس لبریز کیے اور ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھادیا۔

"لو پیو اور یہ پھل بھی کھاؤ۔" وہ بولی "مجھے افسوس ہے کہ میں رات کے اس پہر تمہاری زیادہ خدمت نہیں کرسکتی۔"

"مم۔ میں شراب نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔ اس وقت میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کررہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت شاید میں اپنے حواس ہی میں نہیں تھا۔ اس پراسرار ماحول نے مجھ پر عجیب سا سحر طاری کردیا تھا۔ رہی سہی کسر کاشی کے حسن و شباب نے پوری کردی تھی۔ وہ میرے خرمنِ ہوش پر بجلیاں گرا رہی تھی اور میں بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"یہ شراب نہیں ہے۔" کاشی کی شیریں آواز میری سماعت سے ٹکرائی "تمہارے لیے یہ مشروب پینا بہت ضروری ہے کیونکہ تم جس مہم پر جارہے ہو اس کے لیے تمہارے اندر شکتی ہونی چاہیے۔"

میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں کسی خاص مہم پر جارہا ہوں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یہ مشروب پی لینے سے تمہارے اندر ایسی شکتی پیدا ہوجائے گی کہ نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی سردی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"تت۔۔۔ تم کون ہو؟" میں ہکلا کر رہ گیا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی طرف جارہا ہوں۔"

"میں نیلگری کی محافظ ہوں۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کا راستہ اس طرف ہی سے جاتا ہے۔ کوئی شخص ہماری نظروں میں آئے بغیر آگے نہیں جاسکتا۔"

"لیکن ایک آدمی ایسا ہے جو وہاں پہنچ چکا ہے!" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" کاشی نے جواب دیا "وہ مجھے دھوکا دے کر چلا گیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ میں نے ابھی تک اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ان برف پوش پہاڑوں کی ملکہ نے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں لیکن میرے دشمنوں کو بھی تمہارے ارادوں کا پتا چل گیا ہے۔ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کریں گے۔"

کاشی کی باتیں سن کر میرے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھی اور اس کے دشمن بھی میرے ارادوں سے واقف ہوچکے تھے۔

"لو۔ یہ پی لو۔ اس کے بعد ہم اطمینان سے وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے ایک کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر پہلے صرف ایک چسکی لی۔ عناب جیسی خوشبو تھی اور بہت لذیذ مشروب تھا۔ میں نے دوبارہ گلاس ہونٹوں سے لگایا تو پھر اسے اس وقت ہٹایا تھا جب اس کا آخری قطرہ بھی میں نے چوس لیا اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر کھولتا ہوا لاوا بھر گیا ہو۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا۔ میں نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن میں نے جیکٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ قمیص کے نیچے پورے جسم پر مجھے چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ چوبیس پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے والے ان لوگوں کو سردی کیوں نہیں لگتی تھی۔ یہ لوگ یقیناً مستقل طور پر یہ مشروب استعمال کرتے تھے۔

"تمہیں کچھ دیر بے چینی ہوگی۔" کاشی اپنے گلاس سے چسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی "یہ مشروب ان پہاڑوں میں پیدا ہونے والی قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے اور ہماری غذا کا ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہماری روزمرہ کی غذا میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جو ہمیں موسم کی شدت سے محفوظ رکھتی ہیں۔ آؤ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ خالی گلاس میز پر رکھ کر اٹھ گئی۔

میں بھی اٹھ گیا۔ پسینے میں بھیگی ہوئی قمیص بھی اب مجھے بوجھل سی لگ رہی تھی۔ میں نے قمیص اتار کر پھینک دی اور کاشی کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

میرے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے کاشی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں پر رکھ دیے اور انگلیوں سے مسلنا ٹٹولنے لگی۔ وہ اپنی انگلیوں کو گوشت میں گاڑنے کی کوشش کررہی تھی لیکن میرے مسلز گوشت کی طرح نرم نہیں، پتھر کی طرح سخت تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب سی مسکراہٹ آگئی اور آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیرنے لگے۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ مجھے قمیص نہیں اتارنی چاہیے تھی۔ کاشی کی انگلیوں کے لمس سے میرے دماغ میں بھی سنسناہٹ ہونے لگی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پالیا اور سرک کر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔

"تمہارے دشمن کون ہیں اور میرے بارے میں کیسے جانتے ہو اور تم۔۔۔؟"

"نیلگری نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔" کاشی بھی سنبھل کر بیٹھ گئی "یہ قبیلہ ہزاروں سال سے نیلگری کی حفاظت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ سرداری کے لیے منتخب ہونے والی عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک جاپ مکمل کرے۔ اکیس روز کا یہ جاپ مکمل ہونے کے بعد اس کا نیلگری سے رابطہ ہوجاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم نے بھی وہ جاپ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "لیکن بعض شیطانی قوتیں اسے حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہیں اور نیلگری ان کے قبضے میں نہیں جانا چاہتی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کا چہرہ دھندلا رہا ہے۔ چند روز پہلے میرا اس سے آخری رابطہ ہوا تھا۔ طاغوتی قوتوں نے اس کے گرد جال بن دیا ہے۔ حصار میں قید کردیا ہے اسے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی۔ اگر وہ اس شیطان کے قبضے میں چلی گئی تو وہی کچھ کرے گی جو اسے حکم ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر بھی

تباہی نازل ہوجائے گی۔ یہ جھیل ہماری بستی کو نگل لے گی۔"

"وہ کون لوگ ہیں جو تمہاری مخالفت کررہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"شیواگ!" کاشی نے جواب دیا "اس گروہ کا سرغنہ شیواگ ہے۔ اس کے ساتھ اگرچہ چند ہی لوگ شامل ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ ایک مچھلی بھی پورے جل (تالاب) کو گندا کردیتی ہے۔ شیواگ تمہارے ارادوں سے واقف ہوچکا ہے۔ وہ شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کرے گا بلکہ وہ اپنی کوششیں شروع کرچکا ہے۔ تمہیں روکنے کے لیے پہلے ایسی شرائط عائد کی جائیں گی جنہیں تم پورا نہیں کرسکو گے اور اگر تم نے ان شرائط کو پورا کردیا تو اس کے بعد بھی تمہارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔"

"اب تک میرے راستے میں کئی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہی ہیں لیکن میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور آگے بھی جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" کاشی نے کہا "تم آگے ضرور جاؤ گے لیکن....."

"لیکن کیا....؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے پاس وقت کم ہے۔ صرف بارہ دن۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔ صرف بارہ دن۔" میں نے جواب دیا "اور مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے ان بارہ دنوں ہی میں کرنا ہے۔"

بات کرتے ہوئے میری نظریں سامنے کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ سفید باریک پردے ہوا کے جھونکوں سے اس طرح ہل رہے تھے جیسے سمندر کی پرسکون سطح پر ہلکی ہلکی سی لہریں اٹھ رہی ہوں۔ پردہ اپنی جگہ سے سرکتا تو کھڑکی کی دوسری طرف دن کا ملگجا سا اجالا دکھائی دینے لگتا۔

کاشی نے بھی دیکھ لیا تھا کہ رات دم توڑ چکی تھی اور دن کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ اس نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تالی بجائی۔ وہی خوب صورت لڑکی برآمد ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے شیشے کی خوب صورت طشتری میں صرف ایک گلاس اٹھا رکھا تھا۔ اس میں ہرے رنگ کا شربت بھرا ہوا تھا۔ اس نے قریب آکر کاشی کی طرف دیکھتے ہوئے گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

کاشی نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ اس کا ذائقہ پہلے والے مشروب سے مختلف تھا لیکن یہ بھی بے حد خوش ذائقہ تھا۔

مشروب پینے کے بعد بھی میں کاشی سے باتیں کرتا رہا۔ میرا سر بوجھل ہونے لگا۔ اسی دوران میں کاشی کی وہ خادمہ جو مجھے حویلی میں لے کر آئی تھی' دوڑتی اور چیختی چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بری طرح بدحواس ہورہی تھی۔

"کیا بات ہے بالا۔ کیوں چیخ رہی ہو؟" کاشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"شیواگ نے اپنے شیطانوں کے ساتھ حویلی پر حملہ کردیا ہے کاشی۔" پالا نامی اسی عورت نے جواب دیا "وہ اس طرف آرہا ہے۔"

"اوہ!" کاشی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی "اس کی یہ ہمت.... میں دیکھتی ہوں اسے۔ تم مہمان کو حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر لے جاؤ۔"

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ کاشی مجھے شیواگ کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی اور میں بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ پالا نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچنا چاہتی تھی لیکن میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکلی جارہی ہو۔ گھٹنے دہرے ہوتے چلے گئے اور میں فرش پر ڈھیر ہوگیا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے جھونپڑے میں بستر پر پڑا تھا اور میرے اوپر کئی کمبل لدے ہوئے تھے۔ میرے بستر کے قریب مارتھا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہی تھی۔ مجھے حرکت کرتے پاکر اس نے ڈائری بند کردی اور میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" میں اپنے اوپر سے کمبل ہٹا کر اٹھ گیا "کاشی اور پالا کہاں ہیں؟"

"کاشی اور پالا۔" مارتھا کے لہجے میں حیرت تھی "اوہ! شاید تم دھنو اور شوبھا کو پوچھ رہے ہو۔ وہ باہر دھوپ میں بیٹھی ہیں۔"

"میں قبیلے کی سردار کاشی اور اس کی خادمہ پالا کو پوچھ رہا ہوں۔ شیواگ نے حویلی پر حملہ کردیا تھا۔ وہ...."

"میری سمجھ میں نہیں آرہا' تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک

منٹ رکو۔ میں شوبھا کو بلا کر لاتی ہوں۔" مارتھا یہ کہتے ہوئے اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میری قمیص اور جیکٹ بھی ایک طرف رکھی ہوئی نظر آگئی۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ شیواگ اور اس کے آدمیوں نے جب حویلی پر حملہ کیا تھا تو میں وہیں تھا۔ میں بھی کاشی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن نجانے یکایک کیا ہوا تھا کہ میں بے جان ہوکر گر پڑا تھا اور بے ہوش ہوگیا تھا۔ مجھے یہاں کون لایا تھا اور کاشی کس حال میں تھی!

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دھنو اور شوبھا' مارتھا کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ وہ تینوں میرے قریب بیٹھ گئیں۔

"رات کو تم جھونپڑے سے نکل کر کہاں گئے تھے؟" شوبھا نے پوچھا۔

میں چند لمحے خاموش رہا۔ ان سے کچھ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے صاف صاف بتادیا کہ کاشی کی خادمہ مجھے بلا کر لے گئی تھی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا میں نے محتاط الفاظ میں بتادیا۔

"شیواگ اور اس کے آدمیوں نے حویلی پر حملہ کردیا تھا۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "لیکن نجانے مجھے کیا ہوا تھا کہ عین وقت پر میں بے ہوش ہوکر گر گیا۔ مجھے حویلی سے یہاں کون لایا تھا اور کاشی....."

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" شوبھا نے میری بات کاٹ دی۔ وہ اس طرح میرے چہرے کو گھور رہی تھی جیسے میری دماغی صحت پر کسی قسم کا شبہ ہو۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟" میں نے بھی اسے گھورا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں؟"

"ہاں۔ اب تو یہ شبہ کچھ یقین میں بدلتا جارہا ہے۔" شوبھا نے جواب دیا "یہاں نہ کوئی حویلی ہے اور نہ کسی نے حویلی پر حملہ کیا تھا۔ تم یہاں سے تقریباً دو سو گز آگے جھیل کے کنارے جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ تمہارے جسم پر صرف پتلون تھی۔ قمیص اور جیکٹ تمہارے قریب ہی جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ صبح سات بجے جھیل کی طرف جانے والی ایک عورت نے ہمیں تمہارے بارے میں اطلاع دی تو ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے۔ پتا نہیں تم کب سے وہاں پڑے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ سردی سے تمہیں نمونیا نہ ہوجائے اس لیے میں نے تمہارے اوپر کئی کمبل ڈال دیے تھے۔ تمہیں نمونیا تو نہیں ہوا لیکن سردی نے تمہارے دماغ پر اثر ضرور کیا ہے یا پھر ہوسکتا ہے ہمارے سوجانے کے بعد رات کو تم بستی کے کسی قحبہ خانے میں چلے گئے ہو جہاں شراب پی کر تم بہک گئے اور جھونپڑے کی طرف واپس آنے کے بجائے جھیل کی طرف نکل گئے اور رات بھر سردی میں وہاں پڑے رہے۔"

"کیا بک رہی ہو تم؟" میں نے اسے گھورا "تم جانتی ہو' مجھے شراب سے شدید نفرت ہے۔ میں نے کبھی کوئی اور نشہ بھی نہیں کیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ رات کو مجھے پالا بلا کر حویلی میں لے گئی....."

"یہاں دور دور تک کسی حویلی کا وجود نہیں ہے۔" شوبھا نے میری بات کاٹ دی "اور قبیلے کی سردار کاشی بھی کسی عالی شان حویلی میں نہیں' ایک جھونپڑے میں رہتی ہے جو بستی کے وسط میں واقع ہے اور وہ رات کو اپنے جھونپڑے ہی میں تھی۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں رات کے واقعات کو کیسے بھول سکتا تھا۔ کاشی کی محافظ یہاں آئی تھی اور میں اس کے ساتھ بستی میں سے ہوتا ہوا حویلی گیا تھا جہاں کاشی سے طویل ملاقات ہوئی تھی لیکن شوبھا کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔

اچانک مجھے وہ مشروب یاد آگیا۔ کیا وہ سب کچھ مشروب کی وجہ سے تھا لیکن وہ مشروب بھی تو میں نے حویلی میں جانے کے بعد ہی پیا تھا۔ مجھے رات کی ایک ایک بات یاد تھی۔ کاشی نے نیلگری کے بارے میں بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں اور مجھے یاد دلایا تھا کہ گو تم بھوش کا جاپ مکمل ہونے میں صرف بارہ دن رہ گئے ہیں اور مجھے یہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد تھا لیکن کیا وہ سب خواب تھا؟ شوبھا کا کہنا تھا کہ یہاں دور دور تک کسی حویلی کا وجود نہیں اور کاشی کی رہائش بھی بستی کے ایک جھونپڑے میں ہے اور یہ کہ وہ رات کو اپنے جھونپڑے ہی میں تھی۔

باہر قدموں کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہوگئے۔

"شاید رستوگی کسی کے ساتھ آرہا ہے۔" شوبھا نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "انہیں ایسی کوئی کہانی مت سنانا ورنہ وہ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے۔"

میں شوبھا کو گھور کر رہ گیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی رستوگی ایک اور آدمی کے ساتھ کمرے

میں داخل ہوا اور جب رستوگی نے اس کا تعارف کرایا تو میں اچھل پڑا۔ وہ شیواگ تھا۔

شیواگ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ درمیانہ قد، گٹھا ہوا جسم، گنجا سر اور کانوں میں چوڑیوں کی طرح بڑے بڑے بالے تھے۔ چہرے پر کرختگی نمایاں تھی۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چھوٹی تھیں۔ اس شخص کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بہت کینہ پرور اور نہایت گھٹیا فطرت کا مالک ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کی باتوں سے بھی میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو دو سروں سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہو۔

اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ اسے اس بستی میں ہماری، خاص طور پر میری آمد پسند نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں جلد سے جلد یہاں سے واپس چلا جاؤں۔

میرے ذہن میں کاشی کی باتیں گونجنے لگیں۔ گزشتہ رات پراسرار ملاقات کے دوران میں اس نے بتایا تھا کہ شیواگ مجھے نیلگری کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا اور اب وہ باتیں سچ ثابت ہورہی تھیں۔

شیواگ کا گفتگو کا انداز دھمکی آمیز تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ کل صبح تک اس بستی سے واپس چلا جاؤں۔ اس کے بعد اگر میں یہاں رہا تو نقصان اٹھاؤں گا۔

"قبیلے کی سردار کاشی نے ہمیں یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا "میں نہیں سمجھتا کہ سردار کے علاوہ کسی اور کو بھی احکامات جاری کرنے کا حق حاصل ہے۔"

"میں ہوں نا۔" شیواگ نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "کاشی نے جس طرح دھوکے سے سرداری حاصل کی ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔ اس کے چند حواریوں نے اسے سردار بنا دیا ہے لیکن میں نے اسے سردار تسلیم نہیں کیا۔ میں جب تک اسے اس منصب سے ہٹا نہیں دوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ سردار کو ایک مقابلے کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ جہاں مقابلہ ہو وہاں کسی دھوکے کا امکان نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"مقابلے کے علاوہ ایک اور شرط بھی ہوتی ہے۔" شیواگ نے کہا "سرداری کے لیے مقابلے میں شریک ہونے والی ہر عورت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور کسی مرد کے ساتھ نہ رہی ہو لیکن کاشی کے بارے میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ کنواری نہیں تھی۔ اس قبیلے میں ایک ایسا آدمی موجود ہے جو یہ گواہی دے گا کہ مقابلے سے چند روز پہلے کاشی نے اس کے ساتھ رات گزاری تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ہم لوگ صدیوں سے اپنی رسموں پر کاربند ہیں۔ ان رسموں سے بغاوت یا دھوکا ہی ہمارے قبیلے کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہماری نسل مٹ جائے گی۔ کاشی نے دھوکا کیا ہے جس کے نتیجے میں ہماری تنزلی کا عمل شروع ہوچکا ہے۔ اس مرتبہ ہماری دھان کی فصل اچھی نہیں ہوئی اور جھیل کا پانی بھی چڑھنا شروع ہوگیا ہے۔ اگر ہم نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ نہ کیا تو یہ جھیل ہماری بستی کو نگل جائے گی اور ہمارا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔"

"لیکن ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بستی میں ٹھہرنے اور نیلگری کی طرف جانے کی اجازت دے کر کاشی نے دوسری بڑی غلطی کی ہے۔" شیواگ نے جواب دیا "یہ قبیلہ نیلگری کا محافظ ہے۔ ہم کسی کو ان برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتے جن کی ہم صدیوں سے حفاظت کررہے ہیں۔"

"تم شاید بھول گئے ہو کہ ایک شیطان صفت شخص پہلے ہی اس طرف جاچکا ہے اور تم نے اس کی مدد کی تھی۔" میں نے کہا۔

شیواگ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"وہ شیطان نہیں، بہت مہاپرش (عظیم انسان) ہے۔ مہان قوتوں کا مالک۔ وہ نیلگری کی مہان شکتی حاصل کرنے کے لیے اس طرف گیا ہے۔ اس نے ہمارے قبیلے کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اسے نیلگری کی شکتی مل گئی تو ہمارے قبیلے میں خوش حالی آئے گی۔ ہماری نسل بڑھے گی اور۔۔۔"

"اور وہ تمہیں تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ یہ موضوع چھڑ گیا تھا تو میں نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا "وہ انسان نہیں، شیطان ہے۔ وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے نہیں، تباہی کے لیے نیلگری کی شکتی حاصل کرنا چاہتا ہے اور میں۔۔۔"

"میں تمہیں کل صبح تک کی مہلت دے چکا ہوں۔" شیواگ میری بات کاٹتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اگر تم نے کل تک یہ بستی نہیں چھوڑی تو انجام کے

ذمے دار تم خود ہوگے۔"

وہ چلا گیا۔ رستوگی بھی اس کے پیچھے ہی جھونپڑے سے نکل گیا تھا۔ دھنو اور شوبھا پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ شوبھا تو نیلگری کی حقیقت سے واقف تھی لیکن دھنو اور مارتھا کے لیے یہ نئی باتیں تھیں۔

مارتھا ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے آئی تھی۔ وہاں اس نے پنڈتوں، یوگیوں اور پراسرار قوتوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا تھا۔ کچھ عرصہ مندروں میں بھی گزارا تھا اور اب یہاں پراسرار قوتوں کی باتیں سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا تم بھی پنڈت ہو؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے خیال میں شاید صرف پنڈت ہی پراسرار قوتوں کے مالک ہوسکتے تھے۔ دھنو بھی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"نیلگری اس برف پوش چوٹی کا نام ہے جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔" میں نے مارتھا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "میرا ایک دشمن وہاں چھپا ہوا ہے اور میں۔۔۔"

"شاید تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" مارتھا نے بات کاٹ دی اور میں نے بھی بات آگے نہیں بڑھائی۔

میں نے اٹھ کر قمیص پہن لی اور جھونپڑے سے باہر آگیا۔ جیکٹ پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اس وقت مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ یہ شاید اس مشروب کا اثر تھا جو گزشتہ رات کاشی نے مجھے پلایا تھا لیکن اس سلسلے میں میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ پالا رات کو مجھے حویلی میں لے گئی تھی جہاں کاشی سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے وہ خوش ذائقہ مشروب پلایا تھا جس سے میرے اندر لاوا سا کھولنے لگا تھا لیکن شوبھا کا کہنا تھا کہ مجھے جھیل کے کنارے جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے پایا گیا تھا اور دور دور تک کسی حویلی کا نام و نشان تک نہیں تھا لیکن اگر وہ سب خواب تھا تو وہ ساری باتیں میرے سامنے کیسے آرہی تھیں جو میں نے "خواب" میں دیکھی تھیں۔ شدید سردی سے بچنے کے لیے اس قبیلے کے لوگ خاص قسم کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا وہ مشروب استعمال کرتے تھے۔ میں نے بھی اس مشروب کا ایک گلاس پیا تھا جس کی وجہ سے مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ کاشی نے بتایا تھا کہ شیواگ بعض شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے اور وہ مجھے نیلگری کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا اور اس نے اپنی کوشش شروع کردی تھی۔

گزشتہ رات میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اگر خواب تھا تو یہ ساری باتیں حقیقت بن کر میرے سامنے کیوں آرہی تھیں؟ میں جیسے جیسے سوچتا، میرا ذہن الجھتا گیا۔

میں کافی دیر وہاں کھڑا دھوپ میں چمکتے ہوئے، جھیل کے پانی کو دیکھتا رہا پھر کنارے کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔

میں بستی اور جھیل کے درمیان جھاڑیوں میں چلتا ہوا بستی کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں رات کو پالا مجھے لے کر آئی تھی۔ بستی کے آخری جھونپڑے سے تقریباً دو سو گز آگے ایک بلند ٹیلا تو نظر آرہا تھا لیکن اس طرف حویلی تو کیا، کسی چھوٹے سے جھونپڑے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ٹیلے پر اس کے آس پاس قد آدم جھاڑیاں تھیں۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا ٹیلے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دو عورتوں کو ان جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ اسی طرف آرہی تھیں۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

ان کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا پھر بستی کے باہر ہی باہر چلتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس طرف بستی سے آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ پہاڑی علاقوں میں قابل کاشت زمین ہموار نہیں ہوتی۔ میں نے تھائی لینڈ میں بھی دیکھا تھا اور یہاں بھی دیسی ہی صورت حال تھی۔ کھیت کشادہ سیڑھیوں کی طرح نیچے اوپر دور تک چلے گئے تھے۔

میں باہر ہی باہر گھومتا رہا۔ بستی کے باہر دور تک کوئی عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں بستی میں داخل ہوگیا۔ یہ بستی واقعی بڑی پلاننگ سے بسائی گئی تھی۔ کہیں بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ جھونپڑوں کے درمیان کشادہ گلیاں تھیں۔ گلیوں میں لوگوں کی آمد و رفت تھی۔ زیادہ تعداد عورتوں ہی کی نظر آتی تھی۔ بعض عورتیں مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں بستی کے مرکزی چوراہے پر پہنچ گیا۔ میرا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا کہ اس بستی میں ریسٹورنٹ قسم کی ایسی جگہیں ضرور ہوں گی جہاں لوگ بیٹھ کر وقت گزارتے اور گپ شپ کرتے ہوں گے۔

چوراہے پر بڑی رونق تھی۔ ایک طرف جہاں میں کھڑا تھا، ریسٹورنٹ قسم کا ہال نما جھونپڑا تھا جس کے فرش پر ایک

کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور ٹولیوں کی صورت میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ایک طرف عورتوں کا جمگھٹا سا لگا ہوا تھا اور شور سنائی دے رہا تھا۔

دو جوان عورتیں زمین پر جھکی بیٹھی پنجہ لڑا رہی تھیں۔ میں آگے بڑھ کر یہ دلچسپ منظر دیکھنے لگا۔ ان دونوں کی کہنیاں زمین پر ٹکی ہوئی تھیں اور انہوں نے ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔

دونوں کی کوشش تھی کہ اپنی حریف کا بازو نیچے جھکا کر اس کا ہاتھ زمین سے لگا دے۔ کبھی ایک طرف دباؤ پڑتا اور کبھی دوسری طرف۔ ان کے اردگرد جمع عورتیں چلا چلا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ اس ہجوم میں دو آدمی بھی تھے۔ وہ بھی چیخ چلا رہے تھے۔

دونوں عورتوں میں پنجہ آزمائی کئی منٹ تک جاری رہی۔ دونوں عورتیں دراز قامت اور صحت مند جسم کی تھیں۔ دونوں کے بازوؤں کے مسلز ابھرے ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ بقول شخصے 'کانٹے کا مقابلہ تھا اور بالآخر یہ مقابلہ ختم ہوگیا۔ ایک عورت کا بازو بائیں طرف جھکا اور پھر جھکتا چلا گیا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی حریف کا دباؤ برداشت نہیں کر سکی اور اس کا ہاتھ زمین پر لگ گیا۔

ایک شور سا اٹھا اور فاتح عورت بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں بازو کا مسل تھپتھپانے لگی۔ اسی دوران میں اس کی نظر میری طرف اٹھ گئی۔ اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں مجھے میدان میں آنے کا اشارہ کیا۔

میں گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگا تو کئی عورتوں نے مجھے گھیر لیا اور پکڑ کر زبردستی اس کے سامنے بٹھا دیا۔ وہ عورت دو زانو بیٹھی تھی۔ اس نے آگے جھک کر کہنی زمین پر ٹکا دی اور تاؤ دلانے والی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میرے اردگرد کھڑی ہوئی عورتیں اور وہ دونوں آدمی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں ان کا مطلب سمجھ رہا تھا لیکن میں ایک عورت کا مقابلہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا مگر بالآخر میں نے بھی اپنی کہنی زمین پر ٹکا دی۔ اس عورت نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے میری انگلیوں میں انگلیاں پھنسا دیں۔ اس کا ہاتھ روئی کے گالے کی طرح نرم اور گداز تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا ایک جھٹکا بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔ قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے چیخ کر کچھ کہا اور میری حریف نے زور آزمائی شروع کر دی۔

وہ پورا زور لگا رہی تھی۔ اس کے جبڑوں کے مسل ابھر آئے تھے۔ پہلے وہ گھٹنوں پر جھکی ہوئی تھی پھر نیم دراز ہوگئی۔ اس نے دوسرا ہاتھ زمین پر ٹکا دیا حالانکہ یہ فاؤل تھا مگر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ میرے ہاتھ کو معمولی سی حرکت بھی نہیں دے سکی۔ میرا بازو کھمبے کی طرح اپنی جگہ پر ٹکا ہوا تھا اور پھر میں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

میری حریف کا بازو آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جھکنے لگا۔ وہ دباؤ کو روکنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہی تھی لیکن اس کا بازو جھکتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ کی پشت زمین سے دو انچ اوپر رہ گئی تھی کہ میری نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا عریاں برہنہ سینہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

میری حریف کو موقع مل گیا۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا اور ہمارے بازو ایک بار پھر سیدھے ہوگئے۔ میری نظروں کا زاویہ دیکھ کر اس نے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پہلو بدل کر اپنے آپ کو کچھ اور نمایاں کیا۔ وہ اس طرح مجھ پر حاوی ہونا چاہتی تھی۔ میں اس کی چال سمجھ گیا اور آنکھیں بند کر کے اس کے بازو کو دبانے لگا۔ اس مرتبہ مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور میں نے بڑی آسانی سے اس کا ہاتھ زمین پر لگا دیا۔

ایک آدمی اس عورت کو ہٹا کر میرے مقابلے پر آگیا۔ وہ میری ہی طرح قد آور اور صحت مند آدمی تھا۔ اس کے بازوؤں کے مسلز بھی ابھرے ہوئے تھے لیکن وہ دو منٹ میں شکست کھا گیا۔ وہ شرمندہ سا ہو کر پیچھے ہٹا تو اس کی جگہ ایک اور آدمی نے لے لی لیکن وہ بھی دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹک سکا۔

یہ خبر پورے چوک میں پھیل گئی کہ اجنبی پنجہ آزمائی میں کئی لوگوں کو شکست دے چکا ہے۔ میرے اردگرد بہت بڑا ہجوم لگ گیا تھا اور مرد بھی اب معقول تعداد میں موجود تھے۔ ایک کے بعد ایک آدمی میرے مقابلے پر آتا رہا اور شکست کھا کر پیچھے ہٹتا رہا۔

اور پھر جو آدمی لوگوں کو دھکے دیتا ہوا آگے آیا اسے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ شیواگ تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ شیواگ نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"بہت دیر سے تمہارے بارے میں سن رہا ہوں۔" وہ کہنی زمین پر ٹکاتے ہوئے بولا "آؤ۔ دیکھتے ہیں، تم میں کتنی

طاقت ہے۔"

اس نے مجھے چیلنج کر دیا تھا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر سنسنی سی پھیل گئی۔ اس بستی کے لوگ شیواگ کو مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔ اس کی فطرت سے بھی واقف تھے اور شاید انہیں کسی بنگالے کی بھی توقع تھی اسی لیے ان کے چہروں پر سنسنی سی پھیل گئی تھی۔

شیواگ سے اگرچہ آج صبح ہی بدمزگی کی شروعات ہو چکی تھیں اور میں فی الحال اس سے کوئی پنگا نہیں لینا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی پنگے بازی کر رہا تھا تو میں پیچھے ہٹ کر اپنی سبکی کیسے گوارا کرتا اور پھر اسی لمحے مجھے مارتھا، دھنو اور شوبھا کے چہرے بھی دکھائی دیے۔ وہ عورتوں کو دھکے دیتی ہوئی آگے آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے بھی اپنی کہنی زمین پر ٹکا دی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اپنی انگلیاں پھنسالیں۔ شیواگ نے میری انگلیوں پر دباؤ ڈالا تو میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے فوراً ہی طاقت کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ ریفری کے فرائض انجام دینے والا آدمی بھی آگے آگیا تھا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اوپر اٹھا دیا اور پھر چیخ کر ہاتھ نیچے گرا دیا گویا مقابلہ شروع ہوگیا۔

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ شیواگ میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری انگلیاں آہنی شکنجے میں پھنسی ہوں۔

کبھی میرا بازو چند انچ ایک طرف جھکتا اور کبھی شیواگ کا۔ ہم دونوں کے حمایتی چیخ چیخ کر ہماری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ میری حمایت میں دھنو اور مارتھا وغیرہ تو تھیں ہی، بستی کی دوسری عورتیں بھی میری حمایت میں چیخ رہی تھیں جبکہ شیواگ کے حمایتیوں کی تعداد کم تھی۔

تین چار منٹ گزر گئے۔ مقابلہ ابھی تک برابر تھا۔ کبھی شیواگ کا ہاتھ چند انچ جھکتا اور کبھی میرا۔

اچانک میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے اپنی قوت سلب ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ شیواگ میرا ہاتھ دبا رہا تھا۔ میں مزاحمت کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ بدستور جھکتا جا رہا تھا۔

زمین سے میرے ہاتھ کا فاصلہ صرف تین انچ رہ گیا تھا۔ دھنو، مارتھا، شوبھا اور میری حمایتی بستی کی عورتیں چیخ رہی تھیں۔ مجھے سنبھلنے کا مشورہ دے رہی تھیں۔ شیواگ کے حمایتی بھی چلا چلا کر اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

میرے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر

انگریزی سکھانے والی بہترین کتابیں

HOW TO WRITE A LETTER
خطوط نویسی کے لئے ⬅ 10/-

HOW TO WRITE AN ESSAY.
مضمون نگاری کے لئے ⬅ 10/-

HOW TO WRITE AN EXPLANATION
وضاحت وتشریح کے لئے ⬅ 10/-

HOW TO LEARN CORRECT SPELLING.
صحیح ہجے لکھنے کے لئے ⬅ 10/-

HOW TO DO COMPRIHENSION
اوراک فہم کا اظہار کرنے کے لئے ⬅ 10/-

CORRCT POSITION OF PREPOSITIONS
پری پوزیشن کے صحیح استعمال کے لئے ⬅ 15/-

HOW TO PUNCTUATE
رموز واقاف جاننے کے لئے ⬅ 10/-

10 DAYS TO TRANSLATION
اردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لئے ⬅ 15/-

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں

حفظ وکتابت کا بہترین مکتبہ نفیسات

نہیں لگی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی پراسرار قوت شیواگ کی مدد کر رہی تھی۔ میں نے شیواگ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس کی پشت پر ایک ہیولا سا نظر آیا۔

میرا ہاتھ ایک انچ کے قریب مزید جھک گیا تھا۔ یہ شیواگ کی جسمانی قوت نہیں تھی جو میرا ہاتھ دبا رہی تھی۔ کوئی اور پراسرار قوت اس کی پشت پر تھی جو مجھے شکست دینے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر اچانک میرے اندر بھی ہلچل سی مچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے اندر انگڑائی لے رہا ہو۔

میرا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ شیواگ کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ ہمارے بازو ایک بار پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ شیواگ پوری قوت استعمال کر رہا تھا لیکن اس مرتبہ وہ میرے ہاتھ کو معمولی سی حرکت بھی نہیں دے سکا۔

"تم اگر چاہو تو اپنے ساتھیوں سے مدد لے سکتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم لوگ مل کر بھی اس کھیل میں مجھے شکست دے دو تو میں ایک گھنٹے کے اندر اندر بستی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

شیواگ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس نے چیخ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ پہلے ایک اور پھر دوسرا آدمی بھی اس کی مدد کے لیے آگے آ گیا۔

وہ تینوں میرا بازو موڑنے کے لیے پوری قوت بروئے کار لا رہے تھے لیکن میرا بازو کھمبے کی طرح کڑا ہوا تھا۔ شیواگ کی پشت پر وہ ہیولا اب بھی موجود تھا اور اب تو وہ ہیولا میری نظروں کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا۔

جھریوں بھرا چہرہ، سر کے بال لمبے اور برف کی طرح سفید تھے اور چڑیا کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سفید تھے۔ مونچھیں بھاری، بہت لمبی اور دونوں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داڑھی بھی چھاج کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

میں شیواگ کو نہیں، اس کی پشت پر اس ہیولے کو دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے بھی اپنے اندر کی قوت استعمال کرنا شروع کر دی۔ شیواگ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکنے لگے۔ وہ پراسرار جھریوں بھرا چہرہ اب کچھ بدحواس سا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں جیسے پھٹی پڑ رہی تھیں۔

میں نے اپنے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ان تینوں کے ہاتھ زمین پر لگ گئے۔ شیواگ کے دونوں ساتھی قلابازی کھا کر دور گرے تھے۔ شیواگ دوسرے ہاتھ سے اپنی انگلیاں سہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت دوچند ہو گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ تو مذاق تھا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں بولا "شام کو مقابلہ ہو گا۔ اگر تم نے "نیلا کوبرا" پکڑ لیا تو میں اپنی شکست تسلیم کر لوں گا۔"

اس کے الفاظ سے مجمع پر ایک لمحے کو سناٹا سا طاری ہو گیا۔ شیواگ اور اس کے ساتھی پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجمع میں گویا زندگی لوٹ آئی۔ میری فتح پر لوگ خوشی سے اچھلنے لگے۔ وہ دراز قامت عورت جسے میں نے سب سے پہلے شکست دی تھی، آگے بڑھ کر تیزی سے جھکی اور دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا۔ میں ہاتھ پیر مارتا رہ گیا لیکن ان قبائلی عورتوں نے چوک پر میرا جلوس نکال دیا۔ میری فتح پر ان کی خوشی دیکھ کر شیواگ کے بارے میں ان کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

بستی کے لوگ مجھ سے لپٹے جا رہے تھے۔ ہر شخص اس طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا جیسے میں انہی میں سے ہوں اور میں نے ان کے لیے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ دھنو کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ وہ بار بار مجھ سے لپٹ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے اپنے اندر سمو لیتی۔

میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے پنجہ آزمائی میں اس قبیلے کے ایک معتبر شخص کو شکست دی تھی۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونی چاہییے تھیں لیکن سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ مقابلے کے درمیان بھی لوگ زیادہ تر میری ہی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے اور میری جیت پر تو وہ ناچ رہے تھے، خوشیاں منا رہے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے دلوں میں شیواگ کے لیے کتنی نفرت تھی۔

یہ ہنگامہ ابھی جاری تھا کہ کاشی کی محافظ پالا کسی طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ دو نیزہ بردار مرد بھی تھے۔

پالا اور ان دونوں نیزہ برداروں کو دیکھ کر لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ پالا میرے سامنے آ کر رک گئی۔

"تمہیں کاشی نے طلب کیا ہے۔ ابھی، اسی وقت۔" اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

میں پالا کے ساتھ چل پڑا۔ دھنو وغیرہ بھی آگے بڑھیں تو پالا نے انہیں روک دیا۔

"تم لوگ نہیں۔" اس نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم لوگ یہیں ٹھہرو یا اپنے جھونپڑے میں چلی جاؤ۔ کاشی ضروری سمجھے گی تو تم لوگوں کو بھی بلا لے گی۔"

دھنو کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ میں اور پالا ساتھ ساتھ تھے اور دونوں نیزہ بردار ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

کاشی کا جھونپڑا بستی کے مرکزی چوک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ جھونپڑا دوسرے جھونپڑوں کے مقابلے میں خاصا بڑا تھا۔ باؤنڈری وال نے اچھی خاصی جگہ گھیری ہوئی تھی۔ ایک محافظ بیرونی دروازے کی اندر کی طرف صحن میں موجود تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں نیزہ بردار بھی وہیں رک گئے اور میں پالا کے ساتھ تقریباً دس گز کا مزید فاصلہ طے کر کے جھونپڑے کے دروازے میں داخل ہو گیا جس کے سامنے برآمدے کی طرح سائبان بھی بنا ہوا تھا۔

یہ ہال نما کمرا خاصا بڑا تھا۔ اس کی دائیں طرف ایک مختصر سی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک اور کمرا تھا جس کے دروازے پر پاک کی کھال کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ پالا نے پردہ ہٹا کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں رک گئی۔

میرے ذہن میں اس حویلی کا تصور ابھر آیا جس کی سیر میں نے گزشتہ رات کی تھی لیکن یہ جھونپڑا اس حویلی سے بہت مختلف تھا۔

یہ کمرا بھی خاصا وسیع تھا۔ فرش پر پاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سنگل صوفے کی طرح لکڑی کی ایک بھدی سی کرسی پر کاشی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایسی ہی دو کرسیاں اور بھی پڑی تھیں۔

کرسی کی پشت اونچی تھی اور کاشی دونوں بازو ہتھوں پر ٹکائے بڑی سکنت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہیں۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مجھے بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ قبیلے کی سردار کے سامنے پیش ہونے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ تاہم کاشی نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ آگے بڑھایا تو میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور مودبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ کاشی کل صبح ہمارے جھونپڑے میں آ چکی تھی۔ اس وقت اس کا انداز بے تکلفانہ تھا۔ رات کو..... لیکن میں رات کا ذکر بار بار نہیں کروں گا..... نجانے کیا بات تھی کہ اس وقت مجھ پر کاشی کا رعب سا طاری ہو رہا تھا۔

"بیٹھو۔" اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کاشی اس کمرے میں اکیلی نہیں تھی۔ دائیں طرف ایک دروازے کے قریب ایک نوجوان خادمہ بھی کھڑی تھی۔ دروازے کے سامنے پردے کے بجائے رنگ برنگے موتیوں کی لاتعداد جھالریں لٹکی ہوئی تھیں اور یہی جھالریں پردے کا کام بھی دے رہی تھیں۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر دیوار کے قریب اسٹول کی طرح، چبوترے پر شیشے کا ایک بڑا سا مٹکا رکھا تھا جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

کاشی نے دروازے کے قریب کھڑی ہوئی خادمہ کو اشارہ کیا وہ اندر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد لکڑی کی ایک طشتری میں عنابی رنگ کے مشروب سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آئی۔ دونوں گلاس اس نے کرسیوں کے درمیان رکھی ہوئی گائی نیبل قسم کی بھدی سی میز پر رکھ دیے۔ کاشی نے ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

"لو پیو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "اس کا ذائقہ تمہارے لیے اجنبی نہیں ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں رات کا منظر ابھر آیا۔ کاشی نے اسی طرح مجھے مشروب پیش کیا تھا۔ گویا گزشتہ رات اس سے میری ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ شان دار حویلی، کمروں کی دیواروں اور کھڑکیوں پر لہراتے ہوئے رنگ برنگے وہ ریشمی پردے، وہ سب کچھ کیا تھا؟ اگر وہ خواب تھا تو کیا خواب میں نظر آنے والی ہستی بھی جانتی ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے کے روبرو موجود تھی۔ نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا..... تو پھر کاشی کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہ مشروب پہلے بھی پی چکا ہوں۔

ہم میں ابھی گفتگو کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ کاشی مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وجہ اس کا وہ لباس تھا۔ گھٹنوں سے اوپر کھال کا اسکرٹ اور سینے پر سامنے یاک ہی کی کھال کا مختصر سا ٹکڑا۔

اچانک ایک چھناکا سا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ کاشی بھی ایک لمحے کو بدحواس سی ہو گئی تھی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا اور مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دیوار کے ساتھ چبوترے پر رکھا ہوا شیشے کا مٹکا ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ پانی چاروں طرف بہہ گیا اور رنگ برنگی مچھلیاں

زمین پر تڑپنے لگیں۔

میری طرح کاشی بھی اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کو دھواں ہوگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ میں زمین پر تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو اٹھانے کے لیے لپکا تو کاشی نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور مجھے کھینچتی ہوئی اس کمرے میں گھس گئی جس کے دروازے پر رنگ برنگے موتیوں والی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔

یہ خواب گاہ تھی جس میں دائیں طرف لکڑی کے ایک تخت پر یاک کی کھالوں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ پچھلی طرف ایک کشادہ کھڑکی تھی۔ اس کے سامنے بھی موتیوں والی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔ پلنگ کے سامنے دو آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے چبوترہ بنا ہوا تھا۔ کمرے میں ضرورت کی اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

"بیٹھو۔" کاشی نے چبوترے کی طرف اشارہ کیا اور باہر کھڑی ہوئی خادمہ کو بلا کر دوسرے کمرے سے مٹکے کے ٹکڑے اور مچھلیاں اٹھا لینے کا حکم دیا۔

کاشی پلنگ پر چڑھ کر پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"اس شیطان کو پتا چل گیا ہے کہ تم یہاں آئے ہو۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن یہ کمرا محفوظ ہے۔ یہاں اس کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب چاہے' تمہیں اس کمرے تک محدود کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسا بھی نہیں ہے۔" کاشی بولی "غلطی میری تھی۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے مجھے بندوبست کرلینا چاہیے تھا۔ بہرحال' اس وقت ہم یہاں محفوظ ہیں اور اطمینان سے باتیں کرسکتے ہیں۔"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی ہماری کوئی ملاقات ہوئی تھی؟" میں نے نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ دراصل میں گزشتہ رات کی ملاقات کا حال جاننا چاہتا تھا۔

"ہاں۔ کل صبح تمہارے جھونپڑے میں ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔ اس کے علاوہ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کاشی نے جواب نہیں دیا۔ وہ میرے اس سوال پر محض مسکرا کر رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن ایک بات اور۔" میں نے کہا۔ میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں "شیواگ کو تم سے کس بات پر اختلاف ہے؟"

"وہ نہایت کمینہ اور خبیث شخص ہے۔" کاشی نے جواب دیا "کسی سے اختلاف کے لیے وہ کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کے ساتھ لوگوں کا رویہ تم نے آج دیکھ لیا۔ تم اجنبی ہو اور وہ اس قبیلے کا ایک فرد۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں مگر اس بستی کے لوگوں نے ایک اجنبی کی جیت کا جشن منایا۔"

"اس کی وجہ بھی میں سمجھ سکتا ہوں لیکن وہ تم پر یہ الزام لگاتا ہے کہ سردار منتخب ہونے سے پہلے تم....." میں ایک لمحے کو خاموش ہوگیا۔ میں کھلے الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا "میرا مطلب ہے' تم نے ایک اہم شرط پوری نہیں کی تھی جس کی وجہ سے قبیلے پر عذاب نازل ہورہا ہے یا ہونے والا ہے؟"

کاشی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"وہ شیطان ہر شخص سے یہی کہتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ اس کا اندازہ تم نے آج لگالیا ہوگا۔ اس کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں۔"

"لیکن اگر ایک جھوٹی بات بھی بار بار دہرائی جائے تو اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے اور لوگ اس کا اثر قبول کرلیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لوگ حقیقت کو سمجھتے ہیں۔" کاشی نے کہا "جس شخص کے حوالے سے شیواگ نے مجھ پر الزام لگایا تھا وہ بار بار اس کی تردید کرچکا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ شخص مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہے اس لیے اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ....." میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"قبیلے کی بہت سی عورتیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔" کاشی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "بہرحال' یہ ایک مختلف موضوع ہے اور تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنے مقصد پر توجہ دینی چاہیے جس کے لیے تم اتنا طویل اور کٹھن سفر کرکے آئے ہو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

میرے دماغ میں ایک بار پھر سنسناہٹ ہونے لگی۔ گزشتہ رات کی ملاقات خواب تھی یا حقیقت؟ اب وہ ساری باتیں دہرائی جارہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ بہرحال' میں ان باتوں کو دہرانے کی کوشش

نہیں کروں گا۔ لبِ لباب یہ تھا کہ کاشی اور اس کا یہ قبیلہ صدیوں سے اس راستے کے محافظ کے فرائض انجام دے رہا تھا جو نیلگری کی طرف جاتا تھا۔ تلکو جھیل کے کنارے پر آباد یہ قبیلہ ان برف پوش چوٹیوں کو بہت مقدس اور پوتر سمجھتا تھا اور ان کے عقیدے کے مطابق ان برف پوش چوٹیوں میں ایک ایسی مہان شکتی خوابیدہ تھی جو اگر کسی غلط آدمی کے ہاتھوں میں چلی جاتی تو جھیل کا پانی اس بستی اور قبیلے کو نگل جاتا۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ شکتی چونکہ مونث تھی اس لیے تلکو قبیلے کی سرداری کے لیے بھی ایک ایسی عورت کو منتخب کیا جاتا تھا جو کنواری ہو۔ سردار منتخب ہونے سے پہلے وہ کسی مرد کے پاس نہ گئی ہو۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر یکایک ایک شیطان فطرت آدمی ان برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے میں کامیاب ہوگیا۔ شیواگ نے قبیلے کی رسموں سے بغاوت کرکے اس شیطان کی مدد کی تھی اور اس کی شیطانی قوتوں کے زیرِ اثر آگیا تھا اور وہ کاشی کی مخالفت کررہا تھا۔

قبیلے کی سردار منتخب ہونے والی عورت کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اکیس روز کا ایک جاپ کرے اور دراصل یہ جاپ ہی کاشی کو اب تک بچائے ہوئے تھا۔

ہماری گفتگو خاصی طویل ہوگئی تھی۔ میں اٹھ رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔

"یہ نیلا کوبرا کیا ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس نے تمہیں چیلنج کیا ہے۔" کاشی بولی "نیلا کوبرا وہ زہریلا سانپ ہے جس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ اس سانپ کا زہر اس قدر سریع الاثر ہے کہ انسان کے جسم کو چھوتے ہی اس کی موت واقع ہوجاتی ہے اور چند سیکنڈ کے اندر اندر جسم کوئلے کی طرح سیاہ ہوجاتا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "تاہم ایک خاص عمل کے ذریعے زہر کے اثر کو روکا جاسکتا ہے اور شیواگ یہ عمل جانتا ہے۔ اسے جب بھی کوئی مشکل پڑتی ہے وہ اپنے حریف کو یہی چیلنج دیتا ہے۔ حریف یا تو اپنی شکست تسلیم کرلیتا ہے یا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے میرا مشورہ ہے کہ تم....."

"مجھے اس کا یہ چیلنج قبول ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

کاشی کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

کاشی کے جھونپڑے سے نکل کر میں ٹہلتا ہوا بستی کے مرکزی چوک پر آگیا۔ بہت سے لوگ وہاں موجود تھے مگر شوبھا وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ میں اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ ایک عورت بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"تم نے شیواگ کا چیلنج قبول کرکے بہت بڑی غلطی کی ہے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو میں شیواگ کو یہ چیلنج واپس لینے پر آمادہ کرسکتی ہوں۔"

"اس کے لیے شرط کیا ہوگی؟" میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں اس کے حق میں اپنی ایک عورت سے دستبردار ہونا پڑے گا اور شام سے پہلے پہلے یہ بستی چھوڑنی ہوگی۔ اس کے چند آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے جو تمہیں یہاں سے دو دن کی مسافت پر چھوڑ دیں گے۔"

"اس بستی میں عورتوں کی کمی تو نہیں پھر اس نے میری ساتھی کسی عورت پر نظریں کیوں گاڑ رکھی ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسے تمہاری وہ عورت پسند آگئی ہے جو آج تمہاری جیت کی خوشی میں ناچ رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا اشارہ دھنو کی طرف تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قبیلے کی عورتیں بے حد حسین تھیں لیکن دھنو کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اس کی معصومیت نے بھی اسے کچھ زیادہ ہی حسین بنا دیا تھا۔

"تم شیواگ کی وکالت کیوں کررہی ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"وکالت نہیں کررہی۔ میں نے اس کا پیغام تم تک پہنچایا ہے اور اگر تم چاہو تو اپنی اس عورت کے بدلے تم مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔" اس نے کہا۔

"شیواگ کو شاید اپنی شکست کا خوف ہے اسی لیے وہ مجھے مقابلے سے دستبردار کرانا چاہتا ہے۔ تم نے اس کا پیغام پہنچا دیا۔ شکریہ! اس سے کہنا' میں شام کو چوک پر پہنچ جاؤں گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی رفتار تیز کردی۔

وہ عورت وہیں رک گئی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیز تیز چلتا رہا۔

دھنو وغیرہ جھونپڑے میں موجود تھیں۔ وہ مجھ سے کاشی

سے ہونے والی اس ملاقات کے بارے میں سوال کرتی رہیں اور میں نیلگری کا ذکر بیچ میں لائے بغیر مناسب انداز میں ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

دوپہر کا کھانا ہمیں جھونپڑے ہی میں پہنچا دیا گیا۔ کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔

جب بیدار ہوا تو سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ جھونپڑے میں کوئی نہیں تھا۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ شوبھا اور مارتھا جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دھنو کہیں نظر نہیں آئی۔

"دھنو کہاں ہے؟" میں نے شوبھا کے قریب رک کر پوچھا۔

"بستی میں کہیں گھوم رہی ہوگی۔" شوبھا نے جواب دیا "آج اس نے یہاں کئی لوگوں کو دوست بنالیا ہے۔ تمہارے سو جانے کے بعد کونگا نام کی ایک عورت یہاں آئی تھی۔ وہی دھنو کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔"

میں بھی ان کے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ جھیل میں بہت دور تین چار کشتیاں تیر رہی تھیں۔ یہ بستی کے ماہی گیروں کی کشتیاں تھیں۔ مچھلی بھی قبیلے والوں کی خوراک کا ایک اہم جزو سمجھی جاتی تھی۔

میری نظریں ان کشتیوں سے آگے بہت دور ایک ٹاپو پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں وہ کوئی چھوٹا سا جزیرہ تھا جس پر درخت بھی نظر آرہے تھے۔ اس جزیرے کے بارے میں رستوگی نے بھی مجھے بتایا تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی اور بستی کے لوگ اس طرف جاتے بھی نہیں تھے۔

سورج جھیل کے اس پار پہاڑوں پر جھکنے لگا تھا۔ ہمیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

"ارے یہ دھنو کہاں غائب ہوگئی؟" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیر سپاٹا کررہی ہوگی۔ تم کیوں پریشان ہورہے ہو؟" شوبھا نے جواب دیا۔

میں پھر جھیل کی طرف دیکھنے لگا۔ ماہی گیروں کی کشتیاں واپس آرہی تھیں۔

سورج پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کچھ دیر تک افق پر سرخی تیرتی رہی اور پھر یہ سرخی شام کے دھندلکے میں ڈھلنے لگی۔ میں بار بار دھنو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بستی تو نہیں تھی جس کی سیر میں کئی گھنٹے لگ جائیں۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ شوبھا اور مارتھا کے چہروں پر بھی اب پریشانی کے [illegible]

آئے تھے۔

ہم تینوں وہاں سے اٹھ کر بستی میں آگئے اور مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے مرکزی چوک پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں دھنو کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

مرکزی چوراہے پر چاروں طرف مشعلیں جل رہی تھیں اور چوک کے عین وسط میں بنے ہوئے چبوترے پر ایک صندوق رکھا ہوا تھا جو یاک کی کھال سے ڈھکا ہوا تھا۔ لوگ چبوترے کے اردگرد جمع ہورہے تھے۔

"وہ... وہ دیکھو، کونگا کھڑی ہے۔" شوبھا نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف متوجہ کیا "دھنو اسی کے ساتھ آگئی تھی۔ اس سے معلوم کرو۔"

میں نے اس طرف دیکھا تو چونک گیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے دوپہر کو مجھے شیواگ کے حق میں مقابلے سے دستبردار ہونے کو کہا تھا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر کونگا کو بازو سے پکڑلیا۔

"دھنو کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کسی قدر کرخت لہجے میں پوچھا۔

مجھے دیکھ کر کونگا بدحواس سی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

"کون دھنو؟" وہ الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میری دوست... جسے تم دوپہر کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ تو چلی گئی تھی۔ بستی کے باہر۔ اس طرف۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک آدمی اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔

میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دھنو کی تلاش میں کسی اور طرف جاتا ایک شور سا مچا اور ادھر ادھر پھیلے ہوئے لوگ بھی چبوترے کے گرد جمع ہونے لگے۔

شیواگ ڈھکے ہوئے صندوق کے قریب چبوترے پر کھڑا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی بھی چبوترے پر چڑھ کر صندوق کی دوسری طرف کھڑا ہوگیا اور دو منٹ بعد ہی کاشی بھی پالا اور دو محافظوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ قریب کھڑا ہوا ایک آدمی مجھے [illegible] پکڑ کر چبوترے پر لے گیا۔

اس بوڑھے آدمی نے اونچی آواز میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ کہا اور صندوق پر پڑی ہوئی کھال اٹھادی۔

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ صندوق نہیں، ایک پنجرہ تھا اس کے چاروں طرف اور اوپر بھی باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ اوپر والے حصے پر ایک اتنا بڑا سوراخ تھا کہ ایک ہاتھ اندر ڈالا جاسکتا تھا۔ اس سوراخ پر لکڑی کا ڈھکنا لگا ہوا تھا۔

پنجرے میں کوئی درجن بھر ناگ پھنکار رہے تھے۔ ان میں نیلے رنگ کا ایک کوبرا بھی تھا۔ اس کا چمکتا ہوا نیلا رنگ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا لیکن اس کے اندر وہ زہر بھرا ہوا تھا کہ اس کے ڈس لینے سے آدمی کو دوسرا سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

کوئی بھی سانپ لمبائی میں ڈھائی تین فٹ سے کم نہیں تھا۔ وہ بل کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔ نیلے کوبرے کی لمبائی بھی ڈھائی تین فٹ کے قریب اور موٹائی دو انچ کے قریب تھی۔ وہ ان سب میں نمایاں نظر آرہا تھا۔

"ان میں ہر ناگ اس قدر زہریلا ہے کہ اگر ہاتھی کو ڈس لے تو وہ بھی ڈھیر ہوجائے۔" قریب کھڑے ہوئے بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "نیلا کوبرا ان کا شہنشاہ ہے۔ اس کا زہر آن کی آن میں شکار کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "پہلے شیواگ پنجرے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کوبرے کو باہر نکالے گا۔ اسے دو منٹ اپنے ہاتھوں میں رکھے گا اور پھر پنجرے میں ڈال دے گا۔ اس کے بعد تمہیں پنجرے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کوبرے کو باہر نکالنا ہوگا لیکن اگر تم چاہو تو آخری لمحے پر بھی مقابلے سے دستبردار ہوکر اپنی شکست تسلیم کرسکتے ہو۔"

"میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے کاشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

بوڑھے نے اعلان کیا کہ پہلے شیواگ پنجرے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کوبرے کو پکڑے گا اور اس کے بعد اجنبی کی باری آئے گی۔

شیواگ آگے گیا۔ اس نے ڈھکنا اوپر اٹھا کر ہاتھ اندر ڈال دیا۔ پنجرے کے اندر کلبلاتے ہوئے کوبرے اس کے بازو سے لپٹنے لگے۔ اس نے نیلے کوبرے کو پکڑنا چاہا تو وہ مچھلی کی طرح پھسل کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن بالآخر اس نے نیلے رنگ کو گردن سے پکڑ کر پنجرے سے [illegible] اپنے بازو پر چھوڑ دیا۔ کوبرا... دوشاخہ زبان لہراتا ہوا اس کے بازو کے ساتھ لپٹ کر اوپر کندھے کی طرف جانے لگا اور پھر وہ گردن پر سے ہوتا ہوا دوسرے کندھے پر آگیا۔

ہمارے چاروں طرف بیسیوں لوگ کھڑے تھے مگر خاموشی ایسی تھی جیسے وہاں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ لوگوں کے چہروں پر دہشت اور سنسنی کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے "سانپ سونگھ جانا" کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دو منٹ گزر گئے۔ بوڑھے کے کہنے پر شیواگ نے ناگ کو دوبارہ پنجرے میں ڈال دیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"اب نیلے کوبرے کو پکڑنے کی تمہاری باری ہے اجنبی۔" بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے اگر تم چاہو تو شیواگ کے پیر چھو کر اب بھی مقابلے سے دستبردار ہوسکتے ہو۔"

میں دو قدم آگے بڑھا کر پنجرے کے پاس آگیا۔ سوراخ کا ڈھکنا اٹھا کر کاشی کی طرف دیکھا اور پنجرے میں ہاتھ ڈال دیا۔

کئی سانپ میرے بازو سے لپٹ گئے۔ ایک دو سانپ ایسے بھی تھے جنہوں نے مجھے ڈسنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ بازو پر دو تین جگہوں پر مجھے سوئی کی چبھن کا سا احساس ہوا تھا۔

میں نے نیلے کوبرے کو پکڑنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ پھنکارتا ہوا پھن پھیلا کر میرے سامنے آدھے قد سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے جسم کا باقی حصہ کنڈلی کی طرح بل کھائے ہوئے تھا۔

میں آہستہ آہستہ ہاتھ کو اس کے سامنے ہلانے لگا۔ اس نے حملہ کردیا۔ ہاتھ کی پشت پر سوئی سی چبھی اور پھر میں نے نیلے کوبرے کو گردن سے پکڑ کر پنجرے سے باہر نکال لیا۔

اس وقت بھی ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ ہر چہرے پر سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔

میں نے نیلے کوبرے کو گلے میں ڈال کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ایک دم شور سا اٹھا۔ لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ میں نے کاشی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔ شور سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

نیلا کوبرا ہار کی طرح میرے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی دوشاخہ زبان بار بار لپک رہی تھی۔ میں نے اسے گردن سے

پکڑ کر اپنے سے الگ کیا اور اسے گچھا سا بنا کر ہوا میں اچھال دیا لیکن زمین پر گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے دوبارہ پکڑ لیا۔

نیلا کوبرا پانچ چھ منٹ تک میری بانہوں' گردن' سینے اور پشت پر رینگتا رہا اور پھر میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ پنجرے میں ڈال دیا اور جب مڑ کر دیکھا تو شیواگ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

کاشی نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگی۔ لوگوں نے نعرے لگا کر اس کی باتوں کا جواب دیا اور "شیواگ' شیواگ" کہتے ہوئے ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ شیواگ کو تلاش کررہے تھے۔

کاشی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے جھونپڑے میں لے آئی۔ مارتھا اور شوبھا بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ کاشی کے محافظ باہر ہی رک گئے تھے۔ تاہم پالا اندر آگئی تھی۔

میرے بازوؤں پر جہاں جہاں سانپوں نے ڈسا تھا وہاں وہاں خون کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔ کاشی نے میری طرف دیکھا' میرا ایک بازو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور ہونٹ اس جگہ لگا دیے جہاں خون کا ایک قطرہ چمک رہا تھا۔

میں نے کاشی کو پیچھے ہٹانا چاہا مگر اس نے میرے تمام زخموں سے خون چوس لیا اور اس طرح لہرانے لگی جیسے شراب کی کئی بوتلیں چڑھا گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک دم سرخی بھر گئی تھی اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگی۔ وہ بدمست شرابی کی طرح لہرا رہی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر گھسیٹتا ہوا خواب گاہ میں لے آیا اور اسے بستر پر لٹا دیا۔

میرے خون میں ان زہریلے سانپوں کا زہر شامل ہوگیا تھا جسے کاشی نے چوس لیا تھا اور اس پر زہر کا نشہ طاری ہورہا تھا۔ کاشی کی اس کیفیت سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ زہر خورانی کی عادی تھی اور ناگوں کے زہر نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

شوبھا کو بھی میں نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ میرے اپنے اندر اتنا زہر بھر دیا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی زہر مجھ پر اثر نہیں کرسکتا اور مارتھا تو یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غرق ہوئے جارہی تھی۔ اسے اپنی کتاب کے لیے بہت سنسنی خیز مواد مل رہا تھا۔

"یہ۔ یہ سب کیسے ہوا؟" شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "سانپ کا زہر تم پر اثر انداز کیوں نہیں ہوا؟"

"یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا "اس وقت تو میں دھنو کے لیے پریشان ہوں۔ اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گا۔"

کاشی کے جھونپڑے سے نکلتے ہوئے میں نے اس کو بھی بتا دیا تھا کہ دھنو دوپہر سے غائب ہے۔ ہم اسے تلاش کرنے جارہے ہیں۔

ہم پوری بستی میں گھومتے رہے۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہوگئے تھے۔ بستی کے ایک ایک گھر میں جھانک لیا گیا۔ ہر وہ جگہ چھان ڈالی گئی جہاں اس کے ملنے کی توقع ہوسکتی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا اور میرے لیے مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ مقابلے کے بعد سے شیواگ بھی غائب تھا۔

صبح جب کونگا نے مجھے مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے کہا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ میں دھنو کو شیواگ کے حوالے کرکے اس بستی سے چلا جاؤں تو اسی وقت شیواگ کے بارے میں میرے ذہن میں شبہات کے سانپ کلبلانے لگے تھے۔ دوپہر کو دھنو کے غائب ہوجانے کے بعد یہ شبہات قوی تر ہوتے جارہے تھے اور اب شیواگ کو بھی غائب پاکر میرے شبہات یقین میں بدلتے جارہے تھے کہ دھنو کی گمشدگی میں شیواگ ہی کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

کئی لوگ جن میں قبیلے کی عورتیں بھی شامل تھیں' آدھی رات تک دھنو کو تلاش کرتے رہے اور جب ہم مایوس ہوکر اپنے جھونپڑے میں آگئے تو کچھ لوگ اس وقت بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ لوگ ہم سے اظہارِ ہمدردی کررہے تھے اور بعض ڈھکے چھپے لفظوں میں اور بعض واشگاف الفاظ میں شیواگ کو ہی دھنو کی گمشدگی کا ذمے دار ٹھہرا رہے تھے۔ شیواگ کی تلاش میں تو کچھ لوگ بستی سے تقریباً ڈیڑھ میل دور شیواگ کی زمینوں پر واقع اس کے جھونپڑے کی تلاشی بھی لے آئے تھے لیکن وہاں نہ شیواگ تھا اور نہ ہی دھنو۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ سب لوگ جاچکے تھے۔ میں' شوبھا اور مارتھا جھونپڑے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ بستی میں ہر طرف سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دھنو کی اس پراسرار گمشدگی پر مارتھا تو پریشان تھی ہی' شوبھا کی حالت بھی بہت غیر ہورہی تھی۔ ان کا بہت طویل عرصے کا ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سگی بہنوں کی

طرح چاہتی تھیں۔ شوبھا کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔

اچانک وہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی ہمارے جھونپڑے کی پچھلی طرف دبے قدموں چلنے کی کوشش کررہا ہو۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مارتھا اور شوبھا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر محتاط انداز میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا لیکن دروازہ کھولنے میں مجھ سے تھوڑی سی بے احتیاطی ہوگئی۔ میرا پیر فرش پر بچھی ہوئی کھال میں الجھ گیا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں میرا ہاتھ دروازے سے ٹکرا گیا۔

سناٹے میں دروازے سے ٹکرانے کی آواز دور تک پھیلی تھی اور اسی وقت جھونپڑے کی پچھلی طرف کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور تیزی سے جھونپڑے کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ ایک ہیولا دوڑتا ہوا بائیں طرف تقریباً تیس گز آگے ایک اور جھونپڑے کے اوپر سے گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں قدموں کی آواز کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ایک موقع پر وہ ہیولہ میری نظروں میں آگیا لیکن ایک گلی میں گھس کر بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز پر اس کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ انسانی ہیولا بستی کی گلیوں سے نکل کر جھیل کی طرف آگیا۔ جھیل کا یہ حصہ ہمارے جھونپڑے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے تعاقب کی وجہ سے اسے بستی میں کہیں چھپنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اسی طرف آکر شاید وہ جھاڑیوں میں کہیں غائب ہونا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے تقریباً چالیس گز آگے تھا۔ وہ چیتے کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی رفتار تیز کردی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ قدِ آدم جھاڑیوں میں چھپ گیا تو میں اسے تلاش نہیں کرسکوں گا۔ میری ساری قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا۔

وہ ہیولہ جھاڑیوں کا رخ کرنے کے بجائے جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور پھر اسے ایک جگہ رکتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس جگہ جھیل کے کنارے کے بالکل ساتھ ایک کشتی نظر آرہی تھی جو پانی کی لہروں کے ساتھ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کشتی کی رسی شاید کنارے پر جھاڑیوں سے بندھی ہوئی تھی اور وہ ہیولا جھک کر وہ رسی کھول رہا تھا۔

میں نے اپنی رفتار اور تیز کردی۔ وہ ہیولا رسی کھول کر کشتی کو پانی کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہمارے درمیان دس بارہ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس ہیولے کے اوپر گرا۔

وہ چیخ میرے لیے بڑی حیرت انگیز ثابت ہوئی تھی اور جب پانی میں گرتے ہی میں نے اس ہیولے کو دبوچا تو اس چیخ کے حوالے سے بھی اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ میں جس کا تعاقب کررہا تھا وہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ کوئی عورت اس قدر تیز رفتار بھی ہوسکتی ہے لیکن مجھے زیادہ دیر تک حیران ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس عورت کا بھرپور گھونسا میری کنپٹی پر لگا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچنے لگے۔

ہم اس وقت جھیل کے کنارے کے بالکل ساتھ تھے۔ پانی میری پنڈلیوں تک تھا۔ گھونسا کھا کر میں لڑکھڑا گیا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ مجھے زوردار دھکا دے کر پشت کے بل پانی میں گرا دیا اور کشتی کی طرف لپکی۔

میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ابھی کشتی سے دو تین فٹ دور تھی کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں پانی میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ عورت ہونے کے باوجود کسی مرد کی طرح طاقت ور اور پھرتیلی تھی۔ ہم لڑتے ہوئے پانی سے نکل کر کنارے پر جھاڑیوں میں آگئے۔

اس قبیلے کی لمبی تڑنگی عورتوں کو دیکھ کر اندازہ تو ہو تا ہی تھا کہ وہ بڑی جفاکش قسم کی ہیں اور یہ پہلی عورت تھی جس سے مجھے اس طرح واسطہ پڑا تھا۔ ایسی مرد مار عورتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ ایک مرتبہ تو اس نے مجھے سر سے اوپر اٹھا کر جھاڑیوں میں پٹخ دیا تھا۔

میں ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کی بہادری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اگرچہ طویل مقابلے کی سکت رکھتی تھی لیکن میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ جم کر مقابلہ کرنے کے بجائے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر پانی میں چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اسے کشتی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ اس مرتبہ میں نے اسے اس طرح گرفت میں لیا تھا کہ اس کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ تاریکی کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا اور میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

وہ کونگا تھی۔

"تو اس سازش میں تم بھی شریک ہو۔" میں نے کونگا کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر گرفت میں لیے "بتاؤ دھنو کہاں ہے؟ اگر تم نے جواب نہیں دیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تمہاری عورت شیواگ کے قبضے میں ہے لیکن میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ وہ کہاں ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ صبح ہوتے ہی یہ بستی چھوڑ دو۔ ورنہ....."

میں نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر پانی میں غوطہ دیا۔ وہ جب سیدھی ہوئی تو بری طرح چیخنے لگی۔ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی نرمی اختیار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر اسے موقع مل جاتا تو اب تک مجھے موت کے گھاٹ اتار چکی ہوتی اور پھر یہی وہ عورت تھی جس کی وجہ سے دھنو کسی مصیبت میں مبتلا تھی۔ کونگا ہی دھنو کو کسی طرح بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گئی تھی اور میں اس کا لحاظ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"نن..... نہیں بتاؤں گی۔" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

میں نے اسے ایک اور غوطہ دیا۔ اس مرتبہ وقت ذرا زیادہ دیا۔ وہ مچلنے لگی تو میں نے اس کا سر پانی سے نکال لیا۔

پانچواں غوطہ کھانے کے بعد ہی وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوئی تھی۔

"وہ..... وہ اسے جزیرے پر لے گیا ہے۔" اس نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس جزیرے پر کوئی آبادی نہیں ہے۔ اس طرف کوئی نہیں جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہاں بد روحوں نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ کئی برسوں سے وہ جزیرہ ویران ہے۔ شیواگ اسے وہیں لے گیا ہے۔"

"اس کے ساتھ اور کون کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہینگ کے سوا کسی اور کو میں نے اس کے ساتھ جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔" کونگا نے جواب دیا۔

"ابھی تم بھی وہیں جانے والی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" کونگا نے جواب دیا "اس نے تمہاری نگرانی کی ذمے داری مجھے سونپ رکھی تھی۔ میں اس وقت جزیرے پر جانے کے لیے ہی اپنے جھونپڑے سے نکلی تھی۔ تمہارے جھونپڑے کی طرف سے گزرتے ہوئے اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ تم لوگوں کی کچھ باتیں بھی سن لی جائیں اور یہی مجھ سے غلطی ہوگئی۔ نہ میں اس طرف جاتی، نہ تمہیں میرا پیچھا کرنے کا موقع ملتا لیکن..... تم ایک بات ذہن نشین کرلو۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ ایک بہت بڑی شکتی اس کی پشت پر ہے۔ وہ تمہیں تباہ کردے گا۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی اس عورت کو بھول جاؤ اور اپنی کھال بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

باتوں کے دوران میں، میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے کیونکہ اب مجھے اس سے کسی شرارت کی توقع نہیں تھی لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے موقع پاکر اچانک ہی کھلی ہتھیلی سے میری ناک پر زوردار ضرب لگائی۔ میں کراہتا ہوا لڑکھڑا کر پشت کے بل پانی میں گرا۔ یہ ضرب کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا اور ناک سے خون بہہ نکلا۔

کونگا نے کشتی کی طرف چھلانگ لگا دی جو اس دوران میں ہلکی لہروں پر بہتی ہوئی وہاں سے تقریباً دس بارہ فٹ دور جاچکی تھی۔ پانی میں ایک چھلانگ لگانے کے بعد وہ مچھلی کی طرح تیزی سے تیرنے لگی۔

میں نے بھی سنبھل کر چھلانگ لگا دی اور بڑی تیزی سے تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس جگہ پانی میرے سینے کے برابر تھا اور تیرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

ادھر کونگا نے کشتی پر ہاتھ ڈالا، ادھر میں نے پیچھے سے اس کا ایک پیر پکڑ لیا اور اسے پیچھے کھینچنے لگا۔ کونگا کشتی کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے میری طرف پلٹی۔ پانی میں اس کی یہ قلابازی حیرت انگیز تھی۔ وہ میرے اوپر آرہی اور دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ کر سر کو پانی میں دبانے لگی۔

میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو پانی سے باہر نکالا۔ میرے اور کونگا کے بیچ ایک بار پھر معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ کبھی وہ مجھے پانی میں دبا دیتی اور کبھی میں..... لیکن بالآخر وہ پوری طرح میری گرفت میں آگئی۔ میں اسے پانی میں غوطے دینے لگا۔ آخری مرتبہ میں نے اس کا سر پانی میں ڈبویا تو پھر نہیں اٹھنے دیا۔ وہ پانی میں بری طرح مچل رہی تھی لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہوگئی۔

میں اسے بالوں سے پکڑ کر پانی میں کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور اس کی لاش پانی سے نکال کر جھاڑیوں میں ڈال دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس طرح کسی عورت کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی بہادری نہیں لیکن میں اگر اس کا لحاظ کرتا تو وہ میرا یہی حشر کرتی۔

میں چند لمحے کنارے پر بیٹھا رہا پھر پانی میں اتر کر کشتی کے قریب آگیا۔ یہ کشتی درخت کے بہت بڑے تنے کو کھوکھلا

کرکے بنائی گئی تھی اور اس میں تین چار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کشتی کے اندر چپو بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کشتی میں بیٹھ کر چپو سنبھال لیے اور اسے تیزی سے گہرے پانی کی طرف کھینے لگا۔

تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آج دن میں چونکہ میں نے وہ جزیرہ دیکھا تھا اس لیے محض اندازے کی بنا پر کشتی کا رخ اس طرف رکھے ہوئے تھا۔

مجھے کشتی رانی کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے زندگی میں کبھی شوقیہ طور پر کشتی چلائی ہو لیکن یہ کشتی تو بہت مختلف تھی۔ درخت کا کھوکھلا تنا..... جس کا توازن برقرار رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کئی مرتبہ تو کشتی الٹتے الٹتے بچی تھی لیکن میں نتائج کی پروا کیے بغیر تیزی سے چپو چلاتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد تاریکی میں جزیرے کا ہیولا دکھائی دینے لگا لیکن وہ اب بھی بہت دور تھا اور میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں تک پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹا اور لگتا۔

جھیل کی سطح پر سکون تھی۔ مجھے چپو چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی لیکن اچانک ہوا کا رخ بدل گیا اور اس میں تیزی آتی گئی۔ پہلے تو ہوا پیچھے سے مجھے دھکیل رہی تھی لیکن اب سامنے سے میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے جھیل کی پرسکون سطح پر تیز لہریں اٹھنے لگیں۔ ہوا جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی، لہروں کی تندی بھی بڑھ رہی تھی۔

اور پھر وہ ہوا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ جھیل میں اٹھتی ہوئی لہریں بھنور کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ کشتی کے آس پاس جھیل کا پانی دائرے میں گھومنے لگا۔ یہ صورتِ حال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں کشتی کو گردش کرتی ہوئی لہروں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن بھنور خوفناک صورت اختیار کرتا گیا۔

کشتی بہت تیزی سے بھنور میں گردش کررہی تھی۔ چپو میرے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ ایک چپو تو کشتی کے اندر گرا تھا اور دوسرا باہر جو دیکھتے ہی دیکھتے لہروں میں غائب ہوگیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کشتی کے کناروں کو پکڑ رکھا تھا اور کشتی لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔

کشتی الٹ گئی۔ میں پانی میں گر چکا تھا لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور کشتی کے کنارے کو ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے پانی کے اندر نیچے کی طرف کھینچ رہی ہو۔ مجھے ایک دو غوطے بھی آئے لیکن میں نے کشتی کے کنارے پر مضبوطی سے گرفت جمائے رکھی۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دو نادیدہ قوتوں میں جنگ ہو رہی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا لیکن یہ احساس بہت قوی تھا کہ میرے آس پاس کسی قسم کی جنگ ہو رہی تھی۔ پھنکاریں اور غراہٹیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں بہت واضح طور پر یہ بھی محسوس کررہا تھا کہ آپس میں برسرپیکار ان نادیدہ قوتوں میں سے ایک میری مدد کرنا چاہتی تھی جبکہ دوسری میری غرقابی پر تلی ہوئی تھی۔

ان پراسرار قوتوں میں یہ نادیدہ جنگ دیر تک جاری رہی اور بالآخر بھنور کا زور ٹوٹ گیا۔ ہوا تھم گئی اور جھیل کی سطح بھی بتدریج پرسکون ہوتی چلی گئی۔

میں اچک کر کشتی میں آگیا اور تاریکی میں چاروں طرف گھورنے لگا۔ میں اس جگہ سے بہت پیچھے آگیا تھا جہاں بھنور میں پھنسا تھا۔ میں نے کشتی میں پڑا ہوا چپو اٹھالیا اور اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تیزی سے پانی کو پیچھے دھکیلنے لگا۔ دوسرے چپو کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔

میں ایک ہی چپو سے کام لے رہا تھا۔ کبھی دائیں طرف سے پانی کو پیچھے دھکیلتا اور کبھی بائیں طرف سے اور حیرت انگیز طور پر کشتی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور ہوا بھی اسے پیچھے سے دھکیل رہی تھی۔

جزیرہ اب واضح ہوتا جارہا تھا۔ کشتی بہت تیزی سے جزیرے کے قریب پہنچ رہی تھی۔

میں نے ہاتھ روک لیے۔ جزیرے کا ساحل چند گز کے فاصلے پر تھا اور کشتی ہموار رفتار سے اس طرف بڑھ رہی تھی جبکہ میں بڑی محتاط نظروں سے ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت بلند اور گنجان درخت تھے جو تیز ہوا سے بد روحوں کی طرح جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تیز ہوا اور درختوں کی شاخوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آوازیں دل پر وحشت سی طاری کررہی تھیں۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ جزیرہ کتنا بڑا ہے اور وہ لوگ کہاں اور کس طرف ہوسکتے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کشتی کو ایک طرف کھینا شروع کردیا۔

کشتی ساحل کی جھاڑیوں سے ٹکرا کر رک گئی۔ میں نے نیچے اتر کر رسی جھاڑیوں سے باندھ دی اور محتاط انداز میں اوپر کی طرف چلنے لگا۔

میں درختوں میں تقریباً نصف میل دور تک چلتا گیا۔ یہ جزیرہ کسی بڑے ٹیلے کی طرح تھا جیسے کوئی پیالہ اوندھا کر رکھا

گیا ہو۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور بعض جگہوں پر تو درخت اور قدِ آدم جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

میں ایک جگہ رک گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں اور ان لوگوں کو کہاں تلاش کروں۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کھڑے کھڑے مراقبے کی کیفیت میں چلا گیا۔ ایسے موقعوں پر مجھے مراقبے سے رہنمائی مل جاتی تھی اور اس وقت بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو تاریکی چھٹ گئی تھی بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ میری آنکھوں میں وہ قوت ابھر آئی تھی جو بلی کی طرح اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ میں اس حیرت ناک تجربے سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ گزر چکا ہوں۔

میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف نشیب میں اترنے لگا۔ اب مجھے راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور چلنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میں رک گیا۔ سامنے تقریباً سو گز دور درختوں میں ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں چند لمحے اس طرف دیکھتا رہا اور پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

درختوں کے درمیان ایک کھلا میدان سا تھا جہاں حویلی نما ایک عمارت نظر آ رہی تھی اور اس کے پھاٹک کے سامنے ایک مشعل جل رہی تھی۔

میں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ عمارت کے آس پاس کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکتا۔ دیوار بھی بہت اونچی تھی جس پر چڑھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے اندر داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک قدِ آدم جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں سانپ، بچھو اور دیگر زہریلے حشرات الارض رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں ان سے بچ کر چلتا رہا اور بالآخر ایک جگہ رک گیا۔

دیوار میں ایک دروازہ نظر آیا۔ وہ دروازہ کھڑکی سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہاتھ کے معمولی سے دباؤ سے دروازہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ دوسری طرف بھی قدِ آدم جھاڑیاں تھیں۔ میں وہاں رک کر محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے وہ عمارت تھی جس کے آگے برآمدے کی طرح سائبان بنا ہوا تھا اور وہاں ایک مشعل جل رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ جھینگروں کے سوا کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا جس نے میرے اندر بے چینی سی پیدا کردی تھی۔

میں جھاڑیوں سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہی راہداریاں، ہر راہداری کے موڑ پر جلتی ہوئی مشعل اور وہی محرابی دروازے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس حویلی میں ہر راہداری کے موڑ پر ایک نیزہ بردار عورت بھی کھڑی نظر آئی تھی مگر یہاں کوئی نہیں تھا۔ کیا یہ وہی حویلی تھی جہاں پالا مجھے لے گئی تھی اور کاشی سے طویل ملاقات ہوئی تھی؟

میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ حویلی بستی کے قریب جھیل کے کنارے پر واقع تھی اور یہاں آنے کے لیے مجھے جھیل کے پانی میں طویل سفر کرنا پڑا تھا لیکن ویسا ہی ٹیلا، دیوار میں کھڑکی نما دروازہ، سائبان نما برآمدہ اور ویسی ہی کشادہ راہداریاں!

میں اس محرابی دروازے کے سامنے کھڑا تھا جس کی دوسری طرف کاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے بھاری دروازے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلنے لگا۔ سناٹے میں دروازے کے چرچرانے کی آواز بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا چلا گیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرا تھا جو خالی تھا تاہم ایک طرف مشعل جل رہی تھی۔ دائیں طرف ایک کمرے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگا اور پھر اچانک کوئی بھاری چیز میرے اوپر گری۔ میں بری طرح بدحواس ہوگیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ وہ بوجھ بھی میرے اوپر ہی گرا تھا۔

وہ کوئی اور چیز نہیں بلکہ ایک آدمی تھا جس نے اوپر سے چھلانگ لگائی تھی۔ میرے اوپر یہ حملہ اچانک ہوا تھا اور میں اس کے نیچے دب گیا تھا لیکن میں نے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن ٹھیک اسی وقت ایک اور آدمی نے اوپر سے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میں ایک بار پھر اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ دونوں مجھ سے گتھم گتھا ہوگئے۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ دونوں نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی سختی سے گرفت میں لے لیا تھا۔

اسی وقت سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی میری مزاحمت رک گئی۔ دروازے کے عین سامنے کمرے میں پلنگ پر دھنو پشت کے بل پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پلنگ کی پٹیوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور پیروں کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا اور بیشتر جسم برہنہ تھا۔ اس کے چہرے، سینے اور پیٹ پر خراشوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ دھنو کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پلنگ کے قریب ہی ایک کرسی نما چبوترے پر شیواگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے کچھ زیادہ ہی چھوٹی لگ رہی تھیں۔ بے پناہ کمینگی برس رہی تھی اس کے چہرے پر۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

دھنو نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ بے پناہ کرب کے باوجود مجھے اپنے سامنے پاکر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی اور آنکھوں میں وحشت کی جگہ چمک نے لے لی۔

"مارو۔ مار ڈالو ان کو ہمت سنگھ۔ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے!" وہ چیخ اٹھی۔ وہ شاید اٹھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی مگر اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ وہ محض کسمسا کر رہ گئی۔

"ہمت سنگھ!" شیواگ نے قہقہہ لگایا "وہ تو خود اس وقت بے ہمت ہو رہا ہے۔ تمہیں کیا بچائے گا اور ہمیں کیا مارے گا۔"

وہ کمرے سے باہر آگیا۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر میرے پیٹ پر زوردار گھونسا مارا۔ گھونسا ہتھوڑے کی طرح لگا۔ میں بلبلا اٹھا۔ ان دونوں نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرسکا۔

شیواگ نے دوسرا گھونسا مارا۔ یہ پہلے سے زیادہ طاقت ور تھا لیکن تیسرا گھونسا مارا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے ہاتھ کو بری طرح جھٹکنے لگا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس ہاتھ کی انگلیاں سہلاتے ہوئے وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میرے پیٹ کے مسلز پتھر کی طرح سخت ہوگئے تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر پے در پے میرے پیٹ پر گھونسے برسانے لگا لیکن اس بار مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس شیواگ بار بار اپنا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔

"اب میری باری ہے شیواگ!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر "یل" (YELL) کرتا ہوا پوری قوت سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے بازوؤں پر ان کی گرفت کچھ اور بھی مضبوط ہوگئی اور ان کی یہ کارروائی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ میں ان کے سہارے پر اپنے آپ کو اوپر اٹھاتا گیا اور پھر میں نے دونوں پیر پوری قوت سے سامنے کھڑے ہوئے شیواگ کے سینے پر دے مارے۔ وہ بلبلاتا ہوا لڑکھڑا کر پشت کے بل ڈھیر ہوگیا۔

ان دونوں نے میرے بازو موڑنے کی کوشش کی لیکن پیر زمین پر ٹکتے ہی میں نے اپنے آپ کو دوبارہ اوپر اٹھانا شروع کردیا۔ وہ مجھے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب میں ان کے بس کا نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو پوری طرح اوپر اٹھالیا اور ان کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا ان کے پیچھے جا گرا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی گرے تھے لیکن میں ان سے پہلے سنبھل گیا۔

وہ دونوں اٹھ کر میری طرف لپکے۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور میری ڈبل فلائنگ کک نے انہیں پھر ڈھیر کردیا۔ شیواگ میری طرف لپکا۔ اس وقت میں بھی زمین پر پڑا تھا۔ شیواگ نے میرے اوپر چھلانگ لگائی تو میں نے اسے اپنے پیروں پر روک کر پیچھے اچھال دیا۔ وہ "بھد" کی آواز سے گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

شیواگ کے دونوں آدمی ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے، میں بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک مجھ سے ٹکرا کر قلابازی کھاتا ہوا دور جا گرا اور دوسرا میری ٹانگ سے الجھ کر

وہیں لڑکھڑا کر رہ گیا اور میں نے پھرا سے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

میری ٹھوکریں اسے پورے کمرے میں ناچنے پر مجبور کرتی رہیں۔ ایک موقع پر اس کے دوسرے ساتھی نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں اس شخص کو رگیدتا ہوا دیوار تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران میں' میں نے شیواگ کو ایک طرف پڑے ہوئے نیزے کی طرف لپکتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنے حریف کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا۔ ایک ہاتھ سے اسے دیوار کے ساتھ دبائے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر گھونسے برسانے لگا اور پھر اچانک ہی شیواگ کی دہاڑ سن کر میں اپنے حریف کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو شیواگ کا نیزہ میری پشت میں پیوست ہوجاتا۔

شیواگ پوری قوت سے حملہ آور ہوا تھا۔ نیزہ دیوار سے لگے ہوئے میرے حریف کے سینے کو چیرتا ہوا کئی انچ تک دیوار میں گھستا چلا گیا تھا۔ اس شخص کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔

شیواگ کے چہرے پر بے پناہ خوف ابھر آیا۔ وہ بڑی وحشت زدہ سی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھ رہا تھا جو نیزے کے ساتھ دیوار میں ٹنگ گیا۔ شیواگ کا ہاتھ اب بھی نیزے کے دستے پر تھا۔

شیواگ نے نیزے پر سے ہاتھ ہٹالیا اور اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

"ہینگ پکڑو اسے۔ کاٹ ڈالو۔ زندہ مت چھوڑنا۔"

اب تک کی صورتِ حال سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ حویلی میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے ایک ختم ہوچکا تھا اور اب میرے سامنے صرف دو رہ گئے تھے اور وہ دونوں بڑے پرجوش انداز میں میری طرف لپک رہے تھے اور یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جوش میں ہوش کام نہیں کرتا۔ میرے لیے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا بہترین موقع تھا اور میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

وہ جیسے ہی قریب پہنچے' میں نے ڈبل فلائنگ کک سے انہیں ڈھیر کردیا اور پھر انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں لاتوں اور گھونسوں سے انہیں پورے کمرے میں نچاتا رہا۔

ایک موقع پر ہینگ نے مجھے نیچے گرا دیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے پتلون کا پائنچا اٹھا کر خنجر نکال لیا۔ اس پوری مہم کے دوران میں' میں نے پہلی مرتبہ خنجر نکالا تھا۔

ہینگ میرے اوپر چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے خنجر والا ہاتھ آگے کردیا۔ ہینگ کی خوفناک چیخ گونج اٹھی۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا تھا اور خون کی دھار نے میرے جسم کو بھی آلودہ کردیا تھا۔

ہینگ تڑپ کر میرے اوپر سے ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ میں نے خنجر کھینچ کر دوبارہ اس پر حملہ کردیا۔ اس مرتبہ بھی خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہوگیا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ شیواگ فرار ہورہا تھا۔ میں نے ہینگ کے سینے میں پیوست خنجر ایک جھٹکے سے باہر کھینچا اور شیواگ کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں راہداریوں میں دوڑتے ہوئے حویلی سے باہر آگیا۔ شیواگ اس دیوار کی طرف دوڑ رہا تھا جس میں واقع کھڑکی نما دروازے سے گزر کر میں اندر آیا تھا۔

حویلی کے باہر قدِ آدم گنجان جھاڑیاں تھیں۔ میری آنکھوں میں اگرچہ اس وقت بھی وہ روشنی موجود تھی جو تاریکی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن شیواگ جھاڑیوں میں غائب ہوچکا تھا۔ میں رک گیا۔ اس کا پیچھا کرنا بے کار تھا اور اس کے واپس آنے کی بھی توقع نہیں تھی۔ میں حویلی میں واپس آگیا۔

اس کمرے میں دو لاشیں تھیں۔ ایک نیزے کے ساتھ دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی اور دوسری زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں دوڑتا ہوا سامنے والے کمرے میں داخل ہوگیا۔

دھنو کی آنکھوں میں ایک بار پھر وحشت سی بھر گئی تھی لیکن مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ مسکرا اٹھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بندشیں کاٹ دیں۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"تم۔ تم ٹھیک ہو نا....؟" وہ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں اور...." اس نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ کیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ ویسا ہی کمرا تھا۔ بالکل وہی جہاں پہلی بار کاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں اب بھی نہیں آرہا تھا۔ اس رات کی ملاقات کوئی خواب تھا یا اس وقت میں کوئی خواب دیکھ رہا

تھا!

میں دھنو کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم حویلی سے نکل کر جزیرے کے اس ساحل کی طرف دوڑ رہے تھے جہاں میں نے کشتی چھوڑی تھی۔

وہاں پہنچتے ہی میں رک گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ کشتی غائب تھی۔

میری آنکھوں کے دیے بجھ گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اندھا ہوگیا تھا۔ وہ صلاحیت رخصت ہوگئی تھی جس سے میں بلی کی طرح اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اب پھر میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے جھاڑیوں کے ساتھ کشتی کی رسی کو باندھا تھا لیکن کشتی آس پاس کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

"وہ..... وہ دیکھو کیا ہے؟" میرے قریب کھڑی ہوئی دھنو نے گہرے پانی کی طرف اشارہ کیا۔

کنارے سے تقریباً سو گز آگے ڈرم کی طرح کی کوئی چیز پانی میں تیرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ یقیناً کشتی ہی تھی۔ میں نے دھنو کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی شڑاپ کی ایک اور زوردار آواز سن کر میں چونک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ کنارے پر جس جگہ میں نے دھنو کو چھوڑا تھا وہاں وہ نظر نہیں آرہی تھی۔

"دھنو!" میں نے زور سے پکارا۔

اسی لمحے میرے بالکل قریب ہی دھنو نے پانی سے سر ابھارا۔

"میں یہاں ہوں۔" اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔

میں بھول گیا تھا کہ دھنو ایک بہت اچھی تیراک تھی۔ اس کی زندگی ایک ایسی عبادت گاہ میں گزری تھی جو دریا کے کنارے پر واقع تھی اور اس نے بچپن ہی میں دریا میں تیرنا سیکھ لیا تھا۔

ہم دونوں گہرے پانی کی طرف تیرتے رہے اور تیرتی ہوئی ڈرم نما اس چیز تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ کشتی ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہوا کے کسی تیز جھونکے کی وجہ سے جھاڑی کی شاخوں میں بندھی ہوئی رسی نکل گئی تھی اور کشتی ہلکی لہروں پر تیرتی ہوئی کنارے سے اتنی دور نکل آئی تھی۔

میں نے پہلے دھنو کو کشتی پر سوار ہونے میں مدد دی اور پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ میں نے چپو سنبھال لیا اور پانی کو تیزی سے پیچھے دھکیلنے لگا۔

دھنو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ کونگا اسے سیر کروانے کے بہانے دوپہر کو جھونپڑے سے لے گئی تھی۔ کچھ دیر وہ بستی میں گھومتی رہیں اور پھر کونگا اسے بستی سے باہر بہت دور کھیتوں میں ایک جھونپڑے میں لے گئی۔ وہاں شیواگ اور اس کے دو ساتھیوں کو دیکھ کر دھنو سمجھ گئی کہ اسے دھوکے سے وہاں لایا گیا ہے۔ اس نے جھونپڑے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر شیواگ وغیرہ نے اسے پکڑ لیا۔ اسے مارا پیٹا' ہاتھ پیر باندھ دیے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک طرف ڈال دیا۔

دھنو نے بتایا کہ شام کے بعد کچھ آدمی اس طرف آئے تھے۔ شیواگ وغیرہ نے دور ہی سے ان کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دھنو کو جھونپڑے سے نکال کر دور کھیتوں میں لے گئے تھے۔

اسے تقریباً دو گھنٹے کھیتوں میں رکھا گیا اور پھر شیواگ وغیرہ اسے جھیل پر لے آئے جہاں کنارے کی اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک بڑی کشتی موجود تھی۔ یہ کشتی دو درختوں کے کھوکھلے تنوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ وہ لوگ دھنو کو اس کشتی پر ڈال کر اس جزیرے پر لے آئے۔

دھنو کے کہنے کے مطابق' اس حویلی میں آنے کے بعد بھی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی جس پر اسے مارا پیٹا گیا اور پلنگ پر ڈال کر باندھ دیا گیا۔

"شیواگ نے مجھے دھمکی دی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "کہ اگر تم کل دوپہر سے پہلے پہلے بستی سے نہ گئے تو وہ مجھے قتل کروے گا اور لاش کے ٹکڑے کرکے بستی میں پھکوا دے گا۔"

"اگر وہ ایسا کرتا تو میں قیامت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔" میں نے جواب دیا۔

میں چپو چلاتے ہوئے بار بار اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیواگ کی کشتی جزیرے کے ساحل پر کسی اور جگہ کھڑی ہوگی۔ حویلی سے فرار ہوکر وہ جزیرے پر نہیں رکا ہوگا۔ بستی کی طرف جانے کی وہ غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ ہوسکتا ہے' وہ جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف جانے کی کوشش کرے لیکن جھیل کی سطح دور دور تک تاریک اور سنسان تھی۔ کسی اور کشتی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

واپسی پر کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں کشتی کو جھیل کے کنارے پر اسی طرف لے گیا جہاں کونگا سے معرکہ ہوا تھا۔ کشتی کی رسی کو میں نے کنارے کی جھاڑیوں سے باندھ دیا اور ہم کنارے کے ساتھ ساتھ بستی کی طرف چلنے لگے۔

آبادی سے دور رہتے ہوئے ہم اپنے جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے مارتھا اور شوبھا کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہ دونوں ہمیں دیکھ کر اچھل پڑیں۔

ہم دونوں کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ شوبھا نے بیگ میں سے فوراً ہی ہمارے دوسرے کپڑے نکال دیے۔

"پہلے کپڑے بدل لو پھر باتیں کریں گے۔" اس نے کہا۔

میں اپنے کپڑے لے کر باہر آگیا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے جھونپڑے کی آڑ میں کھڑے ہو کر کپڑے بدلے۔ گیلے کپڑوں کو گھاس پر پھیلا دیا اور اندر آگیا۔ اس دوران میں دھنو بھی کپڑے بدل چکی تھی اور شوبھا نے اسے دو تین کمبلوں میں دبا دیا تھا۔ اس کا سر کمبلوں سے باہر تھا۔ دھنو میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ شوبھا ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتی تھی۔ اسے ہماری بہت زیادہ فکر رہتی تھی۔ میں بھی شوبھا کے قریب بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ تم کہاں غائب ہوگئے تھے اور یہ تمہیں کہاں ملی؟" شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور مارتھا' کاشی کے پاس گئی تھیں۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا تھا کہ تم خیریت سے ہو اور جلد ہی دھنو کو لے کر واپس آجاؤ گے۔ ہم واپس تو آگئیں لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' ہماری پریشانی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ میرا خیال ہے' تم کسی کے پیچھے بھاگے تھے۔ کون تھا وہ؟"

"کونگا۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہیں سب کچھ بتانے لگا۔ میں نے مارتھا کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کونگا اور جزیرے کی حویلی میں دو آدمیوں کے مارے جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ دھنو بھی حویلی والے واقعے کے سلسلے میں خاموش ہی رہی تھی۔

مارتھا بڑی دلچسپی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ وہ آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکی تھی۔ خوفناک جنگلوں میں آباد خوں خوار قبائل میں بھی رہی تھی لیکن یہاں' ہمالیہ کی گود میں اسے جو کچھ دیکھنے اور سننے کو مل رہا تھا وہ دنیا کے کسی اور خطے میں اس نے نہیں دیکھا سنا تھا۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

دروازے سے نکلتے ہی میں کسی سے ٹکرا گیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ نسوانی چیخ کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت بھی کوئی ہماری جاسوسی کرنے آیا تھا اور میں نے اسے بھاگنے کا موقع دیے بغیر گرفت میں لے لیا تھا لیکن اس مرتبہ مجھے شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ وہ کوئی جاسوس نہیں' قبیلے کی سردار کاشی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی محافظ پالا بھی تھی۔ وہ بھی اس صورتِ حال سے بدحواس ہوگئی تھی۔

وہ دونوں اندر آگئیں۔ پالا تو نیزہ سنبھالے دروازے کے قریب کھڑی ہوگئی اور کاشی بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے کاشی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ بولی "کوئی باطل قوت سچائی کے سامنے قدم نہیں جما سکتی۔ تم دونوں کی یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ شیطان کے پیروکار کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔"

"میں اس حویلی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کاشی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ضرور بتاؤں گی۔" کاشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "صدیوں پہلے وہ حویلی تکلو قبیلے کی سردار کا مسکن ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ قبیلہ جھیل کے اطراف میں کئی چھوٹی بڑی بستیوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا لیکن لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے جھیل کا پانی ان بستیوں کو نگلتا چلا گیا۔ صدیوں پہلے بھی قبیلے کی سردار ایک عورت ہی ہوا کرتی تھی۔ وہی سارے نظام کو چلاتی تھی۔ سردار کے انتخاب کا طریقہ کار بھی وہی تھا جو آج بھی رائج ہے لیکن قبیلے کی بعض بستیوں کے لوگ اپنی اپنی بستی کی عورتوں کو سردار بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے روایات کو نظرانداز کرکے غلط راستے اختیار کیے گئے اور جب بھی ایسا ہوا وہ بستی غرق ہوگئی۔ جھیل کے پانی نے اسے نگل لیا۔" وہ خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"قبیلے کی سردار کو ملکہ کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اس جزیرے پر رہتی تھی جہاں مردوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سارا نظام عورتیں ہی چلاتی تھیں لیکن جیسے جیسے بستیاں جھیل میں غرق ہوتی گئیں' قبیلے کی روایات میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں۔ بداعمالیاں بڑھتی گئیں۔ مرد بھی اجازت کے بغیر اس جزیرے پر جانے لگے۔

"ایک رات وہ سب کچھ ہوا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ چند مرد چوری چھپے جزیرے پر آکر حویلی میں گھس گئے۔ ملکہ کے محافظوں کو قتل کرکے انہوں نے حویلی پر قبضہ کرلیا۔ وہ کئی روز تک ملکہ کو ہوس کا نشانہ بناتے رہے اور بالآخر اسے قتل کردیا۔ اس کے تین دن بعد ان سب مردوں کی لاشیں بھی جھیل میں تیرتی ہوئی ملیں۔ جزیرے پر ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی موت پراسرار طور پر واقع ہوئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا' انہیں مارنے والا کون ہے؟

"اس واقعے کے بعد لوگوں میں اتنا خوف و ہراس پھیلا کہ لوگوں نے اس طرف جانا چھوڑ دیا اور وہ جزیرہ ویران ہوگیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہاں بدروحیں قابض ہوگئی ہیں۔

"کبھی کبھی اس جزیرے سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن بستی کے لوگوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہاں کیا چیز ہوسکتی ہے۔

"میرے سردار منتخب ہونے سے دو ہفتے پہلے رات کی تاریکی میں دو کشتیوں کو جزیرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے ہمت کرکے اپنی کشتیوں پر ان کشتیوں کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کشتیاں زوردار آوازوں کے ساتھ آگ کے شعلے اگلنے لگیں۔ ہمارے آدمی خوف زدہ ہو کر واپس آگئے۔ وہ اس قدر بدحواس ہوئے تھے کہ ایک کشتی الٹ گئی اور دو آدمی ڈوب کر ہلاک ہوگئے۔ اس واقعے کے بعد لوگوں کے دلوں میں خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ اب تو جھیل میں مچھلیاں پکڑنے والے بھی اس جزیرے سے دور ہی رہتے ہیں۔"

"تم کبھی اس جزیرے پر گئی ہو؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اس رات.... میرا مطلب ہے جب پالا مجھے یہاں سے لے کر گئی تھی....؟"

"یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی "یہاں بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے ایسے پراسرار واقعات جنم لیتے ہیں جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا اور ہم انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتے اور کبھی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ...." وہ خاموش ہو کر مارتھا وغیرہ کی طرف دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "انسان کے اندر پراسرار قوتوں کے جزیرے آباد ہیں۔ وہ ان پر قابو پا کر کائنات کو تسخیر کرسکتا ہے لیکن اپنے اندر کی تمام قوتوں پر قابو پانا ممکن نہیں۔ تاہم کبھی کوئی کسی قوت پر قابو پالیتا ہے۔ ان میں ایک قوت ایسی بھی ہے جس کے بل بوتے پر دوسروں کو ایسے مناظر دکھائے جاسکتے ہیں جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"گویا وہ بھی کسی قوت کا کمال تھا؟" میں نے کہا۔

کاشی مسکرا کر رہ گئی۔

باہر شور کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ تقریباً سو گز آگے جھیل کے کنارے پر کھڑی دو عورتیں بری طرح چیخ رہی تھیں۔ وہ عورتیں عین اس مقام پر کھڑی تھیں جہاں گزشتہ رات کونگا سے میرا معرکہ ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں عورتیں کیوں چلا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص دوڑتے ہوئے ہماری طرف آیا اور کاشی کے سامنے رک کر تیز لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ کاشی نے جواب میں اس سے کچھ کہا اور وہ شخص ایک سمت بھاگ گیا۔

"کیا ہوا' کوئی گڑبڑ؟" میں نے سوالیہ نظر سے کاشی کی طرف دیکھا حالانکہ میں حقیقتِ حال سے اچھی طرح واقف تھا۔

"جھیل کے کنارے سے کونگا کی لاش ملی ہے۔" کاشی نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "لوگ خوف زدہ ہیں کہ کئی سال بعد ایسا ہوا کہ قبیلے کے کسی فرد کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا "انہیں کسی پر شبہ ہے؟"

"شبہ!" کاشی نے مجھے گھور کر دیکھا "ابھی کچھ طے نہیں ہوا لیکن وہ آدمی کہہ رہا تھا شیواگ قبیلے والوں کا جینا حرام کردے گا۔ کونگا شیواگ کی عورت تھی۔ وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ قبیلے کے لوگ شیواگ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم سے شکست کھانے کے بعد وہ اگرچہ بستی سے غائب ہوگیا ہے لیکن اس کے کچھ حمایتی اب بھی بستی میں موجود ہیں۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

"لوگوں سے کہہ دو کہ اب شیواگ اس بستی کا رخ نہیں کرے گا اور اس کے حمایتی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" میں نے کہا۔

"اس قبیلے کے لوگ بہت توہم پرست ہیں۔ وہ ہر بات کا مطلب اپنے طور پر اخذ کرتے ہیں۔ انہیں کوئی بات سمجھانا

بڑا مشکل کام ہے۔ بہرحال، تم لوگ اپنے جھونپڑے میں رہو۔ میں جاکر معلوم کرتی ہوں۔" کاشی نے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"نہیں۔" وہ میری طرف مڑگئی "تم یہیں رہو۔ تمہارا اس وقت وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ جو بھی صورتِ حال ہوگی، میں بعد میں تمہیں بتادوں گی۔"

کاشی چلی گئی۔ میں شوبھا وغیرہ کے ساتھ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر ہم اندر آگئے۔ دھنو کمبلوں میں دبکی سوگئی تھی۔ میں بھی ایک کمبل اوڑھ کر سوگیا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ سہ پہر سے پہلے نہیں کھل سکی تھی۔ اس وقت بستی پر سناٹا سا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے قریب ہی دوسرے کمبل میں دبکی شوبھا سو رہی تھی جبکہ مارتھا اور دھنو سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کر باہر آگیا۔

موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ عام طور پر اس وقت جھیل کنارے خاصی رونق رہتی تھی لیکن آج دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے جھونپڑے کی پچھلی طرف چلا گیا اور ایک دو ٹکیاں گھوم کر واپس آیا۔ بستی پر اسی طرح سناٹا طاری تھا جیسے یہاں زندگی کا وجود ہی مٹ گیا ہو۔ مجھے کہیں بھی بستی کا کوئی فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ بستی کے لوگ سب کچھ چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ میں اپنے جھونپڑے میں واپس آگیا۔

"بستی کے لوگ کہاں غائب ہوگئے۔ سناٹا کیوں طاری ہے؟" میں نے مارتھا اور دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"آج صبح سے کونگا کی موت کا سوگ منایا جارہا ہے۔" مارتھا نے جواب دیا "دوپہر کے وقت پالا یہاں آئی تھی۔ اس نے ہدایت کی تھی کہ ہم جھونپڑے سے باہر نہ نکلیں۔"

"لیکن بستی کے لوگ کہاں غائب ہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"سب لوگ کونگا کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔" مارتھا نے بتایا "بستی سے باہر تقریباً دو میل دور پہاڑی کے دامن میں کوئی خاص جگہ ہے جہاں مرنے والوں کی آخری رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔"

سورج غروب ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ مارتھا وغیرہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ پوری بستی کو نگا کی موت کا سوگ منا رہی تھی۔ ہمیں کھانے کو کون پوچھتا!

میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ بستی کے کسی گھر میں کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔ ہوسکتا ہے، کہیں سے کھانے کو کچھ مل جائے۔ میں نے مارتھا اور دھنو کو انتظار کرنے کو کہا اور جھونپڑے سے نکل کر اوپر سے گھومتا ہوا بستی میں آگیا۔ میرا رخ مرکزی چوراہے کی طرف تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں قبیلے کے کسی نہ کسی فرد سے ملاقات ہوجائے گی اور ہمیں کھانے کو کچھ مل جائے گا لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔

مرکزی چوراہا بھی سنسان تھا۔ میں وہاں کھڑا کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر میرے قدم خود بخود کاشی کے جھونپڑے کی طرف اٹھنے لگے۔

جھونپڑے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور محافظ بھی موجود نہیں تھے۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ صحن میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی نے مجھے چوروں کی طرح اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تو کہیں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوجائے۔ میں نے کاشی یا پالا کو آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ قبیلے کا ہر فرد بستی سے باہر تھا۔

میں نے برآمدے والا دروازہ کھولا تو دروازے کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز سناٹے میں پھیل گئی۔ میں رکے بغیر دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ کاشی والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے ایک آدمی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

یہ افتاد مجھ پر اچانک ہی پڑی تھی۔ میں ایک لمحے کو بدحواس ہوگیا۔ سنبھلنے سے پہلے حملہ آور میری کھوپڑی پر دو چار گھونسے لگا چکا تھا لیکن پھر میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ جیسے ہی حملہ آور ہوا، میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اچھال دیا۔ وہ کاشی کے پلنگ پر گرا۔ اس کا سر پلنگ کی پشت سے ٹکرایا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ بھی نکل گئی تھی۔

میں نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں منہ کے بل پلنگ پر گرا۔ اس سے پہلے کہ سنبھل سکتا حملہ آور نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ میری پشت پر سوار ہوگیا اور بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میرے سر کو زور زور سے پلنگ کی پٹی پر مارنے لگا۔ میری پیشانی کی کھال پھٹ گئی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں سامنے ٹکا دیں اور پوری قوت سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں ٹانگیں بھی سمیٹنے لگا تھا اور بالآخر میں اسے اپنے اوپر سے گرانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس نے ایک بار پھر مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی تیزی سے پلٹ کر اپنی ٹانگیں اس کی گردن پر لپیٹ دیں اور زوردار جھٹکا دیا۔ وہ الٹ کر پلنگ سے نیچے گر گیا۔

میں حریف کی گردن چھوڑ کر تیزی سے چھلانگ لگا کر پلنگ سے نیچے آگیا۔ وہ بھی اٹھ چکا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور میں ابھی تک اپنے حریف کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ شیواگ ہوگا لیکن اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ شیواگ درمیانے قد کا مالک تھا جبکہ اس شخص کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے نہ صرف اس کے حملے کو ناکام بنایا بلکہ اس کے پیٹ میں ایک زوردار رکک بھی رسید کردی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر دہرا ہوگیا۔ میں نے جھک کر اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کردیا۔ وہ بلبلاتا ہوا سیدھا ہوا تو میں نے اسے گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک زوردار رکک اس کے سینے پر لگی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار کے قریب گرا۔ جس جگہ وہ گرا تھا اس کے قریب ہی ایک موٹا سا ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا، اس نے بڑی تیزی سے ڈنڈا اٹھا کر حملہ کردیا۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس نے وار تو میرے سر پر کیا تھا لیکن ڈنڈا میرے بائیں کندھے پر لگا۔ میرے منہ سے کراہ نکلی۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے میرے سر پر گویا ایٹم بم پھٹ پڑا۔ ڈنڈے کا دوسرا وار میرے سر پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے رقص کرنے لگے اور پھر اندھیرے کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے تیورا کر گرا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے جھونپڑے میں پڑا تھا اور میرے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ آنکھیں کھولنے کے بعد بھی چند لمحوں تک میری نظروں کے سامنے دھند سی چھائی رہی۔ میں بار بار آنکھیں بند کرتا اور کھولتا رہا۔ دھند چھٹنے لگی اور وہ چہرے واضح ہوتے چلے گئے۔ ان میں ایک چہرہ کاشی کا بھی تھا۔

میں نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی تو دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ تکلیف سے میری آنکھیں خود بخود بند ہوگئیں اور کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ لٹا دیا۔

سر میں ہونے والے دھماکے کم ہوئے تو تکلیف بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس مرتبہ میری نظر اس بڑھیا پر پڑی جو میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال نیلگری کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی طرح سفید تھے۔ چہرے پر جھریوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا جیسے مکڑی نے جالا تان رکھا ہو۔ اس کی گردن میں طوق کی طرح لوہے کا ایک کڑا پڑا ہوا تھا جس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کانوں میں بھی چوڑیوں کی طرح لوہے کے بالے لٹکے ہوئے تھے۔ ماچس کی تیلی سے ذرا بڑی ایک سلاخ ناک کے نتھنوں کے عین بیچ میں پروئی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے بالائی حصے پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی جلد کو دیکھ کر صدیوں سے پیاسی پپڑی ہوئی زمین کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ لاتعداد آڑی ترچھی لکیریں تھیں اس کے جسم پر۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر سو کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی لیکن اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حیرت انگیز طور پر زندگی کی بھرپور چمک موجود تھی۔

اس نے ایک ہاتھ میری گردن کے نیچے رکھ کر سر کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹی کا پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹ حرکت کررہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

مٹی کے پیالے میں ہرے رنگ کا مشروب تھا جس کا ذائقہ کریلے کی طرح کڑوا تھا۔ میں نے وہ پیالہ اپنے ہونٹوں سے دور ہٹانا چاہا لیکن بڑھیا نے میری کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہونے دی جب تک اس کڑوے مشروب کا آخری قطرہ بھی میرے حلق میں نہیں چلا گیا۔

وہ مشروب اگرچہ خاصا بدذائقہ تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے حلق سے اتارا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر میں اپنے آپ میں توانائی سی محسوس کرنے لگا۔ اس بڑھیا نے میرا سر دوبارہ نیچے ٹکا دیا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے سر کو ٹٹولنے

لگا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی دیر تک میرے حواس بحال نہیں ہوسکے تھے۔ میں اب بھی متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ میں یہاں کیوں پڑا تھا۔ میرے سر پر پٹی کیوں بندھی ہوئی تھی اور یہ لوگ میرے گرد کیوں جمع تھے؟

"کیسے ہو اب ہمت سنگھ؟"

یہ آواز سن کر میں نے دائیں طرف دیکھا۔ وہ شوبھا تھی جو میرے اوپر جھک رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ میرا ذہن صاف ہوتا گیا اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

میں بستی میں گھومتا ہوا کاشی کے جھونپڑے میں گھس گیا تھا جہاں کسی نے مجھ پر حملہ کردیا تھا۔ میرے سر پر لگنے والی ضرب نے مجھے بے ہوشی کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا جس سے حملہ آور کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ بعد میں کاشی یا اس کے محافظ جھونپڑے میں آئے ہوں گے تو مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔

سر کے زخم میں تکلیف اگرچہ بدستور موجود تھی لیکن وہ کڑوا کسیلا مشروب پینے کے بعد میں اپنے آپ کو بڑی حد تک بہتر محسوس کررہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ کمبل کے نیچے میرے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے گردن گھما کر شوبھا کی طرف دیکھا۔

"یہ دیکھنے کے لیے تمہارے کپڑے اتار دیے گئے تھے کہ تمہارے جسم پر کوئی اور زخم تو نہیں ہے؟" شوبھا نے میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"صرف میرے سر پر ضرب لگائی گئی تھی اس کے سوا کوئی چوٹ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "ان لوگوں کو ہٹاؤ یہاں سے۔ میں کپڑے پہننا چاہتا ہوں۔"

شوبھا نے کاشی سے مدھم لہجے میں کچھ کہا اور کاشی نے کمرے میں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ ان میں تین آدمی تھے اور باقی عورتیں ہی تھیں۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی بڑھیا نے میری دائیں کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر اپنا میلا سا تھیلا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

کمرے میں اب صرف شوبھا اور کاشی رہ گئی تھیں۔ دھنو اور مارتھا بھی باہر جاچکی تھیں۔ شوبھا نے ایک طرف پڑے ہوئے میرے کپڑے اٹھا کر قریب ڈال دیے۔ میں دیوار کی طرف رخ کرکے کمبل اوڑھے کھڑا ہوگیا۔ پہلے پتلون پہنی اور کمبل ہٹا کر قمیص پہننے لگا۔ پتلون پہنتے ہوئے مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میری پنڈلی کے ساتھ خنجر موجود نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کردیا۔ بیلٹ اور خنجر وہاں رکھا ہوا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دھنو اور مارتھا بھی اندر آگئی تھیں اور پالا نے بھی دروازے کے قریب اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ شوبھا نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ سورج غروب ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہوچکے ہیں۔ کاشی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"میں یہ جاننا چاہوں گی کہ تم میرے جھونپڑے میں کیسے پہنچے تھے اور تم پر حملہ کس نے کیا تھا؟" کاشی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

میں چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر میری نظریں اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی نیچے آگئیں۔

"توبہ توبہ۔" شوبھا بڑبڑائی "شرم بھی نہیں آتی۔ کس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھور رہے ہو۔"

میں نے گھورتی ہوئی نظروں سے شوبھا کی طرف دیکھا پھر کاشی کی طرف متوجہ ہوکر بتانے لگا کہ میں اس کے جھونپڑے میں کیوں گیا تھا۔

"وہ پہلے سے تمہارے کمرے میں موجود تھا۔" میں کہہ رہا تھا "میں جیسے ہی اندر داخل ہوا' اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ وہ میرے قابو میں آجاتا لیکن اس نے ڈنڈے سے میرے سر پر حملہ کردیا جس سے میں بے ہوش ہوگیا۔"

"وہ کون تھا۔ شیواگ؟" کاشی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں اندھیرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ شیواگ نہیں تھا۔ شیواگ درمیانے قد کا مالک ہے جبکہ حملہ آور طویل قامت تھا۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تمہارے کمرے سے کوئی چیز تو چوری نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" کاشی نے جواب دیا "وہ جو کوئی بھی تھا چوری کی نیت سے نہیں آیا ہوگا۔ سردار کے جھونپڑے میں اجازت کے بغیر داخل ہونا سنگین جرم ہے اور اس جرم کی سزا موت بھی ہوسکتی ہے۔ محض چوری کے لیے کوئی شخص اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے....؟"

"تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔" کاشی نے میری بات کاٹ دی "عام حالات میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر سردار کے جھونپڑے میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ آج چونکہ سب لوگ بستی سے باہر تھے اس لیے اس شخص کو اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔"

"کیا وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" کاشی نے کہا "بستی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ شیواگ میرا دشمن ہے اور پھر میں نے کھل کر اس کے خلاف تمہاری حمایت کی ہے۔ قبیلے کے کسی فرد کے مقابلے میں ایک اجنبی کی حمایت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن شیواگ کے کردار سے سب ہی واقف ہیں اس لیے تمہارے ہاتھوں اس کی شکست پر بھی لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور ظاہر ہے' شیواگ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے پہلے تمہیں سزا دینے کے لیے تمہاری عورت کو اغوا کیا۔ اس مرحلے پر بھی اسے تمہارے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کونگا اور اس کے دو آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے۔"

میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ کونگا کے بارے میں تو کاشی میری باتوں سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں ماری گئی تھی لیکن جزیرے پر دو آدمیوں کی ہلاکت! ان کا تو میں نے کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا لیکن کاشی سے شاید کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

"جزیرے پر تمہارے ہاتھوں حزیمت اٹھانے کے بعد اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔" کاشی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "آج کا دن اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ وہ خود تو بستی میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرسکا۔ اپنے کسی گرگے کو بھیج دیا جو میرے جھونپڑے میں چھپ کر میرا انتظار کررہا تھا لیکن مجھ سے پہلے تم پہنچ گئے۔"

"برے لوگ آسانی سے کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا "جب تک ان کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نہ نچوڑ لیا جائے' یہ لوگ....."

"اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" اس نے میری بات کاٹ دی "یوں تو شیواگ کے کئی آدمی بستی میں موجود ہوں گے لیکن ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ میرے جھونپڑے میں داخل ہونے والا کون تھا۔"

"اس کے آدمیوں میں سے کسی ایک کی نشان دہی کردو۔ میں اس سے معلوم کرلوں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں ایک دو دن آرام کی ضرورت ہے۔ کسی قسم کی بھاگ دوڑ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔" کاشی اٹھتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ کوئی اہم بات ہوئی تو تمہیں اطلاع دوں گی۔"

کاشی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دو عورتیں ہمارے لیے کھانا لے آئیں۔ کل رات کے بعد سے کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دھنو زیادہ ہی بے چین تھی۔ اس نے کسی سے پوچھے بغیر فوراً ہی کھانا شروع کردیا۔

اس رات سر میں تکلیف کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آسکی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی وہ بڑھیا پھر پہنچ گئی۔ اس نے پٹی کھول کر میرے زخم کا معائنہ کیا۔ دوسری پٹی لگائی۔ ایک پیالہ وہی کڑوا کسیلا جوس پلایا اور آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔ اب ظاہر ہے' مجھے آرام ہی کرنا تھا۔ جب تک میرے سر کا زخم ٹھیک نہ ہوجاتا' میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ نہ تو مجھ پر حملہ کرنے والے شخص کا پتا چلا تھا اور نہ ہی شیواگ کا کوئی سراغ ملا تھا۔ تاہم یہ اطلاع میرے لیے دلچسپ ثابت ہوئی کہ شیواگ کے جو دو چار آدمی بستی میں موجود تھے وہ بھی غائب ہوگئے تھے۔

وہ بڑھیا ہر صبح باقاعدگی سے میرے زخم کی پٹی تبدیل کررہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کریلے کے ذائقے جیسا کڑوا جوس بھی پلایا جارہا تھا جس کے بارے میں پالا نے بتایا تھا کہ اس سے نہ صرف بدن کو توانائی ملتی ہے بلکہ یہ جوس کسی بھی قسم کا زخم خشک کرنے کے لیے بڑا کارآمد ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ میرا زخم بڑی تیزی سے مندمل ہورہا تھا۔

وہ چاند کی پہلی رات تھی اور چاند کی ہر پہلی اور چودھویں رات کو قبیلے والے جشن منایا کرتے تھے۔ اس رات بھی جشن تھا۔

غروب آفتاب سے پہلے ہی بہت سے لوگ ہمارے جھونپڑے سے تقریباً سو گز آگے جھیل کنارے ایک کھلی جگہ پر جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد چاند نظر آتے ہی لوگ ناچنے لگے۔ لوگ بستی سے نکل نکل کر اس جگہ جمع ہونا شروع ہوگئے۔ پالا ہمیں بھی بلا کرلے گئی۔ کھیل تماشے ہورہے تھے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر رقص کررہی تھیں۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ اچانک میں عجیب سی تھکن محسوس کرنے لگا۔ دماغ پر غنودگی سی طاری ہورہی تھی۔ میں نے شوبھا وغیرہ سے واپس چلنے کو کہا لیکن وہ لوگ وہاں رکنا چاہتی تھیں لہٰذا میں اکیلا ہی جھونپڑے میں واپس آگیا۔

دن میں بھی زیادہ تر میں سویا ہی رہا تھا لیکن اس وقت

نیند کا شدید حملہ ہوا تھا۔ میری آنکھیں بند ہوئے جارہی تھیں اور میں بڑی مشکل سے جھونپڑے تک پہنچا تھا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

باہر سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے دماغ پر نیند کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا' کوئی نادیدہ قوت مجھے زبردستی سوجانے پر مجبور کررہی ہو۔ لوگوں کے شور کی معدوم ہوتی ہوئی آوازوں میں جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی وہ کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ آواز اگرچہ بہت کمزور اور ہلکی تھی لیکن اس میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ نیلگری تھی جو دروازے میں سے داخل ہوکر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ چہرہ مرجھا گیا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل پر گھونسا لگا۔

"کیا ہوا نیلگری۔" میں نے پوچھا "تمہاری یہ حالت.....؟"

"میری ساری قوتیں سلب ہورہی ہیں۔" نیلگری کی آواز بھی بے حد کمزور تھی "وہ شیطان میرے قریب آتا جارہا ہے۔ میرے گرد حصار تنگ ہورہا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چھ دن کا فاصلہ رہ گیا ہے اور یہ فاصلہ بھی سمٹ گیا تو میں اس کے قبضے میں چلی جاؤں گی اور سب سے پہلے وہ مجھے تمہارے خلاف استعمال کرے گا۔ میں اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہوں گی۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ چھ دن..... صرف چھ دن۔ اس کے بعد سب کچھ بدل جائے گا۔ سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ میری بیماری اور شیواگ کے چکر میں کافی وقت ضائع ہوگیا تھا اور گوتم بھوش یہی تو چاہتا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں بڑبڑایا اور پھر نیلگری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایسا نہیں ہوگا نیلگری۔ میں اس شیطان کو مزید آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ میں۔ میں آرہا ہوں۔"

"جلدی کرو وجدان۔ وقت نکلا جارہا ہے۔" نیلگری کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اسی وقت شور کی آواز سنائی دی۔ قہقہے گونجنے لگے۔ قہقہوں کی آوازیں کراہوں اور سسکیوں میں بدل گئیں اور پھر قہقہے..... لگتا تھا جیسے سیکڑوں بدروحیں مل کر چیخ چلا رہی ہوں۔ یہ آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ میں نے نیلگری کی طرف دیکھا۔ اس کا ہیولا دھندلا رہا تھا۔ چاندنی جیسی دودھیا روشنی کا وہ ہیولا بتدریج تاریکی میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

نسوانی قہقہوں کی آواز سن کر ایک بار پھر میری آنکھ کھل گئی۔ دھنو' شوبھا اور مارتھا قہقہے لگاتی ہوئی اندر داخل ہورہی تھیں۔

"ارے۔" شوبھا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں تو سمجھی تھی کہ تم سوگئے ہوگے!"

"سوگیا تھا۔ تم لوگوں کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر تم کچھ دیر اور وہاں رکتے تو ایک بہت حسین منظر دیکھتے۔" اس مرتبہ مارتھا نے زبان کھولی "کاشی نے کیا خوب رقص کیا تھا۔ میں تو اسے زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ لگتا تھا جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ زمین پر تو اس کے پیر لگتے ہی نہیں تھے۔"

میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کاشی بہت حسین تھی اور یقیناً رقص بھی بہت اچھا کرتی ہوگی۔

مارتھا اور شوبھا دیر تک آج کے جشن پر تبصرے کرتی رہیں۔ دھنو لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سوگئی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ کچھ دیر تک مارتھا اور شوبھا کی آوازیں میری سماعت سے ٹکراتی رہیں اور پھر وہ آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ میں نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

اگلا دن بڑی بے چینی میں گزرا۔ میں بار بار نیلگری کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ وقت واقعی بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نیلگری کی مدد کے لیے ہی تو نکلا تھا۔ یہ سارے کشٹ (مصائب) اسی کے لیے تو برداشت کررہا تھا لیکن میرے مقابلے پر بھی تو کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا۔ گوتم بھوش ایسا یوگی تھا جس کے قبضے میں کچھ اور قوتیں بھی تھیں اور وہ اپنی قوتوں کے بل بوتے پر نیلگری کو قبضے میں لینے کے لیے جاپ کررہا تھا اور اس کی وہی قوتیں مختلف صورتوں میں میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کررہی تھیں۔ گوتم بھوش کی کوشش تھی کہ میں اس کا جاپ مکمل ہونے سے پہلے اس تک نہ پہنچ سکوں۔ آج نیلگری کی حالت نے مجھے چونکا دیا تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب دنیا کی کسی طاقت کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دوں گا۔

اس روز میں نے دن کے وقت کاشی سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ تاہم شام کو جب شوبھا اور مارتھا بستی میں کہیں گئی ہوئی تھیں' میں اور دھنو جھیل کے کنارے پر بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ پالا نے کاشی کا پیغام دیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

میں نے دھنو کو بستی کے چوراہے پر چھوڑ دیا جہاں مارتھا اور شوبھا بھی موجود تھیں اور خود پالا کے ساتھ کاشی کے جھونپڑے میں پہنچ گیا۔

حسب معمول کاشی اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک شیواگ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ لاپتا ہوگیا تھا اور قبیلے کے لوگ دور دور تک اس کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔

"تمہیں اب یہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے۔" کاشی نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "وقت بہت کم رہ گیا ہے اور تمہارا راستہ بہت کٹھن ہے۔ مزید تاخیر نہ صرف یہ کہ نیلگری کے لیے بلکہ تمہارے اور ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوگی۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی نیلگری سے رابطے میں تھی۔

"میں نے بھی یہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا "بقول تمہارے' راستہ کٹھن ہے اور....."

"تمہاری وہ تینوں عورتیں یہاں رہیں گی۔" کاشی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ مارتھا بھی چونکہ ہمارے ساتھ آئی تھی اور ہمارے ساتھ ہی رہ رہی تھی اسی لیے شوبھا اور دھنو کی طرح اسے بھی میری عورت ہی سمجھ لیا گیا تھا "تمہیں ان کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قبیلے کے لوگ ان کی حفاظت کریں گے۔ تم آج رات ہی یہاں سے رخصت ہوجاؤ۔ دو دن کا راستہ ہے۔ تمہارے پاس صرف تین دن باقی بچیں گے۔"

"میں وہاں کس طرح پہنچوں گا۔ راستے کی کوئی نشان دہی....."

"تمہارے اندر کی قوت تمہیں راستہ دکھائے گی۔" کاشی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی "ویسے تمہاری رہنمائی کے لیے ثوبان تمہارے ساتھ جائے گا۔ آدھی رات کو جب سرخ ستارہ جزیرے کے عین اوپر چمکتا ہوا نظر آئے گا' تم جھونپڑے سے نکل کر بستی کے شمال میں کالی چٹان کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ ثوبان تمہیں وہیں منتظر ملے گا۔

ہم ابھی باتیں کررہے تھے کہ پالا نے آکر کاشی کے کان میں کچھ کہا۔ کاشی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے ثوبان کو یہاں بلایا تھا۔ وہ آگیا ہے۔ تم بھی اس سے ملاقات کرلو۔"

کاشی کے اشارے پر پالا کمرے سے نکل گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دوبارہ اندر داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کا اس نے ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

اس آدمی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ بانس کی طرح لمبا قد' گنجا سر' چہرے پر جھریاں اور آنکھیں.....!

اس کے چہرے پر آنکھیں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ آنکھوں کی جگہ تو تھی لیکن لگتا تھا نعوذ باللہ' قدرت اس انسان کو تخلیق کرتے ہوئے آنکھیں بنانا بھول گئی ہو۔ آنکھوں کی جگہوں پر گوشت تھا۔ بالکل ہموار جیسے کھڑکیوں پر تختے لگا کر انہیں بند کردیا گیا ہو اور یہ ستم رسیدہ چہرہ دیکھ کر میں کانپ اٹھا تھا۔ اس کی عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی اور اس کے گلے میں بھی طوق کی طرح آہنی کڑا پڑا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے کاشی نے کسی ثوبان نامی شخص کا ذکر کیا تھا جو نیلگری کی برف پوش چوٹیوں میں واقع اس قدیم بدھ عبادت گاہ تک میری رہنمائی کرنے والا تھا جہاں گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا اس بدھ عبادت گاہ کا نام "گومپو" تھا۔ چند منٹ پہلے ہی پالا نے ثوبان کی آمد کی اطلاع دی تھی اور پالا کے ساتھ بغیر آنکھوں کے اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں ابھرا تھا کہ یہ ثوبان ہوسکتا تھا۔ میرا خیال تھا یہ کوئی اور ہے اور ثوبان باہر کھڑا انتظار کررہا ہوگا۔ بہرحال میں اس شخص کے لیے دل میں بے حد افسوس محسوس کررہا تھا۔

"ثوبان سے ملو اجنبی!"

کاشی کی آواز سن کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ بغیر آنکھوں والا وہ شخص پالا کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ میں مڑ کر ابھی ہوئی نظروں سے کاشی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ثوبان تمہارے سامنے کھڑا ہے۔" کاشی نے پالا کے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑتی چلی گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کاشی میرے ساتھ شاید

کسی قسم کا مذاق کر رہی ہے۔ جو شخص خود آنکھوں سے محروم ہو وہ کسی دوسرے کی کیا رہنمائی کر سکے گا!

"ثوبان بیناؤں سے زیادہ بینا اور داناؤں سے زیادہ دانا ہے۔" کاشی کہہ رہی تھی "قدرت نے اسے آنکھوں سے محروم رکھا لیکن اس کے اندر کی آنکھیں بہت روشن ہیں۔ یہ بصیرت کی روشنی میں وہاں تک دیکھ سکتا ہے جہاں تک بصارت کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ تم دونوں کا ساتھ خوب رہے گا۔ تم اپنے اندر کی قوتوں سے کام لو گے اور یہ اپنے اندر کی روشنی سے تمہاری رہنمائی کرے گا۔"

ثوبان نے پالا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ اس کی بند آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے ان بند کھڑکیوں سے خارج ہونے والی مقناطیسی لہریں میری آنکھوں کے راستے پورے بدن میں ہلچل سی مچانے لگی ہوں۔

"یہ مالا۔" اس نے سیدھا ہاتھ میرے کندھے سے ہٹا کر گلے میں پڑی ہوئی مالا پر رکھ دیا۔ وہ مالا کے موتیوں کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے ٹٹول رہا تھا "یہ تمہارے لیے نیلگری کا ایک انمول تحفہ ہے لیکن تم اس معاملے میں بھی اجنبی ہی رہے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو اس شیطان کو نیلگری کی پوتر چوٹیوں کی طرف آنے کی ہمت نہ ہوتی لیکن خیر۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ وقت ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں آج یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں کالی چٹان کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ پالا! مجھے باہر چھوڑ آؤ۔"

اس نے مڑ کر ایک ہاتھ پالا کی طرف بڑھا دیا۔

میرے دماغ میں اب بھی دھماکے سے ہو رہے تھے۔ گلے میں پڑی ہوئی مالا کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا لیکن ثوبان جان گیا تھا کہ یہ نیلگری کا تحفہ تھا۔ اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے اور پھر اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں میرے گلے میں مالا کے موتیوں پر گئی تھیں اور ایک لمحے کو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہو لیکن اس کمرے سے باہر جانے کے لیے اس نے پالا کا سہارا لیا تھا۔

عجیب طرح کی سنسنی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ اپنے جھونپڑے میں آکر بھی میں بار بار ثوبان کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا وہ واقعی نیلگری کی برف پوش چوٹیوں تک میری رہنمائی کرے گا یا میں اس کے ساتھ زندگی بھر پہاڑوں میں بھٹکتا رہوں گا؟

اس رات مارتھا اور دھنو سے باتوں کے دوران میں میں بار بار ان کی طرف دیکھتا رہا اور نجانے کیا بات تھی کہ شوبھا بھی میرے چہرے پر نظریں چپکائے بیٹھی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اگر ہم باتیں کرتے رہتے تو رات یونہی آنکھوں میں گزر جاتی جبکہ مجھے آدھی رات کے وقت یہاں سے نکل جانا تھا اس لیے میں نیند کا بہانہ کر کے کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

ان تینوں کی باتوں کی آواز میری سماعت سے ٹکراتی رہی اور بالآخر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ وہ تینوں سو چکی تھیں۔ میں نے آہستگی سے کمبل اپنے اوپر سے ہٹا دیا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔

بستی پر سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں گلیوں میں چلتا ہوا شمال کی طرف بستی سے باہر آگیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔

کالی چٹان بستی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ مجھے اس طرف جانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ کھیتوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی ایک پگڈنڈی اس کالی چٹان تک چلی گئی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ قبیلے کے لوگ اپنے مرنے والوں کی آخری رسوم بھی اس چٹان کے قریب ہی ادا کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا' اس طرف کوئی قبرستان ہو گا جہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہو گا یا کوئی شمشان گھاٹ جہاں ہندوؤں کی طرح مردوں کو جلا دیا جاتا ہو گا۔

میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دھنو اور شوبھا کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ میرے اس طرح چلے آنے پر وہ کیا خیال کریں گی۔ دھنو تو بچوں کی طرح رونا پیٹنا شروع کر دے گی لیکن یہاں سے آگے میں انہیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ راستہ خطرناک ہونے کے علاوہ یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مجھے اس کالی چٹان تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ میں ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں رک رک کر آگے بڑھتا رہا۔

کسی خچر کے ہنہنانے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی اور میں

اس طرف بڑھتا چلا گیا۔

وہ دو خچر تھے لیکن ان کے آس پاس کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ثوبان!" میں نے خچروں کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔

"میں یہاں ہوں اجنبی۔" دائیں طرف سے آواز سنائی دی اور ایک انسانی ہیولا تاریکی سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔

میرا خیال تھا کہ ثوبان کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا جو اسے ہاتھ سے پکڑ کر یہاں لایا ہوگا لیکن آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔

"وقت ضائع مت کرو اجنبی۔" ثوبان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اب ہمیں یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔"

میں ایک خچر کی لگام پکڑ کر ثوبان کے قریب لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے سہارا دے کر اس خچر پر سوار کراؤں گا اور خود دوسرے خچر پر سوار ہوجاؤں گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ثوبان اچک کر دوسرے خچر پر سوار ہوگیا تھا۔ میں بھی اپنے خچر پر سوار ہوگیا۔

پگڈنڈی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ثوبان کا خچر آگے تھا اور میرا خچر سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ آگے کھلا میدان تھا جس سے آگے بہت دور پہاڑوں کے تاریک ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ اس میدان میں آتے ہی ثوبان کے خچر کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ مجھے بھی اپنے خچر کی رفتار بڑھانی پڑی۔ خچر کی ننگی پیٹھ پر سفر کرنا کم از کم میرے لیے بہت کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

مجھے زیادہ حیرت ثوبان پر ہو رہی تھی جس کا خچر مجھ سے کئی گز آگے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لگام تھام رکھی تھی اور خچر کی پشت پر بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

خچر تقریباً دو گھنٹوں تک اس پتھریلے میدان میں دوڑتے رہے اور جیسے ہی پہاڑی سلسلہ شروع ہوا' ان کی رفتار خود بخود کم ہوگئی۔ ثوبان کا خچر اب بھی مجھ سے چند گز آگے تھا۔ مجھے قدرت کی اس ستم ظریفی پر ہنسی بھی آرہی تھی۔ ایک اندھا آنکھوں والے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

ان پہاڑوں میں ہمارا سفر رات بھر جاری رہا۔ ہم نہ صرف بتدریج بلندی کی طرف جا رہے تھے بلکہ راستہ بھی کٹھن سے کٹھن تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو رات کی تاریکی میں خطرناک راستوں پر سفر کرنے کی ہمت کبھی نہ کرتا لیکن ایک ایسا شخص مجھے راستہ دکھا رہا تھا جو آنکھوں سے محروم تھا۔ پورے راستے میں وہ کہیں ایک مرتبہ بھی نہیں ٹھٹکا تھا۔

صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد بھی ہمارا سفر جاری رہا۔ ثوبان کا خچر کبھی میرے برابر آجاتا اور کبھی چند گز آگے نکل جاتا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب راستہ زیادہ خطرناک ہوتا ثوبان کا خچر میرے برابر آجاتا تھا۔

سورج نکل آیا۔ دھوپ کی کرنیں مچلنے لگیں۔ تقریباً ایک گھنٹا مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ چٹانوں کے درمیان بہت کھلی جگہ تھی۔ رات کی تاریکی میں سفر کے دوران میں چٹانوں کے ہیولوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن دن کی روشنی پھیلنے کے بعد آس پاس کے مناظر دیکھ کر حیرت کے مارے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ان پہاڑوں میں اگرچہ اونچے درخت نہیں تھے لیکن سبزہ بے تحاشا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ جس جگہ ہم ٹھہرے تھے وہاں بھی شفاف پانی کی ایک چھوٹی ندی کے آس پاس سبز دبیز گھاس اور پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔

ثوبان نے اپنے خچر کی گردن سے بندھا ہوا ایک تھیلا اتار لیا اور خچر کو کھلا چھوڑ دیا۔ رات بھر کے سفر سے خچر بھی تھک گئے تھے اور میری حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہو رہی تھی۔ راجستھان میں' میں نے شوقیہ طور پر گھوڑے کی تھوڑی بہت سواری کی تھی لیکن آرام دہ زین پر تھوڑی دیر کو سواری کرنا اور بات تھی اور خچر کی ننگی پیٹھ پر رات بھر پہاڑی سفر کرنا دوسری بات۔ میرا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا تھا۔

خچر سے اتر کر میں گھاس پر لیٹ گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ثوبان ندی کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد وہ میری طرف گھوم گیا۔

"تھک گئے؟" وہ بولا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے مجھے دیکھ رہا ہو۔

"گھوڑے یا خچر کی ننگی پیٹھ پر کبھی سفر نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا۔

"کٹھنائیاں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔" اس نے کہا "مقصد اگر نیک ہو تو کوئی مشکل' مشکل نہیں رہتی۔ لو۔ تھوڑی پیٹ پوجا کرلو تو ہم آگے چلیں۔" اس نے تھیلا میری طرف اچھال دیا۔

میں نے اٹھ کر پہلے منہ ہاتھ دھویا اور پھر تھیلا کھول کر

اس میں جھانکنے لگا۔ اس میں مٹر کے بھنے ہوئے دانے تھے۔ گزشتہ رات کا کھانا اس سفر کے دوران میں ہضم ہوچکا تھا اور اس وقت مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ایک مٹھی دانے لے لیے اور تھیلا ثوبان کی طرف بڑھا دیا۔

"لو۔ تم بھی کھاؤ۔"

ثوبان نے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مجھے شرارت سوجھی اور میں نے تھیلا ایک طرف ہٹا دیا۔ ثوبان کا ہاتھ اس طرف بڑھا تو میں نے تھیلا وہاں سے بھی ہٹا دیا۔

"مذاق کر رہے ہو۔" ثوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میرے لاشعور میں شاید یہ ہو کہ میں اسے آزمانا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ آنکھوں سے محروم جو شخص رات کی تاریکی میں خطرناک پہاڑی راستوں پر میری رہنمائی کرتا آیا تھا۔ میں اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا' یہ بھی بھول گیا تھا کہ گزشتہ رات سفر کے دوران میں کئی ایسے خطرناک مقام آئے تھے جہاں معمولی سی غفلت کسی کو تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی اور ایسے ہر موقع پر ثوبان نے میری رہنمائی کی تھی۔

"مجھے افسوس ہے ثوبان۔" میرے لہجے میں ندامت تھی "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں نے برا نہیں مانا۔" ثوبان نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے تھیلا لے لیا اور اس میں سے مٹر کے دانے نکال کر کھانے لگا۔

بھنے ہوئے مٹر کے دانے نمکین تھے جو کھانے میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ مٹر کھانے کے بعد میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ بے حد خطرناک تھا۔ کہیں تنگ سی دراڑوں میں سے گزرنا پڑتا اور کہیں عمودی ڈھلانیں تھیں۔

دن بھر کے بغیر ہمارا سفر جاری رہا۔ سہ پہر کے قریب ہم تھوڑی دیر کو ایک جگہ رکے اور پھر آگے روانہ ہوگئے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں ہمارے سامنے نشیب میں وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی جس کی دوسری طرف تیلگری کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے انہی پہاڑوں میں کہیں بدھ کی وہ قدیم عبادت گاہ گومپو تھی جہاں گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہی برف پوش چوٹیاں تیلگری کا بھی مسکن تھیں جہاں وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم آج کی رات یہاں آرام کرلیں اور صبح اپنا سفر دوبارہ شروع کریں۔" میں نے ثوبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ثوبان نے نفی میں سر ہلا دیا "آدھی رات سے پہلے پہلے ہمیں وادی کی دوسری طرف پہنچ جانا چاہیے۔ اگر تم بہت تھک گئے ہو تو ہم چند منٹ یہاں آرام کرسکتے ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ میں اس ستر سالہ بوڑھے کے سامنے اپنے آپ کو ہلکا ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا جو پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے خچر کی ننگی پشت پر نان اسٹاپ سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ دس منٹ رکنے کے بعد ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کردیا۔ ہمارے سامنے ڈھلان تھی اور وہ وادی میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹوں میں اس وادی کی دوسری طرف برف پوش پہاڑ کے دامن میں پہنچ جائیں گے۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عبرت

جو حالات کے جال میں پھنس کر جرائم

کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعام یافتہ مشہور مصنف جمیل توقیر کا منفرد انداز تحریر

گمراہ

8 حصے

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802561 فیکس: 5802552-5885313

kitabiat1970@yahoo.com

خچر بھی مسلسل سفر سے تھک گئے تھے۔ ان کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں رہی تھی۔

سورج غروب ہوگیا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ سرمئی دھندلکے کی جگہ اندھیرے کی سیاہ چادر پھیلنے لگی اور پھر اندھیرا اس قدر گمبھیر ہوگیا کہ چند گز آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن خچر اطمینان سے چلتے رہے۔ لگتا تھا جیسے یہ راستہ ان کا دیکھا بھالا ہو اور وہ پہلے بھی اس طرف آتے رہے ہوں۔

پرہول سناٹا دل پر وحشت سی طاری کررہا تھا۔ میں نے دھیان بٹانے کے لیے ثوبان سے باتیں شروع کردیں لیکن وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ عجیب آدمی تھا۔ کل آدھی رات کے وقت ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک چند جملوں کے تبادلے کے سوا ہم میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور اس وقت بھی وہ گفتگو سے اجتناب برت رہا تھا۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔

پورے سفر کے دوران میں، میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ ثوبان کبھی کبھی اپنا خچر روک کر اس طرح نتھنے پھلانے پچکانے لگتا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کررہا ہو۔ اس حرکت کے بعد یا تو وہ اس راستے پر اپنا سفر جاری رکھتا یا مجھے اشارہ کرتا ہوا خچر کو کسی اور راستے پر موڑ دیتا۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ ہم مڑ کر بہت دور تک پیچھے آئے تھے اور پھر راستہ تبدیل کیا تھا۔

اس وادی میں سفر کرتے ہوئے تقریباً چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ ڈھلان ختم ہو چکی تھی۔ اب آگے ہموار علاقہ تھا۔ سامنے پہاڑوں کے ہیولے اب بھی اتنے ہی دور تھے جتنے اس وادی کے شروع میں نظر آئے تھے۔

آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کے باعث تاریکی میں اب وہ پہلے جیسی گمبھیرتا نہیں رہی تھی۔ راستہ بھی اب کسی حد تک صاف نظر آنے لگا تھا۔

اچانک ثوبان نے خچر روک لیا اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بھی اپنا خچر روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ثوبان خچر پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف گھوم کر نتھنے پھلا پچکا رہا تھا پھر اچانک وہ سیدھا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اس نے کوئی خوفناک بات محسوس کی ہو۔

"بھاگو یہاں سے اجنبی!" وہ اپنے خچر کی لگام سنبھالتے ہوئے بولا "کھیل شروع ہوگیا۔ بلائیں ہم پر حملہ آور ہونے والی ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہوسکے، ہمیں اس وادی سے نکل جانا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھ سکتا، اس نے اپنے خچر کو ایڑھ لگادی۔ خچر بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اگرچہ اس کی بات پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا لیکن ایک انجانا سا خوف اچانک ہی ذہن میں ابھر آیا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے کوئی بلا نظر نہیں آئی جو حملہ آور ہونے والی ہو لیکن ثوبان بھی غلط نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ آنکھوں سے محروم تھا لیکن قدرت نے اس محرومی کے عوض اسے کچھ اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اندر کوئی ایسی اضافی حس بھی تھی جس سے وہ فضا میں سونگھ کر صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہ حس غالباً چھٹی حس سے بھی آگے کی کوئی چیز تھی۔

اچانک میں چونک گیا۔ کچھ ایسی آوازیں میری سماعت سے ٹکرائی تھیں، جیسے چند جانور ریوڑ کی صورت میں دوڑ رہے ہوں۔ یہ پراسرار آوازیں کبھی قریب سے سنائی دیتیں کبھی بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی۔

"اجنبی! بھاگو۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

ثوبان کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر اس طرف دیکھا تو وہ مجھ سے تقریباً سو گز آگے نکل چکا تھا۔ میں نے بھی اپنے خچر کو ایڑھ لگادی۔

مسلسل سفر سے اگرچہ خچر بھی تھکا ہوا تھا لیکن ایڑھ لگتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ شام سے پہلے ہم نے جہاں تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ ڈالا تھا وہاں میں نے ایک جھاڑی سے لمبی سی ایک شاخ توڑلی تھی جو اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں تن کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ میں لگام تھی اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر خچر کو تیز دوڑنے پر مجبور کررہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ثوبان کے برابر پہنچ گیا۔ وہ بھی خچر کو تیز سے تیز تر بھگانے کی کوشش کررہا تھا۔ ہماری کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے جہنم کی بلائیں ہمارا پیچھا کررہی ہوں۔

اور پھر میں نے ان بلاؤں کو دیکھ لیا۔ دوڑنے کی آوازیں سن کر ہی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

غولِ بیابانی ہمارا پیچھا کررہا تھا۔ وہ خوف ناک بھیڑیے تھے اور تعداد میں کئی تھے۔ ان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی بلور کی طرح چمک رہی تھیں۔ دوڑنے کے ساتھ ان کی غراہٹوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

دونوں خچروں نے بھی خطرے کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ بھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے لیکن ظاہر ہے، وہ خچر تھے۔ ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

ثوبان والا خچر مجھ سے چند گز آگے تھا۔ ثوبان بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا اور "اجنبی تیز... تیز۔" چیختا۔ میں خچر کو تیز تر دوڑانے کے لیے اسے بار بار چابک رسید کررہا تھا۔

دو بھیڑیے میرے بالکل قریب پہنچ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے ایک بھیڑیا خچر کے برابر پہنچ گیا اور اچھل کر میرا پیر پکڑنے کی کوشش کی۔ اگر میرا پیر اس کے منہ میں آجاتا تو وہ اسے چبا ہی ڈالتا۔ میں نے دونوں ٹانگیں خچر کے پیٹ کے ساتھ لپیٹ لیں اور بھیڑیے کے منہ پر چابک رسید کردی۔

چابک کھا کر وہ بھیڑیا تو پیچھے رہ گیا لیکن دوسرا بھیڑیا قریب پہنچ گیا تھا جو خچر کی پچھلی ٹانگ پر دانت گاڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے چھڑی سے اس بھیڑیے پر بھی دو تین حملے کیے لیکن اس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

ثوبان بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دو چار تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ بھیڑیے اس سے کافی دور تھے اور جان توڑ کر دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔

میرے پیچھے آنے والے ایک بھیڑیے نے عقل مندی یہ کی کہ وہ دوڑتا ہوا میرے خچر سے آگے نکل گیا۔ تقریباً دس گز آگے جاکر وہ رکا، تیزی سے مڑا اور حیرت انگیز طور پر ہوا میں اچھل کر میری طرف حملہ آور ہوا۔

اس بھیڑیے کو سامنے دیکھ کر خچر بدک گیا۔ وہ اگلے پیر اٹھا کر ہوا میں اچھلا۔ اس دوران میں سامنے سے ہوا میں اڑتا ہوا بھیڑیا میرے اوپر حملہ آور ہوچکا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی بھی پھینک دی اور خچر کی لگام بھی چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بھیڑیے کو اپنے ہاتھوں پر روکا۔

خچر میرے نیچے سے نکل گیا تھا۔ میں پشت کے بل زمین پر گرا۔ بھیڑیا میرے اوپر تھا لیکن میں نے اسے اپنے پیچھے اچھال دیا تھا۔

اس طرح خچر کی پشت پر سے گرنے سے مجھے اچھی خاصی چوٹ لگی تھی لیکن میں نے سنبھلنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میرے سامنے واقعی جہنم کی بلائیں تھیں۔

ثوبان آگے نکل چکا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بھیڑیا نہیں تھا جبکہ درجن بھر بھیڑیے دانت نکوستے اور غراتے ہوئے مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کررہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ یہ بھیڑیے..... یہ بھی مجھے بدھ کی عبادت گاہ تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش تھی۔ یہ بھی کسی طاغوتی قوت کے نمائندے تھے جو صرف مجھے روکنا اور ختم کرنا چاہتے تھے جبکہ انہوں نے ثوبان کا تعاقب ترک کردیا تھا۔

میرے ذہن میں ابھرنے والے صرف اس ایک خیال نے صورتِ حال بدل دی۔ میری اندر کی تمام تر قوتیں میری آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ تین بھیڑیے بڑی شدت سے میرے اوپر حملہ آور ہورہے تھے لیکن اچانک وہ رک گئے۔ مجھے ان کے پیروں کے قریب کچھ چنگاریاں سی ناچتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ چنگاریاں بڑی سرعت سے پھیلتی گئیں۔ بھیڑیے مجھ پر حملہ آور ہونا بھول گئے اور اچھل اچھل کر اپنے آپ کو ان چنگاریوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

وہ ننھی ننھی چنگاریاں دہکتے ہوئے انگاروں میں بدل گئیں۔ وہ خوں خوار بھیڑیے اچھل رہے تھے۔ ان کے منہ سے اب غراہٹوں کے بجائے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

میری نظروں کا زاویہ بدل گیا۔ اب میں نے نظروں ہی نظروں سے ان بھیڑیوں کے گرد دائرہ بنانا شروع کردیا۔ وہ آگ کا دائرہ تھا جو ان خوں خوار بھیڑیوں کو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ وہ حصار ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بھیڑیا باہر

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

بزرگانِ دین کے ایمان افروز واقعات

عظمت کے مینار

قیمت -/150 روپے

ڈاک خرچ -/25 روپے

مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی

کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر 1

نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ وہ بھیڑیا تھا جس نے خچر سے آگے نکل کر میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ ایک اور بھیڑیے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی آگ کا دائرہ مکمل ہوگیا۔ وہ بھیڑیے آگ کے دائرے میں محصور ہوگئے۔ وہ انگاروں پر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کے منہ سے بڑی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں اس بھیڑیے کی طرف دیکھنے لگا جو فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ بہت دور نکل گیا تھا۔ ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ستاروں کی روشنی میں اس کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے رو رہا تھا۔ سناٹے میں اس کے رونے کی آواز پوری وادی میں پھیل رہی تھی۔

"اجنبی! اب دیر مت کرو۔ نکل چلو یہاں سے۔"

میں نے مڑ کر آواز کی طرف دیکھا۔ ثوبان مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا لیکن اس کی آواز مجھے اپنے بالکل قریب سے سنائی دی تھی۔

میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خچر بھی تقریباً بیس گز دور کھڑا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ پھر بدک گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔

میں اچک کر اس کی پشت پر سوار ہوگیا اور اسے ہلکی سی ایڑھ لگا دی۔ ثوبان میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے بھی اپنے خچر کو ایڑھ لگا دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آگ کا دائرہ روشن تھا اور بھیڑیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم خچروں کو دوڑاتے ہوئے وہاں سے میلوں دور نکل آئے لیکن اس بھیڑیے کے رونے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ روتی اور بین کرتی ہوئی یہ آواز وادی میں چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ثوبان اب بھی خاموش تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

ہمارا سفر رات بھر جاری رہا اور بالآخر ہم وادی سے نکل کر اونچے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ اب ہم پھر بلندی کی طرف سفر کر رہے تھے۔

رات کی تاریک دم توڑنے لگی۔ دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ ثوبان خچر روک کر ایک بار پھر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس طرف! وہاں ایک جگہ ہے جہاں ہم کچھ دیر آرام کر سکتے ہیں۔"

میں نے بھی اس کے پیچھے ہی اپنا خچر موڑ لیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک چٹانوں میں گھومنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہاں ساٹھ ستر فٹ کی بلندی سے ایک آبشار گر رہا تھا اور چنار سے ملتے جلتے درختوں کی بہتات تھی لیکن یہ درخت چنار کی طرح قد آور نہیں تھے۔ ان کے پتے پان سے مشابہ تھے لیکن یہ ایک طرف سے سبز اور دوسری طرف سے چاندی کی رنگت کے تھے۔ ہوا سے جھومتے ہوئے یہ دو رنگے پتے بڑا دل فریب منظر پیش کر رہے تھے۔

یہاں بھی ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں رکے تھے۔ مسلسل سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا لیکن ستر سالہ ثوبان اب بھی تر و تازہ نظر آرہا تھا اور پھر یہ جان کر تو میری جان ہی نکل گئی کہ اس سے آگے ہم خچروں پر سفر نہیں کر سکیں گے۔

خچروں کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہمارا یہ پیدل سفر پہلے سے زیادہ کٹھن اور خطرناک تھا۔ ثوبان نوجوانوں کی طرح میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے بارے میں تو اب میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ خدا جانے' وہ کیا چیز تھی! مجھے تو اب اس کے انسان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا تھا یا پھر کوئی پراسرار قوت اس کے اندر حلول کر گئی تھی۔ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود وہ خطرناک ترین راستوں پر بے دھڑک چل رہا تھا۔ کئی جگہوں پر میں جھجکا تھا لیکن وہ بے دھڑک آگے بڑھ گیا تھا۔

میرا خیال تھا' شاید ہم آسمان کو چھونے جا رہے ہیں۔ اب جمی ہوئی برف اس قدر نرم تھی کہ پیر اندر دھنس رہے تھے۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ دھوپ کی الوداعی کرنوں میں برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

اور بالآخر ہم ایک چٹان پر رک گئے۔ ثوبان نے سامنے اشارہ کیا۔ میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے.... دوسری چٹان پر بدھ کی وہ قدیم عبادت گاہ "گومپو" نظر آرہی تھی جہاں میری اور گوتم بھوش کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا!

میں پلک جھپکے بغیر اس عبادت گاہ "گومپو" کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی بدھا کی یہ قدیم عبادت گاہ دل پر دہشت سی طاری کر رہی تھی اور اس سے زیادہ دہشت ناک وہ راستہ تھا جس سے گزر کر اس عبادت گاہ تک پہنچا جا سکتا تھا۔

پچاس گز طویل وہ راستہ پل صراط تھا۔ تقریباً چھ فٹ چوڑی جمی ہوئی برف کی وہ دیوار عبادت گاہ والی چٹان تک چلی گئی تھی۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر نیچے جھانکا تو مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دونوں چٹانوں کے درمیان یہ کھڈ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ گہرا تھا اور تیز رفتار پانی طوفانی لہروں کی طرح اچھلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ برف کی اس دیوار میں بھی جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ نظر آرہے تھے۔ میرے خیال میں دونوں چٹانوں کو ملانے والی برف کی اس دیوار کو ایک پل کہنا ہی مناسب ہوگا۔ ایک جگہ پل کی سطح سے تقریباً آٹھ فٹ نیچے بھی ایک بہت بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ زیادہ وزن پڑنے سے اس جگہ سے پل ٹوٹ بھی سکتا تھا۔

میں سیدھا ہو کر سامنے بدھ عبادت گاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ چٹان کا وہ غار اگرچہ قدرتی ہی تھا لیکن اس میں انسانی ہاتھوں کی صناعی بھی نظر آرہی تھی۔ غار کا دہانہ محرابی تھا۔ اس کا اوپر والا حصہ زمین کی سطح سے تقریباً تیس فٹ بلند تھا اور وہ دہانہ اس قدر کشادہ تھا کہ دو ہاتھی پہلو بہ پہلو بہ آسانی گزر سکتے تھے۔ اس محراب نما دہانے کے دائیں بائیں دیواروں پر چٹان کو کاٹ کر بدھا کے استادہ مجسمے تراشے گئے تھے اور محراب کے اوپر عین وسط میں بھی اسی طرح بدھا کا تراشا ہوا مجسمہ نظر آرہا تھا۔

غار کے دہانے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اندر سے بھی بہت وسیع و عریض ہوگا لیکن اس کے اندر کیا تھا؟ اس کا اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔

میں چٹان کے کنارے سے چند فٹ دور کھڑا متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ عبادت گاہ والی چٹان تک پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ ضرور ہونا چاہیے لیکن دائیں بائیں دور تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں دونوں چٹانیں آپس میں ملتی ہوں۔ اس جگہ جہاں میں کھڑا تھا' دونوں چٹانوں کے درمیان فاصلہ تقریباً پچاس گز تھا جبکہ دائیں بائیں کہیں یہ فاصلہ کم ہو جاتا تھا اور کہیں زیادہ۔ درمیانی گہرائی بھی کہیں کم تھی اور کہیں زیادہ۔ گہرائی میں تیز رفتار پانی کو اچھلتے دیکھ کر میری رگوں میں بھی خون اچھلنے لگا تھا۔

"عبادت گاہ تک پہنچنے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے اجنبی۔" ثوبان کی آواز سن کر میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند گز پیچھے کھڑا تھا اور اس نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

"تمہیں اس پگڈنڈی سے گزر کر جانا ہوگا۔" اس نے کہا "یہ راستہ صرف وہی لوگ پار کر سکتے ہیں جو آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور تم میں حوصلے کی کمی نہیں۔ اب دیر مت کرو۔"

میرا خیال تھا کہ ثوبان اس موقع پر بھی میری رہنمائی کرے گا اور برف کے پل پر قدم رکھنے میں بھی پہل وہی کرے گا۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

"میں یہاں سے آگے نہیں جا سکتا۔" اس نے ایک بار پھر میرے خیالات پڑھ لیے "تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔ جاؤ۔ اب دیر مت کرو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں نے ثوبان کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر اس پل صراط کی طرف دیکھنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خطرناک راستے کو دیکھ کر میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ پل پر جمی ہوئی برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ثوبان کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ یہ شخص میرے لیے ایک عجوبہ ثابت ہوا تھا۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ خطرناک ترین راستوں پر میری راہنمائی کرتا ہوا مجھے یہاں تک لایا تھا اور اب اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ برف کے اس پل صراط نما راستے سے ڈر گیا تھا۔ یقیناً کوئی اور مصلحت تھی۔

میں نے آخری بار اس کی طرف دیکھا اور مڑ کر اس راستے کی طرف چلنے لگا۔ چٹان پر بکھری ہوئی برف میرے پیروں کے نیچے "کرچ کرچ" کی آواز سے دب رہی تھی۔ میں چٹان سے اس پل پر آگیا۔ پہلا قدم رکھتے ہی میرا دل کانپ اٹھا۔ بے پناہ خوف محسوس ہونے کے باوجود میں نے دوسرا قدم آگے بڑھا دیا۔

چند قدموں تک برف نرم تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں ہوا براہ راست مار نہیں کر رہی تھی۔ میرے پیر ٹخنوں تک اس برف میں دھنستے رہے۔

اور پھر وہ مرحلہ شروع ہوگیا جسے زندگی کا خوفناک ترین تجربہ کہا جا سکتا تھا۔ آگے برف سخت تھی اور شیشے کی طرح چکنی تھی۔ اگر آپ کو کبھی ایسا تجربہ ہوا ہو تو آپ کو اندازہ

ہوگا کہ چمکتے ہوئے شیشے پر چلنا کتنا دشوار ہوتا ہے اور ستم یہ کہ یہاں تو ہوا بھی مجھے ایک طرف دھکیل رہی تھی۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' ہوا میں بھی تیزی آرہی تھی۔ شیشے کی طرح جمی ہوئی برف پر پیر جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک موقع پر تو میرا پیر پھسل گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے میرا توازن بگڑ گیا اور میں پشت کے بل گرا۔ میں بڑی تیزی سے کنارے کی طرف پھسل رہا تھا اور پھر اچانک یوں لگا جیسے میں کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ میں کنارے سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر رکا تھا۔ میں نے متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن میرے آس پاس کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار قوت تھی جس نے مجھے گرنے سے بچالیا تھا۔

میں ایک بار پھر سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت تک میں تقریباً بیس گز آگے آچکا تھا اور پھر اچانک ہی مجھے ایسے لگا جیسے برف کا وہ پل اپنی جگہ سے حرکت کر رہا ہو۔ میرے لیے قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا لیکن میں آگے بڑھتا رہا۔ چند قدم آگے بڑھتے ہی میں پھر رک گیا بلکہ میں نے جھک کر دونوں ہاتھ بھی برف پر جما دیے۔ اس وقت مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے برف ٹوٹ رہی ہو۔ بڑی خوفناک آواز سنائی دی تھی۔ میں چند لمحے بے حس و حرکت چوپائے کی طرح کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

اب میں پل کے وسط میں پہنچ چکا تھا اور اسی جگہ پر تھا جہاں سات آٹھ فٹ نیچے برف کی اس دیوار میں بہت بڑا سوراخ تھا۔ یہاں ہوا بھی بہت تیز ہوگئی تھی اور پھر وہ ہوا جس کی میں توقع نہیں کرسکتا تھا بلکہ ایسی صورتِ حال کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ہوا میں اچانک ہی تیزی آگئی تھی اور جمی ہوئی برف کا وہ پل رسے کے پل کی طرح زور زور سے ہلنے لگا۔ مجھے تھائی لینڈ کے پہاڑی علاقے میں ایک مرتبہ رسے کے پل پر چلنے کا اتفاق ہوا تھا شاؤلن ٹمپل میں بھی رسے کا ایک پل تھا..... جس پر تقریباً روزانہ ہی چلا کرتا تھا لیکن جمی ہوئی برف کا یہ پل.....؟ اس کے اس طرح ہلنے پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

تیز ہوا سے پل بڑی تیزی سے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں پیر جمائے کھڑا رہا تھا۔ ایک ہی جگہ کھڑے رہنے سے پیروں کی حرارت سے اس جگہ برف میں گڑھے سے پڑگئے تھے اور میرے پیر ایک طرح سے ان گڑھوں میں جم گئے تھے لیکن پل جس طرح جھول رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے کئی فٹ اوپر اچھال دیا اور جب میں دوبارہ پل پر گرا تو ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی چٹان چیخ رہی ہو۔ بڑی خوفناک آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں دہل کر رہ گیا۔ میرے پیروں کے نیچے پل ٹوٹ رہا تھا۔ برف کی بہت بڑی سل سلوموشن میں نیچے جھک رہی تھی جیسے درخت کی شاخ ٹوٹ کر آہستہ آہستہ نیچے جھک رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی آہستہ آہستہ نیچے جا رہا تھا اور پھر برف کی وہ سل میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔

میں بڑی تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ ڈیڑھ سو فٹ نیچے طوفانی لہروں کی طرح مچلتا ہوا پانی مجھے اپنی آغوش میں لینے کو تیار تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی تمام تر توجہ مراقبے پر مرکوز کردی۔ یہ لمحاتی مراقبہ سود مند ثابت ہوا۔ یہ میرا تجربہ تھا۔ میں نے جب بھی مراقبے کا خیال کیا تھا' مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایسے موقع پر میرے اندر کی قوت نے میری مدد کی تھی۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں فضا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کھونٹی پر ٹانگ دیا گیا ہو۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں فضا میں معلق گھڑیال کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں نیچے طوفانی رفتار سے بہتے ہوئے پانی سے چند فٹ اوپر تھا۔ اٹھتی ہوئی لہریں کبھی کبھی میرے پیروں کو بھی چھو لیتی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے پانی کی وہ لہریں آگ کی لپٹوں میں بدل جاتیں۔

وہ آگ کا دریا تھا۔ لہروں کی صورت میں اٹھتے ہوئے مہیب شعلے میری طرف لپک رہے تھے۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور تک چٹانوں کے بیچ آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ مہیب شعلے اچھل اچھل کر میری طرف لپک رہے تھے۔ ان کی تپش سے میں گویا پگھلا جا رہا تھا۔ شعلے مجھے نگل لینے کو لپک رہے تھے۔

اب صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی تھی۔ جب میں جمی ہوئی برف کے پل کے اوپر تھا تو ہوا نے مجھے دھکیلنا شروع کیا تھا پھر وہ پل رسے کے پل کی طرح ہلنے لگا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ تند اور تیز ہوا کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے اور جب پل میرے پیروں کے نیچے ٹوٹا تھا تو تب مجھے ذرا سی حیرت ہوئی تھی۔ ایک آدمی کے وزن سے پل کس طرح ٹوٹ سکتا ہے اور اب آگ کا یہ دریا..... مجھے نگل لینے کو

لپکتے ہوئے شعلے.....؟ یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ طاغوتی قوتیں مجھے تباہ و برباد کردینا چاہتی تھیں۔

میرے اندر کی قوت بیدار ہو چکی تھی۔ مہیب شعلے اب مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ شعلے میرے بدن سے ٹکراتے تو وہ پانی کی پھوار میں بدل جاتے۔

طاغوتی قوتوں کے حملوں میں تیزی آتی گئی۔ آگ کے مہیب شعلوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان سے مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا مگر پل کی جمی ہوئی برف تیزی سے پگھلنے لگی۔

مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے قمیص کے کالر سے پکڑ کر اوپر اٹھا رہا ہو۔ میں نے گردن گھما کر اوپر دیکھا۔ ثوبان چٹان کے کنارے پر کھڑا کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے میری شرٹ کا کالر پکڑ رکھا تھا اور مجھے اوپر کھینچ رہا تھا۔

میرے اور ثوبان کے بیچ تقریباً تیس گز کا فاصلہ تھا اور اس کا ہاتھ اتنا دراز ہوگیا تھا کہ اس نے مجھے شرٹ کے کالر سے پکڑ کر نیچے گرنے سے بچالیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا گیا اور پھر اس ہاتھ نے مجھے ٹوٹے ہوئے پل کے دوسرے حصے پر کھڑا کردیا۔ اس کے بعد وہ ہاتھ میری گردن سے ہٹ گیا۔ آگ کے شعلے اب بہت نیچے رہ گئے تھے۔ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تھے لیکن ان کی گرمی سے برف بڑی تیزی سے پگھل رہی تھی اور برف کی دیوار آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہی تھی۔

میں نے بدھ عبادت گاہ والی چٹان کی طرف دیکھا۔ عبادت گاہ کے دہانے پر قدرے اندر کی طرف ایک روشن ہیولا سا دکھائی دیا۔ اس ہیولے کے چہرے کے نقش واضح نہیں تھے لیکن مجھے اس میں نیلگری کی جھلک دکھائی دی تھی۔

برف کی دیوار میرے پیروں کے نیچے بیٹھی جارہی تھی۔ میں نے کنارے کی طرف دوڑ لگا دی۔ کئی مرتبہ میرا پیر پھسلا لیکن میں سنبھل کر دوڑتا رہا۔

دوسری طرف چٹان کا کنارہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ برف کی دیوار میرے پیروں تلے سے نکل گئی۔ میں پوری قوت سے ہوا میں اچھلا اور پرندے کی طرح اڑتا ہوا کنارے کی طرف لپکا۔ ایک دم سامنے سے گرم ہوا کا ایک طوفانی جھونکا آیا جو مجھے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگا۔ میں ایک لمحے کو فضا میں معلق سا رہ گیا۔ تپتی ہوئی ہوا کا وہ جھونکا تیز و تند بگولے میں بدل گیا اور میں لٹو کی طرح گھومنے لگا۔

میں نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ تپتی ہوئی ہوا میرے بدن کو جھلسائے دے رہی تھی۔ میں اس بگولے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ قوت میرے ہاتھوں اور پیروں کو گرفت میں لے کر انہیں رسی میں باندھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے ہاتھ پیر چھڑانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

اچانک بگولے کا زور ٹوٹ گیا۔ میں بلندی سے پھینکے ہوئے پتھر کی طرح تیزی سے نیچے گرنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں چٹان کے کنارے کے بالکل قریب گہرائی میں لپکتے ہوئے آگ کے شعلوں کی طرف گر رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر چٹان کی طرف دراز ہوگیا اور کنارے پر میری گرفت جم گئی۔

اب میں ایک ہاتھ کے سہارے چٹان سے لٹکا ہوا تھا۔ جس پتھر پر میرا ہاتھ اٹکا تھا اس پر برف جمی ہوئی تھی اور میری انگلیاں آہستہ آہستہ برف پر پھسل رہی تھیں۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا' ڈیڑھ سو فٹ نیچے بدستور آگ کا دریا بہہ رہا تھا اور میری طرف لپکتے ہوئے شعلے بتدریج بلند ہو رہے تھے۔

میں نے دوسرا ہاتھ بھی کنارے پر جما دیا اور اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا گیا۔ ایک ٹانگ دہری کرکے پہلے گھٹنا کنارے پر ٹکایا اور اپنے آپ کو ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ ابھی میں پوری طرح سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ میرے منہ پر زوردار گھونسا پڑا۔

وہ نادیدہ گھونسا ہتھوڑے کی طرح وزنی تھا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس وقت میں چٹان کے بالکل کنارے پر تھا اور میرا توازن بگڑ چکا تھا۔ میں کسی بھی لمحے نیچے آگ کے دریا میں گر سکتا تھا۔

فضا میں اچانک ہی قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ خوفناک شیطانی قہقہے چٹانوں میں بازگشت پیدا کر رہے تھے۔ آوازیں سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔

میں پیچھے گرنے کے قریب تھا کہ سنبھل گیا۔ جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے سہارا دیا ہو۔ پشت پر ہاتھ رکھ کر آگے کو دھکیل دیا ہو۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کئی فٹ آگے جا کر منہ کے بل گرا۔ میں نے دونوں ہاتھ بڑی پھرتی سے زمین پر ٹکا دیے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے یا میرا چہرہ زخمی ہوجاتا۔ میں گرنے کے فوراً بعد ہی سنبھل گیا۔

قہقہوں کی پراسرار آوازیں اب رونے اور بین کرنے کی آوازوں میں بدل گئی تھیں جیسے سیکڑوں بد روحیں ماتم

کررہی ہوں اور بین کررہی ہوں۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ ثوبان چٹان کے دوسرے کنارے پر اب بھی اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ ہمارے درمیان اگرچہ پچاس گز کے لگ بھگ فاصلہ تھا لیکن مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ میں واضح طور پر محسوس کرسکتا تھا۔

میں عبادت گاہ کے داخلی راستے کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ یہاں زیادہ کشادہ جگہ نہیں تھی۔ چٹان کا کنارہ پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دوسری چٹان تک جانے والی برف کی دیوار پگھل کرپانی بن چکی تھی۔ میرے اور ثوبان کے بیچ یہ طویل گہری کھائی حائل ہوچکی تھی اور اس گہری کھائی میں اب بھی آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ شعلے لپک رہے تھے۔ میری واپسی کا راستہ مسدود ہوگیا تھا یا مسدود کردیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے' میں بھی ناکام واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کم از کم اس وقت تک واپس جانے کا خیال دل میں نہیں لاسکتا تھا جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوجاتا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد مجھے واپسی کے راستے بھی مل سکتے تھے۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر عبادت گاہ میں داخل ہونے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ پانچ کشادہ سیڑھیاں بھی چٹان کو تراش کرنبائی گئی تھیں۔

میری توقع کے مطابق یہ غار بہت وسیع تھا۔ چھت بھی بہت اونچی تھی۔ دیواروں کو تراش کر عظیم بدھا کے لاتعداد مجسمے بنائے گئے تھے۔

غار کے اختتام پر تقریباً دس فٹ چوڑی راہداری تھی اور میرے خیال میں غار اس طرف کافی اندر تک چلا گیا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ اس غار میں اندھیرا نہیں تھا۔ جب میں نے دوسری طرف سے برف کی دیوار پر چلنا شروع کیا تھا تو اس وقت آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ غار کے باہر اب بھی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ کی وجہ سے غار کے دہانے کے اندر تھوڑی دور تک روشنی تو ہونی چاہیے تھی لیکن پورے غار میں آگے بھی مدھم سا اجالا تھا اور میرے خیال میں اس راہداری کی دوسری طرف بھی کوئی ایسی کھلی جگہ موجود تھی جہاں سے روشنی آرہی تھی۔

میں کچھ دیر اس جگہ پر کھڑا متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں راہداری کی طرف قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم اندھیرا چھاگیا۔ بالکل ایسے ہی لگا تھا جیسے کسی کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ بجھادی گئی ہو۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا اور خوف کی شدت سے کانپ کررہ گیا۔

گہری دھند عبادت گاہ کے سامنے جمع ہورہی تھی۔ دھند کا رنگ پہلے سرمئی سا تھا پھر اس میں گہرا پن آتا گیا اور بالآخر یہ دھند سیاہ رنگت اختیار کرگئی۔

سیاہ دھند کے دل ہی دل غار کے اندر آرہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شدید سردی میری ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کرتی جارہی تھی۔ میرے اوپر کپکپی سی طاری ہوگئی اور باقاعدہ دانت بجنے لگے۔

میں پیچھے ہٹتا ہوا راہداری کی طرف بڑھتا چلا گیا لیکن نہ تو سردی کی شدت کم ہوئی اور نہ ہی دھند میں کمی آئی۔ میں ٹھٹھرنے سے دہرا ہوا جارہا تھا۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہونے لگی۔ اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کے بجائے میں زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے اپنے بازو بھی سمیٹ لیے تھے اور گھٹنے بھی خود بخود سمٹ کر پیٹ سے لگ گئے تھے۔

شیطانی قہقہوں کی آوازیں ایک بار پھر غار میں گونجنے لگیں۔ طاغوتی قوتیں میری بے بسی پر ہنسنے لگی تھیں۔ وہ مجھے ہر صورت میں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتی تھیں۔ زیر کرنا چاہتی تھیں اور موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی تھیں۔

یوگی گوتم بھوش چاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چیلا پنڈت دھیراج مجھے زیر کرنے کے لیے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے پاس بھی ایسی قوتیں ہیں جو اسے شکست سے دوچار کرسکتی ہیں۔

میرے اندر کی سب سے بڑی قوت تو "چی" تھی جسے میں نے شاؤلن ٹیمپل میں بڑی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا۔ سردی کی شدت سے میری قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ میرا سانس رک رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کوشش کرکے اپنی تمام تر توجہ "چی" کی طرف مبذول کردی۔

میں اب بھی یخ بستہ دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن اب میرے جسم میں حرارت پیدا ہورہی تھی۔ میرے سانس کی رفتار نارمل ہوگئی۔ ٹانگیں اور بازو آہستہ آہستہ سیدھے ہونے لگے۔ میں خوابیدہ شیر کی طرح انگڑائی لے کر سیدھا ہوگیا۔ میرے گرد لپٹی ہوئی کالی دھند پانی بن کر غار کے فرش پر بہنے لگی۔

"بھاگو وجدان.... بھاگو..."

ایک پراسرار سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے میرے نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور یہاں میرا نام صرف نیلگری جانتی تھی۔ میرے کان میں سرگوشی کی بازگشت ختم

ہوتے ہی چٹانوں کے ٹوٹنے کی ہیبت ناک آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ غار کی چھت کا ایک حصہ بیٹھ رہا تھا۔ میں نے راہداری کی طرف دوڑ لگادی۔

غار کی چھت کا وہ حصہ بیٹھ گیا۔ غار کے اندر بھی چٹانیں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے شدید زلزلہ آگیا ہو۔ میں دوڑتا رہا۔ تقریباً بیس گز آگے جاکر یہ راہداری دائیں طرف مڑگئی تھی۔ اس طرف مڑتے ہی میں ایک بار پھر بد حواس ہوگیا۔ بروں کی پھڑپھڑاہٹ نے ایک بار پھر مجھ پر دہشت سی طاری کردی۔ سیکڑوں چمگادڑوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا اور نیچے جھک گیا لیکن چہرہ چھپالینے سے میں محفوظ نہیں ہوگیا تھا۔ چمگادڑوں کا حملہ جاری رہا۔ ان کے نکیلے دانت سوئیوں کی طرح میرے بدن میں پیوست ہورہے تھے۔ میں اپنے آپ کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ کئی چمگادڑ گوشت میں دانت گاڑے میرے جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ میرے اندر کی قوت ایک بار پھر بیدار ہوگئی اور مجھے یوں لگا جیسے میری ساری قوتیں سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئی ہوں۔

میں نے چہرے سے ہاتھ ہٹالیے اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے صاف لگ رہا تھا جیسے میری آنکھوں سے لہریں سی خارج ہورہی ہوں۔ میں نہ صرف اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا بلکہ آنکھوں سے خارج ہونے والی لہریں لیزر بیم کی طرح اڑتی ہوئی لاتعداد چمگادڑوں کو شکار کررہی تھیں۔ جو بھی چمگادڑ ان لہروں کی زد میں آتی' راکھ بن کر بکھر جاتی۔ ایک وقت میں کئی کئی چمگادڑ راکھ بن کر ڈھیر ہورہی تھیں۔ میں اپنے بدن پر چپکے ہوئے چمگادڑوں کو بھی نوچ نوچ کر پھینکتا رہا۔

غیر معمولی طور پر ایک بڑی چمگادڑ بار بار مجھ پر حملہ آور ہورہی تھی۔ سیکڑوں چمگادڑ خاک کا ڈھیر بن چکی تھیں لیکن وہ ایک چمگادڑ میری آنکھوں سے خارج ہونے والی لہروں کی زد میں نہیں آرہی تھی۔

وہ چمگادڑ جسامت میں چیل سے بھی بڑی تھی اور بڑی پھرتی دکھا رہی تھی۔ ایک موقع پر وہ میرے اوپر جھپٹی تو میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف جھکتے ہوئے ہاتھ چلا دیا۔ میرا ہاتھ ٹھیک نشانے پر پڑا۔ وہ چمگادڑ "چیں چیں" کی آوازیں نکالتی ہوئی مجھ سے چند فٹ دور زمین پر گری لیکن وہ بڑی پھرتیلی ثابت ہوئی۔ فوراً ہی اڑتی ہوئی دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوئی اور اس مرتبہ اس کا ایک پر' میری آنکھوں سے خارج ہونے والی لہروں کی زد میں آگیا۔ اس کے پر سے شعلے خارج ہونے لگے اور وہ "چیں چیں" کی آوازیں نکالتی ہوئی پلٹ کر ایک طرف غائب ہوگئی۔ اس بڑی چمگادڑ کے غائب ہوتے ہی حیرت انگیز طور پر دوسری بچی کھچی چمگادڑ بھی غائب ہوگئیں اور غار میں گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔

گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کی پراسرار قوتیں مجھے روکنے کے لیے برسرپیکار تھیں لیکن میں انہیں مات دیتا ہوا مسلسل آگے بڑھتا جارہا تھا۔

اس راہداری کے اگلے موڑ پر ایک اور راہداری تھی جو مسلسل نشیب کی طرف چلی گئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پاتال میں اترا جارہا ہوں لیکن اچانک ہی ڈھلان ختم ہوگئی اور اب میں راہداریوں کے ایک چوراہے پر کھڑا تھا۔

مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ بدھا کی یہ قدیم عبادت گاہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ پہلے غار میں مجھے دیواروں پر تراشے ہوئے بدھا کے مجسمے نظر آئے تھے۔ اس کے بعد تو غاروں اور سرنگوں کی بھول بھلیاں سی بنی ہوئی تھیں اور اب میں ایک چوراہے پر کھڑا تھا اور میں نہیں سمجھ پارہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

میں جانتا تھا' یوگی گوتم بھوش عبادت گاہ کے انہی تہ خانوں میں کسی جگہ چھپ کر چاپ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی پراسرار قوتیں مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں لیکن میں یہاں تک آگیا تھا اور یہ طے کرکے آیا تھا کہ اسے چاپ پورا نہیں کرنے دوں گا۔

کوئی غلط راستہ مجھے منزل سے میلوں دور پہنچا سکتا تھا اس لیے میں بہت احتیاط سے راستے کا انتخاب کرنا چاہتا تھا اور میں اس چوراہے پر کھڑا فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرپارہا تھا۔

نیلگری بھی انہی برف پوش پہاڑوں کے سینے میں کسی جگہ موجود تھی لیکن گوتم بھوش کے چاپ نے اسے بے بس کردیا تھا۔ اسے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ جیسے جیسے چاپ کی تکمیل کا وقت قریب آتا جارہا تھا.... اس کی قوت کمزور پڑتی جارہی تھی۔

میں اس چوراہے کے وسط میں کھڑا یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ وہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور جب وہ آواز سمجھ میں آئی تو میں کانپ کررہ گیا۔

وہ پانی کی لہروں کی آواز تھی۔ جیسے بپھری ہوئی موجیں سنگلاخ چٹانوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں متوحش نظروں سے ادھر اوھر دیکھنے لگا اور پھر وہ خوفناک منظر میرے سامنے آگیا۔

جس سرنگ سے میں یہاں تک آیا تھا وہ میری طرف ڈھلوان تھی اور اوپر کی طرف سے پانی کا ایک زبردست ریلا طوفانی رفتار سے جھاگ اڑاتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں جب سے اس چٹان کے سینے میں داخل ہوا تھا' کسی جگہ پانی کا ایک قطرہ تک نہیں دیکھا تھا۔ غار کے باہر دونوں چٹانوں کے بیچ ڈیڑھ دو سو فٹ کی گہرائی میں جو پانی بہہ رہا تھا وہ بھی آگ کے دریا میں تبدیل ہوچکا تھا۔ مان لیا کہ وہ بہتی ہوئی آگ دوبارہ پانی بن گئی ہوگی لیکن اس پانی کے لیے ڈیڑھ دو سو فٹ اوپر آنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ پراسرار قوتوں کا کھیل تھا۔ یہ طاغوتی قوتوں نے میرے خلاف محاذ بنا رکھا تھا۔ یہ پراسرار شیطانی قوتیں مجھے نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ گہرائی میں بہتے ہوئے پانی کو اوپر کھینچ لانا ان کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

جھاگ اڑاتا اور چٹانی دیواروں سے سر ٹکراتا پانی طوفانی رفتار سے میری طرف آرہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچ سکتا' پانی کا طوفانی ریلا مجھ سے ٹکرا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی نہایت تیز رفتار ٹرین مجھ سے ٹکرا گئی ہو۔ پانی کا ریلا مجھے اپنے ساتھ دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا۔ کئی گز آگے جا کر میں سرنگ کی دیوار سے ٹکرایا۔

میرا جوڑ جوڑ ہل گیا۔ پانی کی لہریں مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔ سرنگ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا لیکن نہ تو میرے پیر زمین پر ٹک رہے تھے اور نہ ہی میں کسی دیوار کا سہارا لینے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میرا ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی نیلگری کی مالا سے ٹکرا گیا اور میں نے غیر ارادی طور پر مالا کا بیچ والا پتھر منہ میں ڈال لیا۔ دو پتھر میری ناک کے نتھنوں پر جم گئے۔ اس طرح میرا سانس گھٹ جانا چاہیے تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ پانی کی لہروں نے مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں پوری طرح پانی میں ڈوب گیا تھا اور غوطے کھا رہا تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے چہرے پر گیس ماسک لگا رکھا ہو۔

پانی مجھے مسلسل اٹھا اٹھا کر پٹختا رہا اور بالآخر اس کا جنون کم ہوگیا۔ لہروں کا زور دم توڑنے لگا۔ میرے پیر بھی زمین پر لگ گئے اور میں ایک دیوار کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہوگیا۔

پانی میری گردن سے سینے تک آگیا اور پھر بتدریج نیچے اترتا چلا گیا۔ اس کی پرہول آواز بھی بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔

ایک بار پھر گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ پانی مجھے دھکیلتا ہوا نجانے کہاں سے کہاں لے آیا تھا لیکن اس منظر نے میرے جسم میں سنسنی کی لہری دوڑا دی تھی۔

میں اس وقت بھی ایک سرنگ ہی میں تھا۔ میرے سامنے والی دیوار میں زمین کی سطح سے تقریباً چار فٹ اوپر کھڑکی کی طرح ایک راستہ سا بنا ہوا تھا اور اس کی دوسری طرف روشنی میں ایک مجسمے کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔

میں اس کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

یہ بہت بڑا غار تھا جس کے عین اوپر ایک بہت بڑے سوراخ کی طرح کا خلا نظر آرہا تھا۔ سورج اس وقت عین سر پر چمک رہا تھا اور دھوپ اس خلا کے راستے ہال نما غار میں بدھا کے ایک بہت بڑے مجسمے پر پڑ رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر مجسمے کے سامنے آگیا۔

وہ اسا سائکنگ بدھا تھا۔ سنگتراش نے ایک سنگلاخ چٹان کو مجسمے میں ڈالنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ جیتا جاگتا انسان ہو۔

یہ مجسمہ کم از کم تیس فٹ اونچا ضرور رہا ہوگا۔ اس کے محیط کا اندازہ بھی اسی حساب سے لگایا جاسکتا ہے۔ چھت کے خلا سے دھوپ اس کے عین اوپر پڑ رہی تھی۔

میں کچھ دیر اس مجسمے کو دیکھتا رہا اور پھر ایک دم پیچھے کی طرف پلٹ گیا۔ مجھے نقرئی کھنکتی ہوئی ہنسی واضح طور پر سنائی دی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کھنکتی ہوئی وبی دبی ہنسی کی وہ آواز مجھے چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

"نیلگری!" میں چیخا "نیلگری... کہاں ہو تم۔ میں آگیا ہوں۔"

نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ وبی دبی ہنسی کی وہ آواز نیلگری کی تھی۔ پہلے وہ آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی پھر ایک طرف سمٹ گئی اور میں غیر ارادی طور پر اس طرف بڑھنے لگا جس طرف وہ آواز سمٹی جارہی تھی۔

میں بدھا کے مجسمے کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ دھوپ اب بدھا کے مجسمے سے سرک رہی تھی اور پھر اچانک ہی غار میں

اندھیارا سا چھا گیا۔

میں اس آواز کے پیچھے چلتا رہا۔ غار کے اختتام پر ایک موڑ تھا۔ میں جیسے ہی اس طرف مڑا' ٹھٹک کر رک گیا۔ میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔

اس طرف بھی ایک کشادہ غار تھا جس کے وسط میں آگ کا ایک دائرہ تھا اور اس دائرے میں یوگی گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا... نہیں... بلکہ کھڑا تھا۔

گوتم بھوش ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کی کمر میں معمولی سا خم بھی نہیں تھا۔ اس کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پسلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ سامنے جوڑ رکھے تھے۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح بڑھے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک مختصر سا لنگوٹ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ زندہ انسان نہ ہو' پتھر کا کوئی مجسمہ ہو۔

پراسرار قوتوں پر قابو پانے کے لیے کیے جانے والے جاپ بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ بڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بڑی قوت ہوگی اس کے لیے اتنا ہی کٹھن جاپ ہوگا۔ نیلگری کے حصول کے لیے میں نے بھی ایک جاپ شروع کیا تھا۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ کوئی لالچ نہیں تھا' کوئی اور ہوس نہیں تھی اور قدرت نے میرا جاپ مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے نیلگری کے قریب پہنچا دیا تھا اور گوتم بھوش بھی نیلگری کے حصول کے لیے جاپ کررہا تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ تھی۔ ہوس تھی اسے طویل اور کٹھن راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ یہ آخری مرحلے کا کٹھن ترین جاپ تھا جس کے مکمل ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ کھائے پیے بغیر سینتیس دنوں سے اس طرح ایک ٹانگ پر کھڑا رہا ہوگا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس نے پہلے ایسے جاپ کر رکھے تھے جن کی قوتوں نے اسے کھانے پینے اور نیند وغیرہ کی ضرورت سے بے نیاز کردیا تھا۔

میرے اور گوتم بھوش کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ عام حالات ہوتے تو میں بڑے اطمینان سے اس کی گردن مروڑ دیتا لیکن اب ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ رکھا تھا۔ وہ محض آگ کا دائرہ نہیں تھا۔ طاغوتی قوتوں کا چکر تھا جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور اس چکر کو توڑنا آسان نہیں تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھ گیا اور اسی لمحے "دھب" کی آواز سے کوئی چیز میرے سامنے گری۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میری آنکھوں میں وحشت سی پھیلتی چلی گئی۔

وہ کالی دیوی تھی۔ ہندوؤں کی کالی ماتا۔ جسے تباہی و بربادی کی دیوی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے' اس کے قہر سے بچنے کے لیے اس کے چرنوں پر انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے اور گوتم بھوش نے اسے بھی اپنی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔

کالی دیوی برہنہ تھی۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے ایک ہاتھ میں تیغہ تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک انسانی کھوپڑی تھی جس کے بال اس کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے سیاہ موتیوں کی ایک مالا اور پیپل کے خشک پتوں کا ایک ہار تھا۔ انہی پتوں کی ایک جھالر اس کی کمر پر بھی لپٹی ہوئی تھی۔ کالی کی پھٹی پھٹی سی آنکھوں میں وحشت تھی اور زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون ٹپک رہا تھا۔

"واپس چلا جا مورکھ۔ (بے وقوف) میرے پجاری کو تنگ نہ کر۔ اسے اپنا جاپ پورا کرنے دے۔"

یہ سرگوشیانہ آواز بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ کالی مجھے وارننگ دے رہی تھی۔ خبردار کررہی تھی۔ مجھے نیست و نابود کردینے کی دھمکی دے رہی تھی لیکن میں کسی کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔

میں نے ہندوستان کے مندروں میں کالی کے بہت سے مجسمے دیکھے تھے۔ ہر جگہ اس کا یہی روپ تھا اور اسی خوفناک روپ میں مجھے بھی ڈرانے کے لیے وہ یہاں آگئی تھی۔

"میرے راستے سے ہٹ جا کالی۔" میں نے چیخ کر کہا "میں جانتا ہوں' تمہاری طرح بہت سی شیطانی قوتیں اس راکشش کی پشت پر ہیں لیکن میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہاری قوت کو شکست دے کر میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جا..."

"گستاخ۔" غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "مجھے دھمکی دیتا ہے۔ میں تجھے تباہ و برباد کردوں گی۔ آخری مرتبہ کہتی ہوں' میرے راستے سے ہٹ جا۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی سرخ آنکھوں سے بھی خون ٹپکتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ منظر بھی بڑا خوفناک ہوسکتا تھا۔ کالی کو اس غضب ناک حالت میں دیکھ کر عام آدمی کا تو کلیجا پھٹ سکتا تھا لیکن میں عام آدمی نہیں تھا۔ میں اپنے اندر حوصلہ پیدا کرکے ایسی ہی طاغوتی قوتوں کا

مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا۔

میں نے اپنے گلے سے نیلگری والی مالا اتاری اور اس کے دونوں سرے دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔

کالی کا چہرہ غضب ناک ہو کر کچھ اور بھیانک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے اب باقاعدہ چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور وہ چنگاریاں میری طرف لپک رہی تھیں لیکن میرے اندر کی قوت بھی بیدار ہو چکی تھی۔ کالی کی آنکھوں سے پھوٹنے والی چنگاریاں مجھ سے ایک فٹ آگے کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر رہی تھیں۔

کالی کے حلق سے خوفناک آواز نکلی۔ یہ آواز بادلوں کی گرج کی طرح غار میں پھیل گئی۔ ایک لمحے کو تو میں بھی دہل گیا لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

کالی کا تیغے والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس نے پوری قوت سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی نیلگری کی مالا سامنے کر دی۔ کالی کا تیغہ پوری قوت سے مالا سے ٹکرایا اور فضا تھرا کر رہ گئی۔ لگا تھا جیسے آسمانی بجلیاں آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔ ایسے خوفناک کڑاکے کی آواز میں نے کبھی نہیں سنی تھی اور ایسی چمک بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میری آنکھوں میں چکاچوند سی پیدا ہوئی اور پھر تاریکی چھا گئی۔ ایک لمحے کو تو میں یہ سمجھا تھا کہ شاید میری بصارت ختم ہو گئی ہے لیکن میری بینائی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا۔

اپنا یہ وار ناکام ہوتے دیکھ کر کالی کچھ اور غضب ناک ہو گئی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں اور وہ شعلے میرے سامنے تنی ہوئی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر اسی کی طرف پلٹنے لگے۔ کالی نے اچھل کر اپنے آپ کو ان شعلوں سے بچایا اور ایک بار پھر تیغے سے وار کیا لیکن یہ حملہ بھی پہلے کی طرح ناکام ثابت ہوا۔

"بھاگ جا مورکھ۔ (احمق۔ بے وقوف) میں تجھے آخری موقع دے رہی ہوں۔" کالی کی غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں بھی تجھے آخری موقع دے رہا ہوں۔" میں نے چیخ کر جواب دیا "چلی جا یہاں سے۔ ایسا نہ ہو' تجھے اس ضد (لڑائی) میں شرمندگی اٹھانی پڑے اور تو اپنے پجاریوں کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے۔"

"مجھے دھمکی دیتا ہے۔" کالی چیخی اور پھر اچانک ہی اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انسانی کھوپڑی میری طرف دے ماری۔

کسی نادیدہ قوت نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ میں لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرا۔ وہ انسانی کھوپڑی زناٹے کی آواز سے میرے اوپر سے گزرتی ہوئی سامنے والی دیوار پر لگی۔ ایک کان پھاڑ دینے والا خوفناک دھماکا ہوا اور دیوار کے پتھر ٹوٹ کر گرنے لگے۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت ہی پاور فل راکٹ فائر کیا گیا ہو۔

کالی ایک بار پھر اپنے تیغے سے حملہ آور ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ وہ حملہ نہیں کر سکی۔ اس کا ہاتھ اس طرح رک گیا تھا جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے حملے کو اس طرح ناکام ہوتے دیکھ کر کالی کی آنکھوں میں دہشت کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ میرے لیے اچھا موقع تھا۔ میں نے بھی جوابی حملہ کیا۔ میری آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کسی آٹومیٹک رائفل سے مسلسل فائرنگ کی جا رہی ہو۔ کالی اچھل اچھل کر اپنے آپ کو بچاتی رہی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ کمر پر لپٹی ہوئی پیپل کے خشک پتوں کی جھالر میری آنکھوں سے نکلنے والے انگاروں کی زد میں آ گئی۔ پتوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ کالی ناچنے لگی۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ جس طرف بھی جاتی' کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا جاتی۔ اس کا بدن اب پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اس کا ماس (گوشت) جل رہا تھا۔ گوشت جلنے کی بو پورے غار میں پھیل رہی تھی۔

کالی نڈھال ہو کر گر پڑی۔ اس کے بدن سے اٹھنے والے شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کالی کی ہیئت بھی بدلنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک مادہ بھیڑیے کی جلی ہوئی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ اس کے گلے سڑے بدن کو دیکھ کر مجھے کراہیت سی محسوس ہونے لگی۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ کالی نہیں تھی۔ گوتم بھوش یا اس کے چیلے پنڈت دھیراج نے مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے اپنے کسی بیر (موکل) کو کالی کے بھیس میں میرے سامنے بھیجا تھا۔ وہ مجھے تباہ کرنے آیا تھا لیکن خود اس طرح برباد ہو گیا تھا کہ اسے دیکھ کر گھن آنے لگی تھی۔

میں نے نیلگری کی مالا گلے میں ڈال لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں اتنا زبردست ہنگامہ ہوا تھا لیکن چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے گوتم بھوش کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی ایک ٹانگ پر اسی طرح کھڑا تھا۔

اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ اس کی مونچھوں کے بالوں کے نیچے ہونٹوں کی حرکت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھا لیکن اس طرح لڑکھڑا گیا جیسے میرے پیر کسی رسی میں الجھ گئے ہوں۔ میرا توازن بگڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں گر پڑتا' کسی نے مجھے سہارا دے کر سنبھال لیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی..... بے حد حسین۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دراز قامت' سڈول اور گداز جسم' اس کا سینہ کڑی کمان بنا ہوا تھا۔ اس کا لباس بھی ایسا تھا جسے لباس نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک اور سرخ ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

میرے ذہن میں نیلگری کا خیال ابھرا۔ اس کے چہرے کے نقوش تو میرے دل پر نقش تھے۔ یہ چہرہ اس سے مختلف تھا لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ نیلگری ایک مہان (عظیم) قوت تھی۔ کوئی بھی روپ اختیار کرنے پر قادر تھی۔ ہو سکتا ہے اس وقت کسی مصلحت کے تحت وہ اپنی اصل شکل میں سامنے نہ آنا چاہتی ہو اور کسی اور حسینہ کے روپ میں میری مدد کو آ گئی ہو اور اس نے مجھے گرنے سے بچا لیا ہو۔

"آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ تم تھک گئے ہو۔ تھوڑا آرام کر لو۔ اس طرف..... وہاں۔"

ایک سریلی سی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ اس نے میری کمر میں حمائل کر دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے نظریں جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہوش ربا حسن کی مالک تھی۔ ہونٹوں پر بڑی قاتل مسکراہٹ تھی۔ اس کے گداز بدن کا لمس میرے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑا رہا تھا۔ دل و دماغ پر عجیب سا سرور طاری ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے کشاں کشاں لے جا رہی تھی۔ اس کا رخ غار کے ایک تاریک گوشے کی طرف تھا۔

میں آگ کے دائرے میں' جاپ میں مشغول گوتم بھوش سے دور ہو رہا تھا۔ وہ حسینہ مجھے لے کر ایک تاریک کنج میں گھس گئی۔ یہاں سنگلاخ دیوار میں ایک دراڑ سی تھی اور جگہ اتنی کشادہ تھی کہ دو آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس حسینہ نے مجھے دونوں بانہوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس گپھا میں گھور تاریکی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے حسین و گداز بدن کا ایک ایک خط و خال مجھے نظر آ رہا تھا۔ میرے سامنے اس کے بیٹھنے کا انداز بھی بڑا خوفناک تھا۔

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ میرے اندر سنسنی کی لہریں پھیلتی گئیں اور خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ دماغ پر خمار سا طاری ہو رہا تھا۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس تاریک گپھا سے باہر دیکھا۔ گوتم بھوش مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے بانہوں سے پکڑ لیا۔

پہلے وہ سامنے بیٹھی تھی۔ اب میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کی حرارت میرے اندر آگ بھر رہی تھی۔ اس نے ایک بازو میری گردن کے پیچھے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے آہستہ آہستہ پیچھے دھکیلنے لگی۔ میں اس کی آغوش میں دراز ہوتا چلا گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لگتا تھا' مقناطیسی لہریں آنکھوں کے راستے میرے دل کی گہرائیوں میں اتری جا رہی ہوں۔ میں گہرائیوں میں ڈوبے جا رہا تھا۔ اس کا گرم گرم سانس میرے ہونٹوں سے ٹکرا رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ خوفناک چیخ مار کر میرے اوپر سے اٹھ گئی اور پشت کے بل پیچھے گری۔

وہ چیخ بہت خوفناک تھی۔ میرا دل دہل گیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ گردن گھما کر دیکھا تو وہ حسینہ زمین پر پڑی تھی اور ایک عورت اس کے سینے پر سوار تھی۔ اس نے خوب صورت لڑکی کا گلا دبوچ رکھا تھا اور پھر اس حسینہ نے بھی اپنے سینے پر سوار عورت کے گلے پر ہاتھ ڈال دیا۔

ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ ان دونوں کی خونخوار قسم کی غراہٹوں کے علاوہ ایسی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے سیکڑوں بدروحیں بین کر رہی ہوں۔

میں ابھی تک دوسری عورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی اور وہ اس حسینہ پر حاوی ہو رہی تھی جو مجھے کسی نئی دنیا کی سیر کرانے لے جا رہی تھی۔ مجھے حملہ آور عورت پر غصہ بھی آ رہا تھا جس نے عین وقت پر مداخلت کر کے کھیل کا رنگ بگاڑ دیا تھا۔

جب میں نے نیلگری کو دریافت کیا تھا تو مجھے وہ لمحات بھی یاد تھے جب اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کا لمس تو اب بھی مجھے یاد تھا۔ میں اس کے لیے خطرات سے ٹکراتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ کسی اور حسینہ کے روپ میں میرے سامنے آگئی تھی۔ شاید مجھے میری اب تک کی خدمات کا صلہ دینا چاہتی تھی لیکن یہ دوسری عورت... اس نے عین وقت پر کام بگاڑ دیا تھا۔

ان میں دھینگا مشتی جاری تھی۔ دوسری بھاری بھرکم عورت اس حسینہ پر حاوی ہو رہی تھی۔ اس نے حسینہ کے بال پکڑ لیے۔ حسینہ کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ دوسری عورت اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے سر کے اوپر اس طرح گھما رہی تھی جیسے وہ کوئی بھرپور حسینہ نہیں معمولی سی گڑیا ہو اور پھر اس نے اسے پوری قوت سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔

حسینہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ اس چیخ کی بازگشت پورے غار میں گونج رہی تھی۔ وہ حسینہ دیوار سے ٹکرا کر "بھد" سے زمین پر گری۔ حملہ آور عورت اس کے سینے پر پیر رکھ کر کھڑی ہوئی اور فاتحانہ انداز میں چیخنے لگی۔ میں اب بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

حملہ آور عورت کچھ دیر بعد حسینہ کے سینے سے اتر گئی اور اس نے بیٹھ کر ایک بار پھر حسینہ کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔

یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ زمین پر پڑی ہوئی حسینہ کا بدن سمٹنے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ہیت بھی بدلتی گئی۔

وہ سیاہ رنگ کی بلی تھی۔ لمبے بالوں والی ایسی بلیاں میں نے تھائی لینڈ میں بکثرت دیکھی تھیں۔ اس کے جسم کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کے منہ سے "میاؤں" کی خوفناک آواز نکلی اور وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔

حملہ آور عورت نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ پلٹ کر میرا ہاتھ پکڑا' ایک جھٹکے سے اٹھایا اور مجھے کھینچتی ہوئی اس گپھا سے باہر لے گئی۔ میں اب تک اس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا لیکن گپھا سے باہر آتے ہی اس کا چہرہ میری نظروں میں آگیا اور میں اچھل پڑا۔

وہ کاشی تھی! تنکو قبیلے کی سردار۔

"تت... تم...؟" میں ہکلا کر رہ گیا۔

"تم بال بال بچ گئے اجنبی۔" کاشی نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر وہ چڑیل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو تم جل کر بھسم ہو جاتے اور کسی کو تمہاری راکھ بھی نہیں ملتی۔"

"مگر وہ نیلگری...؟"

"وہ نیلگری نہیں تھی۔" کاشی نے میری بات کاٹ دی "نیلگری اب مکمل طور پر اس کے حصار میں ہے اسی لیے تمہارے گلے میں پڑی ہوئی مالا نے بھی اس وقت کام نہیں کیا۔ وہ بے بس و مجبور بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے اور یہ چڑیل..." وہ ایک لمحے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "گو تم بھوش بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہے صرف چند گھنٹوں کا سفر باقی رہ گیا ہے۔ تم اس کے سر پر پہنچ چکے ہو اور تمہیں روکنے کے لیے وہ اپنی تمام قوتوں کو کام میں لا رہا ہے۔ یہ اس کا بہت خوفناک حربہ تھا۔ حسین عورت... مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں جانتی ہوں عورت کے حوالے سے تمہارے دل میں کوئی میل نہیں ہے لیکن تمہارے ذہن کو مسخر کر دیا گیا تھا۔ تمہارے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر لی گئی تھیں۔ تم اس کے حسن و شباب کے سحر میں جکڑے گئے تھے۔ تم سفلی جذبات کے سیلاب میں بہنے والے تھے۔ وہ تم پر غالب آ رہی تھی۔ اگر اس کے ناپاک ہونٹ تمہارے ہونٹوں کو چھو جاتے تو تمہاری رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہو جاتی۔ گو تم بھوش تمہیں اس عورت کے ذریعے ناپاک کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ چڑیل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو تم جل کر راکھ ہو جاتے اور سب کچھ ختم ہو جاتا۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کاشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عورت کے معاملے میں مجھے اپنے کردار پر فخر تھا۔ صرف ایک مرتبہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی جس پر مجھے اب تک پچھتاوا تھا۔ سونیا کے بعد بھی کئی حسین سے حسین تر عورتیں میری زندگی میں آئی تھیں۔ روپ متی' بلا اور اب دھنو کئی مہینوں سے میرے ساتھ تھی۔ اسے بلاشبہ دنیا کی حسین ترین لڑکی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تلکو قبیلے میں ننگ دھڑنگ حسین عورتیں میرے سامنے پھرتی تھیں۔ کاشی ان میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ میں گھنٹوں اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھا رہتا تھا لیکن میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی ناپاک خیال بھی نہیں آیا تھا مگر... وہ خوب صورت چڑیل مجھے تباہی کے دہانے تک لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ صرف ایک ہلکا سا جھٹکا اور لگتا تو میں بقول کاشی' خاک ہو جاتا... راکھ کا ڈھیر بن جاتا لیکن عین وقت پر کاشی نے مجھے بچا لیا اور میرے لیے شدید حیرت کی بات یہ تھی کہ کاشی یہاں کیسے پہنچی!

"مجھے ثوبان کا پیغام ملا تھا۔" اس نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا تھا "وہ تمہاری مدد کے لیے خود اندر نہیں آنا چاہتا تھا۔ عبادت گاہ کے باہر بھی کسی ایک شخص کی موجودگی ضروری ہے اس لیے اس نے مجھے پیغام بھیج دیا اور میں بروقت یہاں پہنچ گئی۔ اگر مجھے..."

کاشی بولتی رہی لیکن اب میں اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ میں تو حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ کاشی کی بستی یہاں سے کم از کم دو دن کی مسافت پر تھی۔ میں راستے کی جن کٹھنائیوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا اس کا اندازہ مجھے تھا اور کاشی کہہ رہی تھی کہ اسے ثوبان کا پیغام ملا تھا اور وہ فوراً ہی یہاں میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔ میں عجیب سے چکروں میں پھنس گیا تھا۔

کاشی مجھے بدھا کے مجسمے کی طرف لے آئی۔ وہ مجسمے کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہو گئی اور عجیب و غریب زبان میں چیخ چیخ کر کچھ بولنے لگی۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک بھی لفظ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر اس نے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیے۔ چند لمحے بازو پہلوؤں میں لٹکائے کھڑی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کے نتھنوں سے خارج ہوتی ہوئی بھاپ صاف نظر آ رہی تھی۔

کاشی نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آؤ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس شیطان کو اس کے حصار سے باہر نکال سکیں۔"

میں اس کے ساتھ اس طرف آگیا جہاں گوتم بھوش آگ کے حصار میں کھڑا تھا۔ اس وقت میں نے اس میں پہلی مرتبہ ایک تبدیلی واضح طور پر محسوس کی۔ بالوں میں چھپے ہوئے اس کے ہونٹ پہلے سے زیادہ تیزی سے ہلنے لگے تھے اور چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ اس کے سوا اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے بدستور ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔

کاشی نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا پھر اس نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ لیے آنکھیں بند کر لیں اور ہونٹوں میں کچھ بدبداتی ہوئی آگ کے حصار کے گرد چکر لگانے لگی۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے بھی اپنے اندر کی قوتوں کو مصروف کر دیا اور دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے دل سے بے اختیار "اللہ ہو" کی پکار نکلی اور میں انہی مقدس الفاظ کا ورد کرنے لگا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا جاپ تھا۔ یہی حقیقی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ اس کے سامنے دنیا کی ساری قوتیں... ہیچ تھیں۔ میں آنکھیں بند کیے "اللہ ہو" کا ورد کرتا رہا۔

فضا اچانک ہی خوفناک چیخوں اور آہوں سے گونج اٹھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ عجیب و غریب قسم کی مخلوق کاشی کو گھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ واقعی عجیب مخلوق تھی۔ نہ انسان' نہ حیوان۔ ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کوئی انسان کی طرح دو ٹانگوں والا تھا لیکن اس کا سر کسی جانور کا تھا۔ کوئی جانور کی طرح چوپایہ تھا لیکن سر انسان کا تھا۔ چہروں کے نقش بے حد مکروہ اور خوفناک تھے۔ کسی کا سر اس کے جسم سے مختلف تھا۔ کسی کے بازو بالشت بھر سے زیادہ لمبے نہیں تھے اور کسی کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ چھت تک پہنچ رہے تھے۔

اگرچہ وہ سب کے سب عجیب الخلقت تھے لیکن ان میں ایک سب سے نمایاں اور الگ نظر آ رہا تھا۔ وہ انسان کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ جسم کا بالائی حصہ کسی چھوٹے جانور کی طرح تھا جو لمبے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور سر بیل کی طرح تھا لیکن آنکھیں حیرت انگیز طور پر چھوٹی تھیں جیسے آنکھوں کی جگہ بٹن ٹانک دیے گئے ہوں۔ ٹانگیں غیر معمولی طور پر لمبی لیکن بازو غیر معمولی طور پر چھوٹے تھے۔ میرا خیال ہے اس کا کوئی بھی بازو ایک فٹ سے زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ اس کا ایک بازو بری طرح جلا ہوا تھا۔ اوپر کی کھال تو بالکل ہی جل چکی تھی اور جلا ہوا گوشت دیکھ کر گھن آتی تھی۔ اس کے سر پر بھی بیل کی طرح سینگ تھے۔ ایک ایک فٹ لمبے اور نکیلے یہ سینگ آگے کو نکلے ہوئے تھے۔

یہ تمام حیوان نما انسان اور انسان نما حیوان کاشی کے آگے پیچھے ناچ رہے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے' چلا رہے تھے۔ ان کی خوفناک آوازوں سے فضا دہل رہی تھی لیکن کاشی کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہونٹوں میں کچھ بدبداتی ہوئی آگ کے دائرے کے گرد چکر لگاتی رہی۔

لمبے سینگوں اور بیل کی شکل والا وہ شیطونگڑا اچانک ہی سامنے کی طرف سے کاشی پر حملہ آور ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے کاشی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں اچانک ہی اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس شیطونگڑے کے اوپر گرا۔ وہ میرے ساتھ ہی گرا تھا لیکن حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ مجھ سے پہلے سنبھل گیا۔ میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے مجھے کئی شیطونگڑوں نے گھیر لیا۔ وہ قہقہے لگاتے اور چیختے چلاتے میرے گرد گھیرا تنگ کررہے تھے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ مجھے اپنا حصار نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی انسانوں سے دو بدو مقابلہ تو نہیں تھا جنہیں میں مار بھگاتا۔ یہ تو شیطانی قوتیں تھیں جو مجھے گھیرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

ان سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اپنے اندر کی قوت سے انہیں زیر کرنے کی کوشش کروں۔ میری کوتاہی سے کاشی کی زندگی بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔

وہ لوگ بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے لیکن کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر رک گئے۔ لمبے سینگوں والا شیطونگڑا بھی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اس کے جلے ہوئے بازو سے پیپ اور خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے منہ سے اچانک ہی بڑی خوفناک چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلنے والے شعلے میری طرف لپکے۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ شعلے پیچھے دیوار سے ٹکرائے۔ زوردار دھماکے ہوئے جیسے طاقت ور راکٹ داغ دیے گئے ہوں۔

غار کی دیواریں لرز اٹھیں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ میں نے اس شیطونگڑے کی طرف دیکھا اور مجھے ہنسی آگئی۔ وہ الٹا ہوا میں معلق تھا۔ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ وہ ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جھلا رہی ہو اور پھر وہ ہوا میں اڑتا ہوا کئی فٹ دور دیوار سے ٹکرا کر "بھد" سے نیچے گرا۔

میری نظریں اچانک ہی گوتم بھوش کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے جسم کے کسی حصے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ سرخ آنکھوں سے بے پناہ قہر ٹپک رہا تھا۔ اس نے سیدھا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک چھوٹی سی کوری ہنڈیا نجانے کہاں سے اس کے ہاتھ پر آگئی۔ ہنڈیا کے منہ پر کالا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ گوتم بھوش نے ہنڈیا کو اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ اس پر کچھ پھونکا اور اسے پوری قوت سے میری طرف اچھال دیا۔ ہنڈیا بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح میری طرف لپکی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر سیدھا ہاتھ آگے کردیا۔

ہنڈیا میرے ہاتھ سے ٹکرا کر رک گئی۔ میں نے گوتم بھوش کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ وحشت پھیل گئی تھی۔ میری نظریں فضا میں معلق ہنڈیا پر ٹک گئیں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ہنڈیا کو پکڑ کر پوری قوت سے گوتم بھوش کی طرف اچھال دیا۔

ہنڈیا زوردار دھماکے سے کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرائی۔ ایک دم ایسا شور اٹھا جیسے سیکڑوں بدروحیں بد رہی ہوں۔ گوتم بھوش کی آنکھوں میں وحشت بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ میری آنکھوں سے نکلنے والی لہریں نادیدہ دیوار سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح چنگاریاں نیچے گرتی رہیں جیسے لوہے کی شیٹ پر ویلڈنگ کرتے ہوئے چنگاریاں گرتی ہیں۔

کاشی بدستور اپنے عمل میں مصروف تھی۔ وہ گوتم بھوش کے حصار کو توڑنے کی کوشش کررہی تھی اور شیطونگڑے اسے روکنے کے لیے بار بار اس پر حملہ آور ہورہے تھے۔

لمبے سینگوں والا شیطونگڑا ایک بار پھر اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے نکلنے والے کئی سانپ میری طرف لپکے تھے لیکن یہ ناگ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہوگئے۔

اچانک مجھے اپنی گردن پر اس جگہ جہاں نیلگری کی مالا میرے بدن کو چھو رہی تھی..... حرارت کا احساس ہونے لگا۔ اس عبادت گاہ میں داخل ہونے کے کچھ ہی دیر بعد یہ مالا بالکل ٹھنڈی ہوگئی تھی جس کا مطلب تھا کہ نیلگری کو گوتم بھوش کی قوتوں نے مکمل طور پر بے بس کردیا تھا لیکن اب مالا میں یہ حرارت اس میں زندگی کی حرارت کا پتا دے رہی تھی۔

میں نے مالا اتار کر ہاتھ میں پکڑلی۔ پہلے اسے اپنے قریب آنے والے شیطونگڑوں پر کوڑوں کی طرح برساتا رہا۔ وہ مالا جس شیطونگڑے کے بدن کو بھی چھوتی وہ آگ کے شعلوں میں لپٹ جاتا۔

لمبے سینگوں والا شیطونگڑا بھی مالا کی زد میں آگیا۔ پہلی مرتبہ وہ بچ گیا تھا دوسری مرتبہ مالا کڑکتی اور لہراتی ہوئی آسمانی بجلی کی طرح اس کے جسم پر پڑی۔ اس کا جسم بھی آگ کے شعلوں میں لپٹ گیا۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر دوڑتا رہا پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی خوفناک چیخیں فضا کو دہلا رہی تھیں۔ آگ کے شعلے پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ گوشت جلنے کی بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی شیطونگڑے کی ہیت بھی بدلنے لگی اور بالآخر اس نے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کرلی۔

وہ پنڈت دھیراج تھا جس کی قوتوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ جلی ہوئی لاش کی صورت میرے سامنے پڑا تھا۔

"گوتم بھوش!" میں نے یوگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا کھیل ختم ہورہا ہے۔ جاپ ختم کرکے حصار سے باہر آجاؤ ورنہ تمہارا انجام بھی اس پنڈت سے مختلف نہیں ہوگا۔"

گوتم بھوش کا چہرہ قہر و غضب کی علامت بن گیا۔ میں جانتا تھا' اس قسم کے لوگ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتے۔ گوتم بھوش نے بھی اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ایک بار پھر مجھ پر بھرپور حملہ کردیا۔ کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھا کر پٹخ دیا۔ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں سنگلاخ دیوار سے ٹکراؤں گا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہوجائے گی لیکن میں دیوار سے ٹکرانے سے پہلے ہی فضا میں معلق ہوگیا اور پیروں کے بل اس طرح زمین پر گرا جیسے آٹھ دس فٹ اونچی دیوار سے ازخود چھلانگ لگائی ہو۔

گوتم بھوش نے ایک بار پھر ہاتھ سامنے کو پھیلا دیا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک ترشول نمودار ہوا جس کا دستہ اس نے مٹھی میں پکڑلیا اور ہاتھ سر سے بلند کرکے مجھ پر ترشول سے حملہ کرنا چاہا' اس کا ہاتھ تو بڑی تیزی سے نیچے آیا تھا مگر تیر کمان سے نہیں نکلا یعنی ترشول اس کے ہاتھ ہی میں رہا۔

گوتم بھوش نے ایک بار پھر ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا لیکن ترشول اس مرتبہ بھی اس کے ہاتھ ہی میں رہا۔ میری نظریں اس کے ہاتھ پر مرکوز رہیں۔ وہ بار بار ہاتھ کو جھٹکے دے رہا تھا لیکن ترشول اس کے ہاتھ سے نہیں نکل پا رہا تھا۔

یوگی گوتم بھوش کا چہرہ خوف و دہشت سے سیاہ پڑنے لگا۔ اس کے گرد دائرے کی آگ بھی ماند پڑ رہی تھی۔ اس کے حصار میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ حصار ٹوٹ رہا تھا۔ گوتم بھوش کی قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔

کاشی نے دائرے میں قدم رکھا تو جیسے زلزلہ سا آگیا۔ گڑگڑاہٹ کی مہیب آوازیں چاروں طرف سے سنائی دینے لگیں گوتم بھوش کا چہرہ بالکل سیاہ پڑگیا تھا۔ اس نے آخری بار میری طرف دیکھا اور مخالف سمت میں چھلانگ لگادی۔

"اجنبی!" کاشی چیخی "اسے روکو۔ اگر یہ بھاگ گیا تو غضب ہوجائے گا۔ ہم سب اس عبادت گاہ میں دفن ہوجائیں گے۔"

گوتم بھوش غار کی راہداری میں گھوم چکا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگادی۔ جب میں راہداری میں پہنچا تو گوتم بھوش غار کے اگلے حصے میں موڑ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا۔

گوتم بھوش کی ایک بہت بھیانک چیخ گونجی۔ اس کا شریر (جسم) ایک بہت بڑے شعلے میں تبدیل ہوگیا۔ وہ بری طرح چیخنے لگا۔ وہ چیخیں تھیں یا مہیب بادلوں کی گھن گرج..... اس کے ساتھ ہی ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے چٹانیں ٹوٹ رہی ہوں اور پھر گڑگڑاہٹ کی خوفناک آواز فضا میں ابھری اور گوتم بھوش سے چند گز آگے ایک بہت بڑی چٹان ٹوٹ کر گری۔

اس طرف آگے جانے کا راستہ بند ہوگیا۔ گرد و غبار نے سیاہ بادلوں کی طرح فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریکی اس قدر گہری ہوگئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس تاریکی میں وہ مہیب شعلہ تھا جو ادھر ادھر ناچتا پھر رہا تھا۔ گوتم بھوش کی بھیانک چیخوں اور بد روحوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں فضا کو دہلائے دے رہی تھیں۔ گڑگڑاہٹ اور چٹانوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مہیب آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"اجنبی! بھاگو۔ اس طرف....." کاشی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں پیچھے مڑ کر دوڑا۔ کاشی راستے میں کھڑی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور ہم دونوں دوڑتے ہوئے بدھا کے مجسمے والے ہال میں پہنچ گئے اور چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے کی چٹان مہیب آواز کے ساتھ چٹخنے لگی۔ چھت سے بڑے بڑے پتھر گرنے لگے۔ کاشی میرا ہاتھ پکڑے اسی طرف دوڑی۔ اس نے شاید یہ سوچا تھا کہ راستہ مکمل طور پر بند ہونے سے پہلے ہم باہر نکل جائیں گے لیکن ہم سے چند گز آگے ایک بہت بڑا پتھر چھت سے ٹوٹ کر گرا۔ اٹھنے والے گرد و غبار سے ایک بار پھر گہری تاریکی چھاگئی۔

کاشی کے ہاتھ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس کی آوازیں مختلف سمتوں سے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔

زمین کانپ رہی تھی۔ کسی جگہ پر قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں کہیں کھڑے ہونے کی کوشش کرتا تو لڑکھڑا جاتا۔

رونے اور بین کرنے کی خوفناک آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اسی لمحے گڑگڑاہٹ کی خوفناک آواز سن کر میں چونک گیا۔ غار کی چھت بیٹھ رہی تھی۔ میں ایک طرف بھاگا لیکن ایک بہت بڑے پتھر سے ٹکرا کر گر گیا۔ میں فوراً اٹھ کر دوسری طرف بھاگا۔ ادھر بھی راستہ بند تھا۔ کاشی کی چیختی ہوئی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی

محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے لیے کسی سمت کا تعین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سمت کا تعین کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ہر طرف راستہ بند تھا۔

چھت سے مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھر گرنے لگے۔ پہاڑ بیٹھ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف چھلانگ لگا دی لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے مجھے تھام لیا ہو۔ میں نے جس طرف چھلانگ لگائی تھی اس کی مخالف سمت ہوا میں اڑ رہا تھا۔

غار کی چھت بیٹھ گئی۔ چاروں طرف سے گڑگڑاہٹ کی خوفناک اور مہیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ہزاروں فٹ بلند پہاڑ زمین میں دھنس رہا ہو۔ اڑنے والے گرد و غبار سے گہری تاریکی چھا گئی۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ نادیدہ قوت مجھے کھینچے لیے جا رہی تھی اور پھر میں "دھب" کی آواز سے زمین پر گرا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور دوسرے ہی لمحے خوف سے کانپ اٹھا۔ ایک بہت بڑی چٹان میرے اوپر آ رہی تھی۔ میرے اور چٹان کے بیچ صرف چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میرے بچنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اسی وقت بے اختیار میرے دل سے "اللہ ہو" کی پکار بھی نکلی تھی۔

میں منتظر تھا۔ کسی بھی لمحے اوپر سے گرنے والی چٹان مجھے کچل سکتی تھی لیکن ان نازک لمحات میں کسی نے مجھے ایک طرف کھینچ لیا۔ میرے ذہن میں کاشی کا خیال ابھرا تھا۔ شاید اس نے مجھے پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ لیا تھا۔

گڑگڑاہٹ کی مہیب آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔ میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ خوفناک آوازیں بہت دیر تک سنائی دیتی رہیں اور پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ مہیب اور اعصاب شکن سناٹا جیسے اس دنیا میں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ قیامت گزر گئی ہو اور اس نے ہر چیز کو فنا کر دیا ہو۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا ہو۔ بڑا نرم و گداز لمس تھا۔ زندگی کی حرارت سے بھرپور۔ وہ ہستی کون ہو سکتی تھی؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی پیشانی پر تپتے ہوئے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا۔

مجھے وہ رات یاد آ گئی جب کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں مجھے کرسٹل کے مجسمے کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے ملے تھے اور میں کرسٹل کے ان ٹکڑوں کو گھر لے آیا تھا اور انہیں جوڑ کر ان کی "مزہم پٹی" کی تھی اور رات کے آخری پہر وہ مجسمہ دنیا کی حسین ترین عورت کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ نہیں.... وہ اس دنیا کی عورت نہیں تھی۔ وہ نیلگری تھی.... بلکوتی حسن کی مالک۔ وہ گوتم بھوش کی قوتوں کا شکار ہو رہی تھی اور میں نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ میری شکر گزار تھی اور رخصت ہونے سے پہلے اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ وہ ایسا ہی ناقابلِ فراموش کیف آگیں لمس تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ نیلگری تھی جس نے میرا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہی نہیں' پورا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس کے پورے وجود میں زندگی لہریں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں وجدان۔" نیلگری کے ہونٹ ساکت تھے لیکن اس کی سرگوشی جیسی سریلی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی "وہ شیطان ختم ہو گیا۔ تم نے ان طاغوتی قوتوں کو شکست دے کر مجھے بچا لیا۔ تمہاری نیت کے خلوص نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے' میں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔ تمہارے دشمن زیر پا ہوں گے اور فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی لیکن...."

"لیکن کیا نیلگری؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"لیکن تمہاری نیت میں معمولی سی کھوٹ بھی تم سے یہ سب کچھ چھین لے گی۔" نیلگری نے کہا "اور میں جانتی ہوں کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب شیطانی قوتیں پھر تم پر حملہ آور ہوں گی اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں گے۔ میں تمہاری ثابت قدمی کے لیے دعا کرتی رہوں گی لیکن یہ سب کچھ بہرحال تمہارے ہی اختیار میں ہوگا۔"

"تمہیں تو اب کوئی خطرہ نہیں نیلگری؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" نیلگری نے جواب دیا "صدیوں کے فاصلے تک کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جس میں یہ ساری کٹھنائیاں برداشت کرنے کی سکت ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم اپنا جاپ پورا کرلو۔ میں تمہاری کنیز بن کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاؤں گی۔"

میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی طرف سے کاشی کی آواز سنائی دی۔

"اجنبی۔ اجنبی۔ کہاں ہو تم....؟" وہ مجھے پکار رہی تھی۔

"میں جا رہی ہوں۔" نیلگری کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

نیلگری نے میرا سر آہستگی سے زمین پر ٹکا دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ چند لمحے میرے سامنے کھڑی رہی پھر جیسے ہوا میں تیرنے لگی۔ وہ سامنے نیلگری کی برف پوش چوٹی کی طرف جا رہی تھی اور پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"اجنبی! کہاں ہو تم....؟" کاشی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میں یہاں ہوں کاشی۔ اس طرف۔" میں نے چیخ کر جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں اس وقت بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ کے مرکزی دروازے کے سامنے موجود تھا۔ کاشی دہانے کے اندر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور دوڑتی ہوئی والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ نیم برہنہ' جوان اور حسین عورت مجھ سے لپٹی میری پیشانی اور میرے گالوں کے چٹاپٹ بوسے لیے جا رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور بدحواس سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے کسی نے ہمیں یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔

میری نظریں دوسری چٹان کی طرف اٹھ گئیں جہاں ثوبان کھڑا تھا۔ آنکھوں سے محروم اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ دونوں چٹانوں کے بیچ برف کا وہ پل اپنی جگہ موجود تھا جو آگ سے پگھل کر بہہ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ گہرائی میں اچھلتا اور جھاگ اڑاتا پانی بھی رواں دواں تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ جو کچھ بھی تھا' طاغوتی چکر تھا۔ پراسرار قوتوں کا کھیل تھا۔ مجھے روکنے کی کوشش تھی لیکن کوئی باطل قوت مجھے نہیں روک سکی تھی۔ میں اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گوتم بھوش' نیلگری کو حاصل کرنے کے لیے جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے جاپ سمیت اسے ختم کر دیا تھا۔ اس کی تمام پراسرار قوتیں مٹ گئی تھیں۔ وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان طاغوتی اور باطل قوتوں کے خاتمے کے ساتھ ہی ہر چیز معمول پر آ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر عبادت گاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دائیں بائیں چٹانوں پر بدھا کے ترشے ہوئے مجسمے جوں کے توں موجود تھے اور اوپر درمیان بدھا کا اسائلنگ مجسمہ بھی موجود تھا اور لگتا تھا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہو پھر میری نظریں کاشی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بھی سر تا پا پیکرِ مسکراہٹ بنی ہوئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو اجنبی؟" کاشی کے ہونٹ کچھ اور پھیل گئے۔

"کک.... کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا سا گیا۔

"نیلگری آزاد ہو گئی۔" کاشی کے لہجے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا "وہ آزاد تھی۔ آزاد رہے گی۔ بستی میں اس کی آزادی کا جشن منایا جائے گا۔ ایسا جشن جو اس سے پہلے کبھی نہ منایا گیا ہو۔ اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ جشن کی تیاری بھی کرنی ہے۔"

کاشی نے' بات ختم کرتے ہی فرطِ جوش میں ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر برف کے بل کی طرف چلنے لگی۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ دھوپ کی ترچھی کرنوں میں جمی ہوئی برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ کاشی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ہم اس برف پر اس طرح چل رہے تھے جیسے کسی پارک کی پختہ روش پر ٹہل رہے ہوں۔

ثوبان نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور ہمیں آغوش میں لینے کے لیے بانہیں پھیلا دی تھیں۔ میں اور کاشی دوڑ کر والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئے۔ ثوبان نے ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسے دیے اور پھر ہمیں اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

"تم مبارک باد کے مستحق ہو اجنبی۔ تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ نیلگری کی یہ برف پوش چوٹیاں تم سے بہت خوش ہیں۔ دیکھو.... دیکھو۔ یہ برفانی چوٹیاں کس طرح خوشی سے جھوم رہی ہیں۔"

اس نے ہاتھ سے ایک برف پوش چوٹی کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے وہاں کچھ دیکھ رہا ہو۔ میری نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔

نیلگری کی وہ برف پوش چوٹی ہم سے اب بھی ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھی اور چوٹی کے عین اوپر ایک دلچسپ منظر ہماری توجہ کا منتظر تھا۔ برف کے سفید گالے اڑ اڑ کر فضا میں پھیل رہے تھے اور اس طرح گردش کر رہے تھے جیسے رقص کر رہے ہوں۔ خوشی سے جھوم رہے ہوں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ برف کے گالے فضا میں ایک محدود حد تک تھے۔ چوٹی پر ہوا حالانکہ بہت تیز تھی لیکن وہ بکھر نہیں رہے تھے۔

وہ اڑتے ہوئے گالے سمٹتے گئے۔ آپس میں جڑتے گئے۔ وہ منظر بہت ہی دلفریب تھا جب ان برف کے روئی جیسے گالوں نے سمٹ کر ایک ہیولے کی صورت اختیار کرلی تھی۔

وہ نیلگری تھی جو برف پوش چوٹی پر والہانہ انداز میں رقص کررہی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ملکوتی مسکراہٹ تھی۔

یہ دلچسپ منظر کافی دیر تک میری نظروں کے سامنے رہا اور پھر برف کے' وہ گالے فضا میں بکھرتے گئے۔ نیلگری کا ہیولا بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

"اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے اجنبی۔"

ثوبان کی آواز سن کر میں اس طرف مڑگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کاشی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

"کاشی کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ۔ اب چلیں۔" ثوبان نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ میری بات کا جواب نہیں تھا لیکن مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ جس طرح نہایت پراسرار طور پر یہاں آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی تھی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے ثوبان کا ہاتھ پکڑلیا اور ہماری واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔

○☆○

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں خچر چھوڑے تھے۔ وہ خچر بڑے تنعلیق ثابت ہوئے تھے اور اب بھی اس جگہ کے آس پاس چر رہے تھے۔ رات اس جگہ گزارنے کے بعد ہم صبح سویرے ہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

واپسی کا سفر زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ ثوبان حسب معمول میری رہنمائی کررہا تھا۔ اس کا خچر مجھ سے چند گز آگے تھا۔ میں کسی وقت برابر پہنچ کر اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو معمول کے مطابق وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہ بڑھتا۔

دوسرے دن شام کے وقت ہم اس وادی میں پہنچ گئے جہاں بھیڑیوں کے غول نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میرا خچر بھی بڑے اطمینان سے چل رہا تھا اور میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کہیں پھر کسی طرف سے غولِ بیابانی نمودار ہوکر ہم پر حملہ نہ کردے لیکن میرے یہ خدشات بے بنیاد نکلے۔ وہ ایک طاغوتی چکر تھا جو ختم ہوچکا تھا اور اب اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ایک موقع پر میں اور ثوبان ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں اب بھی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی سامنے بھیڑیوں کا ایک غول نظر آیا۔ وہ تعداد میں دس بارہ تھے اور ایک ہی جگہ پر جمع تھے۔ میں نے بے اختیار اپنا خچر روک لیا۔

"چلے آؤ اجنبی۔" ثوبان نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں بلکہ ایک دلچسپ منظر تمہاری نظروں کا منتظر ہے۔"

میں نے خچر کو آگے بڑھا دیا۔ بھیڑیوں کے اس غول اور ہمارے درمیان تقریباً دو سو گز کا فاصلہ تھا اور جیسے جیسے ہم قریب پہنچ رہے تھے' وہ منظر واضح ہوتا جارہا تھا۔

وہاں کوئی لاش پڑی تھی جسے یہ بھیڑیے نوچ رہے تھے۔ بھیڑیے منہ اٹھا اٹھا کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور ہم جیسے جیسے قریب پہنچ رہے تھے' وہ بھیڑیے ایک ایک کرکے وہاں سے ہٹتے جارہے تھے۔

اور جب ہم قریب پہنچے تو وہ منظر واقعی بڑا خوفناک تھا۔ وہ ایک نہیں' تین لاشیں تھیں۔ انسانی لاشیں جو ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر پڑی تھیں۔ دو لاشیں مردوں کی تھیں اور ایک کسی عورت کی۔

میرا خیال تھا کہ انہیں بھیڑیوں کا شکار ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ بیشتر حصوں کا گوشت کھایا جاچکا تھا تاہم چہرے ابھی تک اس قابل تھے کہ انہیں شناخت کیا جاسکتا تھا۔ ان میں ایک شیواگ تھا۔ دوسرے آدمی کا چہرہ بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے بستی میں دیکھا تھا لیکن اس کا نام معلوم نہیں تھا اور وہ عورت..... وہ تو مجھ سے پنجہ بھی لڑا چکی تھی۔ اس شام بستی کے چوک میں مجھ سے کئی عورتوں نے پنجہ لڑایا تھا اور یہ عورت سب سے زیادہ جان دار ثابت ہوئی تھی اور یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے شباب کی جھلک دکھلا کر میرا ہاتھ زمین سے لگانے کی کوشش کی تھی۔

یہ سب بدی کے نمائندے تھے۔ انہوں نے سچائی اور سادگی کا راستہ چھوڑ کر شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع کردیا تھا۔ ان کا انجام دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔

آس پاس کی فضا میں شدید تعفن پھیلا ہوا تھا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے بھیڑیے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رو رہے تھے۔ کچھ بھیڑیے ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہمیں وہاں سے چلے جانے کو کہہ رہے ہوں۔

میں نے ثوبان کی طرف دیکھا۔ اس کا خچر مجھ سے کئی گز آگے جاچکا تھا۔ میں نے بھی اپنے خچر کو ہانک دیا۔

خچر کی ننگی پیٹھ پر سفر میری زندگی کا سب سے اذیت ناک تجربہ تھا۔ دو دن پہلے سفر میں گزرے تھے اور آج بھی دوسرے دن کی شام تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ اس کے بعد رات بھر سفر جاری رہا۔

صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہم ایک بار پھر رک گئے۔ میں خچر سے اتر کر ندی کے کنارے پر آگیا۔ جی بھر کے پانی پیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

صبح کا دھندلکا سا اجالا پھیلنے لگا تو میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب وہ جگہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میرے بائیں طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ کالی چٹان تھی جہاں نیلگری کے مشن پر روانگی سے پہلے ثوبان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر ٹہلنے والے انداز میں چلتا ہوا کالی چٹان کی طرف آگیا۔ ثوبان بھی میرے ساتھ اس طرف آگیا۔ چٹان کے دامن میں بہت گہرا کھڈ تھا۔ میں نے اس کھڈ میں جھانک کر دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ وہ کھڈ بہت لمبا چوڑا تھا اور ہزاروں فٹ گہرائی تک چلا گیا تھا اور اس میں لاکھوں کی تعداد میں ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں..... انسانی ہڈیاں۔ کئی ثابت ڈھانچے بھی نظر آرہے تھے۔

"یہ بستی کا قبرستان ہے۔" ثوبان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا "بستی کا کوئی فرد جب مرجاتا ہے تو اس کی لاش میٹھے مشروب میں نہلا کر اس کھڈ میں لڑھکا دی جاتی ہے۔ لاش پر موجود مٹھاس کی وجہ سے چیونٹیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے اس طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ بستی والوں کا عقیدہ ہے کہ کیڑے مکوڑے جتنی جلدی شریر (جسم) کو کھا جائیں گے' اس کی روح اتنی ہی جلدی عالمِ بالا میں واقع شانتی نگر میں داخل ہوجائے گی۔"

عالمِ بالا کا تصور دنیا کی قدیم قوموں میں بھی تھا اور یہ لوگ بھی اسے مانتے تھے۔ ہڈیوں کا یہ قبرستان دیکھ کر مجھے پارسیوں کا عقیدہ یاد آگیا۔

پارسیوں کا اپنے مرنے والوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ ان کا کوئی باقاعدہ قبرستان نہیں ہوتا۔ زمین سے کئی فٹ اوپر تک دیواریں کھڑی کرکے کنواں سا بنا دیا جاتا ہے جس پر آہنی سلاخوں کی چھت ڈال دی جاتی ہے۔ اسے دخمہ یا سکوت گاہ کا نام دیتے ہیں۔ مردے کو نہلا دھلا کر سلاخوں والے جنگلے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ مردار خور پرندے لاش کا گوشت کھاجاتے ہیں اور مردے کی ہڈیاں نیچے گرتی رہتی ہیں۔ مرنے والے اپنے کسی عزیز کو سفرِ آخرت پر روانہ کرنے کا یہ طریقہ اگرچہ نہایت ظالمانہ ہے لیکن بہرحال یہ ان کا مذہبی عقیدہ ہے۔ اپنے مردوں کو ٹھکانے لگانے کا یہی طریقہ تلکو قبیلے والوں نے بھی اپنا رکھا تھا۔ وہ اپنے مردوں کو اس گڑھے میں ڈال کر چلے جاتے تھے۔ چیونٹیاں' کیڑے مکوڑے اور جنگلی جانور اس کا گوشت نوچ کر کھاتے رہتے تھے اور ہڈیاں باقی رہ جاتی تھیں۔

اس گڑھے سے شدید قسم کی بو آرہی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ ہوا کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہیں رہ سکا اور دوبارہ ندی کے کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔

دن کی روشنی اب واضح ہوتی جارہی تھی۔ ثوبان بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر چلو سے چند گھونٹ پانی پیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر تک نتھنے پھلا پچکا کر فضا میں کچھ سونگھتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب چلو اجنبی۔ وہ سب لوگ وہاں سے جاچکے ہیں۔"

"کون لوگ کہاں سے جاچکے ہیں؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھا لیکن وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اچھل کر خچر پر بیٹھ گیا۔

میں بھی اپنے خچر پر سوار ہوگیا۔ اب ہماری منزل صرف دو کوس کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ تلکو قبیلے کی وہ بستی جہاں شوبھا اور دھنو میری منتظر تھیں۔ پتا نہیں' مارتھا بھی وہاں موجود تھی یا جاچکی تھی۔

منزل کی قربت کے احساس سے مجھ پر تھکن سی سوار ہونے لگی۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ جب منزل دور ہوتی ہے تو چلتے رہنے کا حوصلہ برقرار رہتا ہے لیکن جیسے جیسے منزل قریب آتی جاتی ہے' یہ حوصلہ بھی دم توڑنے لگتا ہے اور دل چاہنے لگتا ہے کہ پر لگ جائیں اور انسان اڑ کر منزل پر پہنچ جائے۔ میں بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور گہری نیند سو جاؤں۔

ثوبان کا خچر مجھ سے تقریباً دس گز آگے تھا۔ اس کا رخ بستی کی طرف نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ بستی کے باہر ہی باہر پہلو سے گزر کر جھیل کی طرف جانا چاہتا تھا۔

اس طرف جھیل کے کنارے پر دور تک شاہ بلوط کے درخت تھے۔ ہم بستی سے تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزرتے ہوئے جھیل کے کنارے درختوں میں پہنچ گئے۔ گزرتے ہوئے میں بار بار بستی کی طرف دیکھتا رہا۔ بعض جھونپڑوں کے دروازے بھی نظر آرہے تھے لیکن مجھے اس طرف کسی ذی

روح کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دیا تھا اگرچہ یہ بہت غیر فطری سی بات تھی کہ بستی کے کسی فرد نے اپنے جھونپڑے سے نکل کر ہماری طرف دیکھا تک نہیں تھا حالانکہ ہماری آمد پر تو بستی میں شور مچ جانا چاہیے تھا لیکن وہاں سناٹا تھا۔ گمبھیر سناٹا..... اس بستی سے زندگی کا نام و نشان تک مٹ گیا تھا۔ بستی بالکل سنسان تھی۔

میں خچر سے اتر کر درختوں میں چلتا ہوا جھیل کے کنارے پر آگیا۔ ثوبان مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ دائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی کشتی نظر آرہی تھی جس کی رسی کنارے کی جھاڑیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ میں ثوبان کے پیچھے پیچھے اس طرف چلنے لگا۔

ہم جیسے ہی کشتی کے قریب پہنچے' نجانے کہاں سے دو جوان لڑکیاں نمودار ہوکر ہمارے سامنے آگئیں۔ ان کے جسموں پر وہی لباس تھا۔ یاک کی کھال کا مختصر سا ٹکڑا سینے کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہا تھا اور زیریں حصے پر مختصر سا چمڑے کا اسکرٹ۔

ان دونوں لڑکیوں کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ ثوبان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی اور مجھے بھی باری باری ان کی طرف دیکھ کر مسکرانا پڑا۔

ثوبان نے اپنا ہاتھ ایک لڑکی کی طرف بڑھادیا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کشتی پر سوار کرانے لگی۔ ثوبان نے خطرناک ترین پہاڑی راستوں پر میری رہنمائی کی تھی اور کشتی پر سوار ہونے کے لیے وہ دو سروں کا محتاج تھا۔

دوسری لڑکی نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب تو مسکراہٹ سے ضرور دیا لیکن اس کا سہارا لینے کے بجائے خود ہی کشتی پر سوار ہوگیا تاہم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ بستی کے لوگ کہاں غائب ہوگئے تھے اور یہ خوب صورت لڑکیاں ہمیں کشتی میں سوار کرا کے کہاں لے جارہی تھیں۔ ثوبان جس طرح بستی سے پہلو بچا کر سیدھا اس جگہ آیا تھا جہاں یہ کشتی ہماری منتظر تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں کہیں اور جانا ہے۔ گویا اسے پہلے سے پروگرام کا علم تھا لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پہلے سے کیسے جانتا تھا!

کشتی کافی کشادہ تھی۔ آمنے سامنے دو سیٹیں تھیں اور ہر سیٹ پر تین آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ میں اور ثوبان ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں لڑکیاں کشتی کو دھکیل کر گہرے پانی میں لے آئیں اور اچھل کر کشتی پر سوار ہوگئیں۔ دونوں نے ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر چپو سنبھال لیے۔

انہیں اس طرح اپنے سامنے بیٹھے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسی وقت سورج طلوع ہوگیا۔ جھیل کے پانی میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ جھیل کے پرسکون پانی پر مچلتی ہوئی دھوپ کی سنہری کرنوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے الاؤ دہک رہے ہوں۔

کشتی کا رخ جزیرے کی طرف تھا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ہم اس ویران جزیرے پر کیوں جارہے ہیں۔ میں ان لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بستی کے بارے میں' بستی کے لوگوں کے بارے میں۔ شوبھا' دھنو اور مارتھا کے بارے میں مگر وہ دونوں لڑکیاں میرے سامنے جس پوزیشن میں بیٹھی تھیں انہیں دیکھ کر میرا پتا بھی پانی ہورہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلینے ہی میں عافیت سمجھی۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا اور کشتی جھیل کی پرسکون سطح پر بہتی رہی۔ چپوؤں کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں مسلسل میری سماعت سے ٹکراتی رہیں۔

شور کی آوازیں سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منظر میرے لیے واقعی دلچسپ تھا۔ ہماری کشتی جزیرے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ساحل پر سیکڑوں لوگ کھڑے خوشی سے چیخ رہے تھے۔

کشتی کا رخ چٹان کو تراش کر بنائے گئے اس گھاٹ کی طرف تھا جہاں ہجوم میں سب سے آگے اس قبیلے کی سردار کاشی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ دھنو' شوبھا اور مارتھا کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے سیکڑوں ننگ دھڑنگ عورتیں' مرد اور بچے بھی موجود تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ سب لوگ میرے استقبال کو آئے تھے۔ دو دن پہلے کاشی نے قبیلے کے لوگوں کو بتایا تھا کہ میں نے اس راکشش کو جلا کر بھسم کرڈالا ہے جو ایک خطرناک جاپ کے ذریعے نیلگری کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ کوہسار کی ملکہ نیلگری اب آزاد تھی۔ اسے اب صدیوں تک کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کاشی نے' ان پراسرار شیطانی قوتوں سے جنگ کا سارا کریڈٹ مجھے دیا تھا حالانکہ اگر خود کاشی اور ثوبان میری مدد نہ کرتے تو مجھے گوتم بھوش اور اس کی پراسرار قوتوں پر اتنی آسانی سے فتح حاصل نہ ہوتی۔ اس پراسرار جنگ میں میری کامیابی کی خوشی میں کاشی نے تین دن تک جشن کا اعلان کیا تھا اور جشن منانے کے لیے اس جزیرے کا انتخاب کیا گیا تھا۔ قبیلے کی ساری آبادی اس ویران جزیرے پر منتقل ہوگئی تھی لیکن اب یہاں ویرانی

نہیں رہی تھی۔ ہر طرف زندگی بھرپور انداز میں نظر آرہی تھی۔

مجھے جلوس کی شکل میں اس حویلی میں لے آیا گیا جہاں سے میں دھنو کو چھڑا کر لے گیا تھا۔ یہ حویلی اس وقت ویران تھی۔ آسیب کا بسیرا لگتی تھی لیکن اب یہاں زندگی سے بھرپور قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر طرف خوشیاں لوٹ رہی تھیں۔

دھنو' شوبھا اور مارتھا بھی میرے ساتھ تھیں۔ ان تینوں کے ساتھ بھی خصوصی مہمانوں کا سا سلوک کیا جارہا تھا۔

میری اور ثوبان کی آمد کے ساتھ ہی جشن شروع ہوگیا تھا۔ جزیرے پر جگہ جگہ کھیل تماشے ہورہے تھے۔ کرتب دکھائے جارہے تھے۔ کہیں پنجے لڑائے جارہے تھے اور کہیں دوسرے طریقوں سے زور آزمائی کے مقابلے ہورہے تھے۔ مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ کوئی بھی ان مقابلوں میں حصہ لے سکتا تھا۔ ہر گروہ کی خواہش تھی کہ میں اور کاشی دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ ان کے ارینا (اکھاڑے) کو رونق بخشیں۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہر جگہ رکتے اور مقابلوں میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ کئی جگہ مجھے بھی پنجہ آزمائی کے مقابلوں میں حصہ لینا پڑا۔

جزیرے پر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف دلچسپ کھیل تماشے ہورہے تھے۔ کوئی تنے ہوئے رسے پر چل رہا تھا' کوئی منہ سے آگ کے گولے نکال کر دو سروں کو حیران کررہا تھا اور کوئی بازی گری دکھا رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کو میں نے کانٹوں کی سیج پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ لکڑی کا ایک تخت تھا جس پر لاتعداد کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ ان کی نوکیں اوپر کی طرف تھیں اور وہ عورت نوک دار کیلوں کے بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی جیسے پھولوں کی سیج پر دراز ہو۔ ایک طرف اس سے بھی زیادہ دلچسپ کھیل دیکھنے میں آرہا تھا۔

لکڑی کا ایک چوڑا تختہ سیدھا کھڑا تھا۔ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی اس تختے کے ساتھ اس طرح چپکی کھڑی تھی کہ اس کے دونوں بازو ذرا سے ترچھے دائیں بائیں تختے پر پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک اور لڑکی کھڑی تھی جس کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے طشت میں تیز دھار خنجر رکھے ہوئے تھے۔ وہ شخص ایک ایک خنجر اٹھاتا' تختے کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف نشانہ باندھتا اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر لڑکی کے بدن سے ایک انچ کے فاصلے پر تختے میں پیوست ہوجاتا۔ اس طرح خنجر لڑکی کے چاروں طرف تختے میں پیوست ہوتے گئے۔ آخری خنجر تختے پر لگنے کے بعد اس شخص نے آنکھوں سے پٹی کھول دی۔ لڑکی بھی تختے سے ہٹ کر اس کے قریب آگئی اور وہ دونوں ایک ہاتھ اٹھا کر' داد طلب نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ کھیل تماشے دن بھر جاری رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ایک جگہ پر آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کردیا گیا۔ مختلف مقامات پر لنگر کا اہتمام بھی تھا۔ لوگ جیسے جیسے کھانا کھاتے جاتے' الاؤ کے گرد جمع ہوتے جاتے۔

ہم نے کھانا حویلی میں کھایا تھا۔ حویلی بھی خوب سجی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ باہر کا موسم اگرچہ نہایت خوشگوار تھا اور ہلکی سی خنکی بھی ہوگئی تھی لیکن حویلی کے اندر لاتعداد مشعلوں کی وجہ سے کچھ حدت سی ہوگئی تھی۔

جب ہم حویلی سے نکل کر الاؤ کے پاس پہنچے تو وہاں کھیل شروع ہوچکا تھا۔ لگتا تھا جیسے قبیلے کی پوری آبادی اس جگہ پر جمع ہوگئی ہو۔ الاؤ کے گرد بہت بڑا دائرہ تھا اور اس دائرے کے وسط میں تین لڑکیاں رقص کررہی تھیں۔ دو تین آدمی ڈھول بجا رہے تھے۔

رقص کے مظاہرے جاری رہے۔ مختلف لڑکیاں آتیں' اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور پھر ان کی جگہ دوسری لڑکیاں آجاتیں اور بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا جس کا لوگوں کو انتظار تھا۔

کاشی اپنی جگہ سے اٹھ کر میدان میں آگئی۔ آج اس کے جسم پر لباس بھی مختلف تھا۔ باریک لباس میں اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ اس نے ڈھول کی تھاپ پر رقص شروع کیا تو سناٹا سا چھا گیا۔ ڈھول کی تھاپ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر شخص کی نظریں کاشی پر مرکوز تھیں۔ رقص میں لمحہ بہ لمحہ تیزی آتی جارہی تھی۔

اچانک میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ ایک اور لڑکی ہمارے قریب سے اٹھ کر کاشی کے ساتھ رقص میں شریک ہوگئی تھی اور وہ کوئی قبائلی لڑکی نہیں تھی۔ وہ اپنی دھنو تھی۔

دھنو کو میں نے بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے قریب دریا کے کنارے پر رقص کرتے دیکھا تھا اور اب اسے کاشی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ قبائلی رقص بہت مختلف تھا لیکن لگتا تھا جیسے دھنو نے بھی اس میں مہارت حاصل کررکھی ہو۔

کاشی اور دھنو ایک دوسرے کے مقابلے پر تھیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ ان کے رقص میں تیزی آتی جارہی تھی۔

بڑا ہیجان خیز رقص تھا جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا

اور جب رقص ختم ہوا تو فضا لوگوں کے شور سے گونج اٹھی۔ مجھے تو دھونپر حیرت ہو رہی تھی۔ کاشی کے سامنے اس نے ایک لمحے کو بھی اپنے آپ کو اناڑی ثابت نہیں ہونے دیا تھا۔

رات کے آخری پہر اس روز کی تقریبات ختم ہو گئیں۔ ہماری رہائش کے لیے بھی حویلی ہی میں بندوبست کیا گیا تھا۔ اگرچہ حویلی میں کئی کمرے تھے لیکن میں نے دھنو اور شوبھا کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے کو ترجیح دی تھی اور ظاہر ہے' مارتھا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کمرے میں آکر ہم تو اپنی اپنی جگہ پر ڈھیر ہو گئے اور مارتھا اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔

جشن کے یہ ہنگامے تین دن تک جاری رہے۔ قبیلے والوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قبیلوں کی زندگی میں ایسے مواقع کبھی کبھار ہی آتے تھے اور اس جشن کو تو "نیلگری کی آزادی کا جشن" کا نام دیا گیا تھا۔

یہ جزیرہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ویران پڑا تھا۔ اس قبیلے کے لوگ اگرچہ توہم پرستی کا شکار تھے لیکن یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ شیواگ' دھنو کو اغوا کر کے اس جزیرے پر لے گیا تھا اور شیواگ اور اس کے چند ساتھیوں نے جزیرے کو اپنی بدمعاشیوں کا اڈا بنایا ہوا تھا' ان کے دلوں سے آسیب کا خوف نکل گیا تھا اور انہوں نے جزیرے کو پھر سے آباد کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کاشی نے بھی اب جزیرے پر واقع حویلی ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میرا کام ختم ہو چکا تھا اور میں اب جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کاشی اور قبیلے کے لوگ بضد تھے کہ ہم چند روز مزید یہاں رہیں۔

لیکن تا کے! بالآخر ہم وہاں سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ کئی کشتیاں تھیں جن پر قبیلے کے بہت سے لوگ سوار تھے۔ جس بڑی کشتی پر میں تھا اس میں دھنو' شوبھا' مارتھا اور کاشی بھی تھی۔ کشتیوں میں سوار لوگ اونچی آواز میں الوداعی گیت گا رہے تھے۔

میرے لیے حیرت کی ایک بات یہ تھی کہ جزیرے پر آنے کے بعد سے میں نے ثوبان کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی تقریب میں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کاشی سے اس کے بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ ٹال گئی تھی اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس سے نہیں مل سکا تھا۔

کشتیوں کا رخ قبیلے کی بستی کی طرف نہیں' جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف تھا۔ بہت بڑی جھیل تھی۔ کشتیوں کی رفتار اگرچہ خاصی تیز تھی لیکن اس کنارے تک پہنچنے میں تقریباً چار گھنٹے لگے تھے۔

جھیل کے اس کنارے پر دور تک گھنا جنگل تھا۔ کشتیوں سے اتر کر ہم جنگل میں پیدل چلنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو قد آدم جھاڑیوں اور درختوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ہم جیسے ہی ایک پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف پہنچے' میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

سامنے ہی درختوں کے جھنڈ میں ایک چشمہ تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر پانچ خچر گھاس چر رہے تھے اور چشمے کے قریب ایک پتھر پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ ثوبان تھا۔

میں دوڑ کر آگے بڑھا تو ثوبان نے بھی اٹھ کر بانہیں پھیلا دیں۔ میں والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ثوبان نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو نجانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ مجھے آنکھوں سے محروم اس شخص پر ترس بھی آیا اور بے حد پیار بھی۔ قدرت نے اسے بے پناہ صلاحیتیں بخشی تھیں لیکن وہ اس دنیا کی رنگینیاں دیکھنے سے محروم تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں ٹھہرے رہے۔ کاشی نے ہم سب کو گلے لگایا۔ مجھ سے لپٹ کر اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے وہ نیلگری کے ہونٹوں کا لمس ہو۔

ہمارے ساتھ آنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ ان کے سریلے نغموں کی آواز فضا میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم لوگ خچروں پر سوار ہو گئے۔ ثوبان کا خچر آگے تھا۔ ہم بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے رہے۔ کاشی اور قبیلے کے دوسرے لوگ ایک اونچی جگہ پر کھڑے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا اور بالآخر وہ لوگ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

مارتھا اور شوبھا' ثوبان کے حوالے سے پریشان تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آنکھوں سے محروم یہ شخص کہیں ہمیں موت کے منہ میں نہ دھکیل دے لیکن میرے دل میں ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا اور جب میں نے انہیں ثوبان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں بتایا تو انہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آیا تھا لیکن اس طویل سفر کے دوران میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ خود بھی انگشت بدنداں رہ گئیں۔

ہمارا سفر دن بھر جاری رہا۔ کبھی فلک بوس پہاڑ ہمارا راستہ روک لیتے اور کبھی نشیب میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی وادیاں ہمیں دعوت نظارہ دینے لگتیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم کملی ناتھ نامی ایک بستی میں پہنچ گئے۔

یہ بہت بڑی بستی تھی اور یہاں بھی بدھا کی ایک بہت بڑی عبادت گاہ تھی لیکن عبادت گاہوں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک عبادت گاہ ہی کے چکر میں کئی روز میری زندگی سے نکل گئے تھے۔ میں اصل راستے سے ہٹ کر کئی روز تک اس جھمیلے میں پڑا رہا تھا جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن مجھے بہرحال خوشی تھی کہ میری تپسیا رائگاں نہیں گئی تھی۔ میں کسی کے کام تو آیا تھا۔

مجھے وہ دن یاد تھا جب کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں کرسٹل کے مجسمے کے دو ٹکڑے ملے تھے اور یہ طاغوتی چکر اسی لمحے سے شروع ہو گیا تھا۔ اس سے اگلے روز گوتم بھوش سے آمنا سامنا ہو گیا تھا اور اس نے اپنی قوتوں کے شعبدے دکھانا شروع کر دیے تھے۔ اگر وہ میرے راستے میں نہ آتا تو شاید میں شوبھا اور دھنو کے ساتھ کھٹمنڈو سے جا چکا ہوتا لیکن گوتم بھوش کی اس پتنگ بازی سے نیلگری کی کہانی کھل کر سامنے آگئی اور میں نے وہ کام کر ڈالا جو دنیا کا کوئی اور شخص نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا قافلہ ثوبان کی رہنمائی میں بستی میں داخل ہو گیا۔ یہ بدھ مت لوگوں کی بستی تھی اور ثوبان ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جس طرف سے گزرتا' لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتے۔ ثوبان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آجاتی اور جواب میں وہ بھی ہاتھ ہلا دیتا۔

دریائے تھونگ کے قریب ہڈن ولی کی طرف جانے والی پختہ سڑک کے کنارے یہ بستی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایک قصبہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ بعض بازاروں کی سڑکیں بھی پختہ تھیں۔ ان بازاروں کو دیکھ کر کسی بہت قدیم بستی کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا اور میرا خیال ہے' یہ بھی کوئی قدیم بستی ہی تھی لیکن اس پر جدیدیت کی ہلکی سی چھاپ بھی نظر آرہی تھی۔ قہوہ خانے یا چائے خانے بکثرت تھے جن میں میزیں کرسیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

شام ہو چکی تھی۔ دکانوں میں لالٹین اور پیٹرومیکس قسم کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ یہاں ایسے لوگ بھی نظر آرہے تھے جنہوں نے پورے لباس پہن رکھے تھے اور ایسے لوگ بھی دکھائی دیے جن کے لباس تقریباً قبیلے کے لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

یہ قصبہ چونکہ شاہراہ پر واقع تھا اس لیے ہمالیہ اور مستانگ کی طرف جانے والے غیر ملکی سیاح یہیں سے گزرتے تھے۔ سیاحوں کی بعض پارٹیاں تو محض ستانے کے لیے گھنٹے دو گھنٹے یہاں رکتیں اور بعض پارٹیاں یہاں رات بھر کے لیے رک جاتی تھیں۔ بستی کے دکانداروں کو ان غیر ملکی سیاحوں کی وجہ سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

ان علاقوں کی طرف آنے والے سیاح عام طور پر گروپس کی صورت میں سفر کرتے ہیں۔ وہ کھٹمنڈو یا کسی قریبی بڑے شہر سے کوئی کوسٹر بس کرائے پر حاصل کر لیتے جس سے انہیں سفر میں بڑی سہولت مل جاتی تھی۔ خچروں پر سفر کرنے والے سیاح بھی اس طرف سے گزرتے رہتے تھے۔ قصبے میں کئی رہائشی ہوٹل اور سرائے تھیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو دیکھ کر ہوٹلوں کے مالک ان کی طرف لپکتے تھے۔ انہیں طرح طرح کی ترغیبات دی جاتی تھیں۔

جب ہم قصبے میں داخل ہوئے تو کچھ لوگ ہماری طرف بھی لپکے تھے لیکن ثوبان کو دیکھ کر ایسے لوگوں کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

ثوبان مختلف بازاروں اور گلیوں میں گھومتا ہوا ایک کشادہ گلی میں حویلی نما عمارت کے پھاٹک کے سامنے رک گیا۔ پھاٹک کے سامنے ایک دربان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ثوبان کو دیکھ کر اندر دوڑ گیا۔ اس کی واپسی میں تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی بھی تھا جس نے افریقہ کے کسی قبائلی جنگ جو کی طرح اپنے جسم پر ہتھیار سجا رکھے تھے۔ اس کا سر گنجا اور کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ وہ لام سوم تھا۔ اس بستی کا سردار۔

اس نے آگے بڑھ کر بڑے احترام سے ثوبان کو سہارا دے کر خچر سے اتارا پھر ہماری طرف بڑھا لیکن ہم خود ہی خچروں سے اتر گئے۔ لام سوم نے پھاٹک کے اندر کی طرف منہ کر کے چیخ کر کچھ کہا۔ چار پانچ خادم دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے خچران کے حوالے کیے اور لام سوم کے ساتھ حویلی کے برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بہت بڑی حویلی تھی۔ کئی کمرے تھے۔ ہمیں مرکزی ہال کمرے میں لے جایا گیا جہاں فرش پر یاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور بیٹھنے کے لیے بڑی بھدی سی لیکن آرام دہ بڑی بڑی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہمیں بڑے احترام سے کرسیوں پر بٹھا دیا گیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد مختلف سمتوں سے لوگ نمودار ہونے لگے۔ ان

میں مرد بھی تھے' عورتیں بھی اور بچے بھی۔ ان کی صورتوں میں چینیوں جیسی کچھ شباہت تھی۔ ان میں عورتیں زیادہ حسین تھیں۔ ان کے لباس بھی ایسے تھے کہ نظریں خود بخود ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ان سب نے باری باری آگے بڑھ کر پہلے ٹوبان کو اور پھر ہمیں گالوں پر بوسے دیے تھے۔ یہ مہمانوں کے استقبال کا ایک انداز تھا جو دنیا کی بیشتر قوموں میں رائج ہے۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا لگا دیا گیا۔ سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ ملازموں نے دسترخوان سمیٹ دیے۔ قہوے کا دور چلا پھر ٹوبان اٹھ کر چلا گیا۔ دن بھر کے سفر سے ہم بھی تھکے ہوئے تھے۔ میزبان لام سوم نے ہماری کیفیت کو محسوس کرلیا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر خادمہ کو اشارہ کیا جس نے ہمیں ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں بھی فرش پر یاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور چند کمبل بھی رکھے ہوئے تھے۔

ہم سب نے اپنے لیے جگہوں کا انتخاب کیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ ہم پر تھکن ضرور سوار تھی لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہم کمبلوں میں دبکے لام سوم کے بارے میں باتیں کررہے تھے کہ دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی پرکشش مسکراہٹ تھی۔ ہمیں اخلاقاً اٹھ کر بیٹھ جانا پڑا۔

وہ دونوں لام سوم کی بیویاں تھیں۔ ایک درمیانے قد کی اکہرے بدن کی مالک تھی جبکہ دوسری خاصی دراز قامت اور صحت مند قسم کی عورت تھی۔ اکہرے بدن والی عورت کا نام شیماتا اور دراز قامت والی کا نام کوری تھا۔ ان سے باتوں کے دوران میں پتا چلا کہ لام سوم کی تین بیویاں اور ہیں جو اسی قصبے میں کسی دوسرے مکان میں رہتی ہیں۔ گفتگو کے دوران میں یہ سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا کہ کوری مستانگ کی رہنے والی ہے اور اس کے دو شوہر اور بھی ہیں اور وہ دونوں مستانگ میں ہیں۔ کوری باری باری ایک ایک مہینہ ان تینوں کے پاس رہتی ہے۔

اس انکشاف پر شوبھا اور مارتھا معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کوری نے اس سلسلے میں کئی سنسنی خیز انکشافات کیے تھے۔ مستانگ کی اکثر عورتیں تین تین چار چار شوہر رکھتی ہیں۔ شوہر آپس میں کبھی نہیں لڑتے تاہم عورت پر سب سے زیادہ حق اس مرد کا سمجھا جاتا ہے جس سے عورت کی پہلی شادی ہوئی ہو۔ کوری نے یہ بھی بتایا کہ وہ تین دن بعد مستانگ جانے والی ہے۔ مارتھا نے فوراً ہی اس کے ساتھ پروگرام بنانا شروع کردیا۔ وہ تو پہلے بھی مستانگ ہی کی طرف جانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اب تو اسے ایک ایسی عورت مل گئی تھی جو اسے مستانگ قبیلے کے رسم و رواج کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی تھی۔

شیماتا اور کوری رات دیر تک ہمارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ ان کے جاتے ہی میں کمبل میں دبک گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

ہم اس قصبے میں دو دن رہے۔ اس دوران میں قصبے کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔ قصبے کے مرکزی چوراہے پر ایک بہت بڑا اسٹوپا تھا۔ اس کے قریب ہی بسوں کا اڈا بھی تھا۔ سب سے زیادہ رونق اسی چوراہے پر تھی۔ یہاں دن میں دو بسیں مستانگ ہائی وے کی طرف سے آتی تھیں اور دو ہی اس طرف جاتی تھیں۔ ان بسوں کے آمد و رفت کے اوقات بھی مختلف تھے۔

تیسرے روز صبح سویرے ہم اس قصبے سے رخصت ہوئے تو کوری بھی ہمارے ساتھ اس بس میں سوار تھی۔ تقریباً بیس میل کے فاصلے پر وہ گاؤں تھا جہاں سے ایک سڑک مستانگ کی طرف اور دوسری تتا پانی کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں گرم پانی کے چشمے تھے اس لیے اس بستی کا نام بھی تتا پانی تھا۔

ہم اس وقت سطح سمندر سے تقریباً چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ ہمارے چاروں طرف برف پوش چوٹیاں تھیں۔ سردی کی لہریں ہڈیوں کے گودے تک میں اترتی جارہی تھیں۔ کاک بنی نامی ایک بستی سے ہم نے مارتھا اور کوری کو مستانگ کی طرف جانے والی بس پر سوار کرا دیا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد ہم دوسری بس میں سوار تتا پانی کی طرف سفر کررہے تھے۔

مختلف بستیوں میں رکتے اور کھٹارا قسم کی بسوں میں سفر کرتے ہوئے ہم تین دن بعد پوکھارا پہنچ گئے۔ ہم صدیوں پرانی تہذیب سے نکل کر ترقی یافتہ دور میں آگئے تھے جو جگمگاتی روشنیاں تھیں' زندگی کے ہنگامے تھے۔ زندگی ہنگامے تو وہاں بھی تھے لیکن کتنا فرق تھا دونوں میں۔ جہالت کے اندھیروں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ اخلاقی قدروں کی پاسدار تھے اور جدید تہذیب کی جگمگاتی روشنیوں میں سانس لینے والے یہ لوگ اخلاقی اقدار کو پامال کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگاتے تھے۔

یہاں ایک ہوٹل میں ہمیں ایک بڑا فیملی روم مل گیا۔ ہم دو دن تک اس کمرے تک محدود رہ کر اپنی تھکن اتارتے رہے۔

اس سے اگلے روز صبح سویرے ہم کھٹمنڈو کے لیے روانہ ہوگئے لیکن کھٹمنڈو جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوپہر کے قریب جب بس تھان کوٹ کے اڈے پر رکی تو میں دھنو اور شوبھا کو اشارہ کرتا ہوا بس سے اتر گیا۔

بس اسٹاپ سے انسپکٹر برندرا کے بنگلے تک کا فاصلہ ہم نے پیدل ہی طے کیا۔ برندرا کے ملازم نے ہمیں پہچان لیا اور دروازے ہمارے لیے کھول دیے اور ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرنے لگا۔

کھانے کے بعد میں نے کھٹمنڈو میں پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا لیکن انسپکٹر برندرا آفس میں موجود نہیں تھا۔ میں نے پیغام دے کر فون بند کردیا۔

کئی روز بعد مرغن قسم کا کھانا کھایا تھا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں اٹھ کر اسی کمرے میں آگیا جہاں پہلے سویا کرتا تھا۔ ان دنوں اگرچہ اس بنگلے میں کسی کی رہائش نہیں تھی لیکن تینوں بیڈ رومز میں بستر بچھے ہوئے تھے اور ہر چیز صاف ستھری تھی۔ گویا ملازم ہڈ حرام نہیں تھا۔

بستر پر لیٹتے ہی میں سو گیا تھا۔

شام سات بجے کے قریب میں خود سے نہیں جاگا بلکہ شوبھا نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔

"کیا مصیبت ہے بھئی۔ سونے تو دو۔" میں نے کروٹ بدل لی۔

"انسپکٹر برندرا ایک گھنٹے سے بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کررہا ہے۔" شوبھا نے جواب دیا۔

برندرا کا نام سنتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دماغ پر اب بھی نیند کا خمار طاری تھا۔ میں نے سر کو ایک دو مرتبہ ہولے سے جھٹکا اور اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے میرے حواس ٹھکانے آگئے۔ نہاتے ہوئے میں نے ایک اور بات نوٹ کی تو چونک گیا۔ نیلگری کی مالا میرے گلے میں نہیں تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ نیلگری کی مالا اس وقت سے میرے گلے میں نہیں تھی جب سے ہم گوتم بھوش اور اس کی قوتوں کو تباہ کرکے نیلگری کی برف پوش چوٹیوں سے واپس لوٹے تھے۔ کئی روز سے میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا لیکن اب مجھے یاد آرہا تھا کہ گوتم بھوش کی قوتوں سے مقابلے کے آخری مرحلے میں' میں نے وہ مالا گوتم بھوش پر دے ماری تھی اور اس کے بعد مجھے اس مالا کا ہوش ہی نہیں رہا تھا اور کئی روز بعد اب احساس ہوا تھا کہ وہ مالا مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔

میں نے مالا کا خیال ذہن سے نکال کر کپڑے پہنے اور باہر آگیا۔ انسپکٹر برندرا اور شوبھا وغیرہ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی وہیں آگیا۔

برندرا بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملا۔ میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ برندرا کو تلکو قبیلے کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی۔ دھنو بھی خاموش بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ملازم نے ہمارے سامنے چائے سرو کردی میرا خیال تھا کہ وہ میرے ہی جاگنے کا انتظار کررہا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں باتیں ہوتی رہیں۔ انسپکٹر برندرا بتا رہا تھا کہ ناگ پال بھی ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔ اس کے کئی ساتھی پولیس کے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکے تھے۔ اس کے گروہ کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا تھا اور جو چینی (جنرل کھوراٹ) کے ایجنٹ نیپال میں قدم جمانے کی کوشش کررہے تھے ان کا بھی مکمل طور پر صفایا ہوگیا تھا۔ منشیات فروشوں کی چند چھوٹی چھوٹی پارٹیاں رہ گئی تھیں۔ انہیں بھی آہستہ آہستہ ختم کیا جارہا تھا۔ ان پارٹیوں میں زیادہ تر انڈیا سے آئے ہوئے ہندو تھے جو نیپال کو منشیات کی نئی منڈی سمجھ کر قدم جمانے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں بھی ناگ پال جیسے لوگوں کی آشیرباد حاصل تھی لیکن ناگ پال کی موت کے بعد یہ لوگ بھی یتیم ہوگئے تھے۔ یا تو یہ ملک چھوڑ کر واپس انڈیا جارہے تھے یا پولیس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے۔

یہ سب کچھ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں شوبھا کو دیش مکھ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا اور یہاں آکر میں موت کے ان سوداگروں سے الجھ گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ہیرو تو نہیں کہوں گا لیکن میرے توسط سے ایک ایسے گروہ کا خاتمہ ہوگیا تھا جو اس ملک کے پرسکون' امن پسند اور سیدھے سادے لوگوں کو جہنم میں دھکیلنے کی تیاری کررہا تھا۔

انسپکٹر اعظم خان کے بارے میں بات ہوئی تو برندرا نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ پہلے انڈیا واپس جاچکا ہے۔

"اب ہماری واپسی کا بندوبست بھی کرو۔" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "میں اب ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ چند روز وہاں رہ کر پاکستان چلا جاؤں گا۔"

"ہندوستان یا پاکستان کیوں؟" انسپکٹر برندرا نے میرے

چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "یہیں رہ جاؤ۔ یہاں تمہیں فرسٹ کلاس شہریت مل جائے گی اور تمہیں وہ ساری مراعات ملیں گی جن کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ زندگی بھر عیش کرو گے یہاں رہ کر۔"

"نہیں دوست۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں سیلانی آدمی ہوں۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہ سکتا اور پھر پاکستان میرا وطن ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے پرورش کہیں اور پائی' زندگی کہیں اور گزری لیکن میرا خمیر تو پاکستان کی مٹی سے ہی اٹھا تھا اور اب وہ مٹی مجھے پکار رہی ہے۔ اب میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ خواہ چند روز کے لیے ہی سہی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرے ماں باپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا تھا اور انہیں دیارِ غیر میں بھی نہیں جینے دیا گیا۔ میں ان لوگوں سے حساب برابر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے پہلے میرے ماں باپ کو اپنے پرکھوں (آباؤ اجداد) کی سرزمین چھوڑنے پر مجبور کیا پھر دیارِ غیر میں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں کئی بار پاکستان جانے کی کوشش کرچکا ہوں لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی مجبوری آڑے آتی رہی لیکن اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی مجبوری کو اپنے راستے کی دیوار نہیں بننے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" برندرا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ یہاں تم نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں۔"

"نہیں دوست۔" میں نے کہا "یہ میرا بوجھ ہے۔ میں اکیلا ہی اٹھاؤں گا۔ تم نے جس چاہت اور محبت کا اظہار کیا ہے' میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار رہوں۔"

اس کے بعد ہمارا موضوع بدل گیا۔ باتوں میں ساڑھے آٹھ بج گئے۔ برندرا گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"چلو۔ کھانا کھانے چلیں۔ ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ بڑے اچھے انڈین اور پاکستانی کھانے ملتے ہیں۔ وہ ریسٹورنٹ دراصل ایک پاکستانی ہی نے کھولا ہے۔"

"اتنی دور جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔" میں نے جواب دیا "یہیں کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔"

"چلو۔ یہیں سہی۔" برندرا نے کہا۔

اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم برندرا کی کار میں بیٹھ کر بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔

وہ ریسٹورنٹ بھی بہت اچھا تھا۔ کھانے کے بعد بھی ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔

آدھی رات کے قریب برندرا ہمیں بنگلے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ صبح گاڑی بھیج دے گا۔

صبح نہ صرف گاڑی آگئی بلکہ ڈرائیور نے ایک پھول دار بڈھا بھی میرے حوالے کردیا جو برندرا نے بھیجا تھا۔ اس میں بڑی مالیت کے کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

ہم گیارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ دن بھر کھٹمنڈو شہر میں پھرتے رہے۔ دوپہر اور رات کا کھانا بھی ہم نے ایک ہوٹل ہی میں کھایا تھا۔ جب ہم بنگلے میں واپس پہنچے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

گھر آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں سو چکا تھا۔

دو تین دن گزر گئے۔ برندرا ہمارے کاغذات تیار کروا رہا تھا۔ میں نے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کے بجائے بائی روڈ سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم نے رانی روپ متی' ٹھاکر بھانوت اور دوسرے دوستوں کے لیے بہت سارے تحائف خریدے تھے۔ برندرا نے بھی ہمارے لیے بہت سے تحائف خرید لیے۔ اس نے تحائف سے بھرے ہوئے دو سوٹ کیس ہمارے حوالے کردیے تھے۔

وہ دن بھی آگیا جب ہم نیپال کو الوداع کہنے کے لیے تیار تھے۔ انسپکٹر برندرا نے ایک ائر کنڈیشنڈ مائیکرو بس کا بندوبست کیا تھا۔ دو مسلح گارڈ بھی ساتھ تھے۔ انسپکٹر برندرا بھی ہمارے ساتھ جارہا تھا۔ صبح چھ بجے کے قریب مائیکرو بس بنگلے سے روانہ ہوئی اور اس کے ایک گھنٹے بعد تیز رفتاری سے پرتھوی ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

ہمارا راستہ وہی تھا جس سے اب تک میں کئی بار گزر چکا تھا۔ پرتھوی ہائی وے۔ یہ نیپال کی سب سے بڑی شاہراہ تھی جہاں ہر قسم کا ٹریفک سب سے زیادہ ہوتا تھا اور زیادہ آبادی بھی اسی ہائی وے کے آس پاس تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی بڑی لاتعداد بستیاں تھیں جہاں رہنے والوں کی زیادہ تعداد بدھ مت کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔

ہم گیارہ بجے کے قریب پوکھارا پہنچے۔ یہاں پولیس کا سارا ہی عملہ انسپکٹر برندرا کو جانتا تھا۔ چیف انسپکٹر کو بھی اطلاع ہوگئی اور وہ اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں ہم چائے پینے کے لیے تھوڑی دیر کو رکے تھے۔ ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ چائے پی کر آگے روانہ ہوجائیں گے اور دوپہر کا کھانا نارائن گھاٹ میں کھائیں گے لیکن چیف انسپکٹر نے ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے روک لیا اور وہ ہمیں محکمہ پولیس کے ریسٹ ہاؤس میں لے آیا۔ اس طرح ہمیں کچھ دیر آرام کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم تین بجے کے قریب پوکھارا سے روانہ ہوئے۔ چیف انسپکٹر نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا تھا۔

اب ہم سدھارتھ ہائی وے پر سفر کررہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے ہم شام سات بجے کے قریب تانا سین پہنچ گئے۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ عام طور پر ڈیڑھ دو گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے لیکن پہاڑی علاقوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں رکھی جاسکتی اس لیے یہ فاصلہ تقریباً دو گھنٹے میں طے ہوا تھا۔

تانا سین میں ہم صرف چائے پینے کے لیے رکے تھے۔ اس کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔ بٹوال وہاں سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور یہ فاصلہ ہم نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کرلیا۔

بٹوال پہاڑی سلسلے اور میدانی علاقے کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ خوب صورت قصبہ قدرتی مناظر کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک پہاڑی اور میدانی علاقے کے درمیان انڈین سرحد کے ساتھ ساتھ سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی ٹنک پور سے بھارتی سرحد میں داخل ہوجاتی ہے۔ اس سے آگے گاٹھ گودام اور نینی تال وغیرہ کے جنگلات شروع ہوجاتے ہیں۔ ہم اس راستے سے دیش بکھ کا پیچھا کرتے ہوئے نیپال میں داخل ہوئے تھے لیکن اب ہمیں ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے اتنا طویل راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بٹوال سے ایک سڑک بھیر ہوا سے ہوتی ہوئی انڈیا کی سرحد پر واقع لم بین قصبے تک چلی گئی تھی۔ یہ قصبہ مہاتما بدھ کا جنم بھومی (جائے پیدائش) تھا۔ بدھ دھرم میں اسے مقدس ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔ بٹوال سے لم بین کا فاصلہ بھی پچاس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ مہاتما کے نام سے موسوم یہ سڑک سدھارتھ ہائی وے کہلاتی تھی۔

بٹوال سے آگے میدانی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز و شاداب خطہ تھا یہاں چھوٹے چھوٹے دریاؤں اور ندی نالوں کی بھی بہتات تھی۔ اس ہائی وے پر اگرچہ اچھا خاصا ٹریفک تھا لیکن انسپکٹر برندرا کو تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

رات دس بجے کے قریب ہم لم بین پہنچ گئے۔ اس وقت بھی قدیم طرز کے اس قصبے میں بڑی رونق نظر آرہی تھی۔ ہر طرف پیلی چادروں میں لپٹے ہوئے گنجے سروں والے بھکشو نظر آرہے تھے۔

اس قدیم قصبے میں کچھ جدید اور ماڈرن طرز کی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ رہائشی ہوٹلوں کی بھی بہتات تھی۔ زیادہ تر ہوٹل سرائے قسم کے تھے جہاں ایک کمرے میں کئی کئی بھکشو رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔

سرحد یہاں سے چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ شام چھ بجے سرحد بند کردی جاتی تھی۔ اس لیے ہمیں رات لم بین ہی میں گزارنی پڑی۔ ہائی وے کے قریب ایک ہوٹل میں دو کمرے حاصل کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک کمرا شوبھا اور وھنو کو دے دیا گیا اور دوسرے کمرے میں برندرا اور میں آگئے۔

ہوٹل کی عمارت دو منزلہ تھی۔ سامنے کے رخ پر بہت وسیع لان تھا اور پچھلی طرف کچھ فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا جس کی دوسری طرف کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ ہمارا کمرا دوسری منزل پر تھا اور اس کی پچھلی طرف بھی ایک وسیع بالکونی تھی جہاں دو کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

وھنو اور شوبھا والا کمرا ہمارے سامنے تھا۔ وہ کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد سوگئی تھیں۔ میں اور برندرا دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر برندرا بھی سوگیا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ گزرے ہوئے واقعات فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انسانی زندگی بھی کیا چیز ہے۔ حضرتِ انسان کو کس مقصد کے لیے زمین پر بھیجا گیا تھا۔ زمین پر تو روزِ اوّل ہی سے فساد شروع ہوگئے تھے جس کی بنیاد عورت اور زمین ہی بنی تھی اور یہ فساد آج تک جاری تھے۔ یہ دنیا کئی مرتبہ تباہ ہو کر پھر آباد ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ اسے قدرتی آفات نے اجاڑا تھا اور کئی مرتبہ یہ خود انسانوں کے ہاتھوں اجڑی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور میرا دماغ چکراتا رہا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور کمرے میں پنکھا بھی چل رہا تھا لیکن مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں بستر سے اٹھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر بالکونی میں آگیا۔ چہرے سے ٹکرانے والا تازہ ہوا کا جھونکا بہت اچھا لگا۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سرگوشیوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ساتھ والے کمرے کی بالکونی میں دو بدھ بھکشو بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی شاید میری طرح نیند نہیں آرہی تھی۔

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور پیر سامنے

دوسری کرسی پر پھیلا لیے۔ سامنے دریا کے کنارے پر چند مکانات تھے۔ ایک دو جگہوں پر روشنی نظر آرہی تھی۔ باقی مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دریا کی دوسری طرف بہت دور کھیتوں میں بھی ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ویرانے میں کسی مزار پر کوئی دیا جل رہا ہو۔

میں اس ٹمٹماتی ہوئی روشنی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت اور سناٹا تھا اور اس سکوت میں میری سماعت سے وقفے وقفے سے ٹکرانے والی بھکشوؤں کی آوازیں بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھیں اور پھر وہ سرگوشیاں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔

میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میری نظریں اب بھی کھیتوں میں بہت دور ٹمٹماتی ہوئی اس روشنی پر مرکوز تھیں۔ پتا نہیں، کتنا وقت گزر گیا۔ دماغ پر غنودگی ہونے کے باوجود میں نے ایک مرتبہ بھی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔

دیے کی وہ ٹمٹماتی روشنی پھیلنے لگی۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس نے تاریکی کے ایک بڑے حصے کو اپنے حصار میں لے لیا۔ روشنی کے اس ہالے کے عین بیچ میں روشنی کا ایک اور نقطہ چمکنے لگا۔ چاندنی جیسی دودھیا روشنی کا یہ نقطہ بھی پھیلتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دودھیا روشنی ایک انسانی ہیولے کی صورت اختیار کرگئی۔

اب میری نظریں روشنی کے اس ہیولے پر مرکوز تھیں۔ میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔

چاندنی کا وہ ہیولا ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے جس کا ڈھیلا ڈھالا لباس ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھ رہے تھے۔

فاصلہ کم ہوتا گیا اور اس ہیولے کے چہرے کے نقوش بھی واضح ہونے لگے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

وہ نیلگری تھی۔

نیلگری کے ہونٹوں پر وہی ملکوتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی ستاروں جیسی چمک تھی۔ وہ میرے قریب آگئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"نیلگری کے دیش میں یہ تمہاری آخری رات ہے۔" اس کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی "میں تمہیں الوداع کہنے آئی ہوں اور تمہاری یہ امانت..." اس نے ایک ہاتھ آگے کردیا۔ مخروطی انگلیوں میں وہی مالا لٹکی ہوئی تھی "اسے تم بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ گومپو ہی میں بھول آئے آؤ۔ میں اسے تمہارے گلے میں پہنا دوں۔ یہ تمہیں ہ یاد دلاتی رہے گی۔ کبھی ملنے کو دل چاہے تو اس کا بڑا چھ میں ڈال کر چوس لینا۔ ویسے میں تمہارے آس پاس ہی ر گی۔ اچھا ہوگا کہ تم اپنا جاپ مکمل کرلو۔ میں ہمیشہ کے تمہاری ہوجاؤں گی۔ لو... اب یہ گلے میں پہن لو۔"

میں بے اختیار ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میں کچھ چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا نیلگری نے وہ مالا اپنے ہاتھوں سے میرے گلے میں پہنا وہ سیدھی ہوکر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا اور آگے جھک کر میری پیشا بوسہ ثبت کردیا۔ ایک عجیب سا سرور مجھ پر طاری ہ چلا گیا۔ نیلگری سیدھی ہوگئی۔

"میں چلتی ہوں۔" اس کی سرگوشی ابھری اور وہ اپ قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔

نیلگری ایک بار پھر روشنی کے اس ہالے میں داخ ہوگئی۔ اس کا چہرہ اب بھی مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ اس ہونٹوں پر اب بھی بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ چاندنی وجود سمٹنے لگا اور بالآخر ایک نقطے میں تبدیل ہوکر ننگا ہوں۔ اوجھل ہوگیا۔ زرد روشنی کا ہالہ بھی سمٹتے ہوئے دیے ٹمٹماتی ہوئی لو میں تبدیل ہوگیا۔

اپنے کندھے پر بوجھ محسوس کرکے میں چونک گیا۔ کو مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میں بالکونی میں کر پر بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا اور اسسٹنٹ بریندرا مجھے جگا رہا تھا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سامنے دور تک سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آرہے تھے اور وہ جگہ جہاں میں نے دیا جلتے دیکھا تھا، وہاں ایک چھوٹا سا مکان نظر آرہا تھا۔

"چھ بج رہے ہیں۔" بریندرا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اٹھ کر تیار ہوجاؤ تو ناشتا کرلیں۔"

کرسی سے اٹھتے ہوئے میرا ایک ہاتھ غیر ارادی طور میرے گلے پر پہنچ گیا اور دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ نیلگری کی مالا میرے گلے میں موجود تھی۔

ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

اطمینان سے تیار ہوکر ہم نے ناشتا کیا اور دس بجے قریب سرحد کی طرف روانہ ہوگئے۔ بارڈر پر پہنچنے میں ہمیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

سرحدی چوکی کے محافظ بھی انسپکٹر بریندرا کی جان پہچان کے نکلے۔ چوکی کا انچارج کئی سال پہلے گھنٹنڈو میں رہ چکا تھا۔ اس نے بریندرا کو پہچان لیا اور ہم سب کو گاڑی سے اتار کر چوکی کے ریسٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں پہلے مشروبات اور پھر چائے وغیرہ سے ہماری واضع کی گئی۔

ہمارے پاس اچھا خاصا سامان تھا۔ چوکی کے محافظوں ہی نے ہمارا سامان اٹھا کر نو مینز لینڈ پر رکھ دیا۔ انسپکٹر بریندرا نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا اور ہم اپنا سامان اٹھا کر سرحد کی دوسری طرف آگئے جہاں ہمارا واسطہ بھارتی چوکی کے محافظوں سے پڑا۔ ہمارے سامان میں اگرچہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قانون کی زد میں آتی ہو لیکن بھارتی چوکی پر امیگریشن اور کسٹمز کے اہلکاروں کا رویہ مختلف تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم ان سے جان چھڑا سکے تھے۔

چوکی سے نکلتے ہی ہمیں بس مل گئی جس نے ہمیں گورکھ پور پہنچادیا۔ ہم نے وہ دن اور اس کے بعد کی رات گورکھ پور ہی میں گزاری اور اگلے روز صبح سویرے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوگئے اور لکھنؤ اور کانپور ہوتے ہوئے شام کے قریب آگرہ پہنچ گئے۔ اگرچہ شام کے بعد بھی آگرہ اور جے پور کے درمیان بسوں وغیرہ کی آمد و رفت جاری رہتی تھی لیکن یہ رات ہم نے آگرہ میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

دھنو کے لیے یہ سفر خاصا دلچسپ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی عمارتیں صرف گھنٹنڈو میں دیکھی تھیں لیکن یہاں بڑے شہروں کے بیچ سفر کرتے ہوئے فلک بوس عمارتیں دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں۔ اس کے لیے سب سے حیرت انگیز چیز ٹرین تھی۔ نیپال میں تو ٹرین کا تصور ہی نہیں تھا۔ گورکھ پور سے لکھنؤ تک ہم نے ٹرین ہی میں سفر کیا تھا اور اس سے آگے آگرہ تک کا فاصلہ بسوں میں طے ہوا تھا کیونکہ ٹرینوں کی آمد و رفت کے اوقات مقرر تھے اور بس کسی بھی وقت مل سکتی تھی۔

آئندہ روز ہم آگرہ سے دہلی پہنچ گئے۔ رات دہلی میں گزارنے کے بعد دوسری صبح ہم جے پور جانے کے لیے "پنک سٹی ایکسپریس" میں سوار ہوگئے۔ مذکورہ ٹرین جے پور اور دہلی کے درمیان چلتی تھی اور دو سو ستر کلومیٹر کا یہ فاصلہ پانچ گھنٹے میں طے کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر موجود ایک قلی نے ہمارا سامان ایک بوگی میں پہنچادیا۔ وہ چھ مسافروں کا کمپارٹمنٹ تھا۔ دو مسافر پہلے سے موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی جس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی جس نے شوخ رنگوں والا راجستھانی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سر پر چنری تھی لیکن اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ بوڑھے نے اس کے پہلو میں کہنی سے ٹھوکا مارا تو اس نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا اور کھڑکی کی طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ بوڑھا بھی سرک کر اس کے ساتھ جڑ گیا۔ میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ جوان لڑکی اس بوڑھے کی بیوی تھی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ میں دوسری سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس طرح وہ لڑکی میرے سامنے تھی۔ بوڑھا اپنی سیٹ پر بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا اور لڑکی کو کہنیاں مار رہا تھا۔ میں اس کی بے چینی کی وجہ سمجھ گیا اور اس سیٹ سے اٹھ کر دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ کھڑکی والی سیٹ پر میں نے دھنو کو بٹھادیا تھا۔

وہ دونوں بھی جے پور ہی جارہے تھے۔ میں نے راستے میں بوڑھے سے دوستی کرلی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ یہ لڑکی اس کی تیسری بیوی ہے۔ دو بیویوں کا وہ اپنے ہاتھوں سے کریا کرم (آخری رسومات) کرچکا ہے اور یہ تیسری شادی اس نے دو مہینے پہلے کی تھی۔ وہ تیتھورا بیوی کو اس کے میکے والوں سے ملوانے کے لیے جارہا تھا۔ اس کا پروگرام ایک ہفتہ وہاں رہنے کا تھا اور اس نے بیوی کو اپنے ساتھ ہی لے کر واپس جانا تھا۔ اس بوڑھے کی صحت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ لڑکی ودھوا (بیوہ) نہیں ہوگی بلکہ یہ بوڑھا ہی اپنی اس تیسری بیوی کی چتا کو بھی اپنے ہاتھوں سے آگ لگائے گا۔

ٹرین جے پور پہنچ گئی۔ ٹرین رکتے ہی پلیٹ فارم پر افراتفری سی مچ گئی۔ بہت سے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بوڑھے اور اس کی نئی نویلی دلہن کے استقبال کے لیے بھی کچھ لوگ موجود تھے لیکن ہمارے استقبال کے لیے کوئی نہیں تھا۔ میں نے روپ متی یا ٹھاکر بھانوت کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ بہت عرصے سے میرا ان سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ گورکھ پور پہنچنے کے بعد پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ فون پر انہیں اطلاع دے دوں پھر یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ میں اچانک ان کے سامنے آکر انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

شوبھا کا خیال تھا کہ اس کے مکان پر چلا جائے لیکن میں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس کا مکان کم از کم چھ مہینوں سے بند پڑا تھا۔ وہاں تو اب مکڑیوں نے جالے تان رکھے ہوں گے۔

"روپ متی کے ہاں چلتے ہیں۔ اس وقت وہ گھر پر ہی

ہوگی۔ ٹھاکر کو بھی ہم وہیں بلالیں گے۔" میں نے کہا۔

اسٹیشن سے باہر آکر سامان ایک ٹیکسی پر لدوا دیا گیا۔ میں نے ڈرائیور کو روپ متی کی حویلی کا بتا دیا اور آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دھنو اور شوبھا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

حویلی کے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکی تو اسی وقت گیٹ کا ذیلی دروازہ بھی کھلا۔ وہ مندری تھی جو باہر نکل کر الجھی ہوئی نظروں سے ٹیکسی پر لدے ہوئے سامان اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شوبھا اور دھنو کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر ابھی تک اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں دروازہ کھول کر نیچے اترا تو مجھے دیکھتے ہی مندری کا منہ اس طرح کھلے کا کھلا رہ گیا جیسے اس نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو پھر دوسرے ہی لمحے وہ چیختی ہوئی اندر کی طرف دوڑ گئی۔

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ لان میں کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ مندری کو چیختے پاکر وہ سب مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک عورت جھٹکے سے کرسی سے اٹھی۔ اس نے شان دار ساڑی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے ساڑی سنبھالے دوڑتی ہوئی میری طرف لپکی اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ روپ متی تھی۔

روپ متی کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ وہ بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ لان میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اٹھ کر ہماری طرف آگئے لیکن وہ سب چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

روپ متی نے دھنو اور شوبھا کا استقبال بھی بڑے پرجوش انداز میں کیا تھا۔ دونوں ملازم بھی بھاگے آئے تھے۔ ان میں ایک شنکر تھا جو ٹھاکر کی ٹیلے والی حویلی میں ہماری خدمت پر مامور تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے اچنبھا سا ہوا تھا لیکن جب میں نے دوبارہ روپ متی کی طرف دیکھا تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا۔

"میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ ٹھاکر کہاں ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی فون کرتی ہوں۔ وہ بھاگا ہوا آئے گا۔" روپ متی نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی "بلا کہاں ہے؟"

"بلا!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ بلا کو میرے ساتھ نہ دیکھ کر یہ سوال ضرور کیا جائے گا

"مجھے افسوس ہے روپ متی۔ میں بلا کی حفاظت نہیں کرسکا۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔"

"اوہ!" روپ متی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی "تم لوگ اندر تو آؤ۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں کہ سب کو یہیں روک رکھا ہے۔ شنکر! سامان اتارو اور ٹیکسی والے کو فارغ کردو۔" اس نے آخری الفاظ شنکر سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

دوسرا ملازم جسونت تھا۔ ان دونوں نے مل کر سامان اتارلیا ٹیکسی والے کو کرایہ بھی جسونت نے ادا کردیا تھا۔ ہم لوگ لان میں آگئے۔

"میرے دوستو!" روپ متی اپنے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "میں آپ حضرات سے ایک ایسی ہستی کا تعارف کرانا چاہتی ہوں جس کا تذکرہ ہم تھوڑی دیر پہلے بھی کررہے تھے۔ مجھے اور ٹھاکر کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اس ہستی کا بھی بڑا دخل ہے' تو ان سے ملئے۔ یہ ہیں ہمت سنگھ۔ میرے محسن اور مہمان دوست!"

سب لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان میں تین عورتیں اور چار مرد تھے۔ سب نے پہلے ہاتھ اٹھا کر پرنام (مخصوص سلام) کیا پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ایک خاتون تو میرے چرن (پاؤں) چھونے کو بھی جھک گئی تھی۔

ہم وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے شوبھا اور دھنو کا تعارف کرایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس دوران میں سب لوگ بڑی گہری نظروں سے دھنو کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی۔" روپ متی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "فی الحال صرف یہ بتاؤ کہ کہاں سے آرہے ہو اور تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"اگر اطلاع دے دیتا تو ملاقات میں اتنا مزہ تو نہ آتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تم بتاؤ۔ یہ "واردات" کب ہوئی؟" میں نے اس کی مانگ میں بھرے ہوئے سیندور کی طرف دیکھا۔

"اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے دو ہفتے مزید انتظار کیوں نہیں کرلیا۔" روپ متی نے جواب دیا "تم بھی ہمارے بیاہ میں شریک ہوتے تو رونق بڑھ جاتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب رونق میلا کریں گے۔" میں نے کہا۔

مندری ہمارے لیے چائے لے آئی۔ اس کی خوشی بھی قابلِ دید تھی۔ اس نے ہمارے سامنے چائے رکھی اور روپ

متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے جیجا جی (بہنوئی) کو فون کردیا ہے دیدی۔ (باجی) وہ آنے ہی والے ہیں۔"

"مندری کی بچی!" روپ متی چیخی "تم نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ میں ٹھاکر کو فون کرکے کوئی ایسی بات کہتی کہ وہ چکرا جاتا اور یہاں آکر ہمت سنگھ کو دیکھتا تو مارے خوشی کے بے ہوش ہوجاتا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ سارا مزہ کرکرا کردیا۔"

مندری ہنستی ہوئی چلی گئی۔ روپ متی پہلے بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اسے چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی تھی اور اب شاید وہ ایک دوسرے کے کچھ اور قریب آگئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مندری اس کی ملازمہ ہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹھاکر بھی آگیا۔ اس کے ملنے کے انداز میں بھی گرم جوشی نمایاں تھی۔ وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتانے لگا کہ میں کون ہوں جبکہ روپ متی انہیں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ٹھاکر، شوبھا سے بڑی گرم جوشی سے ملا تھا۔

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اب تک کے طویل سفر کی دھول نے ہمارے حلیے بگاڑ رکھے تھے اور کسی کو بھی ہماری حالت کا خیال نہیں آیا تھا۔ بالآخر میں نے ہی ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔

"اگر اجازت ہو تو ہم اپنے حلیے درست کرلیں؟"

"ارے۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔" روپ متی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی "آؤ۔ آؤ۔ اندر چلو۔ میں تم لوگوں کو غسل خانوں کا راستہ دکھاؤں۔"

ہم روپ متی کے ساتھ حویلی میں آگئے۔ ہمارا سامان پہلے ہی اندر پہنچایا جاچکا تھا۔ شوبھا اور دھنو نے اپنے اپنے بیگ کھول لیے اور میں اپنے بیگ سے کپڑے نکال کر ایک کمرے میں گھس گیا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد میں تیار ہو کر باہر نکلا۔ روپ متی اور ٹھاکر اس وقت بھی لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے مہمان جاچکے تھے۔ ٹھاکر اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ایک گھنٹا پہلے کی ملاقات سے شاید اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شوبھا اور دھنو بھی آگئیں۔ ان دونوں نے ساڑیاں پہنی تھیں۔ دھنو سڈول جسم اور دراز قامت کی مالک تھی۔ سرخ و سفید رنگت پر نیلے رنگ کی ساڑی اس پر خوب جچ رہی تھی۔ ٹھاکر بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے بھی بلا کے بارے میں سوال کرڈالا۔ میرے خیال میں روپ متی اسے بتا چکی تھی کہ بلا اب ہم میں نہیں رہی۔

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔"

ٹھاکر نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ مندری نے آکر یہ کہ کھانا لگ چکا ہے۔ ہم لان سے اٹھ کر اندر آگئے۔ بڑی چوڑی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ مندری نے مختصر سے وقت میں بڑا زبردست اہتمام کرڈالا تھا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد ٹھاکر مجھے لے کر اٹھ گیا اور روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم لوگ گپ شپ کرو۔ ہم ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔"

ہم دونوں حویلی سے باہر آگئے۔ گیٹ کے سامنے ٹھاکر کی شان دار کار کھڑی تھی۔ میں پسنجر زسیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹھاکر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ کار حرکت میں آکر ایک گلیوں میں گھومنے کے بعد مین روڈ پر آگئی۔

میں بہت عرصے بعد جے پور آیا تھا۔ وہی کوچے بازار تھے، وہی رونق تھی، وہی کشادہ سڑکیں اور ان سڑکوں پر دوڑتی گھماگھمی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا مگر مجھے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔

کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی ایم آئی روڈ پر آکر ایک خوب صورت دو منزلہ بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ گراؤنڈ فلور پر وہی کافی ہاؤس تھا جہاں سونیا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ شوبھا والا کافی ہاؤس تھا۔ میں نے کار سے اترتے ہوئے بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ نیا رنگ و روغن کیا ہوا تھا۔ اوپر کی منزل میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔ سامنے کے رخ جہازی سائز کے ٹنٹڈ گلاس لگے ہوئے تھے۔ اس شیشے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں صرف ایک طرف سے دیکھا جاسکتا ہے۔

ہم اندر آگئے۔ یہ ہال بھی پہلے سے خاصا وسیع ہوگیا تھا۔ غالباً پچھلا پورشن بھی ہال میں شامل کرلیا گیا تھا۔ داخلی دروازے کی بائیں طرف ذرا آگے اوپر جانے کا زینہ تھا جو سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ہم اوپر آگئے۔

اوپر بھی ایسا ہی وسیع ہال تھا۔ مناسب فاصلوں پر بیٹھنے کی بھی ہوئی تھیں۔ یہ گول میزیں عام میزوں سے اونچائی میں کم تھیں اور ان کے گرد رکھی ہوئی کرسیاں اتنی آرام

دہ تھیں کہ گھنٹوں بیٹھا جاسکتا تھا۔ روشنیوں کا انتظام بھی بہت عمدہ تھا۔ کہیں بھی تیز روشنی نہیں تھی۔ دیواروں سے مدھم موسیقی کی لہریں پھوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ یہ ہال بھی نچلے ہال کی طرح ائر کنڈیشنڈ تھا اور زیریں ہال کی طرح یہاں بھی کوئی میز خالی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گاہکوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

ہم زیریں ہال میں آگئے۔ کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹھاکر کو دیکھ کر اٹھنا چاہا لیکن ٹھاکر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

"ہم دفتر میں بیٹھ سکتے تھے۔" ٹھاکر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہال کی پچھلی طرف اشارہ کیا "لیکن یہاں بیٹھنا کچھ اچھا لگتا ہے۔"

جب میں پہلی مرتبہ اس کافی ہاؤس میں آیا تھا تو یہاں ویٹریس کام کرتی تھیں لیکن اب کوئی بھی لڑکی نظر نہیں آرہی تھی۔ تمام مرد ویٹر تھے۔ سفید براق ڈریس میں وہ بڑے اسمارٹ نظر آرہے تھے۔ ٹھاکر نے ایک ویٹر کو کافی کے لیے کہہ دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ شوبھا والا کافی ہاؤس ہے۔ میں نے اس کی اجازت کے بغیر اس میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔"

"وہ تبدیلیاں مجھے نظر آرہی ہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن تم نے تو اس کافی ہاؤس کا سودا کرلیا تھا نا۔ تمہیں تبدیلیاں کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔"

"سودا زبانی ہوا تھا اور میں نے اسے کوئی ادائیگی بھی نہیں کی تھی۔" ٹھاکر نے کہا "دراصل پہلی مرتبہ رشی کیش میں شوبھا سے بات ہوئی تھی تو واپس آتے ہی میں نے اس بلڈنگ پر کام شروع کروا دیا تھا۔ اوپر کی منزل پر فلیٹ کی طرح کمرے تھے جو میں نے تڑوا دیے۔ اس دوران میں اطلاع ملی کہ شوبھا کو دیش مکھ اٹھا کرلے گیا ہے۔ میں اس کے لیے پریشان تو بہت تھا لیکن یہاں میں نے کام جاری رکھا۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں نے اس کافی ہاؤس کا افتتاح کرکے روپ متی کے نام سے اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ یہ مینیجر وہی ہے جو شوبھا کے دور میں تھا۔ بینک اکاؤنٹ اگرچہ روپ متی کے نام پر ہے لیکن وہ صرف چیک پر دستخط کرتی ہے جبکہ سارا حساب کتاب سروپ چند کے ہاتھ میں ہی ہے اور میں سارے بزنس کی نگرانی کرتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ ویٹر نے ہمارے سامنے کافی سرو کردی۔

"مجھے یقین تھا، شوبھا کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ضرور واپس آئے گی۔" ٹھاکر نے اپنے سامنے رکھا ہوا مگ اٹھاتے ہوئے کہا "میں نے اس کا بزنس اور سارا حساب کتاب امانت کے طور پر سنبھالا ہوا ہے۔ اب وہ آگئی ہے۔ اسے صحیح سلامت اور تندرست دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ وہ چند روز آرام کرلے تو میں اس کی امانت اس کے سپرد کردوں گا۔"

"میں نے دنیا میں بہت کم ایسے افراد دیکھے ہیں جو اپنے سینے میں ایسے جذبات رکھتے ہیں۔" میں نے کہا "شوبھا یقیناً یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوگی۔" میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے شوبھا کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح مرمر کر جی ہے۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے لیکن کافی ہاؤس کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گاہکوں کی آمد و رفت اسی طرح جاری تھی۔ ٹھاکر بتا رہا تھا کہ رات دو بجے جب ریسٹورنٹ بند کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی یہاں اسی طرح گاہک موجود ہوتے ہیں۔ انہیں معذرت کرکے بڑی مشکل سے باہر نکالا جاتا ہے۔

ایک بجے ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ٹھاکر نے منیجر سروپ چند کو کچھ ہدایات دیں اور ہم کافی ہاؤس سے باہر آگئے۔ اس سے آگے اسٹیشن روڈ پر ٹھاکر کا اپنا وکرم ہوٹل کا ریسٹورنٹ بھی رات دو بجے تک کھلا رہتا تھا۔ واپس آتے ہوئے ہم کچھ دیر وہاں بھی رکے اور جب گھر پہنچے تو دو بج چکے تھے۔

دھنو سو چکی تھی لیکن شوبھا اور روپ متی جاگ رہی تھیں۔

"تم لوگ ایک گھنٹے کا کہہ کر آگئے تھے اور اب آرہے ہو؟" روپ متی نے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت نمایاں تھی۔

"کافی ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

ہم بھی وہیں بیٹھ گئے اور جب باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو واقعی وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے اپنی کہانی سنانے کے لیے اگرچہ کئی راتیں درکار تھیں لیکن میں رشی کیش میں شوبھا کے اغوا سے لے کر اب تک کے واقعات نہایت مختصر طور پر بتا رہا تھا۔

اس دوران میں بلا کا ذکر بھی آیا تھا جس سے تھوڑی دیر کے لیے فضا سوگوار ہوگئی تھی۔

صبح چار بجے تک ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمارے سونے کا بندوبست اوپر کی منزل پر کیا گیا تھا تاہم دھنو نیچے ہی ایک کمرے میں سوگئی تھی اور اس وقت اسے جگانا

مناسب نہیں سمجھا گیا۔

روپ متی ہمیں اوپر لے آئی۔ کئی کمرے تھے اور سب کے سب آراستہ۔ میں نے اس کمرے پر قبضہ کرلیا جہاں پہلے روپ متی رہا کرتی تھی اور میں بھی کئی روز تک اسی کمرے میں سویا تھا۔

شوبھا اتنی بڑی حویلی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"میں نے روپ متی کے بارے میں بہت قصے کہانیاں سنی تھیں لیکن یہ تو بہت مختلف ثابت ہوئی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی رانی روپ متی ہے جس کے بارے میں ہر روز ایک نئی کہانی سنی جاتی تھی۔" یہ بات شوبھا نے اس وقت کہی تھی جب ہم دونوں اوپر والے ہال میں کھڑے تھے اور اسی وقت روپ متی اس کمرے سے برآمد ہو رہی تھی جو شوبھا کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس نے شاید شوبھا کی بات سن لی تھی۔

"روپ متی کی شخصیت میں اس تبدیلی کے لیے مجھے ہمت سنگھ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔" اس نے کہا اور قریب آکر میرے کندھے پر سر ٹکا کر کھڑی ہوگئی "یہ شخص اگر میری زندگی میں نہ آتا تو میں آج بھی گندگی کی دلدل میں پڑی ہوتی۔ میں تو جیون (زندگی) کے آخری لمحوں تک ہمت سنگھ کا احسان نہیں بھول سکتی۔"

بات کرتے ہوئے روپ متی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کندھا تھپتھپانے لگا۔

"زندگی میں اگر یہ نشیب و فراز نہ ہوں تو جینے کا مزہ نہیں آتا۔" میں نے کہا "مجھے دیکھ لو۔ کیسے کیسے مصائب سے دوچار رہا ہوں لیکن میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔"

"اسی لیے تو میں نے تمہارا نام ہمت سنگھ رکھا تھا۔" روپ متی بولی اور مجھے یاد آگیا کہ مجھے یہ نام واقعی روپ متی نے ہی دیا تھا۔

"اب سونے کا ارادہ ہے یا رات کا باقی حصہ بھی یونہی کھڑے کھڑے باتوں میں گزار دوگی۔" میں نے کہا۔

"سوری جی۔" روپ متی مسکرا دی "ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح باتیں ہوں گی۔"

روپ متی نیچے چلی گئی۔ میں شوبھا کے ساتھ اس کے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ باقی سب لوگ مجھ سے پہلے جاگ چکے تھے۔ ٹھاکر تو صبح سات بجے ہی ہوٹل چلا گیا۔ یہ اس کی بڑی اچھی عادت تھی کہ اپنے کام کی طرف سے اس نے کبھی غفلت نہیں برتی تھی۔ وہ کاروبار پر پوری توجہ دیتا تھا۔

میرے جاگنے سے پہلے دھنو اور شوبھا نے گھوم پھر کر پوری حویلی دیکھ لی تھی۔ دھنو کی زندگی تو ایک عیاش گاہ میں گزری تھی۔ شوبھا اگرچہ جے پور میں ہی رہی تھی لیکن اس قسم کی محل نما حویلی میں آنے کا اس کا پہلا موقع تھا اور راجاؤں، مہاراجاؤں کی زندگیوں کے بارے میں بار بار حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ جے پور میں اگرچہ حویلیوں اور محلات کی بھرمار تھی۔ اس نے تفریح کی غرض سے کئی محلات دیکھے بھی تھے لیکن کسی حویلی میں رہنے کی بات دوسری تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے ٹھاکر کا فون آگیا۔ کچھ دیر روپ متی اس سے بات کرتی رہی پھر اس نے ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے تقریباً دس منٹ اس سے بات کی اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

"شوبھا۔" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری عدم موجودگی میں تمہارا کافی ہاؤس بند رہا ہے۔ سنا ہے بلڈنگ کی حالت بھی بہت بری ہے۔ چلو ذرا دیکھ آئیں۔ اسے ٹھیک ٹھاک کرانے میں پیسہ بھی بہت خرچ ہوگا اور وقت بھی بہت لگے گا۔"

شوبھا کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں ابھر آئیں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم سب روپ متی کی چم چماتی ہوئی گاڑی میں سوار ایم آئی روڈ کی طرف جا رہے تھے۔

گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے رکی تو کار سے اترتے ہی شوبھا اس طرح ٹھٹک کر رک گئی جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ وہ متوحش نظروں سے بلڈنگ کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

ٹھاکر کافی ہاؤس کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ ہمارے استقبال کے لیے وہ چند قدم آگے آگیا اور جب وہ اس کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے تو شوبھا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منیجر سروپ چند نے بھی چرن (قدم) چھو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ کافی ہاؤس میں اس وقت بھی کوئی میز خالی نہیں تھی۔ اوپر سے نیچے تک گھومنے کے بعد ہم دفتر میں آگئے۔ دفتر بھی بہت کشادہ تھا اور شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہم سب صوفوں پر بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر بعد ایک ویٹر نے ہمارے سامنے کافی سرو کردی۔

"آپ کے آجانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی شوبھا دیدی۔" ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کی اجازت کے بغیر میں نے اس بلڈنگ میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں لیکن یہ آپ کی امانت ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ابھی اور اسی وقت اپنی یہ امانت سنبھال لیں۔ سارا حساب کتاب سروپ چند کے پاس موجود ہے۔ اکاؤنٹ روپ متی کے نام پر ہے جسے کل آپ کے نام منتقل کیا جاسکتا ہے۔"

"مجھے نہ تو اپنی آنکھوں پر یقین آرہا ہے اور نہ ہی کانوں پر۔" شوبھا بولی "اس کافی ہاؤس کا تو تم سے سودا....."

"وہ زبانی بات تھی اور میں نے آپ کو کوئی ادائیگی نہیں کی تھی۔" ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی "میں نے امانت سمجھ کر اس بزنس کو سنبھال رکھا تھا۔ اب یہ آپ کے سپرد ہے دیدی۔"

"نہیں بھیا، نہیں۔" شوبھا گویا پھٹ پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انسان بھی عجیب چیز ہے۔ خوشی بھی ملتی ہے تو دل بھر آتا ہے اور آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ روپ متی اور ٹھاکر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ روپ متی نے اسے بازو میں لپیٹ کر اپنے اوپر کھینچ لیا اور ٹھاکر اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

شوبھا کافی دیر بعد اپنی کیفیت پر قابو پا سکی تھی۔

"لیکن شوبھا رہے گی کہاں؟ اس کے گھر کو تو تم نے کافی ہاؤس بنا دیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمت سنگھ۔" روپ متی نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "اتنی بڑی حویلی کو میں نے اپنا مقبرہ نہیں بنانا۔ شوبھا دیدی ہمارے ساتھ اسی حویلی میں رہے گی۔ اب تم کوئی نیا شوشہ مت چھوڑنا۔ سمجھے۔"

"سمجھ گیا ماں لکن۔" میں نے جواب دیا۔

"شٹ اپ!" روپ متی چیخی "اب میں تمہارے منہ سے مذاق میں بھی ایسی کوئی بات نہ سنوں۔" سمجھے....."

"سمجھ گیا ما....." میں نے شرارتاً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ کافی ہاؤس کا نظام جس طرح چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دیا جائے اور شوبھا حویلی میں ان لوگوں کے ساتھ رہے گی۔ ظاہر ہے، دھنو کے بارے میں یہی طے ہوا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ رہے گی۔

شوبھا، سروپ چند کے ساتھ ایک بار پھر اوپر سے نیچے تک کافی ہاؤس کا جائزہ لیتی رہی۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم کافی ہاؤس سے اٹھ کر گرم ہوٹل میں آگئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے یہیں پر کھایا۔ چار بجے کے قریب ہم دھنو کو شہر کی سیر کرانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹھاکر تو ہوٹل ہی میں رہ گیا تھا۔ کار میں شوبھا آگے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اسٹیئرنگ روپ متی کے کنٹرول میں تھا اور میں دھنو کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی ہلکی رفتار سے شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور بالآخر آٹھ بجے کے قریب ہم حویلی واپس آگئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ٹھاکر بھی پہنچ گیا۔

تمام معاملات طے ہو چکے تھے۔ میرے جانے کے بعد روپ متی اور میرے تعلقات کے حوالے سے پنڈتوں کے کچھ ہنگامے جاری رہے تھے لیکن ٹھاکر اور روپ متی ان سے نمٹتے رہے اور ان کی شادی کے بعد بالآخر پنڈتوں کی زبانیں بھی بند ہوگئیں۔

میں یہاں سے جانے کا پروگرام بنانے لگا تو دھنو نے ایک اور ٹنٹا کھڑا کردیا۔ وہ یہاں رہنے کو تیار نہیں تھی اور میرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ یہ میرے لیے ایک نیا مسئلہ تھا۔ روپ متی، شوبھا اور ٹھاکر اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ مان کر نہیں دی اور بضد رہی کہ میں جہاں جاؤں گا وہ میرے ساتھ رہے گی اور بالآخر مجھے ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میں تو فوری طور پر یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا لیکن روپ متی اور ٹھاکر کچھ دنوں کے لیے مجھے روکنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں ان کی شادی میں شریک نہیں تھا اس لیے وہ میرے اعزاز میں ایک زوردار پارٹی دینا چاہتے تھے۔ اس سے اگلے ہی روز ٹھاکر کی ٹیلے والی حویلی میں پارٹی کے انتظامات شروع کردیے گئے۔

دعوت کے لیے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے ٹیلے والی حویلی کی طرف جانے بھی نہیں دیا گیا۔ دعوت والے روز شام کو ہم وہاں پہنچے تو حویلی کو دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ در و دیوار رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ حویلی کے سامنے دور تک چمچماتی گاڑیوں کی قطاریں لگتی گئیں۔ روپ متی بھی ایک راج کماری تھی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی ایک سابق ریاست کے دیوان کا بیٹا تھا۔ اس دعوت میں نہ صرف جے پور بلکہ راجستھان کی کئی سابق ریاستوں کے سابق راجے، مہاراجے، راج کمار، راجکماریاں، بڑے بڑے رئیس اور اعلیٰ سرکاری افسران مدعو تھے۔ یہی سب لوگ ان دونوں کی شادی میں بھی شریک تھے۔

اس وقت بھی شادی کا سا ہی سماں تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے زرق برق لباس لہراتے نظر آرہے تھے۔ حویلی کے وسیع

وعریض ہال میں بھی انتظام تھا اور وسیع و عریض لان میں بھی میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ باوردی ویٹر مشروبات سرو کرتے پھر رہے تھے۔

ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں تو میں کئی مرتبہ جا چکا تھا لیکن اس قسم کی کسی شاہانہ گھریلو تقریب میں پہلی مرتبہ شریک ہوا تھا۔ میں اپنے آپ میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں اسی جے پور میں پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ پولیس شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں لگی رہتی تھی لیکن وہ سب کنور بلونت سنگھ جیسے بدمعاشوں اور متعصب پنڈتوں کی سازشیں تھیں اور اب روپ متی اور ٹھاکر بڑے فخر سے شہر کے معززین اور اعلیٰ سرکاری آفیسروں سے میرا تعارف کرا رہے تھے۔

"ان سے ملئے۔ یہ ہیں ہمت سنگھ جن کے اعزاز میں آج کی اس دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

جے پور میں میرا نام اجنبی نہیں رہا تھا۔ جے پور میں تو ہمت سنگھ ایک افسانوی کردار بن چکا تھا۔ روپ متی اور ٹھاکر نے بھی اس نام کو افسانوی رنگ دینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ مجھے انسان نہیں دیوتا سمجھتے تھے۔

لوگ مجھ سے ہاتھ ملانے میں بھی بڑا فخر محسوس کر رہے تھے۔ ٹھاکر نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ دیش دھرم جیسے بدمعاش کو بھی 'پاتال' تک پہنچا کر کے میں نے ہی ختم کیا تھا۔

دعوتِ طعام کے بعد راگ رنگ کی محفل جم گئی۔ اگرچہ جے پور کی چوٹی کی رقاصاؤں اور گانے والیوں کو بلایا گیا تھا لیکن مہمانوں ہی میں درجنوں ایسی خواتین موجود تھیں جو اس فن میں ماہر تھیں۔ انہوں نے پیشہ ور رقاصاؤں کو آگے آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ خود روپ متی اور مندری کے رقص نے تو رنگ جما دیا۔ دھنو نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ساری محفل دھنو ہی نے لوٹ لی تھی۔

یہ محفل رات کے آخری پہر تک جاری رہی۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ مجھے آج بھی یاد ہے' مہمانوں کی آخری ٹولی صبح پانچ بجے رخصت ہوئی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ہم جو سوئے ہیں تو شام تک ہوش ہی نہیں رہا۔

دو تین دن اور گزر گئے۔ اس دوران میں ٹھاکر یہ کوشش کرتا رہا کہ ہمارے کاغذات بن جائیں اور ہم قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان جائیں لیکن اس میں کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ کچھ قانونی رکاوٹیں تھیں۔ اگرچہ جعلی کاغذات بڑی آسانی سے بن سکتے تھے لیکن میں نے ٹھاکر کو منع کر دیا اور بالآخر ایک روز ہم نے وہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ٹھاکر نے کچھ لوگوں سے مل کر پورا پروگرام تیار کر لیا تھا۔ پاکستان کی سرحد کی طرف جانے کے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہم مکرانہ' ناگور' پوکھران سے ہوتے ہوئے جیسلمیر جاتے اور وہاں سے چالیس کلومیٹر آگے کسی جگہ سے سرحد پار کرنے کی کوشش کرتے۔ دوسرا راستہ اجمیر' مارواڑ اور دل واڑہ سے ہوتا ہوا ماؤنٹ آبو تک جاتا تھا۔ وہاں سے آگے صوبہ گجرات میں داخل ہو کر رن کچھ کی طرف سے آسانی سے سرحد عبور کی جا سکتی تھی اور ٹھاکر نے جن لوگوں سے بات کی تھی انہوں نے بھی ہمیں یہی راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

روپ متی اور شوبھا بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں لیکن ہم دونوں نے ہی انہیں سختی سے منع کر دیا۔ اس روز صبح چھ بجے ہم روانہ ہونے لگے تو بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ شوبھا اور روپ متی مجھ سے لپٹ کر اس طرح رو رہی تھیں جیسے ان کا کوئی اپنا' بہت قریبی عزیز ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہو۔

ٹھاکر کی ایئر کنڈیشنڈ لینڈ کروزر بڑی شان دار تھی۔ دھنو پچھلی سیٹ پر تھی اور میں اگلی سیٹ پر جبکہ ٹھاکر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ٹھاکر نے احتیاطاً جسونت کو بھی ساتھ لے لیا تھا اور وہ سب سے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

گاڑی شہر سے نکل کر اجمیر کی طرف جانے والی ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا لیکن ٹھاکر کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

دھنو کی زندگی پہاڑی علاقوں میں گزری تھی۔ اس نے میرے ساتھ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سفر کیا تھا اور اب اس صحرائی سفر سے بھی خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اجمیر تک ایک سو دس کلومیٹر کا سفر ہم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر لیا۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں پالی میں رکنا پڑا۔ یہاں ہم نے کچھ دیر آرام بھی کیا اور پھر رکے بغیر ہمارا سفر جاری رہا۔ پالی سے ڈرائیونگ کی ذمے داری جسونت نے سنبھال لی تھی اور میں اور ٹھاکر بھی پچھلی سیٹ پر آ گئے تھے۔ دھنو اپنی سیٹ پر نیم دراز اونگھنے لگی تھی۔

تقریباً پانچ سو بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم سہ پہر چار بجے کے قریب ماؤنٹ آبو پہنچ گئے۔ بڑا خوب صورت ہل اسٹیشن تھا۔ اس طرف سے ٹرین کی آمد و رفت بھی تھی لیکن

ریلوے اسٹیشن شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر دور تھا۔

ہماری منزل رن کچھ میں واقع "سوئی گام" نامی وہ گاؤں تھا جو پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمیں جس آدمی کے ساتھ سرحد پار کرنی تھی وہ آدمی سوئی گام ہی میں ہمارا منتظر تھا لیکن شام کے بعد اس طرف کا سفر کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے رات کو ہم نے ماؤنٹ آبو ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ماؤنٹ آبو میں یوں تو کئی بہت اچھے رہائشی ہوٹل بھی تھے لیکن ٹھاکر نے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا تھا۔

دن بھر کے سفر سے ہم تھک گئے تھے۔ رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا گیا اور گیارہ بجے کے قریب میں سو گیا تھا۔

صبح ناشتا کر کے ہم نو بجے کے قریب اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ راستہ خاصا دشوار ثابت ہوا تھا۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کہیں تو سڑک ہی غائب تھی۔ ریگستان میں بھٹک جانے کا اندیشہ بھی تھا لیکن ایسا کوئی سانحہ پیش نہیں آیا اور ہم دوپہر کے قریب سوئی گام پہنچ گئے۔

دھرم چند کی حویلی گاؤں کے آخری سرے پر آبادی سے ذرا ہٹ کر واقع تھی۔ ہم نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی جس شخص سے دھرم چند کے بارے میں پوچھا تھا وہی ہمیں حویلی تک لے گیا تھا۔

حویلی کے وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں چاروں طرف سایہ دار درختوں کی بہتات تھی۔ ظاہر ہے' گاؤں کی یہ حویلی جے پور جیسی حویلیوں سے بہت مختلف تھی لیکن بہرحال دھرم چند گاؤں کا کھلا بھی تھا اور سب سے دولت مند آدمی بھی اس لیے اس کی حویلی گاؤں کے دیگر مکانات سے مختلف تھی۔

حویلی کے برآمدے میں دھرم چند نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ رام نام کا وہ آدمی بھی تھا جس نے ہمیں سرحد پار پہنچانا تھا۔ وہ دبلا پتلا لمبے قد کا آدمی تھا۔

ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کیا گیا تھا اور کھانے کے بعد ایک نوکر ہمیں مہمان خانے میں لے آیا۔ رام بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہ ہمیں پروگرام سمجھانے لگا۔

رام کے جانے کے بعد میں اور ٹھاکر تو باتیں کرتے رہے اور دھنو چارپائی پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد ہم ایک جیپ میں سوار ہو گئے۔ ٹھاکر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دھرم چند کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دے دیا جو سرحد کی دوسری طرف نگر پارکر نامی گاؤں میں پہنچ کر کشوری لال نامی ایک آدمی کو دینا تھا۔ کشوری لال یہ خط دیکھ کر مجھے پچاس ہزار روپے مالیت کی پاکستانی کرنسی دے دیتا۔ اس کے عوض ٹھاکر نے رقم یہاں دھرم چند کو دے دی تھی۔

جیپ ریگستان میں ایک جگہ رک گئی۔ وہاں دس اونٹوں پر مشتمل ایک قافلہ ہمارا منتظر تھا۔ اس قافلے میں تین آدمی تھے۔ ان سب نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ اسمگلروں کی ایک پارٹی تھی جس کا سربراہ ہرنس نامی ایک آدمی تھا۔ وہ بھی دبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔

دھنو اور میں ٹھاکر بھانوت سنگھ سے گلے ملے۔ یہ ہماری الوداعی ملاقات تھی۔

مجھے اور دھنو کو الگ الگ اونٹوں پر سوار کرا دیا گیا۔ ہمیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ ہم اپنے آپ کو اونٹوں پر کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔

میں نے غیر قانونی طور پر دنیا کے کئی ملکوں کی سرحدیں پار کی تھیں لیکن اونٹ پر سرحد پار کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ نیلگری کے پہاڑوں میں خچر کی ننگی پیٹھ پر طویل سفر کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن اونٹ پر سواری کی اور بات تھی۔

اونٹ جب اٹھ کر کھڑے ہوئے تو دھنو بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔ ریگستان کے اس جہاز پر سفر کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب راجستھان کے صحرا میں ہوائی جہاز کی تباہی کے بعد ہم ڈاکوؤں اور بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ہمیں اونٹوں پر بٹھا کر غلاموں کی منڈی تک لے جایا گیا تھا۔

ٹھاکر اور رام جیپ کے پاس ہی کھڑے رہ گئے اور ہمارا قافلہ سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے آگے ہرنس کا اونٹ تھا۔ اونٹوں کی رفتار بتدریج تیز ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا اونٹ دھنو کے قریب کر لیا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے آگے کو جھک کر کجاوے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اچانک ہی کسی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ فائر کی آواز اگرچہ بہت دور سے سنائی دی تھی لیکن وہ سناٹے میں دور تک پھیل گئی تھی۔

"جلدی۔ تیز۔۔۔" ہرنس چیخا۔

اونٹ ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ دھنو کے منہ سے

خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ اچھل رہی تھی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے بڑی مضبوطی سے کجاوے پر گرفت جمار کھی تھی۔

فائرنگ کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہو اور خطرناک بات یہ تھی کہ فائرنگ کی وہ آوازیں بتدریج ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہم سرحد کے عین اوپر تھے۔ دھنو اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکی اور اچھل کر اونٹ سے گر گئی۔ اس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے بھی اپنے اونٹ سے چھلانگ لگا دی۔

دوسرے اونٹ دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ہرہنس یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اپنا اونٹ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دوڑتا ہوا دھنو کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ریت پر پڑی چیخ رہی تھی۔

میں دھنو کو اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ دائیں طرف بہت دور کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بھی مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سرحدی محافظوں کی جیپ تھی جن کا غالباً اس طرف اسمگلروں کی کسی اور پارٹی سے ٹکراؤ ہو گیا تھا اور وہ جیپ ٹیلوں میں اچھلتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ میں نے دھنو کو کندھے پر ڈالا اور اس طرف دوڑ لگا دی جس طرف اونٹ گئے تھے۔

فائرنگ میں شدت آتی گئی۔ وہ جیپ بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ یہاں ریت سخت تھی اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ جیپ اچھل رہی تھی۔ اس کی روشنیوں کا رخ بھی بار بار بدل رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم ابھی تک روشنیوں کی زد میں نہیں آئے تھے لیکن پھر اچانک جیپ کا رخ بدل گیا۔ میں نے ایک ٹیلے کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور دھنو کو ساتھ لیے لڑھکتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت وہ ٹیلا جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی گولیوں کی ایک باڑھ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے ایک ہاتھ دھنو کے منہ پر رکھ دیا تھا ورنہ عین ممکن تھا وہ چیخ پڑتی۔

جیپ کچھ آگے نکل گئی۔ اس پر شاید لائٹ مشین گن نصب تھی جس سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں دھنو کو گرفت میں لیے ٹیلے کی آڑ میں لیٹا رہا۔

"ہمت سنگھ!"

دائیں طرف سے ایک سرگوشی سن کر میں اچھل پڑا اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔

"میں اس طرف ہوں۔" وہی سرگوشی دوبارہ سنائی دی "ٹیلے کی آڑ میں رینگتے ہوئے اس طرف آ جاؤ۔ کھڑے ہونے کی کوشش مت کرنا۔"

میں نے اس طرف کسی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ سکا لیکن بہرحال' وہ جو کوئی بھی تھا اس نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔ ہو سکتا ہے' ٹھاکر نے ہرہنس یا اس کے کسی ساتھی کو میرا نام بتا دیا ہو۔ میں نے دھنو کے کان میں سرگوشی کی اور آہستہ آہستہ آواز کی سمت رینگنے لگا۔ دھنو بھی میرے ساتھ ساتھ سینے کے بل رینگ رہی تھی۔

تقریباً بیس گز پیچھے ایک اور ٹیلا تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا ایک انسانی ہیولے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔

"جیپ مڑ کر واپس آ رہی ہے۔ جلدی سے آگے بڑھو۔" ہیولے کی طرف سے سرگوشی ابھری۔

میں دھنو کو گھسیٹتا ہوا کہنیوں کے بل تیزی سے رینگنے لگا۔ جیپ لائٹ مشین گن سے فائرنگ کرتی ہوئی واپس آ رہی تھی۔ ہم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں اور لاتعداد گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ جیپ تیز رفتاری سے اس طرف چلی گئی جہاں اب بھی دو پارٹیوں میں معرکہ جاری تھا۔

"تم دونوں ٹھیک ہو نا ہمت سنگھ؟" اس ہیولے نے ہمارے قریب آتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ وہ ہرہنس ہی تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ میری ساتھی کو اونٹ سے گرنے سے شاید چوٹ لگی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جلدی سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔" ہرہنس نے کہا "آدھا میل ادھر شاید دونوں طرف کے سرحدی محافظوں میں جھڑپ ہو گئی ہے۔ اگر پاکستانی محافظ اس طرف آ گئے تو ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہمیں کم سے کم دو سو گز کا فاصلہ طے کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔"

"کیا تم چل سکتی ہو دھنو؟" میں نے دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کو... کوشش کرتی ہوں۔" دھنو نے جواب دیا۔

دھنو نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گئی۔

"شاید میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں نے جھک کر دھنو کو کندھے پر لاد لیا اور ہرہنس کے

پیچھے دوڑ پڑا۔

ہم دور تک ٹیلوں کی آڑ میں بل کھاتے ہوئے دوڑتے رہے۔ پہلے تو ریت سخت تھی پھر آگے نرم ریت آ گئی۔ ہمارے پیر دھنس رہے تھے اور دوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔

دو سو کے بجائے ہم تقریباً چار سو گز تک دوڑتے رہے۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ ایک بڑے ٹیلے کے پیچھے پہنچ کر ہم رک گئے۔ وہاں تمام اونٹ اور ہرہنس کے دونوں ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ اونٹ بھی سدھائے ہوئے تھے۔ اب تک ان کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی تھی۔ اگر عام اونٹ ہوتے تو انہوں نے بلبلا بلبلا کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہوتا۔

دھنو اب اونٹ پر اکیلے بیٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور ہمارا قافلہ رات کی تاریکی میں ایک بار پھر چل پڑا۔ رفتار اس مرتبہ بھی خاصی تیز تھی۔ دھنو میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ گئی تھی اور دونوں بازو میرے سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک اسی اس رفتار سے دوڑتے رہے اور پھر ہرہنس کی ایک آواز پر ان کی رفتار کم ہو گئی۔ میرا انجر پنجر ڈھیلا ہو چکا تھا۔ دھنو بھی بار بار کراہ رہی تھی۔

ہمارا یہ سفر جاری رہا۔ میرا خیال تھا کہ ہم سرحد پار کرنے کے بعد کئی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ تاریکی بھی اب چھٹنے لگی تھی۔ دم توڑتے ہوئے اندھیرے میں بہت دور کسی بستی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ صبح کا اجالا واضح ہوتا گیا اور ہمارے اور بستی کے بیچ میں فاصلہ بھی سمٹتا گیا۔

بستی سوئی ہوئی تھی لیکن بستی کے کتے جاگ رہے تھے۔ انہوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ ہمارا قافلہ بستی کے وسطی چوک سے گزر کر ایک حویلی کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پھاٹک کھول دیا تھا۔

"آچر۔" ہرہنس نے اپنے اونٹ سے چھلانگ لگاتے ہوئے ان دونوں میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ان دونوں کو کشوری لال کے مکان پر لے جاؤ اور پیر بخش! تم چھوکروں کو بلا کر اونٹوں سے مال اتروا دو۔ جلدی کرو۔" آخری بات اس نے دوسرے شخص سے کہی تھی۔

آچر نامی شخص نے ہمارے اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ میں نے اتر کر دھنو کو بھی سہارا دے کر اتار لیا۔ اس کا ایک پیر سوج کر کپا ہو رہا تھا۔ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے آچر نامی اس شخص کی طرف دیکھا۔

"کشوری لال کے مکان پر۔ دو گلی آگے ہے مگر یہ چھوکری چلے گی کیسے...! اس کا تو پیر..."

"تم اس کی فکر مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور جھک کر دھنو کو کندھے پر لاد لیا اور آچر کے پیچھے حویلی سے باہر آ گیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے' یہ گاؤں...؟"

"نگر پارکر۔" آچر نے میری بات پوری ہونے سے پہلے جواب دیا۔

آچر نے بتایا تھا کہ ہمیں دوسری یا تیسری گلی میں جانا ہے لیکن ہم کئی گلیاں گھومنے کے بعد ایک مکان کے سامنے رکے تھے۔

تیسری دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ بھی خاصا بڑا مکان تھا۔ ہمیں ایک الگ تھلگ کمرے میں پہنچا دیا گیا میں نے دھنو کو ایک چارپائی پر لٹا دیا اور آچر کی طرف مڑ گیا۔

"میری ساتھی کے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ کسی وید یا حکیم کا بندوبست ہو سکتا ہے؟"

"سائیں' ابھی تو صبح بھی نہیں ہوئی۔ یہاں کے سارے لوگ سو رہے ہیں۔" آچر نے جواب دیا "ابھی دن چڑھنے دو۔ کشوری لال کسی وید کا بندوبست کر دے گا۔ ابھی تم لوگ ادھر بیٹھو۔ میں جاتا ہوں۔ کشوری لال آئے گا تو اس سے بات کر لینا۔"

آچر چلا گیا۔ میں جھک کر دھنو کا پیر دیکھنے لگا۔ ٹخنا پھولا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کے پیر پر ہاتھ رکھا' وہ چیخ اٹھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے۔

دھنو چارپائی پر پڑی کراہتی رہی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے پیر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اسے حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ دھنو نے دانت بھینچ لیے۔

میں نے اندازہ لگا لیا کہ فریکچر نہیں ہوا تھا۔ اونٹ پر سے گرتے ہوئے پیر آڑا پڑ گیا تھا جس سے موچ آ گئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی گلی کی طرف بھی کھلتی تھی جو اس وقت بند تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر چٹا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ غالباً سورج نکلنے والا تھا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے آہٹ سن کر پیچھے گھوم کر دیکھا۔

درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی اندرونی

دروازے سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی توند مٹکے کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ عمر کا اندازہ پچاس کے لگ بھگ لگایا جا سکتا تھا۔ اس نے سفید کھلے کی دھوتی باندھ رکھی تھی اور جسم کے اوپر والے حصے پر پیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی جس پر جگہ جگہ اوم چھپا ہوا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں خون کی طرح سرخ اور سر گنجا تھا لیکن کھوپڑی کے پچھلے حصے پر بالشت بھر چٹیا تھی۔ ماتھے پر قشقہ تھا اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں والی کئی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔

وہ اس قصبے کے بڑے مندر کا پنڈت کشوری لال تھا۔

ہندوستان کے پنڈتوں کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کے مندر جرائم اور عیاشیوں کے اڈے تھے۔ انسانیت کے خلاف سازشوں میں ان پنڈتوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور یہ کشوری لال پاکستان کے ایک سرحدی قصبے کے مندر کا پنڈت تھا۔ یہ بھی جرائم میں ملوث تھا۔ کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ وہ اسمگلروں سے ملا ہوا تھا اور اس غیر قانونی دھندے میں ان کا برابر کا شریک تھا۔

چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے اس کی توجہ دھنو کے پیر کی طرف مبذول کرائی تو اس نے آواز دے کر اندر سے ایک لڑکے کو بلا لیا اور اسے وید کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

"یہ نہیں چلے گا سائیں۔" وہ دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا نہیں چلے گا؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ لباس بدلنا ہوگا۔" اس نے دھنو کی طرف اشارہ کیا جس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی "اس لباس میں یہ چھوکری فوراً لوگوں کی نظروں میں آجائے گی۔ اس کے کپڑے بدلنا ہوں گے۔"

"بدل لے گی۔" میں نے جواب دیا "لیکن کیا تم ہمارے لیے چائے پانی کا انتظام کر سکتے ہو؟"

"ہاں ہاں۔ ابھی سارا بندوبست ہو جاتا ہے۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

میں چارپائی کے سامنے پڑی ہوئی ایک خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک نو عمر لڑکا ہمارے لیے ناشتا لے آیا۔ دو پراٹھے تھے اور دو کپ چائے۔ میں نے دھنو کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ ٹرے اس کے سامنے چارپائی پر رکھ دی اور کرسی کھینچ کر خود بھی قریب ہو گیا۔

ناشتے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد وید آگیا۔ وہ پہلوان ٹائپ بٹاکٹا آدمی تھا۔ اس نے دھنو کے پیر کو ٹٹول کر دیکھا اور بتایا کہ موچ آگئی ہے' پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اور جب اس نے موچ نکالی تو دھنو کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وید نے کسی مرہم سے مالش کر کے پٹی باندھ دی۔

وید چلا گیا۔ دھنو بھی بتدریج پرسکون ہوتی چلی گئی تھی۔ پنڈت کشوری لال کرسی پر بیٹھ گیا اور میں چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے سائیں۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟" پنڈت کشوری لال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم کراچی جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی کسی اور طرف جانے کا سوچیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے سائیں۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "کراچی کے اخباروں میں ہر روز ایسی خبریں چھپتی ہیں کہ انڈیا کی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کے ایجنٹ پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی ایجنسیوں کے ایجنٹ بھی بھیس بدل کر سرحدی بستیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ کسی کے گھر میں مہمان آجائیں تو انہیں شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ تم لوگ یہاں....."

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں خود بھی یہ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤں لیکن....."

"اس چھوکری کی وجہ سے تمہیں چند روز یہاں رکنا پڑے گا۔" پنڈت نے کہا "تم لوگوں کو یہاں رکھ کر میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ یہاں ایک چھوٹی سی سرائے ہے۔ میں آج تم لوگوں کے لیے وہاں بندوبست کروں گا بلکہ آج دوپہر کے کھانے کے بعد....."

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ کمرا بیٹھک قسم کا تھا جس کا ایک دروازہ گلی کی طرف بھی تھا اور دستک اسی دروازے پر ہوئی تھی۔

پنڈت کشوری لال نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو دو آدمی اندر داخل ہوئے انہیں دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ پولیس والے تھے!

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کوئی عام پولیس والے نہیں تھے۔ ان دونوں کا تعلق پاکستان رینجرز سے تھا۔ اس نیم عسکری فورس کے جوان ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سرحد کے آر پار غیر قانونی نقل و حمل پر نگاہ رکھنا ان کی اوّلین ذمے داری ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنی جان پر کھیل کر اس فرض کو نبھاتے ہیں جو بڑے فخر کی بات ہے۔

صورتِ حال اچانک سنگین رخ اختیار کر گئی تھی۔ ہمارے ساتھ "سر منڈواتے ہی اولے پڑے" والا معاملہ ہو گیا تھا۔ اس افتاد نے دھنو کو بھی اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گزشتہ رات والے "معرکے" میں دھنو کا ٹخنا بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اگرچہ حکیم نے اس کا تسلی بخش معائنہ کرنے کے بعد مرہم لگا دیا تھا تاہم اس کی تکلیف کو چند روز مزید رہنا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھی تو ٹخنے سے اٹھنے والی روح کش ٹیس نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔

میں اپنی تمام تر توجہ کھلے ہوئے دروازے پر مرکوز کیے کھڑا تھا۔ دروازے کے اندر' بیٹھک نما کمرے میں پنڈت کشوری لال ہکا بکا کھڑا آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پنڈت کی پشت میری جانب تھی مگر مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ پل صراط سے گزر رہا تھا۔ اس پتا کے بارے میں اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

دروازے میں کھڑے "رینجرز" کے جوانوں نے کشوری لال کے شانوں کے اوپر سے کمرے کا جائزہ لیا پھر ان کی عقابی نگاہیں ہم پر آکر ٹھہر گئیں۔ کشوری لال اس دوران میں صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر آنے والوں کو داخلے کا راستہ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"مہاراج! خیریت تو ہے۔ اتنی صبح اس کشٹ (تکلیف) کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔"

وہ دونوں پنڈت کی بات کا جواب دیے بغیر کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بیٹھک کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہ دونوں مسلح تھے۔ ایک جوان کے شولڈر بیجز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ آفیسر رینک تھا' دوسرے کی حیثیت ایک کانسٹیبل ایسی تھی۔ اسی جوان نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی تھی۔

اندر آتے ہی کانسٹیبل نے ہمیں اپنی گن کے نشانے پر رکھ لیا۔ آفیسر رینک سرحدی محافظ کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ تاہم اس نے اپنا پستول ہم میں سے کسی پر تاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہی شخص پنڈت کشوری لال سے مخاطب ہوتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔

"پنڈت جی! آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔"

"مہاراج! میں کچھ سمجھا نہیں۔" کشوری لال نے اپنی دانست میں لاعلمی کی بھرپور اداکاری کرنے کی کوشش کی تھی۔

آفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا "آج تمہاری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا پنڈت کشوری لال۔ ہم بہت دنوں سے تم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق تم مختلف آشیا کے ساتھ ساتھ انسانوں کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہو۔ لوگوں سے بھاری معاوضہ لے کر تم انہیں سرحد کے اس پار پہنچاتے ہو اور ادھر کے پنچھیوں کو ادھر بلاتے ہو جن میں زیادہ تر بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"مائی باپ!" پنڈت کشوری لال نے فدویانہ لہجے میں کہا "یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس قسم کے دھندے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو ایک سیدھا سادہ پنڈت ہوں۔ یہاں کے بڑے مندر کا پجاری۔ میرا کام پوجا پاٹھ ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

پنڈت ابھی تک نہایت معقول انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ دونوں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر چل جائیں مگر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

آفیسر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی بھرپور کاٹ تھی "پنڈت کشوری لال! پوجا پاٹھ تمہارا فرض اور اسمگلنگ کا دھندا تمہارا پیشہ ہے اور..... تم کتنے سیدھے سادے ہو یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے ہماری جانب دیکھا۔ دھنو چارپائی پر ہی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ میں پوری حاضر دماغی سے پنڈت اور سرحدی محافظ کے درمیان ہونے والی مکالمت کو سن رہا تھا۔ ہمارا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد وہ پنڈت سے مستفسر ہوا "پنڈت جی! ان دونوں کا تعارف نہیں کرواؤ گے؟"

"یہ..... یہ دونوں میرے مہمان ہیں۔" پنڈت لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

آفیسر نے پوچھا "یہ دونوں کہاں سے آئے ہیں؟"

"وہ..... جی یہ دونوں مہمان "آدیگاؤں" سے آئے ہیں۔"

پنڈت نے بوکھلاہٹ میں کسی سرحدی گاؤں کا نام لے دیا تھا۔ آفیسر اس کی بوکھلاہٹ سے شیر ہوگیا۔ اگلا سوال اس نے خاصے خوں خوار لہجے میں پوچھا تھا۔

"آدیگاؤں میں یہ لباس کب سے پہنا جانے لگا ہے؟"

اس کے ساتھ ہی آفیسر نے میرے اور دھنو کے لباس کی جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ دھنو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھی جبکہ میں نے جینز کے اوپر چیک دار ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہم دونوں کے پاؤں میں جوگرز تھے۔

آفیسر کے پچھتے ہوئے سوال نے پنڈت کو مزید گڑبڑا دیا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ یہ صورتِ حال سراسر ہمارے خلاف جارہی تھی۔ ہم اس وقت جس بیٹھک نما کمرے میں تھے اس کا ایک دروازہ گلی کی جانب کھلتا تھا۔ سرحدی محافظوں نے اسی دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے جواب میں پنڈت کشوری لال نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس سے ایک بات واضح ہوگئی تھی کہ آنے والوں کو وہاں ہماری موجودگی کے بارے میں پکی اطلاع دی گئی تھی ورنہ اگر وہ معمول کی کارروائی کے لیے آتے تو ایک تو اتنی صبح دھاوا بولنے کی ضرورت نہیں تھی' دوسرے اس صورت میں وہ لوگ بیٹھک کے دروازے پر دستک دینے کے بجائے گھر کے داخلی دروازے کا رخ کرتے۔

میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی معمول کی کارروائی نہیں تھی۔ سرحدی محافظوں کو ہماری آمد اور کشوری لال کے گھر میں قیام کے بارے میں باقاعدہ اطلاع دی گئی تھی۔ میرا ذہن بہت تیز رفتاری سے اس اطلاع دینے والے مخبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سوچ کی برق رفتاری کو صرف وہی افراد سمجھ اور محسوس کرسکتے ہیں جو غور و فکر سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں۔ انسانی ذہن ایک سیکنڈ میں بے بہا باتیں اور لاتعداد واقعات کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور تصور کی نگاہ سے انسان کو محسوس بھی کروا سکتا ہے۔ میرا ذہن بھی اس وقت انتہائی مصروف ہوگیا تھا' سوچ کا پرندہ اپنی پوری بلندی پر پرواز کررہا تھا۔

انڈیا کی سرحد پر واقع "سوئی گام" نامی گاؤں تک ٹھاکر بھانوت سنگھ خود ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ڈرائیور نما گارڈ جسونت بھی تھا۔ سوئی گام میں ٹھاکر نے میرے اور دھنو کے گلے مل کر ہمیں الوداع کہا تھا۔ وہ جسونت کے ساتھ اپنی لینڈ کروزر پر واپس چلا گیا تھا۔

ہمیں بحفاظت بارڈر پار کروانے کے لیے ٹھاکر نے گاؤں کے کھیا دھرم چند سے معاملہ طے کر رکھا تھا۔ دھرم چند نے مجھے پنڈت کشوری لال کے نام ایک رقعہ بھی دیا تھا جس کو پڑھنے کے بعد کشوری لال مجھے پچاس ہزار روپے کے پاکستانی کرنسی نوٹ دے دیتا۔ اس رقم کے برابر ٹھاکر نے دھرم چند کو انڈین کرنسی دی تھی اور ساتھ ہی اس کی "خدمات" کا بھاری معاوضہ بھی دیا تھا۔ مذکورہ رقعہ ہندی زبان میں رقم کیا گیا تھا جس میں دھرم چند نے ہدایت کی تھی کہ پنڈت ہمارے لیے کراچی پہنچنے کا محفوظ بندوبست بھی کرے۔ دھرم چند اور پنڈت کشوری لال میں اس قسم کی کاروباری "ڈیل" ہوتی رہتی تھی۔ دونوں اپنی اپنی طرف کے لوگوں سے بھاری رقم وصول کرکے انہیں دوسرے کے حوالے کردیتے تھے۔ سرحد کی دوسری جانب ایک دوسرے کے بندوں کو بحفاظت ٹھکانے لگانا ان کی ذمے داری تھی جس کے لیے کسی قسم کے مالی لین دین کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ گویا یہ سب کچھ امدادِ باہمی کے تحت ہورہا تھا۔

دھرم چند نے ہمیں ایک قافلے کے ہمراہ کردیا تھا۔ دس اونٹوں اور تین افراد پر مشتمل وہ قافلہ درحقیقت ایک اسمگلر پارٹی تھا۔ تینوں افراد سیاہ لباس میں ملبوس تھے جن میں ایک کی حیثیت سربراہ ایسی تھی۔ اس دبلے پتلے شخص کا نام ہربنس تھا۔ ہربنس نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر علی الصباح ہمیں پاکستان کی حدود میں واقع نگرپارکر کے اس سرحدی گاؤں میں پہنچادیا تھا۔

ہربنس اور دھرم چند سے کسی قسم کی غداری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ اس نوعیت کے جرائم پیشہ لوگ زبان' اعتماد اور وعدے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس کی خاطر اپنی جان بھی گنوا دیتے ہیں۔

اب آجاکر دو افراد کی طرف شک جاتا تھا۔ ان میں ایک آچر تھا اور دوسرا پیر بخش۔ ہربنس نے گاؤں میں داخل ہوکر بڑی حویلی کے پھاٹک پر ان دو افراد سے پہلی ملاقات کی تھی۔ آچر کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے اور دھنو کو پنڈت کشوری لال کے گھر پہنچا دے اور پیر بخش سے کہا تھا کہ وہ ملازموں کو بلا کر اونٹوں سے اسمگلنگ کا سامان اتروالے۔ میرا ذہن کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ آچر اور پیر بخش کی حیثیت ملازمین کی سی تھی۔ ان میں سے کوئی مخبری کرسکتا تھا۔ زیادہ دھیان آچر کی طرف جارہا تھا کیونکہ وہی ہمیں کشوری لال کے مکان تک چھوڑنے آیا تھا۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سرحدی محافظ کی تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اب اس کے لہجے میں درشتی کے ساتھ ساتھ تندی بھی آگئی تھی۔ وہ کشوری لال سے مخاطب تھا۔

"پنڈت! تمہاری آئیں بائیں شائیں تمہیں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کرنے والی ہے۔" وہ پنڈت کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا "ابھی تک تم نے میرے کسی سوال کا دوٹوک اور واضح جواب نہیں دیا۔ اگر کچھ بکا بھی ہے تو لولا لنگڑا اور نامعقول۔" آفیسر کا لہجہ زہریلا ہوتا چلا گیا "میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ ان دونوں کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتادو۔ یہ ادھر سے ادھر آئے ہیں یا ادھر سے ادھر جانے والے ہیں؟"

"آپ یقین کریں مہاراج۔" پنڈت نے گھگیاتے ہوئے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی "یہ دونوں میرے مہمان ہیں اور آدیگاؤں سے۔۔۔"

پنڈت کی منت آمیز وضاحت ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت آفیسر ریننگ سرحدی محافظ کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ ایک زناٹے دار تھپڑ پنڈت کے گال پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی آفیسر کی دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم نے بہت بک بک کرلی پنڈت۔ اب میری باری ہے۔" آفیسر نے پنڈت کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے کہا "اور میں زبان سے زیادہ ہاتھ پاؤں سے کام لینے کا عادی ہوں۔"

پنڈت دونوں ہاتھ جوڑ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید پنڈت کی حالت اتنی خستہ نہ ہوتی مگر اس وقت وہ واقعی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ ہمارے بارے میں ایسی کوئی بھی وضاحت کرنے سے قاصر تھا جس سے سرحدی محافظ مطمئن ہوسکتے۔ پنڈت پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا۔

آفیسر ریننگ سرحدی محافظ کھا جانے والی نظر سے پنڈت کو گھورتے ہوئے بولا "پھر کیا ارادہ ہے کشوری لال! تمہیں سب کچھ سچ سچ بتادو گے یا ہیڈ کوارٹر۔"

آفیسر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور معنی خیز نظر سے پنڈت کو دیکھنے لگا۔ پنڈت کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "مائی باپ' جو پوچھنا ہے' یہیں پوچھ لو۔ ہیڈ کوارٹر جانے کی ضرورت نہیں۔"

پنڈت کی سراسیمگی سے میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ آفیسر نے جس "ہیڈ کوارٹر" کا ذکر کیا تھا وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور تکلیف دہ جگہ ہوگی کیونکہ آفیسر کی بات سن کر پنڈت کا چہرہ ہلدی ہوگیا تھا۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔

میں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرچکا تھا۔ آفیسر کی پراعتماد پیش رفت اور پنڈت کی مجرمانہ پسپائی ہمیں کسی بہت بڑی مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ یہ معاملہ پنڈت کے بس کا نہیں تھا اس لیے میں نے فوری طور پر مداخلت ضروری سمجھی۔

"آفیسر!" میں نے شائستہ لہجے میں سرحدی محافظ کو مخاطب کیا "ہم تمہارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنے کو تیار ہیں۔"

پنڈت نے چونک کر خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھا' دونوں سرحدی محافظ بھی حیرت آمیز نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو میں پہلی مرتبہ شامل ہوا تھا۔ اس شمولیت کا سبب یہ تھا کہ میرا ذہن موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چاق و چوبند ہوچکا تھا۔ میں پنڈت کے بھروسے پر کسی مصیبت کو گلے لگانے کو تیار نہیں تھا۔ آفیسر کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے ایک کہانی گھڑلی تھی۔ یہ فرضی کہانی حقیقت کے بہت قریب بھی تھی۔ ہر بات میرے ذہن میں بہت واضح ہوگئی تھی چنانچہ میرا مطمئن نظر آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

پنڈت کشوری لال نے مریل سی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "مورکھ! وھیان بھی ہے' تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں مورکھ (بے وقوف) کشوری لال!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا "میں پوری طرح دھیان گیان میں ہوں۔ اگر یہ آفیسر اپنی تسلی کے لیے ہمیں ہیڈ کوارٹر لے جائے گا تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" پھر میں آفیسر کی جانب متوجہ ہوا "کیوں آفیسر! اگر میں یہیں پر آپ لوگوں کے سوالوں کے اطمینان بخش جواب دے دوں تو کیا پھر بھی تم ہمیں ہیڈ کوارٹر لے جاؤ گے؟"

"یہ تو تمہارے جوابات سننے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔" آفیسر نے کہا۔

کشوری لال بولا "شاید تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

پنڈت کا اشارہ میری جانب تھا۔ دراصل پنڈت کو یقین ہوچلا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گا۔ "پاک رینجرز" والوں نے بڑے نازک موقع پر اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں بھی یہ محسوس کرچکا تھا' غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے پاکستان میں ہماری آمد کو سرحدی محافظوں سے چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔ اگر وہ ہماری تلاشی لیتے تو میرے لباس سے دھرم چند کا دیا ہوا رقعہ برآمد ہوجاتا جس کی تحریر ہمارے ہر من گھڑت جھوٹ کی قلعی کھول دیتی۔ میں نے ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک فرضی کہانی بنی تھی۔ اس توجیہہ کی میں اس لیے بھی ضرورت محسوس کررہا تھا کہ میں اپنے وطن میں قدم رکھنے کے بعد کسی قسم کی "مارا ماری" نہیں چاہتا

تھا۔ جس تیزی سے سرحدی محافظ ہم تک پہنچ گئے تھے' ان حالات میں مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ تاہم اس صورت میں پنڈت کشوری لال کے خلاف بیّن ثبوت سرحدی محافظوں کے ہاتھ آجاتے اور جان چھڑانے کی اس کی تمام کوششیں ناکامیاب ہوجاتیں۔ اس پاپی پنڈت کی دستگیری کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔

کشوری لال نے بھنّائے ہوئے انداز میں میرے دماغ کے خراب ہونے کی بات کی تھی مگر میں نے اس کی بات پر توجہ دینے کے بجائے آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم سوال کرو آفیسر' میں جواب دیتا ہوں۔"

میرے پر اعتماد لہجے نے آفیسر کو حیرت زدہ ضرور کیا ہوگا۔ اس الجھن زدہ حیرت کے اثرات اس کے چہرے پر بڑے واضح نظر آرہے تھے۔

اس نے پوچھا "تم دونوں کون ہو' کہاں سے آئے ہو اور تمہارے نام کیا ہیں؟"

"آفیسر! تم نے تو ایک ہی سانس میں تین سوالات کر ڈالے۔" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ دراصل میں اپنے طرزِکلام سے مفاہمت اور بے تکلفی کی فضا قائم کرنا چاہتا تھا جس میں مجھے خاطرخواہ کامیابی ہوئی تھی۔

وہ معتدل لہجے میں بولا "تم بھی چاہو تو ایک ہی سانس میں جواب دے ڈالو۔"

میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "ہم دونوں مسلمان ہیں' ڈھاکا سے آئے ہیں اور ہمارے نام مراد اور کلثوم ہیں۔"

میرے اس جواب نے پنڈت کشوری لال کے ساتھ ساتھ دھنو کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تاہم دھنو نے پلک جھپکتے میں اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ اب کافی عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ میری ایک ایک ادا اور ایک ایک انداز کو جاننے اور پہچاننے لگی تھی۔ وہ ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ میں نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر وہ بیان جاری کیا ہے لہٰذا خاموش رہتے ہوئے دھنو نے چہرے پر ایسے تاثرات سجالیے جیسے وہ میری بات کی تصدیق کررہی ہو۔ یہ اس کی سمجھداری تھی۔

پنڈت دیدے پھاڑے مجھے تک رہا تھا۔ اس کی مٹکا نما توند کچھ اور گول ہوگئی تھی۔ سرخ آنکھوں میں سفیدی کھنڈ گئی اور ٹھنی میں گردن ہلانے کے باعث اس کے سر پر موجود بالشت بھر چٹیا عجیب سے انداز میں پھدک رہی تھی۔ لگتا تھا' جیسے کوئی تنہا پتلی مضحکہ خیز انداز میں رقص کررہی ہو۔ بلا مبالغہ اس کے چہرے پر تیرہ بج رہے تھے' گویا اس کے چودہ طبق گل ہوچکے تھے۔

میرے جواب نے سرحدی محافظ کو بھی اچھلنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ محتاط لہجے میں بولا "کیا تم دونوں غیرقانونی طور پر سرحد پار کرکے یہاں پہنچے ہو؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے آفیسر۔" میں نے کہا۔ میرا انداز بے باک تھا۔

"مگر کہاں ڈھاکا... اور کہاں نگرپارکر کا یہ سرحدی گاؤں؟" آفیسر کے لہجے میں الجھن تھی "تمہاری بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "آفیسر' ڈھاکا بنگلہ دیش میں ہے اور نگرپارکر پاکستان میں۔ اس میں سمجھ میں نہ آنے کی کون سی بات ہے؟"

"میرا مطلب ہے' ان دونوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں۔" وہ بولا "پھر تم لوگ..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آفیسر! تمہاری یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ ان دو ملکوں کی سرحدیں آپس میں کہیں نہیں ملتیں مگر ایک تیسرے ملک کی سرحدیں ان دونوں ملکوں سے ملتی ہیں۔ ہم اسی تیسرے ملک میں کٹھن اور مصیبت بھرا سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

کتنے افسوس کی بات تھی کہ ایک جسم کے دو بازو ایک دوسرے سے کتنی دوری پر تھے۔ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش نہیں بنا تھا اس وقت بھی اور آج بھی دونوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں کہیں ملتی ہیں اور نہ ہی یہاں بسنے والے لوگوں کے دل۔ جس کے لیے دونوں طرف کے لوگ قصوروار ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے' مانیں یا نہ مانیں۔

وہ بخوبی سمجھ گیا کہ تیسرے ملک سے میری مراد انڈیا تھی۔ پنڈت کشوری لال کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "اور غیرقانونی طور پر بارڈر عبور کروانے میں تمہاری مدد اسی پنڈت نے کی ہوگی؟"

"تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں غالب کردار دھرم چند نے ادا کیا ہے' جو سرحد کے اس پار سوئی گام نامی گاؤں کا کھلیا ہے۔"

آفیسر اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا "جانتا ہوں' جانتا ہوں۔ ان لوگوں کے کام کرنے کا یہی طریقہ کار ہے۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی آفیسر نے پنڈت کو گھورا۔ وہ جزبز ہو کر رہ گیا۔ ایک ایک کرکے اس کے خلاف ثبوت جمع ہورہے تھے۔ اس کا چھٹکارا کسی بھی طور ممکن نہیں تھا۔

آفیسر نے مجھ سے پوچھا "تمہیں غیرقانونی طور پر سرحد عبور کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"مجبوری تھی!" میں نے مختصراً کہا۔

وہ قدرے سخت لہجے میں بولا "کیا مجبوری تھی۔ کیا تم دونوں کسی غیرقانونی دھندے میں ملوث ہو؟"

"قطعاً نہیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا "ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم بنگلہ دیش سے بھی غیرقانونی طور پر سرحد پار کرکے انڈیا میں داخل ہوئے تھے۔"

"مجبوری کی وضاحت کرو۔" آفیسر نے کہا۔

میں نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی کے مطابق جواب دیا "ہماری مجبوری تھی... "مسلم کش فسادات" ڈھاکا میں ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں کسی مذہبی معاملے پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی تھی جس کے نتیجے میں ہمارے گھر بھی لپیٹ میں آگئے۔ ہم بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ ہمارے گھر کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ہم دونوں ڈھاکا سے چھپتے چھپاتے کھلنا پہنچے۔ یہاں سے ہم انڈیا کے شہر کلکتہ میں داخل ہوگئے پھر تین ماہ کا تکلیف دہ سفر کرتے ہوئے کلکتہ سے آسنسول' پٹنہ' الہ آباد' کان پور' آگرہ' دہلی' جے پور' اجمیر' ماؤنٹ آبو' رن کچھ سے ہوتے ہوئے انڈیا کے سرحدی گاؤں سوئی گام پہنچ گئے جہاں سے گزشتہ رات اونٹوں کے ذریعے یہاں نگرپارکر کے اس گاؤں میں آپ لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔"

میرا یہ بیان بڑی حد تک مبنی برسچ تھا۔ مثلاً یہ کہ ہم واقعی کان پور' آگرہ' دہلی' جے پور' اجمیر' ماؤنٹ آبو' رن کچھ' سوئی گام وغیرہ سے گزر کر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے اپنی کہانی کچھ اس طرح سیٹ کی تھی کہ اس پر ہر سننے والا فوراً یقین کرلیتا پھر میرے لہجے کا اعتماد بھی میری سچائی پر دلالت کرتا تھا۔ میری "کوشش" کے بڑے مفید اور حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے تھے۔

آفیسر نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری بات پوری سنی اور حتمی لہجے میں بولا "تمہاری کہانی دل کو لگتی ہے جوان۔ تمہاری ایک ایک بات سے سچائی ٹپکتی ہے مگر...!"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور عجیب سی نظر سے دھنو کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں ہوس کے بجائے ستائش تھی۔ دھنو پر حسن اور جوانی کچھ اسی طور ٹوٹ کر برسی تھی کہ دیکھنے والے کی نظر چپک کر رہ جاتی تھی پھر جینز اور ٹی شرٹ میں وہ کچھ زیادہ ہی قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس لیے آفیسر کے عمل کو ردِعمل کہنا چاہیے۔

میں نے آفیسر کی نگاہ کا تعاقب کیا تو وہ جھینپ گیا پھر کھسیانا ہوکر مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا "مگر کیا آفیسر؟"

وہ گڑبڑائے لہجے میں بولا "مگر ابھی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔"

"وہ بھی پوچھ ڈالو۔" میں نے کہا۔

وہ دھنو کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "تم نے کیا نام بتایا تھا اپنی ساتھی کا۔ ہاں یاد آیا۔" اسے دھنو کا فرضی نام یاد آگیا تو کہنے لگا "تمہاری یہ ساتھی کلثوم ابھی تک منہ سے ایک لفظ نہیں بولی۔ ساری گفتگو تم ہی کررہے..."

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی اور خود کہا "کلثوم بے چاری پیدائشی گونگی ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ترحم آمیز نظر سے دھنو کو دیکھا جس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا تھا۔ تاہم اسی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ یہ اچھا ہوا کہ بات کرتے ہوئے آفیسر میری جانب دیکھ رہا تھا ورنہ دھنو کے چہرے کے تاثرات سے وہ ٹھٹک سکتا تھا۔

اس موقع پر پنڈت کشوری لال کی حالت دیدنی تھی۔ وہ میرے اس پر اعتماد جھوٹ پر دل ہی دل میں اش اش کر اٹھا ہوگا تاہم اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی تھی۔ وہ کوئی بھی بات کرکے اپنی راہ کے کانٹوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "آفیسر! ایک گونگا شخص ظاہر ہے' بات چیت نہیں کرسکتا۔ وہ مخصوص اشاروں ہی سے دوسرے کی بات سمجھتا ہے اور اپنی بات دوسرے کو سمجھاتا ہے البتہ کراہنے کی بات دوسری ہے۔"

کراہنے کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لیے بھی کردیا تھا کہ جب سرحدی محافظ کمرے میں آئے تھے تو اس سے پہلے دھنو اٹھ کر بیٹھی تھی اور کنکنے کی تکلیف کے باعث اس کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی تھی۔

میں نے دھنو کی جانب بولتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے وہ میری بات اور میرے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ اس کی غزالی آنکھوں نے بہ زبانِ خاموشی مجھے بڑے واضح انداز میں بتایا کہ میں جیسا چاہتا ہوں' وہ ویسا ہی عمل کرے گی اور یہ کہ

وہ میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ اپنی یادداشت میں محفوظ کرتی جارہی ہے تاکہ اسے عمل کے دوران میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں مطمئن ہو کر آفیسر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مسٹر مراد، تمہارا اس گونگی لڑکی سے کیا ناتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "ہمدردی کا رشتہ، انسانیت کا ناتا اور دوستی کا تعلق ہے میرا کلثوم سے۔ میرے خیال میں یہ سب سے زیادہ مضبوط بندھن ہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" آفیسر تائیدی انداز میں گویا ہوا "میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آیا یہ تمہاری رشتے دار ہے یا..." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھا اور بولا "تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی "بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

وہ ایک مرتبہ پھر بڑی شوخ نظر سے دھنو کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی کے ساتھ ساتھ ایک افسوس بھی موجود تھا جیسے گل کے ساتھ خار ہوتا ہے۔ شاید وہ اس بات سے دکھی ہو رہا تھا کہ اتنی دلکش اور پرشباب لڑکی گونگی کیوں تھی!

وہ بے چارہ سولہ آنے درست سوچ رہا تھا۔ دھنو گونگا پن، پھول کے ساتھ کانٹے والی بات ہی تھی۔ شاید چاند کا داغ بھی اسی کو کہتے ہیں!

میں نے بے تکلفی کی فضا قائم کر کے ماحول کی شدت کو بڑی حد تک کم کردیا تھا۔ وہ کانسٹیبل جس نے پہلے ہم لوگوں پر گن تان رکھی تھی۔ اب اس نے اپنے افسر کے اشارے پر گن کی نال کا رخ ہماری جانب سے ہٹالیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی دروازے سے لگا چوکس کھڑا تھا جیسے اپنے افسر کا اشارہ ملتے ہی وہ ہمیں گولیوں سے بھوننے میں کسی غفلت سے کام نہیں لے گا۔ اس کا آفیسر بھی خاصا مستعد تھا۔

میں نے اس موقع پر ایک اور پھلجھڑی چھوڑی۔ گن بردار کانسٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے آفیسر سے سوال کیا۔ "کیا تمہارا یہ ماتحت بھی گونگا ہے؟"

افسر نے زیرلب مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے کہا "جب سے تم لوگ آئے ہو اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں سمجھا شاید یہ بھی میری ساتھی کلثوم کی طرح قوتِ گویائی سے محروم ہے۔"

پتا نہیں، کیا بات تھی کہ اپنے وطنِ عزیز کی مٹی چھوتے ہی میرے دل کا کوئی شگفتہ دریچہ وا ہوگیا تھا۔ اپنے ملک کی فضا میں سانس لینا خاصا خوشگوار تجربہ ثابت ہو رہا تھا جس سے طبیعت میں ایک عجیب سی گدگدی کا احساس ہوتا تھا۔ میں ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان لوٹا تھا اور طویل عرصے تک قیام کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ آگے جو خدا کی مرضی!

تھوڑی دیر کی ہنسی خوشی کے بعد آفیسر پھر سنجیدہ ہوگیا "مسٹر مراد! تم ڈھاکا میں کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے ایک محلے کا نام لے دیا جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دراصل سنگاپور میں ہمارے اسٹور پر کام کرنے والے ایک ملازم کا تعلق ڈھاکا کے اسی محلے سے تھا اس لیے محلے کا نام مجھے یاد رہ گیا تھا جو اس وقت کام آگیا۔

میرے جواب نے آفیسر کو قدرے مطمئن کردیا مگر وہ سوال کرنے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ اس نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور تمہاری ساتھی یہ گونگی لڑکی کلثوم؟"

"یہ میری محلے دار ہے، یعنی پڑوسی۔" میں نے بتایا۔

"تم لوگوں نے بنگلہ دیش ہی میں کہیں پناہ کیوں نہیں تلاش کی۔" آفیسر مال کی کھال اتارنے پر کمربستہ تھا "پہلے انڈیا اور پھر پاکستان کا رخ کیوں کیا؟"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ گزشتہ رات ہم "بی ایس ایف" والوں کے ہتھے نہیں چڑھ گئے تھے ورنہ وہ ہمارا حشر خراب کردیتے۔ "بی ایس ایف" یعنی بارڈر سیکیورٹی فورس بھارت کے سرحدی محافظوں پر مشتمل ایک ادارہ ہے۔ جس طرح پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت "رینجرز" والے کرتے ہیں بالکل اسی طرح بھارت کی سرحدوں کی حفاظت "بی ایس ایف" والے کرتے ہیں۔ ہم ہرجنس کی رہبری میں "بی ایس ایف" والوں کی نظروں میں آئے بغیر رات کے اندھیرے میں خاموشی سے ریگستان کا وہ علاقہ عبور کر آئے تھے جو دونوں ملکوں کی سرحدوں کے درمیان واقع ہے۔ البتہ پاکستان میں اپنے پہلے پڑاؤ پر ہی یہاں کے سرحدی محافظ ہمارے سروں پر آن پہنچے تھے اور اب ایک آفیسر مجھ سے، گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوالات کر رہا تھا۔

میں نے آفیسر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "جناب! جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوجاتا ہے۔ بس یوں سمجھیں ہم بھی پریشانی میں انڈیا کا رخ کر بیٹھے اور ایک طویل سفر طے کر کے اب یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے اپنے لہجے میں درد اور غم کی کیفیت کو سمو دیا تھا جس سے آفیسر خاصا متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا "تم نے بتایا ہے کہ مسلم کش فسادات کے باعث تم لوگوں کو وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ آج کل پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی فضا خاصی گرم ہے۔ تم دونوں کو اس سلسلے میں کافی پریشانیاں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہارا تمام تر سفر غیر قانونی ہے؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آفیسر۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "آج کل واقعی انڈیا میں مسلمان دشمنی خاصی عروج پر ہے مگر ہم نے اس آگ سے بچنے کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔"

"کیسا انتظام مراد؟" آفیسر نے پوچھا۔

میں نے بتایا "ہم نے اپنے نام ہندوانہ رکھ چھوڑے تھے۔ میں نوود اور کلثوم آشا بن گئی تھی چنانچہ ہمیں مسلم دشمنی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

"تم تو خاصے چلتا پرزہ قسم کے بندے ہو مسٹر مراد۔" آفیسر نے مجھے گھورا۔

اس موقع پر پنڈت کشوری لال خاموش نہ رہ سکا، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "چلتا پرزہ قسم کے نہیں بلکہ یہ پکا راکشش ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں والا نام اور پاکستان میں مسلمانوں والا نام۔ مجھے اگر معلوم ہوتا..."

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا اور پریشانی سے سرحدی محافظوں کو تکنے لگا۔ شاید وہ کوئی ایسی بات کہنے جارہا تھا جو اسے مزید پھنسانے والی ہوتی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہرجنس نے اسے ہمارے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ تاہم میں نے ابھی تک کھیا دھرم چند کا رقعہ کشوری لال کو نہیں دکھایا تھا۔ البتہ وہ اس رقعے کی، میرے پاس موجودگی سے آگاہ ہوچکا تھا۔ جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو ہمارے درمیان رقم کے بارے میں مختصر گفتگو ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی، دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔

آفیسر نے پنڈت کی جانب مڑتے ہوئے کہا "اگر تمہیں معلوم ہو کہ مراد اتنا زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے تو تم اسے اپنے یہاں ٹھہرانے کا رسک نہیں لیتے۔ یہی کہنا چاہ رہے ہو نا تم؟"

پنڈت کشوری لال معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ آفیسر کے سوال کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اچانک بے حد محتاط نظر آنے لگا تھا۔

آفیسر نے اپنے ماتحت سے کہا "تم باہر سے باقی جوانوں کو بھی اندر بلالاؤ اور اس گھر کے چپے چپے کی تلاشی لو۔"

آفیسر کی بات سے پتا چلا کہ سرحدی محافظوں کے کچھ ساتھی باہر گلی میں موجود تھے پھر باتوں ہی باتوں میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ باہر گلی کے کونے پر ان کی جیپ کھڑی تھی جس میں مزید تین مسلح افراد بیٹھے تھے۔

اگلے چند لمحوں میں وہ کانسٹیبل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر آگیا۔ تیسرا شاید ڈرائیور تھا جو جیپ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ تینوں مسلح سرحدی محافظ پنڈت کشوری لال کے گھر کی تلاشی لینے میں مصروف ہوگئے۔

میں نے آفیسر سے پوچھا "ہمارے لیے کیا حکم ہے آفیسر؟"

"تم ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلو گے۔" اچانک اس کے لہجے میں کختی آگئی "لیکن اس سے پہلے تم دونوں کی مکمل تلاشی ہوگی۔"

"تلاشی!" میں نے متعجب نظر سے آفیسر کو دیکھا۔

"ہاں، جامہ تلاشی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا، پھر پوچھا "تم لوگوں کا سامان وغیرہ کہاں ہے؟ پہلے سامان چیک کراؤ پھر جامہ تلاشی ہوگی۔"

جامہ تلاشی کے ذکر پر بے اختیار میرا ہاتھ اپنی گردن پر چلا گیا پھر اس وقت میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ نیلگری کا دیا ہوا تحفہ وہ طلسماتی مالا میری گردن پر موجود نہیں تھی۔ میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ کل رات سے اب تک مجھے اس مالا کا خیال نہیں آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سوئی گام نامی گاؤں سے رخصت ہوتے وقت وہ مالا میری گردن میں موجود تھی۔

ہمارے لیے گزشتہ رات کا دشوار گزار اور تکلیف دہ سفر کسی بھیانک خواب کے مانند تھا۔ اس دوران میں ہمیں اپنا خیال تک نہیں رہا تھا، مالا کی طرف دھیان کیسے جاتا۔ اب دھیان گیا تھا تو مالا میرے جسم پر سے غائب تھی۔ میں نے اضطراری انداز میں اپنے پورے جسم کو ٹٹول ڈالا مگر مالا کی کوئی خبر نہ ملی۔ مجھے ایک لمحے میں یقین ہوگیا کہ وہ نادر الوجود مالا مجھ سے بچھڑ چکی ہے۔ میرے دل سے ایک آہ سی خارج ہوئی۔ مالا سے جدائی مجھے ایک بے نام سی کسک میں مبتلا کر گئی تھی۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔

یہ غنیمت تھا کہ آفیسر اس وقت میری جانب متوجہ نہیں

تھا۔ وہ ہمارے سامان کے بارے میں سوال کر کے کمرے میں متلاشی نظر سے اس سامان کو ڈھونڈنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے اندرونی جذبات اور چہرے پر ابھر آنے والے تاثرات پر قابو پالیا' مبادا آفیسر میری حالت دیکھ کر کسی شک میں مبتلا ہو جائے۔

میرا ذہن مسلسل مالا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نیلگری سے ہونے والی آخری ملاقات کی ایک ایک تفصیل مجھے یاد تھی۔ مالا کی گمشدگی کے بعد میرے تصور کے پردے پر نیلگری کی ایک ایک بات' ایک ایک جملہ روشن ہو رہا تھا۔ مہاویگی گوتم بھوش اور اس کے چیلے پنڈت دھیراج کو شرمناک شکست دینے کے بعد میں نے انہیں عبرت ناک موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ گومپو کی بدھ عبادت گاہ سے واپسی کے سفر میں ہم مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے "لمبینی" نامی قصبے میں بھی رکے تھے۔ اس قصبے کو گوتم بدھ یعنی لارڈ بدھا کی جنم بھومی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

لمبینی میں نیلگری نے مجھ سے آخری بات چیت کی تھی۔ وہ یک طرفہ گفتگو تھی۔ نیلگری خاموش لبوں سے بول رہی تھی اور میں ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کی پدھر آواز سن رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد ملاقات تھی۔ اسی ملاقات کے دوران میں نیلگری نے مجھے وہ مالا دوبارہ دے دی تھی۔ میں اپنی غفلت میں گوتم بھوش سے مقابلہ کرتے ہوئے اس مالا کو گومپو کی قدیم عبادت گاہ ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک موقع پر میں نے یہ مالا کھینچ کر گوتم بھوش پر دے ماری تھی۔

نیلگری نے یہ مالا اپنی مخروطی انگلیوں سے میری گردن میں پہناتے ہوئے کہا تھا "وجدان! یہ مالا تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔ کبھی ملنے کو دل چاہے تو اس کا بڑا پتھر منہ میں ڈال کر چوس لینا۔ ویسے میں تمہارے آس پاس ہی رہوں گی۔ تم اپنا جاپ مکمل کرلو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں گی۔" پھر وہ میری پیشانی پر ایک کیف آور بوسہ ثبت کر کے ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

پھر میرا ذہن نیلگری کی یاد میں کچھ اور پیچھے چلا گیا۔ بدھ کی قدیم عبادت گاہ گومپو میں بھی اس نے میری سماعت میں ایک سریلی سرگوشی کی تھی "وجدان' تم نے گوتم بھوش جیسے شیطان کو ختم کر کے مجھ پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ تمہاری نیت کے خلوص نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے' میں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔ تمہارے دشمن زیر پا ہوں گے اور فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی لیکن۔۔۔"

وہ اچانک خاموش ہو گئی تو میں نے مضطرب انداز میں پوچھا "لیکن کیا نیلگری؟"

اس نے بوجھل آواز میں جواب دیا تھا "لیکن تمہاری نیت کی معمولی سی کھوٹ بھی تم سے یہ سب کچھ چھین لے گی اور میں جانتی ہوں۔۔۔ کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب شیطانی قوتیں پھر تم پر حملہ آور ہوں گی اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں گے۔ میں تمہاری ثابت قدمی کے لیے دعا کرتی ہوں لیکن یہ سب کچھ بہرحال تمہارے ہی اختیار میں ہوگا۔ میں پھر تم سے یہی کہوں گی کہ تم اپنا جاپ مکمل کرلو۔ میں تمہاری کنیز بن کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاؤں گی۔"

میں نیلگری کے حسین اور دل نشیں تصور میں کھویا ہوا تھا کہ آفیسر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ایک دیوار کی جانب اشارہ کر کے پوچھ رہا تھا "کیا وہ بیگ تمہارا ہی ہے؟"

میں نے آفیسر کے اشارے کا تعاقب کیا۔ اس نے بالکل درست بیگ کی نشان دہی کی تھی۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا وہ سفری بیگ ہمارا ہی تھا جس میں روزمرہ کی چیزوں کے علاوہ ہمارے کپڑے تھے۔ بیگ میں قابلِ اعتراض کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

میں نے آفیسر کے سوال کا مثبت جواب دیا "ہاں' یہ بیگ ہمارا ہی ہے۔"

دس منٹ تک وہ بڑے ماہرانہ انداز میں ہمارے بیگ کی تلاشی لیتا رہا پھر ہماری جانب بڑھتے ہوئے بولا "اب تم دونوں باری باری جامہ تلاشی دو۔"

میں نے کہا "آفیسر! میں مرد ہوں۔ تم بخوشی میری تلاشی لے لو لیکن میری ساتھی کلثوم ایک لڑکی ہے۔ اس کی جامہ تلاشی کے لیے اگر کسی لیڈی سرچر کا انتظام ہو جائے تو۔۔۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "اس کی ضرورت نہیں۔"

"تو۔۔۔؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے کہا "تو یہ کہ تمہاری ساتھی اپنے لباس کی تمام جیبیں الٹ کر دکھا دے۔ میں مطمئن ہو جاؤں گا۔"

آفیسر کی تجویز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک معقول اور شریف النفس انسان تھا۔ میرے اشارے پر دھنو نے پہلے اپنی ٹی شرٹ کی ننھی سی اکلوتی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے الٹ دیا۔ یعنی جیب کے کپڑے کو باہر نکال کر الٹا دیا۔ وہ جیب بالکل خالی تھی۔ آفیسر نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

دھنو نے جو جینز پہن رکھی تھی اس کی جیبوں میں بھی

قابلِ گرفت چیز کوئی نہیں تھی۔ تاہم آفیسر کی تسلی کے لیے انہیں الٹا کر دکھانا ضروری تھا۔ جب دھنو نے یہ "کوشش" کی تو بخیے کی تکلیف نے اسے باقاعدہ کراہنے پر مجبور کر دیا۔

"اس کے پاؤں میں کیا ہوا ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دھنو کے بخیے پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا پھر کہا "آپ لوگوں کی آمد سے کوئی آدھا گھنٹا پہلے اس گاؤں کا حکیم کلثوم کے بخیے کی موچ نکال کر گیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ چند روز تک اسے درد برداشت کرنا ہوگا۔"

دھنو کے جوگرز بھی اتروائے گئے اور موزوں تک کو الٹ کر دیکھ لیا گیا لیکن کوئی ایسی چیز آفیسر کے ہاتھ نہ لگی جو ہمارے لیے پریشانی کھڑی کرتی۔

دھنو کی تلاشی کے بعد آفیسر مطمئن ہو کر میری جانب بڑھا۔ میرے لباس میں بھی ایسی کوئی شے نہیں تھی جسے قابلِ اعتراض کہا جاتا۔ البتہ دھرم چند کا دیا ہوا رقعہ آفیسر کو کسی شک میں ڈال سکتا تھا مگر میں اس رقعے کے حوالے سے اٹھنے والے تمام سوالات کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا اس لیے فکرمندی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم ٹھاکر بھانوت کی ہدایت اور مشورے کے مطابق اپنے ساتھ ایسی کوئی بھی شے لے کر نہیں آئے تھے جو کسی نازک موقع پر ہماری جان کا وبال بن جاتی۔

پہلے میرے جوگرز چیک کیے گئے اور اب آفیسر جامہ تلاشی لیتے ہوئے میرے بدن کو بھی ٹٹول رہا تھا۔ جب اس کے فولادی ہاتھ میری گردن پر پہنچے تو ایک مرتبہ پھر مجھے نیلگری کی مالا کا خیال آگیا۔ مالا کا زیاں میں کسی بھی طور بھول نہیں سکتا تھا۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ مالا ریگستان کے کسی مقام پر میری گردن سے جدا ہو گئی تھی' خاص طور پر اس وقت جب فائرنگ کی آواز سن کر ہم اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔۔۔ ہم کیا' ہمارے اونٹ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ فائرنگ سرحدی محافظوں کی ایک جیپ سے کی جا رہی تھی جن کا غالباً کسی اسمگلر پارٹی سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ جیپ پر لگی لائٹ مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ نکل رہی تھی جس کی آواز سے ہمارے اونٹ بدک گئے تھے پھر جب دھنو اپنے اونٹ سے نیچے گر گئی تو میں نے بھی اپنے اونٹ سے چھلانگ لگا دی تھی۔ ہم اپنی جان بچانے کے لیے ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں میں گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہرنس اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنے اونٹ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ریت کے ٹیلوں میں الٹنے لڑھکنے کے دوران میں وہ قیمتی مالا کسی طرح میری گردن سے نکل گئی تھی جس کا حصول اب تقریباً ناممکنات میں تھا۔ میں واپس ریگستان کے اس خطرناک حصے میں جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ مالا از خود اڑ کر میری گردن تک پہنچ سکتی تھی البتہ نیلگری سے کچھ بھی بعید نہیں تھا مگر میں اس وقت پیش آمدہ صورتِ حال سے برسرِ پیکار تھا۔ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" آفیسر کے سوالیہ جملے نے مجھے خیالات کی نگری سے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایک کاغذ میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھ رہا تھا "اس کاغذ پر ہندی زبان میں کیا لکھا ہوا ہے؟"

میں نے چونک کر آفیسر کے ہاتھ میں وہ اس کاغذ کو دیکھا۔ وہ پنڈت کشوری لال کے نام دھرم چند لکھا کا دیا ہوا ہی رقعہ تھا جس کے مطابق پنڈت نے مجھے پچاس ہزار روپے دینا تھے۔ آفیسر وہ رقعہ میرے لباس سے برآمد کر چکا تھا۔

میں نے کہا "آفیسر! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ انڈیا کے سرحدی گاؤں سوئی گام کے کھیا دھرم چند نے ہمیں ادھر پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ یہ اسی کا دیا ہوا خط ہے۔ اس کے مطابق پنڈت کشوری لال ہمیں بحفاظت کراچی تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔"

میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا ذکر دانستہ گول کر دیا تھا۔ آفیسر غالباً ہندی تحریر کو پڑھنے سے قاصر تھا۔ وہ ناواقفیت کے انداز میں اس رقعے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد وہ رقعہ پنڈت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کشوری لال! اسے تم ہی پڑھ کر سناؤ۔"

کشوری لال نے ہچکچاتے ہوئے وہ رقعہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے گریز آمیز انداز کو دیکھتے ہوئے رینجرز آفیسر نے کہا "گھبراؤ نہیں' یہ کوئی زہریلا سانپ نہیں بلکہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جو تمہیں ذرا سی بھی گزند نہیں پہنچائے گا۔"

پنڈت نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "میرے لیے تو کاغذ کا یہ پرزہ کسی خطرناک ناگ سے کم نہیں مہاراج۔"

"ہاں' تم صحیح کہتے ہو۔" آفیسر نے کہا "اس رقعے کی تحریر تمہارے کالے کرتوتوں کا بیّن ثبوت پیش کرے گی۔ واقعی یہ کاغذ تمہارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہونے والا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "لیکن پنڈت! کسی ہیرا پھیری کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ ایک ایک لفظ ٹھیک ٹھاک پڑھنا۔"

میں نے ہندوستان میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا جس کی وجہ سے میں ہندی رسم الخط کو اچھی طرح پڑھنے' سمجھنے اور لکھنے لگا تھا۔ بول چال میں تو ہندی بڑی حد تک اردو کے مماثل ہے اس لیے مجھے بولنے اور سمجھنے میں کبھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کے تحت ہندی کے ٹھیٹ الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔

کہتے ہیں' ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایسا کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وقت پڑنے پر انسان مشکل سے مشکل کام بھی سیکھ ہی جاتا ہے۔ جو لوگ چٹے ان پڑھ ہوتے ہیں' قسمت کی یاوری جب انہیں یورپ یا امریکا کے کسی ایسے ملک میں سیٹل کردیتی ہے جہاں انگلش بولی جاتی ہو تو وہ تھوڑے ہی عرصے میں فر فر انگریزی بولنے لگتے ہیں۔

پنڈت کشوری لال نے وہ رقعہ پڑھ کر سنا دیا۔ تاہم یہاں اس کی سازشانہ ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ رقم کے معاملے میں ڈنڈی مار گیا تھا۔ میں نے تو کسی مصلحت کی بنا پر پچاس ہزار روپے کا ذکر نہیں کیا تھا مگر پنڈت کی عیاری آمیز بے ایمانی پر میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

"پنڈت! تم نے آفیسر کی تنبیہہ کو نظر انداز کرکے اپنے لیے گڑھا کھودا ہے۔" میں نے کشوری لال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کک... کیوں۔" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا "مم... میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

میں نے تمہید انداز میں کہا "تم نے رقعے کے چند نہایت اہم مندرجات کو حذف کرکے پڑھا ہے۔ یاد ہے' آفیسر نے اس سلسلے میں تمہیں وارننگ بھی دی تھی!"

میرے انکشاف پر آفیسر نے نفرت آمیز نظر سے پنڈت کشوری لال کو گھورا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم بتاؤ مراد' پنڈت نے کہاں گڑبڑ کی ہے؟"

میں نے اسے اصل بات سے آگاہ کردیا۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا اور کہا "کیا تم ہندی تحریر پڑھ لیتے ہو؟"

میں نے مصلحت کے تقاضے کے پیش نظر نفی میں گردن ہلا دی ورنہ مجھے انڈیا کا کوئی خفیہ ایجنٹ بھی سمجھا جاسکتا تھا جبکہ میں اب تک کے اپنے بیان میں خود کو بنگلہ دیش کا باشندہ ظاہر کرچکا تھا۔

آفیسر نے سوال کیا "پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ خط میں پچاس ہزار روپے پاکستانی کرنسی کا ذکر موجود ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا "دھرم چند نے یہ رقعہ میرے حوالے کرتے ہوئے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ چونکہ زبان کے دھنی ہوتے ہیں اس لیے میں نے دھرم چند کی بات کا اعتبار کرلیا لیکن۔" میں نے ذرا توقف دے کر پنڈت کو گھورا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن پنڈت کی تازہ ترین چالاکی کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس "شعبے" میں اس جیسی کچھ کالی بھیڑیں بھی ہوتی ہیں۔"

میرے تبصرے پر آبنوسی رنگت کا مالک پنڈت کشوری لال پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پچاس ہزار روپے کے ذکر پر آفیسر خاصا چوکنا اور محتاط ہوگیا تھا۔ اس نے ہم سب کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلو گے۔"

پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر باقاعدہ منت سماجت شروع کردی مگر آفیسر نے اس کی ایک نہ سنی اور حتمی انداز میں کہا "تمہیں جو بھی رونا گانا اور چیخنا چلانا ہے وہ ہیڈ کوارٹر میں جاکر شوق پورا کرلینا۔"

میں نے معتدل لہجے میں آفیسر سے پوچھا "تم ہمیں کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

"میں تم دونوں کو اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کروں گا۔" اس نے کہا۔

"مگر میں نے تو تمہارے تمام سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔" میں نے قدرے برہم لہجے میں کہا۔

"اب تمہیں مزید جو کچھ بھی کہنا ہو' اعلیٰ افسر کے روبرو کہنا۔" وہ دوٹوک انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔

"مگر تم..." میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"نو آرگومنٹس۔" اس نے سختی سے میری بات کاٹ دی۔

میں جھنجلا کر خاموش ہوگیا۔ پنڈت کی عیاری سے میں خواہ مخواہ جذباتی ہوگیا تھا۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا وہ آخر ہو کر رہی تھی۔ آفیسر اتنی بڑی رقم کے ذکر پر محتاط ہوگیا تھا۔ بہرحال مجھ سے ایک غلطی ہوچکی تھی جس کی کسی موقع پر خوب صورتی سے تلافی کی ضرورت تھی۔ فی الحال آفیسر سے بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔

اسی وقت خانہ تلاشی لینے والے واپس آگئے۔ وہ خالی ہاتھ اور مایوس چہروں کے ساتھ پنڈت کے گھر کے اندرونی حصے سے برآمد ہوئے تھے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان کے ہاتھ کوئی قابلِ اعتراض شے نہیں لگی تھی۔

پنڈت کشوری لال واقعی ایک عیار اور چالباز شخص تھا۔ اس نے اسمگلنگ کے مال کو گھر سے دور رکھا تھا۔ علی الصباح جب ہرنس راہنما ہرنس کے ساتھ اس بستی میں پہنچے تھے تو ہرنس نے پیر بخش نامی ایک شخص کو اونٹوں سے "مال" اتروانے کا حکم دیا تھا۔ اسمگلنگ کا وہ مال یقیناً کسی دوسرے محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا۔

"سر! ہم نے اس مکان کا کونا کونا اور چپا چپا دیکھ لیا ہے۔" اس کانسٹیبل نے بتایا جو آفیسر کے ساتھ ہی ہمارے سروں پر نازل ہوا تھا۔

میں اس سرحدی محافظ کا ذکر کانسٹیبل کے طور پر کررہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نیم عسکری فورس یعنی "رینجرز" میں اس عہدے پر فائز تھا البتہ پولیس میں اس حیثیت کے شخص کو کانسٹیبل اور آرمی میں سپاہی یعنی سولجر کہا جاتا ہے۔

آفیسر نے سخت لہجے میں دریافت کیا "تو پھر؟"

کانسٹیبل نے کہا "سر! ہمیں کوئی بھی قابلِ گرفت چیز نہیں ملی۔"

اس موقع پر پنڈت کشوری لال چلایا "مہاراج! دیکھ لیا آپ نے۔ میں نے تو آپ کو بتایا تھا کہ میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ اسمگلنگ کے دھندے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔" پھر وہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس بندے کے سلسلے میں مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے وہ آپ معاف کردیں۔ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔"

آفیسر نے پنڈت کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا "ان تینوں کو لے جاکر جیپ میں بٹھاؤ۔ ہری اپ!"

حکم حاکم مرگ مفاجات۔ ہمیں گنوں کے نشانے پر رکھتے ہوئے جیپ میں سوار کروایا گیا جو گلی کے سرے پر کھڑی تھی۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر رینجرز کا ایک جوان بالکل مستعد بیٹھا تھا۔ آفیسر نے پسنجرز سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے جیپ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوچکی تھی۔

میری معلومات کے مطابق ہماری منزل رینجرز کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ دھنو خاصی سہمی ہوئی تھی۔ اب تک اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ خاص طور پر جب سے میں نے اسے گونگا ظاہر کیا تھا' لگتا تھا وہ واقعی گونگی ہوگئی ہو۔

ہمیں جیپ میں اگلے سرے پر بٹھایا گیا تھا یعنی ڈرائیونگ کیبن کے عین پیچھے۔ تینوں مسلح رینجرز کے جوان ہمارے بعد بیٹھے تھے۔ یہ آمنے سامنے کی دو سیٹیں تھیں۔ ایک سیٹ پر دھنو' میں اور ایک کانسٹیبل بیٹھا تھا جبکہ سامنے والی نشست پر پنڈت کشوری لال کے بعد دو کانسٹیبل موجود تھے۔ ہم سب اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ میرے عین سامنے وہ کانسٹیبل تھا جو آفیسر کے ساتھ سب سے پہلے پنڈت کے گھر پہنچا تھا۔ ہمارے سامان والا بیگ جیپ کے فرش پر رکھا تھا تاہم اس پر سرحدی محافظوں ہی کا قبضہ تھا۔

میں نے وقت گزاری اور اپنی معلومات کی خاطر اپنے روبرو بیٹھے کانسٹیبل سے بات چیت شروع کردی۔

"بھائی! یہ تو بتاؤ' تم لوگوں کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے کتنا دور ہے؟"

میرا سوال بہت عام سا اور برمحل تھا اس لیے اس نے جواب دینے میں کوئی تردد نہیں کیا' بولا "زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے پوچھا "تمہارا جو آفیسر جیپ کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہے' اس کا عہدہ کیا ہے؟"

"وہ صوبے دار صاحب ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تم لوگوں کا اعلیٰ افسر کون ہے؟"

"کپتان صالح رحیم صاحب۔"

"کپتان صاحب کس قسم کے آدمی ہیں؟"

اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور کہا "تم اپنی زبان بند ہی رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔"

میں نے اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے کانسٹیبل کی ایک "خفیہ حرکت" کو نوٹ کرلیا تھا۔ مذکورہ کانسٹیبل نے مجھ سے بات کرنے والے کانسٹیبل کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ٹھوکا دیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھ سے زیادہ "فری" ہونے کی ضرورت نہیں۔

میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے سامنے والے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے لجاجت آمیز انداز میں کہا "اچھا بھائی' بس ایک بات بتادو۔ ہیڈ کوارٹر کے ذکر پر پنڈت کشوری لال کا پتا پانی کیوں ہوگیا تھا۔ کیا وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور ڈراؤنی جگہ ہے؟"

جواب دینے کے بجائے کانسٹیبل نے مجھے بری طرح جھڑک دیا "کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟"

"سنی ہے جناب۔" میں سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر اسے دھیان میں رکھو۔" دوسرے کانسٹیبل نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "اگر اب تم نے کوئی سوال کیا تو تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔"

میں اپنے ساتھ کسی برے سلوک کی خواہش نہیں رکھتا تھا اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دھنو تو گونگی بنی

ہی ہوئی تھی' ناچار میں بھی گونگا بن گیا۔ یہ گونگلوں کی ایک ایسی جوڑی تھی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی تھی۔ اچھے خاصے ہنستے بولتے' قہقہے اچھالتے دو انسانوں کو وقت کے جبر اور حالات کی مصلحت نے گونگا بن کر چپ بیٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔

کانسٹیبل کی فراہم کردہ معلومات کے بالعکس پندرہ بیس منٹ کے بجائے ہماری جیپ ریت اڑاتی لگ بھگ آدھے گھنٹے میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔

رینجرز کا ہیڈ کوارٹر ایک متروک حویلی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ اب کھنڈر کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ بس دو تین کمرے استعمال کے قابل تھے جنہیں رینجرز والوں نے ٹھیک ٹھاک کرکے اپنی چوکی قائم کر رکھی تھی۔ دراصل اسی چوکی کو ہیڈ کوارٹر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

ہمیں ایک کمرے میں لے جاکر بٹھایا گیا۔ وہ ایک عام سا کمرا تھا جس میں ایک میز کے سامنے چند آہنی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک آہنی بینچ بھی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دفتری ضروریات سے زیادہ اٹھنے بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہم پر کڑی نظر رکھنے کے لیے ایک مسلح جوان کمرے کے دروازے میں اٹین شن کھڑا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد مجھے اس صوبے دار کی شکل دکھائی دی جو صبح پنڈت کے گھر پہنچا تھا اور ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر مجھ سے کہا "کپتان صاحب! آپ دونوں کو یاد کررہے ہیں۔"

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا "پنڈت کا کیا ہوا؟"

"پنڈت کو بھول جاؤ۔" وہ کرخت انداز میں بولا۔

"پھر بھی۔"

میں نے پنڈت کشوری لال کے بارے میں جاننا چاہا مگر صوبے دار نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "تمہیں صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پنڈت کے ساتھ ہم اس کے "شایانِ شان" ہی سلوک کریں گے مگر تم نے اگر کپتان صاحب کے سامنے اپنی دروغ گوئی جاری رکھی تو سمجھ لو' تمہارا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا۔"

صوبے دار کی دھمکی آمیز گفتگو سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ کھیل بگڑ چکا ہے۔ صوبے دار نے میری دروغ گوئی کا حوالہ دے کر مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ اس نے میری کہانی کو یقین کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے دھنو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر ہم صوبے دار کی معیت میں چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے جس کے اندر کپتان صالح رحیم موجود تھا۔

صوبے دار نے کمرے کے دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی اور ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کردیا۔

ہم نے صوبے دار صاحب کے اشارے کی تعمیل کی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ہمارے عقب میں دروازہ بند ہوگیا۔ یقیناً دروازہ صوبے دار نے بند کیا تھا۔ ہم گھوم کر صالح رحیم کی جانب متوجہ ہوگئے۔

کپتان صاحب کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ وہ نہایت متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر ذہانت اور تجربہ جھلکتا تھا۔ کپتان کی کنپٹیوں کے بال سفید ہوچکے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک جہاں دیدہ' بردبار اور پختہ مشیے کا ماہر دکھائی دیتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کی شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

کپتان صالح رحیم کے اشارے پر ہم اس کی میز کے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے اپنی میز پر موجود چیزوں کی ترتیب بدلتا رہا پھر ہماری جانب دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں گویا۔

"تم لوگوں نے اپنے نام مراد اور کلثوم ہی بتائے تھے نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا "جی کپتان صاحب۔"

وہ بڑے مشفقانہ انداز میں بتانے لگا "مسٹر مراد! گزشتہ رات سرحد کے اس پار ریگستان میں اسمگلروں کی ایک پارٹی سے ہماری مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔" وہ کچھ اس انداز میں بول رہا تھا جیسے ہم اس کے پرانے شناسا ہوں۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "ہم نے اپنی جیپ سے ان پر فائرنگ کی تھی۔ لائٹ مشین گن سے برسنے والی گولیوں نے اسمگلروں کو وہیں ریت پر اس طرح ڈھیر کردیا کہ ان کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "یہ ایل ایم جی کی گولیاں اتنی ہی سفاک ہوتی ہیں۔"

ہم خاموشی سے کپتان صالح رحیم کو دیکھ رہے تھے۔ دھنو تو خاموش رہنے پر مجبور تھی کہ اسے گونگا ظاہر کیا گیا تھا مگر میں بھی چپ چاپ بیٹھا کپتان کو سن رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "برخوردار! میں نے جس اسمگلر پارٹی کا ذکر کیا ہے وہ چار افراد پر مشتمل تھی۔ ان چاروں نے ہماری جوانوں پر جوابی فائرنگ بھی کی تھی لیکن خدا کا شکر ہے ہمارے جوانوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔ اسمگلروں کے دو ساتھی ہماری فائرنگ سے موت کے گھاٹ اتر گئے اور باقی دو۔۔۔!"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے ہمیں دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے توقع ہو کہ میں فوراً بول اٹھوں گا لیکن میں نے اس کی توقع کے خلاف زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ میں اپنے اندرونی تجسس کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

"باقی دو میں سے۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "یعنی ایک بندہ اور ایک بندی ابھی تک ہمارے ہتھے نہیں چڑھے۔"

اتنا کہہ کر وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے ایک مرتبہ پھر باری باری ہمارے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ دھنو "گونگی" تھی۔ میں بھی "گونگا" بنا بیٹھا رہا۔

کپتان صالح رحیم نرم آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا "آج صبح ہمیں اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی کہ دو افراد غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرکے ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ دونوں پنڈت کشوری لال کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" ایک لمحے کو توقف دے کر کپتان نے اپنی میز کی دراز کھولی' ایک نظر اندر جھانکا' دراز کو بند کیا پھر ہماری جانب متوجہ ہو کر بولا۔

"میں نے صوبے دار محمد رمضان کو فوراً پنڈت کے گھر کی طرف روانہ کردیا مگر نتیجہ ہماری توقع کے مطابق برآمد نہ ہوا۔ پنڈت کے گھر پر تم دونوں سے صوبے دار کی ملاقات ہوگئی۔ تم ہمارے مطلوبہ بندے تو نہیں ہو لیکن۔۔۔"

کپتان جملے کو نامکمل چھوڑ کر مجھے تکنے لگا۔ اس موقع پر میں نے بولنا ضروری سمجھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں کہا "لیکن کیا کپتان؟"

"لیکن۔" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا "لیکن یہ برخوردار کہ تم دونوں غلط طریقے سے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہو۔ تمہارا یہ جرم نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔"

میں نے بیزاری سے کہا "میں اپنی مجبوری کی وضاحت کرچکا ہوں۔"

"یقیناً۔" کپتان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا "تم سے پوچھ گچھ کی مکمل رپورٹ صوبے دار رمضان مجھے دے چکا ہے جس کے مطابق تم نے متعدد جھوٹ بولے ہیں۔ ہم تمہاری کہانی پر کیسے یقین کرلیں؟"

"میں نے کون سے جھوٹ بولے ہیں؟" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں بتاتا ہوں کیونکہ یہ جاننا تمہارا حق ہے۔" کپتان نے معتدل اور سنجیدہ انداز میں بولنا شروع کیا "تمہارے بیان کے مطابق تم دونوں بنگلہ دیش سے انڈیا اور پھر انڈیا سے پاکستان آئے ہو۔ بنگلہ دیش میں مسلم کش فسادات میں تم دونوں کے گھر والے جان ہار گئے تھے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "برخوردار! میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔ پورے پاکستان کے علاوہ دنیا کے چودہ پندرہ ممالک میں مجھے رہنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے بنگلہ دیش میں بھی تین سال گزارے ہیں۔" ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا پھر گمبھیر لہجے میں بولا "تم دونوں کا رنگ و روپ' قد کاٹھ اور صحت و جسمانی بنگلہ دیش سے لگا نہیں کھاتی پھر ہر ملک اور ہر خطے میں بسنے والوں کے کچھ مخصوص خال و خط ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی تم دونوں میں بنگالیوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میرا مشاہدہ اور علم یہ بتاتا ہے کہ تمہارا تعلق پاکستان یا ہندوستان سے ہے جبکہ تمہاری ساتھی تھائی لینڈ' چائنا یا تبت کی رہنے والی ہے۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

سوال کرکے وہ جواب طلب نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ کپتان نے تو ہمارا ایکسرے کرڈالا تھا۔ اس کی تجربہ کار نگاہ کی داد دینے کو دل چاہ رہا تھا مگر یہ موقع تفریح کا نہیں تھا۔ کپتان کے انکشاف نے ہم دونوں کو پریشان کردیا تھا۔ میں قدرے الجھ گیا۔ دھنو بھی ہراساں نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جب ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہ بولا تو کپتان نے کہا "مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ تمہارے چہروں کے تاثرات نے مجھے بتادیا ہے کہ میرا قیاس صد فی صد درست ہے۔"

وہ چند لمحے اپنے دونوں ہاتھوں کو گھورتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا "مسٹر مراد! مجھے نہیں یقین کہ تمہارا نام مراد اور تمہاری ساتھی کا نام کلثوم ہے۔ اس سلسلے میں بھی تم نے یقیناً دروغ گوئی سے کام لیا ہوگا۔ سچ بتاؤ' تم دونوں کون ہو' کہاں سے آئے ہو اور تمہارے نام کیا ہیں۔ پاکستان میں تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟"

بات ختم کرتے کرتے کپتان کے لہجے میں خاصی سختی آگئی تھی۔ اب وہ پہلے والا نرم خو اور مہربان افسر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ بڑی حد تک سچ بول کر ان

سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "کپتان صاحب! آپ کا اندازہ بڑی حد تک درست ہے۔ میں پیدائشی طور پر پاکستانی ہوں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ سنگاپور میں گزرا ہے۔" پھر میں نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میری دوست ہے' اس کے آباؤ اجداد کا تعلق تبت سے تھا۔" اس کے بعد میں نے ناگفتی اور انتہائی ذاتی واقعات کو چھپاتے ہوئے کپتان کو اپنے اور دھنو کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں بعض واقعات پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی تھیں بہرحال' میں نے اسے ایک خاص حد سے آگے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میری زندگی کی کہانی کا لب لباب یہ تھا کہ میں شر کے خلاف حق کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ میرے اثر انگیز اور جامع بیان نے کپتان کو مطمئن کردیا۔ اس نے بعض سوالات بھی کیے جن کے میں نے تسلی بخش جواب دیے۔ میں نے کپتان کو اپنے اصل نام بھی بتادیے تھے۔ ظاہر ہے' دھنو کا "گونگا پن" بھی مجھے "ختم" کرنا پڑا تھا۔ میرے انکشاف پر کپتان نے نرمی سے کہا۔

"اس بات کا ہمیں صبح ہی پتا چل گیا تھا۔"

"صبح ہی؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "ہاں صبح ہی۔ ہمارے مخبر نے ہمیں بتایا تھا کہ زخمی لڑکی نے اپنے ٹخنے کی موچ نکلوانے سے پہلے تم سے اور موچ نکلوانے کے بعد حکیم جی سے کیا باتیں کی تھیں۔"

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ کپتان نے بات ہی ایسی کی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کیا وہی حکیم آپ کے لیے مخبری کرتا ہے؟"

جب پنڈت کے گھر میں حکیم دھنو کا ٹخنا دیکھنے آیا تھا تو اس وقت بیٹھک نما کمرے میں میرے' دھنو اور کشوری لال کے سوا کوئی چوتھا فرد موجود نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے تو کوئی انفارمر ہو نہیں سکتا تھا۔ آجا کر حکیم پر ہی تان ٹوٹتی تھی پھر کپتان نے دھنو کی حکیم سے بات چیت کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے سارا شک حکیم کی طرف ہی جاتا تھا۔

کپتان میرا سوال سن کر زیر لب مسکرایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "تمہارا یہ سوال مجھ تک نہیں "پہنچا" تم اپنے طور پر جو بھی نتیجہ اخذ کرلو' تمہیں اس کا حق ہے۔ ماشاءاللہ' تم تو خاصے تجربے کار سیلانی اور مہم جو ہو۔"

کپتان نے بڑے مبہم الفاظ میں میری تعریف کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی زبان سے حکیم کے مخبر ہونے کا اقرار نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اس کا انداز ہی میرے لیے مثبت جواب تھا۔ حکیم کے سوا اور کوئی شخص یہ خبر ان تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میں نے اپنے مطلب کی طرف کپتان کی توجہ دلاتے ہوئے پوچھا "اب ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ آپ لوگوں کو ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"تم دونوں کو مزید دو تین گھنٹے ہماری چوکی پر رکنا ہوگا۔" کپتان نے جواب دیا "محکمہ جاتی ضروری کارروائی کے بعد آپ کو مقامی پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔"

"پولیس کے حوالے کیوں جناب؟"

"ہمارے بعد ان کا کام شروع ہوتا ہے اس لیے۔"

"تو اس کا مطلب ہے' آپ ہم سے مطمئن نہیں ہیں جناب!"

"ایک حد تک مطمئن ہوئے ہیں۔" کپتان صالح رحیم نے مضبوط لہجے میں کہا "باقی کا اطمینان مقامی پولیس والے کریں گے۔"

میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا "میں کچھ سمجھا نہیں جناب!"

"دیکھو برخوردار۔" کپتان کا لہجہ پھر مشفقانہ ہوگیا "ہم سرحدی محافظ ہیں۔ ہمارا کام وطن عزیز کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ ہم یہ کام نہایت تن دہی اور جوش و جذبے سے کرتے ہیں۔ اپنی ڈیوٹی کے مقام پر ہم بڑی چوکس نظر سے سرحد کی نگرانی کرتے ہیں۔ ہر قسم کی غیر قانونی نقل و حمل آمد و شد کو روکنا ہمارا اولین فریضہ ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی کے دوران میں جو مجرم ہمارے ہتھے چڑھتے ہیں انہیں ضروری کارروائی کے بعد ہم اپنی رپورٹ کے ساتھ مقامی پولیس کے حوالے کردیتے ہیں اس کے بعد ان کا کام شروع ہوتا ہے۔ وہ معاملے کی نوعیت اور جرم کی سنگینی دیکھتے ہوئے پیش قدمی کرتے ہیں۔ ہمارا دائرہ کار صرف سرحد تک ہے۔ ملک دشمن اور قانون شکن حرکات و سکنات کرنے والوں کو ہم پکڑتے ہیں پھر انہیں مقامی پولیس والوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے تو کوئی بھی ملک دشمن حرکت نہیں کی۔"

"تم کسی حد تک درست کہہ رہے ہو۔" کپتان میری تائید کرتے ہوئے بولا "لیکن غیر قانونی طور پر کسی بھی ملک

سرحد پار کرنا ایک سنگین جرم ہے چاہے یہ جرم کتنی بھی مجبوری کی حالت میں کیا جائے اس لیے تم دونوں کو پولیس کو فیس کرنا ہوگا۔"

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ایک فوری خیال نے مجھے سکون قلب سے نواز دیا تھا اور وہ اچھوتا خیال یہ تھا کہ ہمیں مقامی پولیس کے حوالے کیا جارہا تھا۔ آپ بھی یہ سوچ رہے ہوں گے کہ پولیس کی کسٹڈی میں جانے کو میں اچھوتا اور اطمینان بخش خیال کیوں کہہ رہا ہوں؟

دراصل بات یہ ہے کہ میں نے صبح سے دوپہر تک رینجرز والوں کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور ان کے بارے میں' میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان سے کسی قسم کی ساز باز ممکن نہیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم نے سرحد پار کرکے سرحدی قوانین کی کھلی خلاف ورزی کی تھی جو قانون شکنی کے زمرے میں آتی تھی۔ رینجرز والے نہایت ایمان دار اور فرض شناس ثابت ہورہے تھے۔ میں ایک غیر قانونی حرکت کرنے کے بعد ان سے کسی قسم کی رعایت کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

ہاں البتہ' پولیس کا معاملہ دوسرا تھا۔ میں نے برصغیر پاک و ہند کی پولیس کی بہت "تعریف" سن رکھی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے انڈیا پولیس سے تو میرا گہرا واسطہ بھی رہا تھا۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوچکا تھا لہٰذا اس تناظر میں پولیس والوں کے پاس پہنچنے کے بعد ہمارے لیے آسانیاں پیدا ہونے کی امید کی جاسکتی تھی۔

میں نے کپتان صالح رحیم سے پوچھا "پنڈت کشوری لال کہاں گیا؟"

"وہ ہمارے قبضے میں ہے۔" اس نے بتایا "گزشتہ رات تمہارے قافلے والوں نے اونٹوں پر جو مال اسمگل کرکے بستی کے داخلی حصے میں واقع حویلی تک پہنچایا ہے' پنڈت نے اس کے بارے میں سب کچھ قبول کرلیا ہے۔ پنڈت کے دونوں آدمی آچر اور پیر بخش بھی ہماری تحویل میں آچکے ہیں البتہ تمہارے قافلے کا سربراہ ہرنس ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اسمگلنگ کا مال برآمد کرلیا گیا ہے۔ پنڈت کے بارے میں بھی ایک سنسنی خیز رپورٹ تیار ہورہی ہے۔ اسے بھی تم دونوں کے ساتھ ہی حوالۂ پولیس کیا جائے گا۔"

کپتان کا انکشاف پر از معلومات تھا۔ مجھے اپنی رقم کا خیال آگیا۔

"کپتان صاحب!" میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا "سوئی گام کے کھیا دھرم چند نے مجھے ایک رقعہ دیا تھا۔ جس میں۔"

"ہاں' وہ رقعہ میں پڑھ چکا ہوں۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "صوبے دار محمد رمضان نے سب سے پہلے مجھے وہی خط دکھایا تھا۔ صوبے دار ہندی تحریر نہیں پڑھ سکتا لیکن میں اردو' انگریزی کے علاوہ سندھی' پنجابی' گجراتی اور ہندی زبان بھی بہت اچھی طرح لکھ' پڑھ اور بول سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "اگر آپ نے وہ رقعہ پڑھ لیا ہے تو پھر آپ کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ پنڈت نے مجھے پاکستانی کرنسی میں پچاس ہزار روپے دینا ہیں۔"

"ہاں' میں نے یہ بھی پڑھا ہے' پھر؟"

کپتان نے سوالیہ انداز میں جملہ ختم کیا تھا' میں نے کہا "آپ یہ تو کرسکتے ہیں' مجھے وہ رقم ہی دلا دیں۔"

"ناممکن!" وہ قطعیت سے بولا "ہمارا کام مجرم کو پکڑ کر مقامی پولیس کے حوالے کرنا ہے۔ تم یہ "فرمائش" پولیس والوں سے کرنا۔ وہاں پنڈت بھی موجود ہوگا۔ ممکن ہے' تمہارا کام ہوجائے۔ ویسے مجھے اس کی زیادہ امید نہیں ہے۔"

میں خاموش ہوگیا۔ کپتان نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا "ٹھیک ہے' اب تم دونوں دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے صوبے دار کو بلا کر ہمیں اس کے حوالے کردیا۔

صوبے دار محمد رمضان نے طنزیہ مسکراہٹ سے دھنو کو دیکھا پھر میری جانب تکتے ہوئے پوچھا "مسٹر مراد! کیا تمہاری ساتھی کلثوم ابھی تک گونگی ہے یا اس نے بولنا سیکھ لیا ہے؟"

میں اس کے طنز کو سمجھ رہا تھا۔ صوبے دار کو یہ تو معلوم تھا کہ دھنو قوتِ گویائی سے محروم نہیں لیکن وہ یہ بات ابھی نہیں جانتا تھا کہ ہم مراد اور کلثوم نہیں بلکہ وجدان اور دھنو ہیں خیر' بہت جلد اسے یہ پتا چلنے والا تھا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا "بھئی صوبے دار صاحب! آپ کے کپتان صاحب تو بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ انہوں نے میری ساتھی کو فر فر بولنا سکھا دیا ہے۔" پھر میں نے دھنو کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر کہا "صوبے دار صاحب کو ذرا بول کر دکھاؤ۔" دھنو میرے سہارے چل رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے پاؤں پر وزن ڈالنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔

وہ سمجھ گئی کہ میں شرارت کے موڈ میں ہوں۔ وہ کسی تیز رفتار مشین کے مانند اسٹارٹ ہوگئی۔ صوبے دار صاحب

حیرت سے منہ کھول کر دھنو کا منہ تکنے لگا۔ دھنو طبعاً شوخ چنچل اور شریر تھی اور اس وقت تو اس کافی دیر بعد زبان کھولنے کا موقع ملا تھا۔ وہ تبتی اور ہندی الفاظ سے مزین جملے بڑی روانی سے بول رہی تھی۔

صوبے دار نے بالآخر اپنی حیرت کو رفع کرنے کی خاطر پوچھا "بھئی یہ کون سی زبان بول رہی ہے؟"

"یہ بات تو تم اپنے کپتان صاحب سے پوچھو جاکر۔" میں نے مزاح کے رنگ میں کہا "انہوں نے ہی اسے بولنا سکھایا ہے۔"

صوبے دار ہمیں واپس اسی کمرے میں پہنچا کر جانے لگا تو میں نے پوچھا "جناب! صبح سے دوپہر ہوگئی بلکہ اب تو دوپہر بھی ڈھل رہی ہے۔ ہم نے صبح ناشتے میں ایک پراٹھا اور ایک ایک چائے کا کپ پیا تھا۔ اس کے بعد مجال ہے' جو ایک کھیل بھی اڑ کر ہمارے منہ تک پہنچی ہو۔ اگر کھانے وغیرہ کا بندوبست نہیں ہوسکتا تو اللہ کے بندے پانی کے دو گھونٹ ہی پلا دو۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔

ہم دونوں اس وقت کمرے میں اکیلے تھے۔ تاہم ایک گن بردار سرحدی محافظ کمرے کے دروازے کے باہر مستعد کھڑا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہی دروازہ تھا جسے وہ مسدود کیے کھڑا تھا۔

ہم دبی دبی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ہماری یہ پوری کوشش تھی کہ ہمارے الفاظ پہرے دار مسلح شخص کی سماعت تک نہ پہنچنے پائیں۔ ہم احتیاط کے دامن کو بڑی مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہتے تھے۔

دھنو نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا "ہمت سنگھ! آج تو تم خاصی زندہ دلی کا مظاہرہ کررہے ہو!"

"میں ہمت سنگھ نہیں' وجدان ہوں۔" میں نے ٹوکتے ہوئے کہا "اور الحمدللہ مسلمان ہوں۔"

وہ زیرلب مسکرائی "ہاں' اب میں تمہاری حقیقت جان گئی ہوں۔"

دھنو جب مسکراتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے ویرانے میں بہار آگئی ہو۔ ہم جس قسم کی صورت حال میں محبوس تھے اس کے پیش نظر کہا جاسکتا تھا کہ دھنو کے مسکرانے سے ریگزار میں ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ دھنو کو میری اصلیت کا پتا ابھی چلا تھا۔ ہمت سنگھ کا نام مجھے رانی روپ متی نے دیا تھا۔ دھنو کو میرے اصلی نام اور مذہب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ مجھے تھوڑی دیر پہلے تک ہمت سنگھ ہی سمجھ رہی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میری حقیقت جان گئی ہو تو اسے یاد بھی رکھنا۔"

وہ ایک انداز دلربائی سے مسکرائی اور بولی "میں تمہیں بھولنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی وجدان۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ تمہارا تعلق مذہب اسلام سے ہے۔ یہ مذہب ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی تعلیمات ہمارے مذہب سے بہت ملتی ہیں۔ لارڈ بدھا اگر عظیم ترین ہیں تمہارے پیغمبر عظیم ترین ہیں۔ میں نے اس محسن انسانیت کے بارے میں بہت کچھ جان رکھا ہے۔"

ایک غیر مسلم بدھ مت لڑکی کی زبان سے اسلام کی تعریف سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے کی خوشی بھی اس خوشی میں شامل ہو کر میرے اندرون کو باغ باغ کررہی تھی۔

میں نے کہا "دھنو! تم نے پہلے کبھی اپنے ان خیالات اور احساسات کا اظہار نہیں کیا؟"

"اگر سچ بولوں تو برا تو نہیں مانو گے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں' نہیں۔ کہو' کیا کہنا چاہتی ہو۔"

اس نے کہا "میں اب تک تم سے جو متاثر ہو رہی ہوں اس کی ایک خاص وجہ تھی۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کسی خاص وجہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی "وجدان! سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے احسانوں تلے دبی ہوئی ہوں۔ تم نے بڑے کڑے وقت میں مجھے سہارا دیا تھا۔ میرا سب کچھ لٹ چکا ہوگیا تھا۔ میرے باپ تھونچی اور ماں بھیرجانی کو سفاک درندوں نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں بے بس' بے کس اور بے سہارا ہوگئی تھی۔ ایسے موقع پر تم اور تمہارے ساتھیوں نے مجھے پوری طرح سنبھال دیا۔ ناگ پال کے آدمیوں کی بربریت کا شکار ہونے والے اپنے والدین کی لاشیں لے کر جب میں کھٹمنڈو پہنچی تو تم نے قدم قدم پر میری مدد کی۔ میں تمہارے احسانات میں سر تا ڈوبی ہوئی ہوں۔ کون کون سا واقعہ یاد کروں۔"

وہ خاموش ہو کر خیالوں میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔

"وجدان! تنکو قبیلے میں قیام کے دوران میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا' کیا میں اس اندوہناک واقعے کو بھول سکتی ہوں؟" ایک لمحے کو چپ رہنے کے بعد وہ بولی "غنڈا صفت شیواگ نے اپنی رکھیل کی مدد سے مجھے اغوا کروالیا تھا۔ میں شیواگ کی باتوں میں آگئی تھی للندا دھوکے سے مجھے اس حرافہ کونگا کی باتوں میں آگئی تھی للندا دھوکے سے مجھے ایک پراسرار جزیرے پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ پر بہت تشدد کیا گیا مگر میری زندگی بچانے والے تم تھے۔"

میں نے کہا "زندگی لینے اور دینے والی صرف خدا کی ذات ہے۔ میں نے اس نازک مرحلے پر جو کچھ کیا' اپنا فرض جان کر کیا۔"

وہ اپنی ہی دھن میں بولے چلی گئی "وجدان' تم نے اس جزیرے پر پہنچ کر شیواگ اور اس کے ساتھی ہینگ کے پنجۂ ستم سے مجھے نجات دلائی تھی۔ میری زندگی اور عزت کو محفوظ رکھنے میں تم نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں' کم ہے۔"

میں نے کہا "دوستوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا دھنو۔"

"میں تمہاری دوستی کے قابل کہاں وجدان۔" وہ وجد کے عالم میں بولی "تم تو بہت مہان ہو' عظیم ہو۔ اگر مجھے تمہارے قدموں میں ہی جگہ ملی رہے تو میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔"

میں نے کہا "تم مجھے شرمندہ کررہی ہو۔"

"میں اگر اس بارے میں سوچوں بھی تو مجھے موت آجائے۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی "تمہاری شرمندگی قیمت پر مجھے منظور نہیں۔"

"دیکھو دھنو!" میں نے اسے شانوں سے تھام کر کہا "دوستوں پر نہ تو احسان کیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی معاملے میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ دونوں عمل دوستی کے لیے زہرہلال ہیں۔" میں نے تھپک کر اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹالیے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم نے بھی میری خاطر بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں دھنو! ناگ پال کے آدمیوں نے تمہارے ماں باپ کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا' وہ میری جنگ کا ایک منظر تھا۔ وہ جنگ' جو میرے اور ناگ پال کے درمیان جاری تھی۔ اس کے علاوہ نرس مایا متی کے باپ کے قتل اور اس کے گھر پر قبضے کے جھوٹے الزام میں ہم تینوں کو پولیس پکڑ کرلے گئی تھی تو پولیس کسٹڈی میں تم پر بے انتہا تشدد کیا گیا تھا حتیٰ کہ تمہارا لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ یہ ظلم و زیادتی سہنے میں تمہارا کیا قصور تھا؟ یہ بھی تو میری ہی جنگ تھی نا! میں نے تم سے اور شوبھا سے کہا بھی تھا۔ تم لوگ میرے خلاف بیان دے کر نجات حاصل کرلو مگر تم نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا "نہیں' لارڈ بدھا کی قسم' میں جان تو دے سکتی ہوں مگر تمہارے خلاف ایک لفظ نہیں بول سکتی۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ انداز میں اپنی بات جاری رکھی "کیا اس واقعے کو بھول گئی ہو جب کھٹمنڈو میں جاسوسی کے الزام میں ہمیں گرفتار کرکے ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہاں تم پر اور شوبھا پر تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم تم لوگوں کو بری طرح ہراساں کیا گیا تھا۔ تم نے وہ اعصاب شکن لمحات کس کرب میں گزارے ہوں گے' مجھے پوری طرح اس کا احساس ہے۔ تم دونوں کو ڈرایا دھمکایا گیا تھا' خوفناک نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ اس حساب سے تو مجھ پر تمہارے احسانات کا بوجھ کہیں زیادہ ہے۔ شیواگ والا واقعہ بھی میری ہی وجہ سے پیش آیا تھا۔ وہ مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی بھی موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔"

میں یہ جذبات سے لبریز تقریر کرکے خاموش ہوا تو دھنو نے کہا "تم کچھ بھی کہو مگر میں یہی سمجھتی ہوں کہ میں تمہارے احسانات تلے دبی ہوئی ہوں۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم کسر نفسی سے کام لے رہے ہو۔ میں تمہاری نیت کی سچائی اور پرخلوص برتاؤ ہی کی وجہ سے تم سے متاثر ہوئی تھی وجدان۔ بس ایک بات مجھے ہمیشہ بے کل رکھتی تھی مگر اب وہ بھی کانٹا نکل گیا ہے۔"

"ایسی کیا بات تھی دھنو؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

دھنو کے جواب دینے سے پہلے ہی صوبے دار محمد رمضان دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ایک چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں دو گلاس پانی کے ساتھ دو روٹیاں اور چھوٹی سی کٹوری میں اچار تھا۔ صوبے دار ٹرے ہمارے حوالے کرکے کمرے سے باہر چلا گیا۔ دونوں روٹیاں تنوری تھیں اور اچار آم ولیموں کا تھا۔

ہم کھانا کھاتے ہوئے دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگئے۔ ہم بڑے محتاط انداز میں اس طرح گفتگو کررہے تھے کہ دروازے پر کھڑے مسلح محافظ کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔ ہمارا انداز سرگوشیانہ تھا۔

میں نے کہا "دھنو! تم کسی خاص بات کا ذکر کررہی تھیں؟"

"ہاں وجدان! میں سچے دل سے کہتی ہوں' تم پر لاکھ اعتماد کرنے کے باوجود یہ خیال مجھے بے چین رکھتا تھا کہ تم ایک ہندو ہو۔ ہندوؤں نے تبت' نیپال اور بدھ مت کو اپنی فطری مکاری اور چالبازی سے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بس

یہ ایک لاشعوری کھٹکا سا تھا جو اب ختم ہوگیا ہے۔ لاڑ بدھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے' تم ایک مسلمان ہو۔ اب میرے دل میں کوئی خلش نہیں ہے۔"

میں حیرت اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کانچ کی گڑیا کو دیکھ رہا تھا۔ دھنو کے چہرے کی معصومیت نے اس کی دلکشی اور نظر فریبی میں چار چاند لگادیے تھے۔ وہ اٹھارہ انیس سال کی ایک دراز قامت' سڈول جسم والی لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی ہرنی جیسی سیاہ آنکھیں خاموشی کی زبان بولتی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت نے اس کے حسن میں تازگی بھردی تھی۔ اس پر اس کی شوخی' چنچل اور شرارت آمیز اداؤں نے اس کے شاداب بدن کو پنکھ لگادیے تھے۔

میں نے کہا "دھنو! میں کوشش کروں گا کہ تمہارے اعتماد پر پورا اتر سکوں لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا' میرے پاؤں میں بگولے بندھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتا میرا کون سا دن کہاں اور کون سی رات کہاں گزرے گی۔ زندگی مجھ سے ایک کڑا امتحان لے رہی ہے اس لیے تم مجھ سے کوئی بہت بلند امیدیں وابستہ نہ کرلینا۔ آخر کو میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔"

"وجدان! میں نے اپنے روحانی پیشوا دلائی لاما کے اقوال کو اپنی روح میں اتارا ہے' دل میں بسایا ہے اور ذہن پر نقش کیا ہے۔" وہ کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے بولی "وہ ایک جگہ لکھتے ہیں... انسان کو اپنے عزائم کو بلندی کی انتہا سے زیادہ بلند اور ناممکنات سے زیادہ ممکن رکھنا چاہیے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اسے کامیابی نہ ہو تو انسان کا دل نہیں ٹوٹتا۔ وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں تھا۔"

"تمہارے دلائی لاما نے بڑی گہری بات کی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "دلائی لاما نے تو تمہارے بارے میں بھی بڑی گہری باتیں کی ہیں وجدان۔ یاد ہے' میرے باپ تھوپچی نے تمہیں عبادت گاہ کے تہ خانے کا راز کیوں بتایا تھا؟ وہ وقت بھی یاد کرو جب میرے ماں باپ کی موت کے بعد دلائی لاما کے بھیجے ہوئے نئے بدھ راہب' بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا چارج سنبھال رہے تھے تو انہوں نے تم سے کیا گفتگو کی تھی؟"

میں دھنو کے اشارے بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ بڑے فخر و انبساط کی بات تھی کہ دلائی لاما نے مجھ پر اپنا بھرپور اعتماد ظاہر کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یقیناً وہ میرے جوہر سے آشنا تھا۔

دھنو نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "تم نے تو ہنزہ، گلگت اور نیپال میں میری ہر قسم کی مدد کی ہے۔ یہ تو تمہارا اپنا گھر ہے۔ یہاں تو میں زیادہ محفوظ ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو دھنو۔" میں نے کھانے والی میز کو ایک جانب کھسکاتے ہوئے کہا "پاکستان میرا اصل وطن ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ تم کپتان کی موجودگی میں میری زندگی کی بیشتر کہانی سن چکی ہو۔ جو باتیں میں نے یہاں مصلحتاً چھپائی ہیں وہ رفتہ رفتہ تم پر آشکار ہوتی رہیں گی۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات جاری رکھی "میں اپنے والدین کی گود میں جب اس ملک سے گیا تھا تو میری عمر صرف دو ماہ تھی۔ میرے والدین کو بڑی کسمپرسی کی حالت میں اپنا ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ اپنے گاؤں رکھا والی سے لاہور شہر پہنچے' پھر لاہور سے کراچی اور کراچی سے سنگاپور چلے گئے۔ میں بارہ سال کا ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے بڑی بے دردی سے میرے ماں باپ کو قتل کردیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن' میں مسلسل ایک چکر میں ہوں۔ حالات اور قسمت جہاں لے جائے وہ وہاں چلا جاتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی پاکستان آنے کی کوشش کی تھی مگر ہمارا جہاز ائرپاکٹ میں پھنس گیا اور جہاز کو ہنگامی لینڈنگ کرنا پڑی جس کے باعث میں انڈیا کے وسیع و عریض ریگستان میں پہنچ گیا تھا اور اب..." میں نے ایک لمحے کو رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی اور کہا "اور اب اپنے ملک کی دھرتی پر قدم رکھا ہے تو ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

دھنو نے کہا "وجدان' ہم دونوں کی کہانی میں کچھ مماثلت ہے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "ہم دونوں کے والدین کو ہمارے سامنے خاک و خون میں لوٹایا گیا' بس فرق اتنا سا ہے کہ ان اندوہناک لمحوں دل دوز واقعات کے وقت تمہاری عمر بارہ سال تھی اور میری اٹھارہ سال کی ہوں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو دھنو۔" میرے لہجے میں اداسی در آئی۔ کہا۔

وہ بھی دل گرفتہ نظر آنے لگی۔ دھنو بھی ماضی قریب کی ایک صدمہ جانکاہ سے گزری تھی۔ وہ میری کیفیت کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھ اور محسوس کرسکتی تھی۔ اس کی یہ بات حد تک درست تھی کہ ہم کم و بیش ایک جیسے حالات میں والدین سے محروم ہوئے تھے۔

کہتے ہیں' حالات کی کشیدگی کو زبان کی شگفتگی کاٹ دیتی ہے۔ شاید اسی فلسفے کے تحت دھنو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی تھی۔ وہ مزاجاً چنچل اور شریر تو تھی ہی۔ دو چار شرارت آمیز جملوں کے بعد وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"وجدان! ایک بات پوچھوں' صحیح صحیح جواب دو گے؟"

اس کی سنجیدگی میں مصنوعی پن کی جھلک کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں پوچھو' کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

اس نے پوچھا "وجدان! کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

اس کا سوال بہت نازک اور اہم تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں' میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں سے محبت کی ہے۔"

"میں بہت سے لوگوں کی بات نہیں کررہی۔"

"میں بتا رہا ہوں نا۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "سب سے پہلے میں نے اپنے ماں باپ سے بے انتہا محبت کی' اس کے بعد اپنے تمام دوستوں سے مجھے محبت ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو میرے کام آتے ہیں یا میں جن کے لیے کچھ کرتا ہوں' میں ان کا خیر خواہ ہوں' ہمدرد ہوں۔ میرے دل میں ان کے لیے خلوص ہے' محبت ہے۔ میں ان کے آرام اور سکھ کے لیے اپنی جان کو کسی بھی مصیبت میں ڈال سکتا ہوں اور میں..."

اس نے میری بات کاٹ دی پھر شرارت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "تم بہت خوب صورتی سے میرے سوال سے پہلو تہی کررہے ہو وجدان!"

"میں پہلو تہی نہیں کررہا دھنو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بلکہ تمہارے سوال ہی کا جواب دے رہا ہوں۔"

"پھر میں کہوں گی' تم نے میرے سوال کو سمجھا ہی نہیں۔"

"تم سمجھانے کی کوشش کرو۔" میں نے معصومیت سے کوشش کررہا ہوں۔ اس کے اس انداز میں بڑی حد تک سچائی شامل تھی۔

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگی جیسے میں اسے بنانے کی

میری عملی زندگی میں بے شمار لڑکیاں اور عورتیں آتی جاتی رہی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک طرح دار حسینہ تھی۔ بعض اوقات تو میں ہجوم مہ وشاں میں رات و دن گھرا رہتا تھا۔ دھنو نے میری زندگی کے ایک ایسے گوشے میں جھانک لیا تھا کہ میری یادداشت میں خیالات کا البم کھل گیا تھا اور میں دماغ کی کھڑکی سے ماضی میں دیکھنے لگا تھا۔

تھائی وانگ میری زندگی میں آنے والی پہلی نامحرم تھی۔ میں اس کی دہری محبت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ ہماری عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا۔ اس نے مجھے ایک محبوبہ اور ایک ماں کے پیار کے امتزاج سے روشناس کرایا تھا۔ میں اس کی آغوش میں جاکر کبھی تو ایک ننھا بچہ بن جاتا تھا اور کبھی بھرپور مرد۔ میں آج تک اس کی محبت کے مزاج اور اسٹائل کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس دو پہلو محبت سے ہمکنار ہوتے ہوئے کبھی میرے پاؤں نہیں ڈگمگائے تھے۔ ہماری طویل رفاقت کے دوران میں ہم دونوں سے کبھی کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس پر ہمیں بعد میں شرمسار ہونا پڑا ہو۔ تھائی میری سچی دوست تھی۔ اس نے میری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ گھر بار' کاروبار میری حمایت کی پاداش میں تباہ و برباد کروالیا تھا اور بالآخر میری دوستی کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بھی دے دیا تھا۔

جانکی دیوی بھی ایک جاں نثار دوست ثابت ہوئی تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھی مگر میری دوستی نے اسے دردر کی خاک چھاننے پر مجبور کردیا تھا اور وہ اسی دربدری میں خوش تھی پھر ایک موقع پر اسے بھی میری جنگ کے شعلوں نے نگل لیا تھا۔ وہ میری جیت کی خاطر اپنی جان ہار گئی تھی۔

نوبیتا اور رنگولی کاکروار بھی میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا اور رنگ سنت کی بیٹی کو میں کیسے بھول سکتا تھا؟ سونیا بڑی قیامت خیز اور طوفان آمیز لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے میرے ذہن کی دنیا میں جزوی سیندھ لگالی تھی جس پر میں ابھی تک نادم تھا۔ گولڈن ٹرائی اینگل کی جانب جاتے ہوئے "چیانگ سائین" کی ایک پہاڑی پناہ گاہ میں' سونیا کے ساتھ قیام کے دوران میں میری زندگی میں وہ لمحات بھی آئے تھے جب میرے پایہ استقامت میں معمولی سی جنبش پیدا ہوئی تھی۔ اس حرکت نے مجھے پورے وجود سے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

رانی روپ متی اور شوبھا نے بھی میری دوستی میں بہت مصائب اٹھائے تھے۔ مجھے ہمت سنگھ کا نام روپ متی ہی نے دیا تھا۔ وہ مجھے ایک انسانی نیلام گاہ سے بھاری قیمت میں خرید کرلائی تھی۔ میں قانوناً اس کا زر خرید غلام تھا مگر اس نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ میری حمایت اور دوستی کے جرم میں اس نے جے پور کے پنڈتوں کی دشمنی مول لی تھی۔

پھر بیلا اور چترا یتیم تھیں۔ ان دونوں نے بھی میرے لیے بہت قربانیاں دی تھیں بلکہ مجھ پر اپنی جانیں بھی قربان کردی تھیں۔ ایسے جاں نثار دوستوں کا زیاں مجھے بہت ستاتا تھا۔ ان کے بارے میں سوچ کر دل خون ہوجاتا تھا لیکن یہی زندگی ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا عمل دائمی ہے۔ اگر آپ زندہ ہیں اور دنیا میں رہتے ہیں تو اس سے نجات ممکن نہیں۔

دھنو کی شوخ پکار نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "کہاں کھوگئے وجدان؟"

میرے کھوئے ہوئے دھیان کو دھنو کی شیریں آواز نے تلاش لیا تھا۔ میں دماغی طور پر اس کے پاس حاضر ہوگیا۔ وہ میری ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے، تم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے!"

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"کس سوچ میں گم تھے؟"

"یادِ رفتگاں میں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "تم مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہی تھیں؟"

"سمجھ دار کو سمجھانا، نا سمجھی ہوتی ہے وجدان۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "اچھا! تم کس سمجھ دار کی سمجھداری کی بات کررہی ہو دھنو؟"

وہ میرے چہرے کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس سمجھدار کو سمجھنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"پھر آیا کچھ سمجھ میں؟"

"بڑی حد تک۔" وہ شرارت سے مسکرائی "باقی بھی رفتہ رفتہ سمجھ ہی جاؤں گی۔"

دھنو جب مسکراتی تھی تو اس کی آنکھوں کی چمک میں کرنوں کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔ تبتی نقوش کی حامل وہ شوخ و شنگ لڑکی پلیے کی صفات کی حامل تھی۔ آواز کی شیرینی اور رسیلاپن اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ سے جھلکتا تھا۔ وہ بولتی تھی تو لگتا تھا، شہد ٹپک رہا ہو۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "اس نیک مقصد سے لگی رہو۔"

وہ شاکی لہجے میں بولی "اچھی بات نہیں ہے وجدان!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولی "تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا!"

"اپنے سوال کو دہراؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہاری یادداشت اس قدر کمزور کب سے ہو جدان۔" وہ روٹھنے کے سے انداز میں بولی پھر خود وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ نے اپنی زندگی میں کسی لڑکی سے محبت کی ہے۔ محبت میری مراد وہ قلبی تعلق ہے جو ایک عاشق اور معشوق درمیان ہوتا ہے یا ایک محبوب اور محب میں دیکھنے ہے؟"

میں نے بے ساختہ کہا "ایسی محبت کرنے کی تو زندگی مجھے کبھی فرصت ہی نہیں دی۔"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میری زندگی میں اتنے چڑھاؤ اور گھماؤ پھراؤ تھے کہ میں "دل لگی" سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ "دل کی لگی" کیا ہوتی ہے کیونکہ میرے دل کو ابھی لگی نہیں تھی۔

اس سے پہلے کہ دھنو کوئی اور سوال کرتی، ایک ... پوش سرحدی محافظ کھانے کے برتن اٹھانے آگیا۔ ... خاصا گرم تھا اور پھر ہم ریگزار میں تھے۔ اس وقت ... حالیہ قیام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، بس یہ پتا تھا ... پاکستان کے صوبہ سندھ کے جنوبی ضلع "تھرپارکر" میں ... تھرپارکر اسی ضلع کا ایک سرحدی قصبہ ہے جو بارڈر ... قریب ہونے کے باعث بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔

ہم نے اچار کے ساتھ تنوری روٹیاں کھا کر ایک ... گلاس پانی اپنے حلق میں انڈیل لیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد ... دوبارہ پیاس لگنے لگی تھی۔ اچار کے ساتھ روٹی کھانے ... پیاس بڑھ جاتی ہے۔ سرحدی محافظ برتنوں والی ٹرے ... جانے لگا تو میں نے درخواست کی۔

"بھائی! اگر ناراض نہ ہو تو ایک ایک گلاس پانی ... اور پلا دو۔ سندھ کے اس صحرا میں حلق خشک اور زبان ... بن کر رہ گئی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ محافظ ہمیں ہمارے بار بار کے "... کے پروگرام" پر کھری کھری سنائے گا مگر اس نے چہرے ... کوئی اچھا برا تاثر دیے بغیر دو گلاس پانی مزید لاکر ... سامنے رکھ دیا اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

دروازے پر کھڑا مسلح محافظ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ... اچٹتی مگر محتاط نگاہ ہم پر ڈال لیتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پانی پینے کے بعد نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ دھنو نے پانی والے گلاس کو اپنے ... نہیں لگایا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر تکلیف کے ...

آئے۔

میں نے تشویش بھری آواز میں پوچھا "کیا ہوا دھنو؟"

وہ اپنے ٹخنے کو سہلاتے ہوئے بولی "اس میں بہت درد ہورہا ہے۔"

حکیم نے صبح دھنو کے ٹخنے کی موچ نکالنے کے بعد کوئی ... رنگ مرہم لگا کر اچھی طرح مالش کردی تھی اور ایک چھوٹی سی ڈبیا میں وہ مرہم دے بھی دیا تھا جو تین چار روز تک دن میں تین مرتبہ لگانا تھا۔ مذکورہ مرہم وہیں پنڈت کشوری لال کے گھر میں رہ گیا تھا۔ پنڈت کے گھر سے آنے کے بعد دھنو نے میرے کندھے کے سہارے اچھی خاصی چلت پھرت کی تھی جس کی وجہ سے ٹخنے پر ورم آگیا تھا۔ درد کی وجہ یہی ورم تھا۔

میں نے دھنو سے کہا "تم اپنا پاؤں اس کرسی پر رکھ دو۔"

ساتھ ہی میں نے اس کرسی کی جانب اشارہ بھی کیا جو ہمارے درمیان رکھی ہوئی تھی۔ دھنو نے اپنی جینز کا پائنچا ذرا سا اٹھا کر مضروب پاؤں کرسی پر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اس کا پاؤں اپنے ہاتھوں میں لے کر معائنہ کرنے لگا۔

دھنو سرخ و سفید رنگت کی مالک تھی۔ اس کے سڈول بدن کے انگ انگ میں توازن تھا۔ پاؤں خوب صورت اور بناوٹ میں اپنی مثال آپ تھے۔ میں نے ٹخنے کی ہڈی پر اپنے دائیں ہاتھ سے دائرہ وار مساج کیا۔ میرے ہاتھ کی حرکت سے یقیناً دھنو کے درد میں اضافہ ہوا تھا اور اس نے تکلیف برداشت کرنے کے لیے دانتوں کو سختی سے بھینچ رکھا تھا۔

میں لگ بھگ تین منٹ تک کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز مساج کرتا رہا پھر میں نے انگشتِ شہادت کو ٹخنے کی ہڈی کے عین وسط میں پیوست کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور پوری توجہ اس کے ٹخنے پر مرکوز کردی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہو پھر میں نے خاص طور پر اپنے دائیں بازو کو گرم محسوس کیا۔ کوئی غیر مرئی حرارت میرے بازو میں سفر کررہی تھی۔ اس کے سفر کا رخ کندھے سے ہاتھ کی جانب تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے کندھے سے طاقتور حرارتی لہریں نکل کر بازو کے راستے میرے ہاتھ میں پہنچ رہی ہوں اور پھر انگشتِ شہادت سے ہوتے ہوئے وہ دھنو کے ٹخنے میں جذب ہورہی ہوں۔ حرارتی توانائی کی یہ ترسیل ایک عجیب سا مزہ بھی دے رہی تھی۔ چند لمحات تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر میرا بازو نارمل درجہ حرارت پر آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ "کام" ہوگیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے دھنو کی آنکھوں میں حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لکنت زدہ آواز میں سرگوشی کی۔

"وج... وجدان... تت... تم کوئی جادو... جانتے ہو؟"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

وہ لرزاں لہجے میں بولی "لارڈ بدھا کی قسم، تم جادوگر ہو۔ بڑے گنی ہو۔ مہان ہو، عظیم ہو۔ میں... میں..."

جذبات کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا "بات کیا ہے، کچھ منہ سے بھی تو بولو۔"

وہ بولی "وجدان! میرے ٹخنے کا درد بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔" پھر وہ اپنے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیجان خیز لہجے میں کہنے لگی "یہ دیکھو... یہاں کی سرخی اور ورم بھی بہت کم ہوگیا ہے۔ تم نے کیا پڑھ کر پھونکا ہے؟"

"میں نے کچھ بھی پڑھ کر نہیں پھونکا دھنو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "جھاڑ پھونک میرے بس کی بات نہیں۔"

وہ دراصل "چی" کی قوت کا کمال تھا یا آپ اسے "ارتکازِ توجہ" کا کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔ میرے بدن کی توانائی نے حرارت کی شکل اختیار کرکے دھنو کے ٹخنے کا درد غائب کردیا تھا اور اس کے ورم میں بھی کمی آئی تھی۔ یہ ایک سیدھا سیدھا فزیوتھراپی کا عمل تھا۔

میرے جواب سے دھنو کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "وجدان! تم بہت گہرے آدمی ہو۔ تمہاری اصلیت پرت در پرت دنیا کی نظر سے اوجھل ہے۔ تم جتنے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ ہو۔"

"تم بھی تو ایسی ہی ہو دھنو۔" میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا تم اس وقت مجھے پوری نظر آرہی ہو؟"

وہ جانے میری بات کا کیا مطلب سمجھی، خود کو سمیٹتے ہوئے جلدی سے بولی "تم بہت ماہر ہو باتیں بنانے کے۔ تمہیں میری بات کا جواب نہیں دینا، نہیں دو گے۔ چاہے میں لاکھ کوشش کرلوں۔ لارڈ بدھا کی قسم، میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی اس لیے تم سے اب تمہاری شکتیوں (قوتوں) کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ تم اگر کسی بات کو راز میں رکھنا چاہتے ہو تو میں اسے افشا کرنے کی ضد نہیں کروں

گی۔"

"یہ بات نہیں ہے دھنو۔" میں نے نرمی سے کہا "ابھی جو کچھ تمہارے سامنے پیش آیا ہے اس کی حقیقت کو چھپانے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم جسے کوئی جادو یا جھاڑ پھونک سمجھ رہی ہو وہ دراصل "چی" کی قوت کا کرشمہ ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے سوال کیا "کیا تم چی کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

اس نے معصومیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا "چی" انسانی جسم میں پوشیدہ ایک پراسرار اور مفید قوت کا نام ہے۔ یہ ہر انسان میں موجود ہوتی ہے مگر خوابیدہ حالت میں۔ اس کا مسکن یا آرام گاہ ناف کے نزدیک ہے۔ جو لوگ اپنی ریاضت اور کڑی مشقوں سے اسے بیدار کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔"

"تم اپنی "چی" کو بیدار کرچکے ہو؟" دھنو نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی "تو تم نے ابھی اسی "چی" کے ذریعے میرے ٹخنے کے درد کو رفع کیا ہے؟"

میں نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور کہا "یہ تو "چی" کا ایک معمولی سا شعبدہ ہے۔ اس کے بل بوتے پر تو بہت سے ناممکن کام بھی کیے جاسکتے ہیں۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکنے لگی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "چی" کو بیدار کرنے والی مشقیں تو انتہائی سادہ اور آسان ہیں لیکن ان کی تکمیل کے لیے کسی عامل کامل استاد کی نگرانی بہت ضروری ہوتی ہے۔ راہبر کے بغیر انسان بھٹک کر تاریکی کے کسی عمیق غار میں بھی کھو سکتا ہے۔ استاد کی راہنمائی حاصل نہ ہو تو یہی سادہ اور آسان مشقیں انتہائی کٹھن اور دشوار گزار ہوجاتی ہیں۔"

دھنو پوری دلچسپی سے میری جانب متوجہ تھی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے سوال کیا "وجدان! تم نے "چی" کی بیداری کی مشقیں کون سے استاد کی نگرانی میں اور کہاں کی تھیں؟"

میں نے جواب دیا "ماسٹرپنگ پائی کی نگرانی میں۔ یہ میرے دادا استاد بھی تھے۔ اب وہ میرے استاد مہاراج وانگ ونگ یائے کی طرح آنجہانی ہوچکے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے یہ ریاضت "شاؤلن ٹیمپل" میں کی تھی۔"

اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں "کیا تم شاؤلن ٹیمپل بھی جاچکے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بتایا "کوئی حرج نہ سمجھا اور کہا "میں ایک طویل عرصے تک ہمالیہ (تھائی لینڈ) میں مارشل آرٹس کے گرینڈ ماسٹر مہاراج وانگ ونگ یائے سے ان عسکری فنون کی تربیت لیتا رہا ہوں پھر ان کی ہدایت پر میں ان کے استاد یعنی اپنے دادا استاد ماسٹر پنگ پائی کے پاس مزید ٹریننگ لینے شاؤلن ٹیمپل چلا گیا تھا۔ وہیں میں نے کنگ فو، یوگا، جمناسٹک اور مراقبے کے علاوہ بہت سی خفیہ روحانی ورزشیں اور مشقیں بھی کی تھیں اور تمہیں ایک بات سن کر بہت حیرت ہوگی دھنو۔"

اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں حیرت اور استعجاب کا سمندر موجزن تھا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے جس یوگی گوتم بھوش سے گوریلا کی بدھ عبادت گاہ میں زبردست طلسماتی مقابلہ کیا تھا وہ شیطان صفت یوگی بھی ماسٹرپنگ پائی ہی کا شاگرد تھا۔"

وہ جلدی سے بولی "یہ واقعی عجیب بات ہے مگر میں کہوں گی، ایسا ہوتا ہے۔ ایک ہی استاد کے تمام شاگرد نہ تو اچھے ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی سب کے سب برے نکلتے ہیں۔"

"سارا کھیل ذہنیت کا ہے دھنو۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "انسان کی ذہنیت مثبت یا منفی ہوتی ہے۔ مثبت ذہنیت کے لوگ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں اور منفی ذہنیت والے افراد وقتی فائدے کے سوا کچھ حاصل نہیں کرسکتے اور ان کا انجام بڑا دردناک اور عبرت انگیز ہوتا ہے۔ جیسا کہ یوگی گوتم بھوش کا حشر ہوا۔ ہم دونوں ماسٹرپنگ پائی کے شاگرد تھے۔ میں نے نیکی اور اثبات کی راہ اختیار کی، گوتم بھوش بدی اور نفی کے راستے پر گامزن رہا۔ نتیجے طور پر وہ میرے ہاتھوں شکست فاش کھانے کے بعد موت کی گھاٹ اتر گیا۔ فتح ہمیشہ نیکی کی ہوتی ہے دھنو۔ میری یہ بات یاد رکھنا۔ ظلم اور بدی زیادہ دیر تک نہیں پھلتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولی "میری زندگی کا محدود تجربہ بھی یہی ہے۔"

گرینڈ ماسٹر وانگ ونگ یائے، ماسٹرپنگ پائی اور شاؤلن ٹیمپل کے ذکر نے دھنو کو ایک خاص قسم کے جوش اور ولولے میں مبتلا کردیا تھا۔ اس کی خوشی اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"دھنو، کیا تم بھی "چی" کی مشقوں میں کوئی دلچسپی رکھتی ہو؟"

شاید میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی، وہ بے ساختہ بول اٹھی "بالکل، مجھے بھی شدید خواہش ہو رہی ہے کہ اپنی "چی" کی قوت کو بیدار کروں۔ ابھی تم نے تھوڑی دیر پہلے میرے ٹخنے پر جو عمل کیا ہے یہ تو سیدھی سیدھی مسیحائی ہے۔ اگر مجھے ایسی قوت حاصل ہوجائے تو میں بہت سے دکھی اور درد میں مبتلا بے کس لوگوں کی تکلیف کو راحت میں بدل دوں گی۔ کسی کے دکھ درد اور غم والم کو بانٹنا کتنی بڑی نیکی ہے وجدان! پھر اس سے جس قدر سکون قلب اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔"

ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے اپنی سانس درست کی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "وجدان! کیا اس سلسلے میں تم میری راہنمائی کرو گے؟"

"ضرور۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی "واقعی، تم ایک عظیم ہستی ہو وجدان! ورنہ اس دنیا کا دستور تو یہی ہے کہ جس کے پاس جو علم اور ہنر ہوتا ہے، وہ اس میں سے کسی کو ذرا سا بھی دینا پسند نہیں کرتا۔ یہ تنگ نظری، کنجوسی اور گھٹیا پن ہے۔"

"ہاں دھنو، اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔" میں نے کہا "حالانکہ علم اور ہنر کا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ ان کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے، یہ اتنے ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیے کہ اگر آپ کسی کو کچھ بتا دیں گے یا کچھ سکھا دیں گے تو اس سے آپ کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہوجائے گی۔ اگر آپ واقعی عالم، ہنرمند اور اپنے فن کے ماہر ہیں تو یاد رکھیے، آپ کا شاگرد ہمیشہ آپ سے پیچھے ہی رہے گا۔ وہ کبھی بھی آپ کو اوورٹیک یا ٹریس پاس نہیں کرسکے گا کیونکہ جتنا وقت اسے ایک چیز کو سمجھنے اور سیکھنے میں لگے گا، اتنے ہی وقت میں آپ اس سے کہیں زیادہ علمی اور فنی راستہ طے کرچکے ہوں گے کیونکہ آپ اس سے زیادہ تجربہ کار اور مشاق ہوتے ہیں۔ بس شرط یہی ہے کہ آپ کے علم کا سفر جاری و ساری ہو۔ آپ کہیں کسی ایک مقام پر تھک کر بیٹھ نہ گئے ہوں۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے، حرکت میں برکت ہے۔ پانی بھی ایک جگہ ٹھہر جائے تو اس میں طرح طرح کی آلائشیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ٹھہرا ہوا علم بہت جلد زنگ پکڑ لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے عالم کو چاٹ کر رکھ دیتا ہے۔"

"تمہاری ذات کا ہر پہلو دلکش و دل نشیں ہے وجدان۔" دھنو نے مسرور لہجے میں کہا "تم اگر ایک مصلح یا مبلغ ہوتے تو تمہاری شیریں بیانی و شعلہ بیانی کی آمیزش سے وجود پانے والی گفتگو دنیا کا پاسا پلٹ کر رکھ دیتی۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سماعت میں شہد گھولتا ہوا سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔"

"یہ تمہارے نیک جذبات میں دھنو اور پرخلوص خیالات ہیں۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا "ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

وہ مدبرانہ انداز میں بولی "میں جانتی ہوں، ہمیشہ خالی برتن ہی کھنکتا ہے۔ جو لوگ اندر سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنی بڑائی میں لن ترانی نہیں کرتے۔"

"تم تو اس وقت مجھے کوئی دانشور لگ رہی ہو۔" میں نے تیز نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا تمہارے اندر کسی فلسفی کی روح حلول کرگئی ہے؟"

وہ قدرے جھینپ گئی پھر بات بدلتے ہوئے بولی "پکا وعدہ ہے نا! تم "چی" کی قوت حاصل کرنے کے سلسلے میں مجھے گائیڈ کرو گے؟"

"پکا وعدہ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اور میں مارشل آرٹس بھی سیکھوں گی!"

"وہ بھی سکھا دوں گا۔"

"اور بھی اچھی اچھی باتیں۔" وہ کسی بچے کی طرح مچل رہی تھی۔

"ہاں بھئی، سب کچھ سکھا دوں گا۔ تم سیکھنے والی تو ہو۔" میں نے کہا "یاد رکھو، جب تک کوئی شخص سیکھنے کی کوشش نہ کرے یا سیکھنا نہ چاہے، دنیا کا بڑے سے بڑا استاد بھی اسے کچھ نہیں سکھا سکتا۔ شاگرد کی لگن سچی اور محنت پکی ہو تو منزل خود چل کر قدموں کے پاس آجاتی ہے۔"

"میرے اندر بہت لگن ہے۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، وہ تو مجھے نظر آرہی ہے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ جھینپ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی خفت کو کم کرنے کی خاطر کہا "دھنو! تم بہت حوصلے والی لڑکی ہو۔ مجھے امید ہے، تمہاری لگن تمہیں ایک دن کسی نمایاں مقام تک پہنچا دے گی۔"

"مجھے نہیں کسی نمایاں مقام پر فائز ہونا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولی "میری دنیا تمہارے قدموں سے شروع ہو کر تمہارے قدموں میں ختم ہوجاتی ہے۔"

میں لاجواب سا ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

دھنو بڑی عجیب لڑکی تھی۔ وہ صرف میری قربت اور رفاقت کی خاطر اپنا ملک چھوڑ کر پاکستان چلی آئی تھی حالانکہ وہ اگر چاہتی تو میں نیپالی انسپکٹر برندرا سے کہہ کر اسے کھٹمنڈو میں کہیں بھی سیٹل کروا سکتا تھا پھر جے پور میں بھی روپ متی نے کوشش کی تھی کہ وہ اس کے پاس یا شوبھا کے پاس رہ جائے مگر دھنو کی سوئی بس ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی... وہ میرے ساتھ جائے گی' چاہے میں اسے جہاں بھی لے جاؤں۔

نتیجے کے طور پر میں اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے آیا تھا۔

یہ معصوم صورت' غزالی آنکھوں والی گوری چٹی تبتی لڑکی میرا پیچھا آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس کے عزائم مجھے خاصے خطرناک دکھائی دے رہے تھے حالانکہ اس نے ابھی تک ایسی کوئی جنبش نہیں کی تھی جس سے اس کے دل کا حال اور دماغ کا جال کھل جاتا لیکن وہ کیا کہتے ہیں... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ میں دھنو کی جانب سے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

پھر ہمارے درمیان زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ دھنو نے مجھ سے پوچھا "وجدان! تم نے بتایا ہے کہ جب تمہارے والدین نے پاکستان چھوڑا تو تم صرف دو ماہ کے تھے۔ تمہارے ماں باپ کو سنگاپور میں تمہاری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اب دنیا میں تمہارا کوئی رشتے دار نہیں ہے' پھر تم کس غرض سے پاکستان آئے ہو؟"

"سب سے بڑی غرض تو وطن کی محبت ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "کافی عرصے سے میرا دل پاکستان دیکھنے کو مچل رہا تھا۔ ایک مرتبہ کوشش بھی کی لیکن حادثاتی طور پر ہم راجستھان کے صحرا میں پہنچ گئے جس کی داستان میں تمہیں سنا چکا ہوں۔" ایک لمحے کے لیے میں رکا پھر دھنو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مزید بتایا۔

"میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ میں اپنے وطن عزیز کا چپا چپا دیکھوں' خاص طور پر گاؤں "رکھاں والی" جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ اگرچہ وہ میرے دشمنوں کا علاقہ ہے مگر میں کسی نہ کسی بھیس میں اس گھر کا دیدار کرنا چاہتا ہوں جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔"

"رکھاں والی گاؤں تمہارے دشمنوں کا علاقہ کیوں ہے؟"

دھنو کے اس سوال پر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گاؤں کے بڑے چوہدری ملک رمضان نے میرے دادا چوہدری حاکم علی کو کھیتوں میں شوٹ کیا تھا پھر یہ دشمنی نسل آگے بڑھی اور ملک رمضان کا بیٹا ملک نواز میرے والد عابد علی کا دشمن بن گیا پھر دشمنی نے وہ موڑ حاصل کیا کہ میرے والد عابد علی اور ماں شگفتہ کو گاؤں چھوڑ کر لاہور آنا پڑا مگر وہاں بھی ملک نوازش کا چیچہ خاص دار کے تعاقب میں تھا۔ لاہور سے چھپتے چھپاتے وہ دونوں [illegible] گود میں لے کر پہلے کراچی پہنچے اور پھر سنگاپور چلے گئے نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ایک رات وہ ان خون میں ہاتھ رنگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ازاں بعد دار دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا اور آخر کار میں نے اسے عبر ناک انجام تک پہنچا دیا تھا۔

میری بات سننے کے بعد وہ بولی "وجدان' جیسا کہ تم رہے ہو میں سمجھتی ہوں' اپنے آبائی گاؤں جانا تمہارے بہت خطرناک ہو گا۔"

"ہاں خطرناک تو ہو گا۔" میں نے گمبھیر آواز میں "میری تو ساری زندگی خطروں سے کھیلتے ہوئے گزری دھنو۔ میں نے زندگی سے ایک سبق سیکھا ہے۔ اگر خطروں سے نہیں کھیلیں گے تو خطرات آپ سے کھیلنے گے۔ یہ کھیل تو کسی نہ کسی طور جاری رہنا ہی ہے اس میں بالکل مطمئن ہوں۔ وطن کی دھرتی پر قدم رکھنے کے میں اس قدر سرشار ہوں کہ بیان سے باہر ہے حالانکہ میں چاہتا تو انڈیا سے سیدھا سنگاپور چلا جاتا۔ وہاں ہمارا اب میرا ایک بہت بڑا "شعبہ جاتی اسٹور" ہے جو میں نے بوٹا سنگھ کے سپرد کر رکھا ہے۔ "عابد علی اینڈ سن" سنگاپور علاقے "چائنا ٹاؤن" کا ایک معروف ڈیپارٹمنٹل اسٹور جو ساگو اسٹریٹ پر واقع ہے مگر وطن کی محبت مجھے یہاں لائی ہے۔ کیا تمہارا' اپنے آبائی علاقے تبت کی جانب جا کو دل نہیں چاہتا؟"

"بہت دل چاہتا ہے' اس جنت نظیر اور حیرت آفرین لختِ ارض کو دیکھوں۔" وہ پرجوش لہجے میں بولی "میں نے بس وہاں کی پراسرار اور تحیر آمیز کہانیاں ہی سنی ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے بھی تبت کے بارے میں بہت سن رکھا ہے دھنو۔ میں زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ اسراروں کی اس سرزمین کو دیکھنے جاؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی وجدان۔" وہ بو گئی۔

"بشرطیکہ اس وقت تم میرے ساتھ ہو گیں تو!" نے کہا۔

وہ فرطِ جذبات سے بولی "لارڈ بدھا مجھے زندگی بھر تمہارے ساتھ رکھیں!"

اس کا انداز دعائیہ تھا۔ گویا وہ مہاتما بدھ سے درخواست کر رہی تھی کہ ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ہو جائے۔

دھنو کی خواہش بے اختیار اس کی زبان سے پھسل گئی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ مجھے ایک اور اہم کام نمٹانا ہے۔"

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "ملک نوازش علی اور میرے والد عابد علی کی دشمنی کی ایک بنیادی وجہ بھاری مالیت کا سونا بھی تھی۔ میرے والد نے نوازش علی سونا اسمگل کرنے کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا اور اس کی سونا افزائی میں سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے کینوس کے دو بڑے تھیلے میرے والد کے ہتھے چڑھ گئے تھے جو انہوں نے ایک متروک کنوئیں میں پھینک دیے تھے لیکن نوازش علی کے ہرکارے دارا سے یہ بہانہ کیا کہ انہوں نے سونے والے تھیلے دریائے راوی میں پھینک دیے ہیں۔ یہ دریا پاکستان کے شہر لاہور کے نزدیک ہے۔"

"اچھا' تو تم گڑے مردے اکھاڑنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"تمہیں یہ ساری اہم باتیں تمہارے والد نے بتائی تھیں؟" دھنو نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا "نہیں' والد صاحب کی موت کے بعد مجھے اپنے گھر میں سے ان کی خفیہ ڈائری ملی تھی جس میں یہ تمام واقعات درج ہیں۔"

"وہ ڈائری کہاں ہے؟" دھنو نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا "لاہور میں' میرے ایک محسن کے دوست کے پاس وہ ڈائری محفوظ ہے۔ میں لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی سے ملوں گا۔"

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی "اور اگر وہ ڈائری یا وہ تمہارے محسن کا دوست اب تک محفوظ نہ ہوا تو؟"

"تو کچھ نہیں۔" میں بے پروائی سے بولا "میں سونے کے حصول کی خاطر لاہور نہیں جا رہا۔ یہ تو ایک طرح کا ایڈونچر ہے۔ یادِ ماضی کا شاخسانہ ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں' میں جانتی ہوں وجدان! تم لالچی یا ہوس پرست نہیں ہو۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں جب سنگھ بدھ بھکشو نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ تم چاہو تو تہ خانے سے کچھ سونا اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو' تو تم نے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے' ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تمہارے انکار پر نئے بدھ بھکشو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے بارے میں دلائی لاما نے پہلے ہی یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ تم اس قدیم بدھ عبادت گاہ سے ایک تنکا بھی لے کر نہیں جاؤ گے۔"

مجھے یہ بات بھی اچھی طرح یاد تھی۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا چارج سنبھالنے والے بدھ راہب نے دلائی لاما کے حوالے سے کچھ اسی قسم کا تبصرہ کیا تھا۔ دلائی لاما کو بدھ مت کے پیروکار اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ تبت سے جلاوطنی کے بعد دلائی لاما نے ہندوستان کی شمالی ریاست ہماچل پردیش میں پناہ لی تھی۔ دھرم شالا کو ہماچل پردیش کے صدر مقام کی حیثیت حاصل ہے۔

دھنو نے ڈائری کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایک طرح سے بالکل ٹھیک ہی سوچ رہی تھی۔ ایسا ہو جانا ممکنات میں سے تھا۔ صحیح صورتِ حال اور تازہ ترین حالات کا علم تو لاہور پہنچنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

میرے والدین کی بہیمانہ موت کے بعد مجھے اپنے گھر سے وہ خفیہ ڈائری ملی تھی۔ ان دنوں میرے والد سنگاپور میں فورٹ کیننگ روڈ پر رہتے تھے۔ اسی گھر کے مین گیٹ پر میری ماں اور باپ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں ان کی موت کا منظر کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ازاں بعد میں نے سفاک قاتلوں کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

میرے والد صاحب کے ایک دوست پرتاب سنگھ سنگاپور کے علاقے "لٹل انڈیا" میں رہتے تھے۔ چاچا پرتاب نے جب دیکھا کہ میرے والدین کو قتل کرنے کے بعد قاتل ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ بنکاک (تھائی لینڈ) لے آیا۔ میں نے یہ سفر سنگاپور سے بنکاک تک براستہ ملائشیا کیا تھا لیکن میرے دشمن پیچھا کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ چاچا پرتاب سنگھ نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچایا تھا اور میں مہاراج وانگ ونگ یائے کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔

سنگاپور سے روانگی سے قبل چاچا پرتاب نے والد صاحب کی خفیہ ڈائری اپنے ایک دوست خشونت سنگھ کے پاس امانتاً رکھوا دی تھی۔ خشونت سنگھ اپنی بیوی رجنی اور بیٹی ارملا کور کے ساتھ سنگاپور ہی میں رہتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب مجھے دوبارہ سنگاپور جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت خشونت سنگھ اور اس کی بیوی رجنی کا انتقال ہو چکا تھا۔

ارملا کور کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس کے باپو خشونت سنگھ نے اپنی موت سے قبل وہ لاہور میں مقیم اپنے ایک دوست کو بھجوا دی تھی۔ ارملا نے مجھے اس شخص کا پتا بھی بتایا تھا جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا تھا۔

میرے اور دھنو کے درمیان کافی دیر تک مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ ایک موقع پر میں نے کہا۔

"دھنو! کیا تم اپنا نام تبدیل کرسکتی ہو؟"

"کیوں' میرے نام میں ایسی کیا خرابی ہے؟"

میں نے کہا "خرابی تو کوئی نہیں ہے۔"

وہ بولی "پھر تم مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس' مجھے تم پر یہ نام اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

دھنو چند لمحے گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "تو یہ تمہاری خواہش ہے کہ میں اپنا نام بدل لوں؟"

میں نے کہا "ایسا ہی سمجھ لو۔"

"تمہاری خواہش کی خاطر تو میں ہمالیہ سے ٹکرا سکتی ہوں وجدان۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی "ایک نام کی کیا حیثیت ہے۔ تم نے تو میری زندگی بدل دی ہے' نام بھی بدل ڈالو۔"

"ٹھیک ہے' میں اس بارے میں سوچوں گا۔" میں نے کہا۔

"تم میرا کیا نام رکھنا چاہتے ہو؟"

"ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" میں نے کہا "تمہارے ذہن میں کوئی خوب صورت سا نام ہو تو بتاؤ۔"

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی "نہیں وجدان! میں یہ نہیں کروں گی۔"

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی' میں نے پوچھا "تم کیا نہیں کرو گی؟"

"وجدان!" وہ میرے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے بولی "میرے ذہن میں چاہے سیکڑوں خوب صورت نام موجود ہوں مگر میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہی تو بات ہے وجدان۔"

"مجھے بھی تو سمجھاؤ نا!" میں نے حیرت سے اس شرارت کی پڑیا اور موم کی گڑیا کو تکتے ہوئے کہا "تم الجھی ہوئی باتیں کیوں کررہی ہو؟"

وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی "دیکھو وجدان! تم نے میرا نام تبدیل کرنے کی تجویز دی ہے۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ میرے لیے نیا نام بھی تم ہی منتخب کرو۔"

میرے سینے سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ دھنو [illegible] قدم پر اپنی ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔ پتا نہیں' وہ مجھ کیا سمجھ بیٹھی تھی۔ اس کی والہانہ عقیدت میں لمحہ [illegible] اضافہ ہوتا جارہا تھا جو مجھے ذہنی طور پر الجھن میں مبتلا [illegible] تھا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ بے سوچے نہ کررہی ہو بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی ہو۔ صورتِ حال خاصی سنگین شکل اختیار کرتی جارہی تھی۔

میں نے کہا "فی الحال تو کوئی مناسب اور منفرد سا نام [illegible] سوجھ نہیں رہا۔ میں اس بارے میں غور و فکر کروں گا۔"

"میں انتظار کروں گی وجدان۔"

دھنو نے ایک سادہ سا جملہ بالکل سہل انداز میں کہہ کر مجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ بظاہر جتنی سیدھی [illegible] آتی تھی' اندر سے اتنی ہی پیچیدہ تھی۔

○☆○

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں ہمارے "اعمال نامے" کے ساتھ اس چوکی سے متعلقہ تھانے پہنچا دیا گیا۔ مقامی پولیس کے حوالے کرنے کے بعد رینجرز والے واپس چلے گئے۔ ہم دونوں کے علاوہ پنڈت کشوری لال اور اس کے دونوں ساتھی آچرج اور پیر بخش کو بھی پولیس کی تحویل میں دیا گیا تھا۔

میں اور دھنو حوالات کے ایک کمرے میں تھے جبکہ پنڈت اور اس کے دونوں بندے دوسرے کمرے میں تھے۔ رینجرز والوں نے حویلی کے خفیہ گودام سے اسمگل شدہ مال برآمد کرلیا تھا اور ہم پانچوں کے خلاف مکمل رپورٹ درج کرنے کے بعد ہی ہمیں اپنی چوکی سے "رخصت" کیا تھا۔

ہمیں حوالات کے جس کمرے میں رکھا گیا تھا' اس کے فرش پر کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک مختصر سی چٹائی بچھی تھی۔ کسی زمانے میں وہ چٹائی اپنی اصل شکل و صورت اور سائز کے ساتھ وجود رکھتی ہوگی مگر اب امتدادِ زمانہ نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کا وجود خاصی حد تک سمٹ چکا تھا۔ اس کی حالت سے کسنہ سالی جھلکتی تھی۔ جابجا تنکے بھی ہوئے تھے۔ مذکورہ "چٹائی کی باقیات" پر مشتمل یہ کچرا کمرے کے ایک کونے میں پڑا اپنی بربادی پر اشکبار تھا۔

میں نے اس چٹائی پر بیٹھ کر حوالات کی ٹھنڈی دیوار سے ٹیک لگالی۔ دھنو بھی میرے قریب ہی ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے سے اس وقت بھی تکلیف جھلک رہی تھی۔ اب سورج پوری طرح ڈوب چکا تھا اور فضا میں خنکی در

تھی۔ صحرا کا دن جس قدر جھلسا دینے والا ہوتا ہے' رات اتنی ہی خنک اور جما دینے والی ہوتی ہے۔ ابھی تو رات کا آغاز ہوا تھا۔ فضا میں بڑھتی ہوئی خنکی دھنو کے پاؤں کے درد میں اضافہ کررہی تھی۔

میں نے اشارے سے دھنو کو اپنا پاؤں نزدیک لانے کو کہا۔ اس نے ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ مضروب پاؤں والی ٹانگ کو سمیٹ لیا۔ اس طرح زخمی ٹخنے والا پاؤں میرے دائیں ہاتھ کے قریب آگیا۔ میں نے اس کے متورم ٹخنے پر ہولے ہولے اپنی انگلیوں سے مساج کرنا شروع کردیا۔ اس طریقہ علاج کو "پاسس" کہا جاتا ہے۔ آج کل یہ عمل "ریکی" کے نام سے بھی متعارف کروایا جارہا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ قوتِ ارتکاز کی کرشمہ کاری ہے جس کے پس پردہ "چی" کارفرما ہوتی ہے۔ یہ ایک مستند اور موثر دافع درد عمل ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دھنو شانت ہوگئی پھر وہ بھی کھسک کر میرے نزدیک آگئی اور حوالات کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اب اس نے اپنی ٹانگوں کو آلتی پالتی کی شکل میں ایک دوسرے کے اوپر چڑھا لیا تھا۔ دھنو کے دائیں ٹخنے میں چوٹ آئی تھی۔ اس حالت میں بیٹھتے ہوئے مضروب پاؤں بائیں ران کے اوپر ٹک گیا تھا۔ دھنو اب اپنے ہاتھ سے دھیرے دھیرے اسے سہلا رہی تھی۔ اس نے اپنی کمر کو سیدھا رکھتے ہوئے آنکھوں کو بند کر رکھا تھا' گویا وہ "سیلف پاسس" کے عمل سے گزر رہی تھی۔

میں نے ایک بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ دھنو کے چہرے کی فطری معصومیت نے میرے دل میں گدگدی سی جگادی۔ بے اختیار مجھے اس پر پیار آنے لگا۔

دو گھنٹے بعد ہماری طلبی ہوئی۔ ایک کانسٹیبل نے آکر حوالات کا دروازہ کھولا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"انچارج صاحب نے تم دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔"

میں کوئی سوال کیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر اٹھنے میں مدد دینے کے لیے دھنو کی جانب جھکا۔ اس مرتبہ دھنو نے بہت معمولی سا سہارا لیا تھا جس کا مطلب تھا' اس کے ٹخنے کی تکلیف کافی حد تک رفع ہوچکی تھی۔

کانسٹیبل ہمیں تھانہ انچارج کے پاس پہنچا کر واپس چلا گیا۔ ہم دونوں مجرموں کی طرح تھانے دار کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ اس نے تنقیدی نظر سے ہمارا جائزہ لیا پھر اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی فائل پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"بابا' جاسوسی کرتے ہو؟"

اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ میں اس کے سوال پر کھول کر رہ گیا۔ تاہم میں نے ضبط کے دامن کو تھامے رکھا اور معتدل لہجے میں کہا۔

"تھانے دار صاحب! ہم جاسوس نہیں ہیں۔ ایک مجبوری نے ہمیں آپ کے قبضے میں پہنچا دیا ہے۔ آپ اپنی کارروائی جلد از جلد مکمل کرو اور ہمیں جانے دو۔" پھر میں نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "میری ساتھی کا پاؤں زخمی ہے' یہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔"

تھانے دار نے دھنو کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "تم بیٹھ سکتی ہو۔"

تھانے دار کی میز کے پاس ہی ایک چوبی بینچ دھری تھی۔ دھنو اس "عنایتِ خسروانہ" سے استفادہ کرتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئی۔ تھانے دار میری جانب متوجہ ہوگیا۔

"بابا' جب کوئی مجرم قانون کی گرفت میں آجاتا ہے تو وہ یہی کہانی سناتا ہے۔ وہ خود کو بے بس' لاچار' مجبور اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ ہم اس کے عادی ہیں۔"

میں نے مضبوط لہجے میں کہا "ہم نہ تو مجرم ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی جاسوسی میں ملوث ہیں۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے ہمارے بارے میں۔"

"ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہوتی۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "ہم رینجرز والوں کو مکمل بیان دے چکے ہیں۔ وہ ہم سے مطمئن ہوگئے تھے۔ ہماری تفصیلی رپورٹ آپ کے پاس پہنچ چکی ہے پھر خواہ مخواہ ہمیں کیوں پریشان کیا جارہا ہے؟"

وہ چند لمحوں تک مجھے ایسی نظر سے دیکھتا رہا جیسے میرے آرپار دیکھنے کی کوشش کررہا ہو پھر اس نے گمبھیر آواز میں کہا "رینجرز والوں نے جو کچھ کیا' اسے تو بھول جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔"

"آپ کیا کرنے والے ہو تھانے دار صاحب؟"

"میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو دشمن ملک کے جاسوسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" وہ کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تم دونوں "را" کے ایجنٹ ہو اور غیر قانونی طریقے سے بارڈر پار کرکے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہو۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے تیز آواز میں کہا۔

وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا "بابا' زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری ساتھی کا لحاظ کررہا ہوں ورنہ تمہیں ایسی کھری کھری سناتا کہ تمہارا دماغ "روشن" ہوجاتا۔"

"تم وہ کھری کھری سنا ہی دو۔" میں نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا "اس طرح تمہاری یہ کھوٹی کھوٹی تو نہیں سننا پڑے گی۔"

میرے لہجے میں اس نے گستاخی کی بو سونگھ لی۔ اس نے دہاڑتے ہوئے کہا "یہ تھانا ہے بابا... اور میں اس تھانے کا انچارج ہوں۔ زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ورنہ..."

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "ورنہ کیا ہوگا؟"

"بہت برا۔" وہ سلگتی ہوئی آواز میں بولا "بابا' تمہارے ساتھ بہت ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "ہمارے ساتھ اب تک صبح سے کون سا اچھا ہوتا آرہا ہے۔"

"بابا' تم بولتے بہت زیادہ ہو۔" تھانے دار نے تیز نظر سے مجھے گھورا "اور تمہارا خون بھی بہت گرم ہے مگر تم نے ابھی...؟"

ایک مرتبہ پھر اس نے سوالیہ انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا "آپ کو ہماری بے گناہی کا یقین کیسے آئے گا؟"

"یقین دلانا چاہتے ہو!" اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا "آپ نے ہماری رپورٹ تو پڑھ لی ہوگی۔ اس میں ایک رقعے کا ذکر بھی ہے بلکہ میرے خیال میں وہ رقعہ بھی فائل میں موجود ہوگا؟"

ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ نظر سے کرخت صورت تھانے دار کو دیکھا۔ وہ ذومعنی انداز میں گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا "ہاں ہاں' فائل میں رقعہ موجود ہے اور میں نے اسے پڑھا بھی ہے مگر تم یہ سوال کیوں کررہے ہو؟"

میں نے کہا "اس رقعے کے مطابق پنڈت کشوری لال مجھے پاکستانی کرنسی میں پچاس ہزار روپے دینے کا پابند ہے۔"

یہاں تک کہہ کر میں نے پھر تھانے دار کی طرف ایک خاص نظر سے دیکھا' وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دلچسپی نما سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا "اگر وہ رقم کشوری لال سے وصول کرکے آپ مجھے دینے کے بجائے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!؟"

میں نے اس مصیبت سے جان چھڑانے کی آسان ترین ترکیب آزمانے کا فیصلہ کرلیا تھا' گویا میں تھانے دار کو سیدھا سیدھا رشوت کی پیشکش کررہا تھا۔ میں نے برصغیر کی پولیس کے بارے میں بہت سی کہانیاں اور قصے سن رکھے تھے۔ انڈیا کی پولیس کو تو میں اچھی طرح برت اور پرکھ چکا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں بھی اس محکمے کی وہی حالت ہے جو ہندوستان میں ہے۔

میری پیشکش پر تھانے دار کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ پچاس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ یہ تو مرد آنکھوں میں بھی زندگی کی چمک اجاگر کرسکتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تھانے دار مجھے کچھ مضطرب نظر آیا پھر قدرے سخت لہجے میں بولا۔

"تو تم مجھے رشوت پیش کررہے ہو؟"

"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔

وہ سوچ میں پڑگیا پھر مجھے تولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "تم کوئی چال چلنے کی کوشش تو نہیں کررہے ہو؟"

میں نے اسے بکھن لگاتے ہوئے کہا "جناب! آپ کے سامنے میں کیا چال چل سکتا ہوں۔ آپ طاقت ور اور بااختیار ہیں۔ میں آپ کے زیر حراست ہوں۔ یہ آپ کا تھانا ہے۔ آپ یہاں کے مختار کل ہیں۔ آپ جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ قید میں رہتے ہوئے میرے لیے وہ رقم کاغذ کے ٹکڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر مجھے پچاس ہزار روپے کے عوض آزادی مل جائے تو میں خوش خوش یہاں سے جاؤں گا اور آپ کا بھی بھلا ہوجائے گا۔"

ایک لمحے کو توقف کرکے میں نے کھوجنے والی نظر سے تھانے دار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ تذبذب کے عالم میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ گویا وہ اس وقت کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے بھرپور چوٹ لگائی۔

"تھانے دار صاحب! پچاس ہزار روپے اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ اس سے آپ کے بہت سے دلدر دور ہوجائیں گے۔ گورنمنٹ آپ کو کیا تنخواہ دیتی ہوگی۔ آج کل تنخواہ میں کہاں گزارا ہوتا ہے۔ دو ماہ بعد عید آنے والی ہے۔ کیا اس موقع کو آپ ضائع کردیں گے۔ گھر آئی ہوئی لکشمی کو

دروازے سے لوٹانا عقل مندی نہیں تھانے دار صاحب!"

میری چکنی چپڑی باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ مجھے وہ نیم آمادہ نظر آنے لگا۔ میں نے ایک اور روا چڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم جاسوس نہیں ہیں ورنہ رینجرز والے ہمیں اتنی آسانی سے نہ چھوڑتے۔ ان کی عقابی نگاہیں سامنے والے کا ایکسرے کر دیتی ہیں۔ ہم اپنی بعض مجبوریوں کے باعث غیر قانونی طریقے سے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ رینجرز والے ہمیں کلیئر کر چکے ہیں۔ اب سارا معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ بھی "کلیئر" کر دیں گے تو دونوں فریقوں کا فائدہ ہو جائے گا۔ آپ ہمیں تھوڑا سا زادِ راہ دے دیں تاکہ ہم کراچی تک بہ آسانی پہنچ جائیں۔ باقی ساری رقم۔۔۔"

میں ادھورے جملے پر اپنی بات ختم کر کے زیرِ لب مسکرایا۔

تھانے دار دھیمے لہجے میں کہا "بابا' یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"آپ کے لیے آسان اور مشکل کیا ہے سائیں۔" میں نے اس میں ہوا بھرتے ہوئے کہا "کیس اس تھانے میں ہے اور آپ یہاں کے بادشاہ ہیں۔"

وہ نیم رضامند ہوتے ہوئے بولا "وہ تو ٹھیک ہے بابا' پھر بھی بہت سی باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔"

"پوری رات پڑی ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تمام باتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں اور صبح ہمیں خوشی خوشی یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔"

"ایک رات میں کیا ہو سکتا ہے!" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پھر کتنا وقت چاہیے تمہیں؟" میں اب کاروباری انداز میں تھانے دار سے بات کر رہا تھا۔

وہ بولا "سب سے پہلے تو پنڈت کشوری لال سے رقم وصول کرنے کا مرحلہ ہے۔"

"آپ کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔" میں نے اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا "پولیس والے تو اگائی کے ماہر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی پنڈت اسمگلنگ کے چکر میں بھی پھنسا ہوا ہے۔ آپ اس پر دباؤ ڈال کر پچاس ہزار تو کیا' کئی پچاس ہزار نکلوا سکتے ہو۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "آپ پتا نہیں' کس قسم کے تھانے دار ہو سائیں! اگر آپ کی کرسی پر میں بیٹھا ہوتا تو کب کی یہ "ڈیل" مکمل کر چکا ہوتا۔"

میری بات نے تھانے دار کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تعاون آمیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "اچھا' ٹھیک ہے۔ میں پنڈت کو بلا کر اس سے بات کرتا ہوں۔"

میں مطمئن ہو گیا کہ اب "بات بن" جائے گی۔

ہمیں دوبارہ حوالات میں لے جایا جانے لگا تو میں نے تھانے دار سے کہا "سائیں! کیا آپ کی نگری میں ہم بھوکے پیاسے مر جائیں گے!"

اس نے نگاہ اٹھا کر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا اور کہا "کیا مطلب ہے آپ کا بابا؟"

"مطلب یہ ہے سائیں کہ ہم نے دوپہر کے بعد سے کچھ کھایا پیا نہیں۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے پینے کا کچھ بندوبست ہو جائے تو۔۔۔"

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا "ہاں ہاں' بابا تمہیں رات کا کھانا ضرور دیا جائے گا۔"

ہم مطمئن انداز میں کانسٹیبل کے ساتھ چلتے ہوئے دوبارہ حوالات میں آ گئے۔ کانسٹیبل نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہمارا کھانا حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ تنوری روٹیوں کے ساتھ مکس سبزیوں کا سالن تھا جو کسی اناڑی باورچی کی "ہنرمندی" کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ منہ بولتا اس طرح بھی کہ اسے کھانے کے بعد کھانے والا منہ سے کچھ نہ کچھ ضرور بولتا تھا۔۔۔ اور یہ بولنا' باورچی کی شان میں "قصیدے" کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال' ہم نے صبر شکر کر کے کھانا اپنے معدوں میں اتارا اور پانی پینے کے بعد کھانے کے برتن حوالات کے دروازے کے پاس رکھ دیے۔

میں نے دوبارہ حوالات کی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ ہمارے پاس گھڑی نہیں تھی تاہم میرا اندازہ تھا کہ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ مجھے امید تھی کہ تھانے دار پنڈت کو پٹانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

دھنو بھی خود کو خاصا "ریلیکس" محسوس کر رہی تھی۔ اس کی نخنے کی چوٹ میں اب درد نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا پھر تھانے دار سے ہونے والی ملاقات بھی خاصی حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھی۔ اسی ذیل میں دھنو نے مجھ سے پوچھا۔

"وجدان! تمہارا کیا خیال ہے' تھانے دار تمہاری تجویز ماننے پر تیار ہو جائے گا؟"

میں نے کہا "مجھے تو پوری امید ہے۔ پنڈت کشوری لال اس وقت تھانے دار کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ دم نہیں مار سکے گا۔ اس پر اسمگلنگ اور غیر قانونی طور پر لوگوں کو بارڈر عبور کروانے کے سنگین ترین الزامات ہیں۔ ان الزامات کے سلسلے میں ٹھوس ثبوت بھی موجود ہیں۔ اس وقت تھانے دار پنڈت سے ہر بات منوانے کی پوزیشن میں ہے پھر پنڈت کوئی مفلس و نادار یا پھٹیچر قسم کا آدمی بھی نہیں ہے۔ وہ اس گاؤں کی ایک صاحب حیثیت شخصیت ہے۔ پچاس ہزار تو وہ خوشی خوشی تھانے دار کی ہتھیلی پر رکھ دے گا بلکہ میرا خیال ہے' خوشی تھانے دار اس سے کچھ زیادہ رقم نکلوانے کی کوشش بھی کرے گا۔ یہ پچاس ہزار تو پنڈت کو ہر صورت دینا ہی ہیں۔ اس کے پاس یہ رقم ہماری امانت ہے۔"

دھنو نے کہا "ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ انشاء اللہ۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

وہ بولی "وجدان! تمہیں کیسا لگ رہا ہے۔ اپنے ملک میں داخل ہوتے ہی تم قدم قدم پر الجھنوں میں گھرتے جا رہے ہو؟"

"یہ وقتی پریشانی ہے دھنو۔" میں نے کہا "ہم بہت جلد اس ملک کی آزاد فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔"

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "وجدان! میں نے تمہاری دیکھا دیکھی کچھ کوشش کی ہے اور مجھے اس سے فائدہ بھی ہوا ہے۔"

میں نے پوچھا "کیسی کوشش اور کس قسم کا فائدہ؟"

"تھوڑی دیر پہلے جب تم نے میرے نخنے کا مساج کیا تھا تو مجھے بڑا سکون ملا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "بعد میں' میں نے بھی آلتی پالتی مار کر آنکھیں بند کرنے کے بعد اپنی ساری توجہ نخنے پر مرکوز کر دی تھی اور اس مساج سے مجھے واقعی خاصی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔"

"ہاں' میں نے دیکھا تھا تمہیں ایسا کرتے ہوئے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ارتکازِ توجہ سے ایسے چھوٹے موٹے شعبدے دکھائے جا سکتے ہیں۔ چند روز کی مشق سے یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی جا سکتی ہے تاہم "چی" کی بیداری اور اس قوت کا استعمال ایک دوسری چیز ہے جس کے لیے باقاعدہ کسی جانکار کی نگرانی میں مشقیں کرنا پڑتی ہیں۔"

وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے دانستہ اس سے یہ بات چھپالی تھی کہ جب وہ آلتی پالتی مارے دھیان گیان میں مصروف تھی تو مجھے بے اختیار اس پر پیار آ رہا تھا۔

میری بات کے مکمل ہونے پر دھنو نے کہا "وجدان! ہم ذرا اس مصیبت سے نکل جائیں پھر میں تمہاری نگرانی میں "چی" کی مشقیں شروع کر دوں گی۔"

میں نے کہا "دھنو! اگر ہم اپنی پوری زندگی کا دیانت داری سے تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہماری زندگی کا زیادہ تر حصہ بدامنی' الجھن اور پریشانی میں گزرتا ہے۔ خوشی' آرام' سکون اور فراغت کے بہت کم لمحات ہمارے حصے میں آتے ہیں اس لیے ہمیں کسی تعمیری اور مثبت کام کا آغاز کرنے کے لیے کسی خاص موقع کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم بہت سا وقت ضائع کر دیتے ہیں چنانچہ ایک لمحے کی تاخیر سے تمہیں یہ نیک کام شروع کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے' کل ہم آج سے زیادہ مصیبت زدہ ہوں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو وجدان!" وہ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ یہاں حوالات میں تم "چی" کی بیداری کی مشقیں نہیں کر سکتی ہو اور خاص طور پر یہ وقت بھی غیر موزوں ہے کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے کھانا کھایا ہے۔ "چی" کی مشقیں ہمیشہ خالی پیٹ کی جاتی ہیں لیکن۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن کسی بھی پریکٹیکل سے پہلے تھیوری پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔"

"ہاں' یہ تو تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" دھنو جلدی سے بولی۔

میں نے کہا "دھنو! جب تک تمہیں پورے سکون سے مشقیں کرنے کا موقع نہیں ملتا' تم تھیوری کو ہی ازبر کر لو۔ میں تمہاری تربیت ابھی سے شروع کر دیتا ہوں۔"

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور پوری توجہ میری آواز پر مرکوز کر دی۔

اسی وقت حوالات کے دروازے پر وہ کانسٹیبل نمودار ہوا جو ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولے بغیر خالی برتن حوالات کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر ڈال کر اٹھا لیے۔ جب وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"سائیں! کیا پوری رات ہم یونہی بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے رہیں گے۔ کوئی چادر یا کمبل وغیرہ نہیں ملے گا

ہمیں؟"

رات جوں جوں بھیگ رہی تھی' فضا کی خنکی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے اپنی تو پروا نہیں تھی۔ میں ایک لنگوٹ میں برف کی سل پر بیٹھ کر بھی پوری رات نہایت سکون سے گزار سکتا تھا لیکن دھنو اس قسم کی سختی سہنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اگرچہ وہ سرد پہاڑی علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس نے بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں سرد ترین موسم بھی برداشت کیا ہوگا۔ یہ قدیم بدھ عبادت گاہ ایک دریا کے کنارے واقع ہے اور پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ اگر کھٹمنڈو سے بھاگ متی کی جانب جائیں تو یہ بدھ عبادت گاہ ان دونوں مقامات کے درمیان سڑک سے چھ سات کلومیٹر ہٹ کر واقع ہے۔

لیکن یہاں مسئلہ دوسرا تھا۔ دن اور رات میں موسم کے تیور بالکل بالعکس ہوتے تھے۔ صحرا کا دن انتہائی تپتا ہوا اور جھلسا دینے والا ہوتا ہے اور رات کا ابتدائی حصہ معتدل ہوتا ہے مگر جیسے جیسے رات آگے سرکتی ہے' ٹھنڈک بڑھنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ رات کے پچھلے پہر شدید سردی ہوجاتی ہے پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ دھنو کا ایک تخنا بری طرح متاثر ہوچکا تھا اور وہ گزشتہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔ میں نے انہی تمام حقائق کی روشنی میں دھنو کے لیے کسی اوڑھنی کا بندوبست کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

کانٹیبل نے میری بات کا مثبت ردِعمل پیش کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ چیک دار ایک بوسیدہ سی چادر لے کر میرے پاس آگیا۔

میں نے حوالات کی سلاخوں میں سے وہ چادر پکڑلی اور کانٹیبل سے پوچھا "تھانے دار صاحب کیا کررہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "وہ پنڈت کشوری لال کے ساتھ کسی قسم کے مذاکرات کررہے ہیں۔"

میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا کہ ان "مذاکرات" کی نوعیت کیا ہوگی۔

کانٹیبل کے جانے کے بعد میں نے وہ خستہ حال چادر دھنو کو اڑھادی اور گفتگو کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑتے ہوئے کہا۔

"دھنو!" "چی" کی قوت پیٹ کے زیریں حصے میں' ناف کے قریب خوابیدہ حالت میں موجود ہوتی ہے۔ اس کو جگانے کے لیے سانس کی مخصوص قسم کی مشقیں کرنا پڑتی ہیں۔ وہ مشقیں میں عملی طور پر تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم اس میدان میں باقاعدہ قدم رکھ دو گی۔

"جب "چی" ایک مخمور انگڑائی لے کر بیدار ہوجائے' پھر سب سے اہم مرحلہ اس کو سنبھالنے کا ہوتا ہے۔ وہ کسی سرکش گھوڑی کے مانند آسانی سے قابو میں نہیں آتی۔ اسے باقاعدہ لگام دینا پڑتی ہے ورنہ وہ دماغ کی طرف سفر کرکے بے انتہا تباہ کاری مچاسکتی ہے جس میں سب سے زیادہ خطرہ مشقیں کرنے والے انسان کی جان کو ہوتا ہے۔"

دھنو نے ایک جھرجھری لی اور بولی "پھر تو یہ بہت خوفناک قوت ہے!"

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بات جاری رکھی "یہ خطرناک اور نقصان دہ صرف ان لوگوں کے لیے ثابت ہوتی ہے جو بغیر کسی راہنما کے الٹی سیدھی مشقیں کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان نوجوانوں اور جوانوں کی ہے جو بازار میں موجود کتابوں کی مدد سے اس قوت کو تسخیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"تم آسانی کے لیے یوں سمجھ لو کہ "چی" کو بیدار کرنے والی مشقیں صرف اور صرف احتیاط اور مناسب راہنمائی کا تقاضا کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی ماہر کی نگرانی میں یہ مشقیں کرے تو بے شک وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔"

"چی کو بیدار کرنے میں کم و بیش کتنا عرصہ لگ جاتا ہے؟" دھنو نے ایک اہم سوال کیا۔

میں نے بتایا "یہ مدت ہر شخص کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ دو ماہ سے لے کر دو سال تک لگ سکتے ہیں اور بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی بھر کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہر بار ناکام رہتے ہیں۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟" دھنو نے پوچھا۔

"دھنو! ایک بات ذہن میں بٹھالو۔" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ سارا کھیل لگن اور ارتکاز کا ہے۔ جن لوگوں میں ان دو چیزوں یا ان میں سے کسی کے ایک چیز کا بھی فقدان ہوتا ہے' وہ ساری عمر سر پٹختے رہتے ہیں مگر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

دھنو نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "وجدان! تمہیں اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے میں کتنا عرصہ لگا تھا؟"

میں نے بتایا "عرصہ پچاس دن۔"

"یعنی دو ماہ سے بھی کم؟" اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

میں نے کہا "دھنو! اس میں مجھ سے زیادہ کمال میرے استاد کا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی بہت بلند پایہ روحانی و جسمانی علوم کا ماہر تھا۔"

"تم کتنے خوش قسمت ہو وجدان۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی پھر پرعزم انداز میں کہا "خیر' میں بھی کچھ کم خوش نصیب نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے جیسا دوست اور استاد حاصل ہوگیا ہے۔ میں بھی ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دکھاؤں گی۔"

"انشاءاللہ۔" میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

دھنو کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ یہ نیند اور بے آرامی کا نتیجہ تھا۔ گزشتہ پوری رات ایک قسم کے ایڈونچر میں گزری تھی۔ ہم دونوں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکے تھے۔ میں خود بھی اپنے جسم میں تناؤ اور تھکن سی محسوس کررہا تھا۔ تاہم میرا جاگتے رہنا ضروری تھا اس لیے میں نے دھنو سے کہا۔

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ تمہیں سوجانا چاہیے۔"

"اور کیا تم جاگتے رہو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم بھی تو تھکے ہوئے ہو!"

"میری بات دوسری ہے۔" میں نے کہا۔

"دوسری کیوں ہے؟" وہ اپنی فطری شوخی سے بولی۔

"ہر بات بتانا ضروری نہیں ہوتا۔" میں نے میٹھی سرزنش کی۔

اس نے پوچھا "پھر کیا ضروری ہوتا ہے؟"

"تم باز نہیں آؤ گی دھنو کی بچی!" میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا "بولنا بند کرو۔"

"بولنا بند کردوں تو پھر کیا کروں؟" وہ شرارت پر تلی بیٹھی تھی۔

میں نے جھلا کر کہا "سوجاؤ!"

اور وہ واقعی سوگئی۔

○☆○

میری نظر دیے کی لو پر جمی ہوئی تھی۔

رات کا اندھیرا ہوتے ہی ایک کانٹیبل یہ دیا حوالات کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں سنگی دیوار سے سر ٹکائے یک ٹک دیے کی لو کو دیکھ رہا تھا۔ میرے نزدیک ہی دھنو بوسیدہ چٹائی پر خستہ حال چادر اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس وقت ہم جس صورتِ حال سے گزر رہے تھے وہ نہ تو اطمینان بخش تھی اور نہ ہی آرام دہ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

میری آنکھیں بھی بوجھل ہورہی تھیں۔ مجھے ایک خمار کا سا احساس ہورہا تھا۔ دیے کی لو دیکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے دیے کی حرارت میری آنکھوں کے راستے جسم میں اتر رہی ہو۔ کچھ دیر میں اسی کیفیت میں رہا پھر مجھے اپنا بدن تپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ واقعتاً دیے کی لو سے خارج ہونے والی "لائٹ انرجی" میرے جسم میں اتر کر اس کا درجہ حرارت بڑھا رہی تھی۔

یکایک مجھے یوں لگا جیسے دیے کی لو نے پھیلنا شروع کردیا ہو۔ وہ ننھی سی لو بڑی تیزی سے اپنے حجم میں اضافہ کررہی تھی مگر اس کی شکل و ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہی کہا جاسکتا تھا کہ ننھی لو نے دیو قامت اختیار کرلی تھی۔

میں لو کے بڑھتے ہوئے سائز کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب تماشا شروع ہوگیا۔ اس دیو قامت لو میں سے ایک انسانی پیکر نمودار ہورہا تھا۔ میں یک ٹک نظر جمائے اس پیکر کو تکے چلا جارہا تھا۔ جب اس کے خدوخال نمایاں ہوگئے تو میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

وہ ملکوتی حسن کی مالک نیلگری تھی!

میں کھلی آنکھوں سے اس مجسم حسن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آمد نے حوالات کے کمرے کو مہکا دیا تھا۔ وہ سبک خرام قدموں سے ہوا میں چلتی ہوئی میرے نزدیک آگئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر وہی دل نشیں مسکراہٹ تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کرچکا تھا۔ میں اس کے کیف آور لمس کو بھی نہیں بھولا تھا۔ اس کے مرمریں بدن کی ایک ایک جنبش میری یادداشت میں نقش تھی۔

میرے قریب پہنچ کر وہ میرے چہرے پر جھک گئی پھر اپنے دودھیا گداز ہاتھوں میں اس نے میرا چہرہ تھام لیا اور میری پیشانی پر اپنے شنگرفی ہونٹ رکھ کر ایک طویل بوسہ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

وہ بند آنکھوں کے پیچھے روشن ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے جن سے خارج ہونے والی کرنیں میرے تصور کو جگمگا رہی تھیں۔ میرے تصور کی دنیا اس کے لطیف بدن کی خوشبو سے بس گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی عطردان کھول کر رکھ دیا گیا ہو۔

اپنے گلاب لبوں کی نرمی اور تازگی کو میری پیشانی میں اتارنے کے بعد جب وہ سیدھی ہوئی تو اس کا انگ انگ مہکا رہا تھا۔ میں ان ناقابلِ فراموش اور انبساط آور لمحوں کی نشاط انگیزی کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

نیلگری کے نورانی پیکر میں زندگی اپنے مدوجزر کے ساتھ

ہلکورے لیتی محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ بولی تو ایسا لگتا جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔

اس کی آواز اپنی تمام تر نغمگی کے ساتھ سماعت کے راستے میری روح میں اتر رہی تھی۔ میں سرشاری کے عالم میں نیلگری کی مدھر آواز پر توجہ مرکوز کیے لیٹا تھا۔ اس نے سریلے لہجے میں کہا۔

"وجدان! ایک مرتبہ پھر میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے اس خبیث خصلت گوتم بھوش کو ختم کرکے مجھے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے کیونکہ ہزاروں سال تک مجھے کوئی ایسی ہستی دکھائی نہیں دیتی جس میں اس راہ کی دشواریاں اور سختیاں جھیلنے کا یارا ہو۔ اب میں ہزاروں سال کے لیے امن و سکون سے رہ سکتی ہوں لیکن..." وہ یک لخت اداس ہوگئی۔ اب وہ پہلے والی شگفتہ نیلگری نہیں رہی تھی۔

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جگر پاش نظر سے مجھے دیکھا۔ میں تڑپ کر بولا۔

"لیکن کیا نیلگری؟"

اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میرے لیے یہ حیرت اور دکھ کی بات تھی۔ گوتم بھوش کی موت کے بعد نیلگری بڑی شاداں و فرحاں رہنے لگی تھی اس لیے اس کی یہ دل گرفتگی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"لیکن وجدان!" وہ دکھی لہجے میں بولی "مجھے لگتا ہے، تم کبھی میری بات نہیں مانو گے۔"

نیلگری جب بولتی تھی تو اس کے ہونٹ ساکت رہتے تھے۔ بس اس کی سریلی سرگوشی میری سماعت تک پہنچتی رہتی تھی۔ آج اس سرگوشی کا سریلا پن اچانک غم و اندوہ میں ڈوب چکا تھا۔

میں نے بے قرار لہجے میں پوچھا "میں سمجھا نہیں نیلگری، تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ میں تمہاری کون سی بات نہیں مانوں گا؟"

"میری دلی خواہش یہ تھی کہ تم اپنا جاپ مکمل کرلو تاکہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری کنیز بن جاؤں مگر تم نے کبھی اس طرف دھیان دینے کی کوشش نہیں کی اور اب تو مجھے یہ اور بھی ناممکن نظر آرہا ہے کیونکہ..."

اس نے ایک مرتبہ پر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "اب ایسی کیا بات ہوگئی نیلگری؟"

"اب تم نے اپنی دھرتی پر قدم رکھ دیا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے وجدان۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں نیلگری۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا "ذرا وضاحت سے اور آسان الفاظ میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرو۔"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر ساکت لبوں سے سرگوشیانہ انداز میں بتانے لگی "وجدان! تم مسلمان ہو، تمہاری رگوں میں مسلمان والدین کا خون ہے۔ مسلمان جاپ اور منتر وغیرہ کو اچھا نہیں سمجھتے اور جب سے تم نے اپنے ملک کی زمین پر قدم رکھا ہے، میں محسوس کررہی ہوں، تم اپنے ماضی سے ناتا توڑتے جارہے ہو۔ تمہارے اندر کا مسلمان انگڑائی لے کر بیدار ہورہا ہے۔ اب مجھے نہیں امید کہ تم کبھی اپنا جاپ مکمل کرنے کی کوشش کرو اس لیے میں کلی طور پر تمہارے تصرف میں نہیں آسکوں گی لیکن..."

"تم بار بار اپنی بات کو ادھورا کیوں چھوڑ دیتی ہو نیلگری؟"

"چھوڑو، رہنے دو۔" وہ جان چھڑانے لگی۔

"نہیں، تمہیں بتانا ہوگا۔" میں نے اصرار کیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "تم نے میری دی ہوئی مالا کی بھی حفاظت نہیں کی۔" اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے نیلگری۔" میں نے جلدی سے کہا "مالا کی گمشدگی میں میرا کوئی قصور نہیں۔ ہم ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھے کہ ہمیں اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی "میں جانتی ہوں مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ تمہیں اس زیاں پر کوئی افسوس بھی نہیں ہورہا۔ تم نے اس دوران میں ایک مرتبہ بھی شدت سے مالا کی جدائی کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"میں اپنی اس کوتاہی پر نادم ہوں نیلگری۔" میں نے خلوص دل سے کہا "تم تو جانتی ہی ہو، ہم یہاں آتے ہی کن حالات کا شکار ہوگئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ دوبارہ اس ریگزار میں جاکر مالا کو تلاش کروں۔"

"اس کی ضرورت نہیں وجدان۔" وہ اداس مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی "وہ مالا میرے پاس پہنچ چکی ہے۔ میں اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا بخوبی جانتی ہوں۔"

"کہاں ہے وہ مالا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں نے بتایا نا، وہ میرے پاس ہے۔"

"مجھے نہیں دوگی؟"

"نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے قطعیت سے بولی۔

"کیوں، ناراض ہو؟"

"میں تم سے ناراضی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"پھر مالا دینے میں تردد کیوں؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "تمہیں اس مالا کی حاجت نہیں ہے۔"

"کیا کسی کو دیا ہوا تحفہ واپس لیا جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "میں نے وہ مالا تم سے واپس نہیں لی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس تحفے کی حفاظت نہیں کرسکے۔"

"اس کوتاہی کے لیے میں ندامت کا اظہار کرچکا ہوں نیلگری۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "اگر اس سے تمہاری تشفی نہیں ہوئی تو میرے لیے کوئی سزا مقرر کردو۔"

وہ شاکی لہجے میں بولی "کیسی باتیں کرتے ہو وجدان! میں تمہیں کوئی سزا دینے کے بارے میں بھلا کیسے سوچ سکتی ہوں۔ میری تو شدید ترین تمنا یہ تھی کہ تمہاری کنیز بن کر میں تمہارے قدموں میں رہوں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اب میں کسی دوسرے طریقے سے تمہارا قرب حاصل کرتی رہوں گی۔"

"تم تو بہت ڈرانے والی باتیں کررہی ہو نیلگری۔"

"ڈرو مت وجدان۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم مرد ہو، مرد کے بچے ہو۔ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرو۔"

"میں نے زندگی بھر مردانہ وار ہی حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت گزارا ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگی۔ تم مہان شکتی ہو، ہمالیہ کی ترائیوں میں مقیم ایک پراسرار قوت ہو۔"

وہ اپنی صراحی دار گردن کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی "ہاں، میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں ہمالیہ کی شکتی ہوں۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے پنڈت، یوگی اور سادھو اپنی زندگی مشکل اور کٹھن جاپوں کی نذر کردیتے ہیں مگر چونکہ ان کی نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، وہ مجھے اپنی برتری منوانے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں، نوعِ انسانی کو اپنے قدموں میں جھکانے کے خواب دیکھتے ہیں اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے لیکن تم..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی پھر چند لمحات بعد خود ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تم نے مجھے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تم نے مجھے ایک مکروہ شخص کے قبضے میں جانے سے بچایا ہے۔ میں اس کے لیے زندگی بھر تمہاری شکر گزار رہوں گی۔ تم نے کہا، مجھے تمہاری زندگی کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہوگا۔ ہاں، میں تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جانتی ہوں۔ تم نے بچپن سے نوجوانی اور پھر جوانی تک ایک جنگ لڑی ہے بلکہ جنگ لڑ رہے ہو اور آئندہ بھی زندگی بھر یہ جنگ لڑتے رہو گے۔ یہ نیکی اور بدی کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں بالآخر فتح نیکی ہی کی ہوتی ہے مگر کٹھنائیوں اور مشکلوں سے گزرنے کے بعد۔ وجدان! تم ایک سچے انسان ہو، نیکی کے علمبردار ہو اس لیے فتح و کامرانی اور نصرت و شادمانی ہمیشہ تمہارے قدم چومے گی مگر..."

وہ ایک مرتبہ پھر بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا وجود ساکت تھا لیکن جب وہ بولتی تھی تو لگتا تھا، اس کے اندر کوئی نادیدہ قوت، کوئی سرگرم حرارت موجزن ہو۔ اس کا ہر ہر عضو خاموشی کی زبان بولتا تھا۔ وہ بات کے مفہوم اور اہمیت کے مطابق اپنے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی لے آتی تھی۔ کبھی وہ بہت غم زدہ اور ملول نظر آنے لگتی، دل گرفتہ اور آزردہ دکھائی دینے لگتی، کبھی وہ سنجیدہ اور شکوہ کناں بن جاتی اور کبھی کھلی کھلی پڑ رہی ہوتی۔ اس کی ملکوتی مسکراہٹ سے پھول جھڑتے تھے، اس کا انداز اپنے اندر گل افشانی کی خاصیت رکھتا تھا، وہ ایک روح پرور نظارہ تھی، حسن کی ہر ہر ادا اس سے آشکارہ تھی۔

اس مرتبہ نیلگری کی خاموشی کو میں سہہ نہ سکا، بے اختیار میں نے پوچھا "تم نے "مگر" پر اپنی بات کو روک دیا ہے۔ کیوں، نیلگری! ایسا کیوں؟"

وہ مدبرانہ انداز میں سنجیدہ ہوگئی پھر کسی مفکر کے سے لہجے میں بولی "وجدان! تم نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا تجربہ حاصل کرلیا ہے لیکن ایک شعبے کے بارے میں تمہاری معلومات صفر کے برابر ہیں۔"

"وہ کون سا شعبہ ہے نیلگری؟" میں متعجب نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

"وہ شعبہ ہے... عورت!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں الجھ گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم عورت کے مزاج، اس کی فطرت، اس کی سرشت اور اس کی عادت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

میں نے بدستور الجھے ہوئے لہجے میں کہا "ذرا وضاحت کرو۔"

وہ بولی "میری ایک بات ذہن میں نقش کرلو وجدان! عورت کے پیچھے جتنا بھاگو گے' یہ تم سے دور ہوتی جائے گی اور اگر تم عورت سے بھاگو گے تو یہ تمہارے تعاقب میں لگی رہے گی۔ میں طبعاً' مزاجاً اور ساختاً ایک عورت ہوں اس لیے یہ بات میں زیادہ بہتر طور پر جانتی ہوں۔ تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنے رویے میں توازن قائم کرو۔ کائنات کی ہر شے کا وجود توازن پر قائم ہے۔ اگر کسی چیز میں زیادہ عرصے تک توازن کا فقدان رہے تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے' تباہ و برباد ہوجاتی ہے' اس کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اگر تم نے اپنے رویے میں تبدیلی نہ کی تو۔"

یہاں تک پہنچ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ "تو کیا؟" میں اس کی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت گہری تھی' اسی لیے گہری گہری باتیں کرتی تھی۔ میرے ذہن میں اس رات کا منظر گھوم گیا جب کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں مجھے نیلگری کا ٹوٹا ہوا مجسمہ ملا تھا۔ کرسٹل کا وہ صاف و شفاف مجسمہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ میں ان دونوں حصوں کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا اور انہیں اسکاچ ٹیپ کی مدد سے جوڑ کر مجسمے کو مکمل کردیا تھا پھر رات کے آخری پہر وہ مجسمہ دنیا کی حسین ترین عورت کا روپ اختیار کرگیا تھا۔ نیلگری کا حسن و جمال واقعی لاجواب اور بے مثال تھا۔ وہ اس دنیا کی نہیں لگتی تھی!

میں ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں نیلگری کو دیکھ رہا تھا۔ وہ روشنی کا پیکر تھی اور فضا میں معلق تھی جیسے اڑتے اڑتے ساکت ہوگئی ہو' تیرتے تیرتے تھم گئی ہو اور بہتے بہتے رک گئی ہو۔

چند لمحات کے توقف کے بعد اس کے ساکت احمریں ہونٹوں کی خاموش سرگوشی میری سماعت میں گونجنے لگی۔ وہ اپنی شیریں آواز کا رس میری روح پر ٹپکا رہی تھی جس کی مٹھاس سے میرے قلب و نظر پر وجد کا سا عالم طاری تھا۔

"وجدان! قدرت نے انسان کو ایک مخصوص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ عورت اور مرد کو ایک جوڑے کی شکل دی ہے۔ فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ عورت اور مرد جوڑے کی صورت میں زندگی بسر کریں۔ یاد رکھو' کائنات کی کوئی بھی چیز اپنی فطرت کے خلاف زیادہ عرصے تک پنپ نہیں سکتی۔ اسے نیست و نابود ہونا پڑتا ہے۔ تم میری باتوں کا مطلب سمجھ رہے ہو نا وجدان؟"

میں نے کسی سحرزدہ معمول کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اپنا شیریں کلام جاری رکھتے ہوئے بولی "میں نے یہ تمنا کی تھی کہ تمہاری کنیز بن جاؤں مگر اپنی اصلی شکل میں اب مجھے یہ ممکن نظر نہیں آتا' مجھے کوئی دوسری صورت اختیار کرنا ہوگی۔ میں مکمل طور پر تمہاری بن جانے سے پہلے تمہیں بے انتہا و بے پناہ شکتیوں کا مالک بنانا چاہتی تھی۔ وہ پراسرار مالا اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی لیکن' آہ!"

وہ ایک طویل نرم و گرم سانس خارج کرتے ہوئے بولی "وجدان! تم مختلف اور منفرد مرد ہو۔ پراسرار شکتیوں وغیرہ کو تم زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہو بلکہ اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہو۔ تم نے ماسٹرہپناٹائز کی دی ہوئی شکتی یعنی "چی" سے بھی خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔ بس اتفاق ہی سے دو چار مرتبہ اسے استعمال میں لائے ہوگے۔ تم دراصل ایک عملی انسان ہو۔ پریکٹیکل لوگوں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ تم ایک باصلاحیت اور نیک نیت انسان ہو۔ بدی کے خلاف نیکی کا ساتھ دیتے ہو۔ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی دستگیری کرتے ہو۔ بس تمہاری انہی اداؤں نے تو مجھے گھائل کیا ہے وجدان۔ میں تمہاری گرویدہ ہوگئی ہوں۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی اور اپنی اصلی شکل و صورت میں تمہارے قریب نہیں آسکتی کیونکہ تم نے اپنا چاپ مکمل نہیں کیا اور نہ ہی کبھی مکمل کرو گے۔ چاپ مکمل کیے بغیر ہمارا ملاپ نہیں ہوسکتا۔ تمہیں میری طلب ہو یا نہ ہو لیکن تم میرا مطلوب ہو۔ میں اپنی اصل شکل میں نہ سہی' کسی دوسری صورت میں تو تمہارا قرب حاصل کرسکتی ہوں!"

یہاں تک پہنچ کر نیلگری دل آویز انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کوئی ایسی بات تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا "آخر تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو نیلگری۔ تمہارے عزائم تو مجھے خاصے خوف زدہ کرنے والے محسوس ہورہے ہیں۔"

روشنی کے اس پیکر نیلگری کی آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ وہ خاموش لبوں سے گویا ہوئی تو میری سماعت میں نقرئی گھنٹیوں کی گنگناہٹ بہت دور تک اترتی چلی گئی۔

"وجدان! ساری دنیا کے یوگی' سادھو' پنڈت اور گیانی مجھے حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں لیکن میں نے خود کو تمہارے لیے مخصوص کردیا ہے۔ میں تمہاری سنجیدہ مہکاؤں گی' راتیں چمکاؤں گی اور خلوتیں گرماؤں گی۔ تم مجھے اپنے بستر کی شکنوں میں پاؤ گے۔ میں لہو بن کر تمہاری نس نس میں دوڑوں گی۔"

میں سراسیمہ نظر سے نیلگری کو دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک انداز دلربائی سے مسکرائی اور بولی "وجدان! مجھے دیکھ لو' بہت اچھی طرح غور سے دیکھ لو۔ میں اپنی اصلی شکل و صورت میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ آج کے بعد تم میری اصل صورت نہیں دیکھ سکو گے اس شکل میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وجدان!"

"ایسا تو نہ کہو نیلگری!" میں تڑپ کر بولا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی "وجدان! آج کے بعد میں نئے رنگ و روپ میں' نئے بہروپ میں تمہارے سامنے آیا کروں گی۔ جب بھی کوئی عورت تنہائی میں تمہارا قرب حاصل کرنا چاہے گی تو تم اس کے اندر نیلگری کو پاؤ گے۔ ہر عورت میں' بہرصورت میں تمہیں حاصل کرتی رہوں گی۔"

میں نے لکنت زدہ لہجے میں کہا "تم اتنی خطرناک ہوسکتی ہو نیلگری' یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا!"

وہ خاموش لبوں سے مسکرائی اور ہوا میں تیرتے ہوئے میرے انتہائی قریب آگئی پھر میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے بولی "جو بات انسان نے کبھی سوچی نہیں ہوتی' کبھی نہ کبھی اسے سوچنا پڑتی ہے۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ نہایت آہستگی سے میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم حد سے بڑھ رہی ہو نیلگری!"

"اور تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو وجدان۔" وہ میری پسلیوں پر اپنا ملکوتی چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔

میں سناٹے میں آگیا پھر کمزور سے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"یہ بے ہودگی نہیں' خوشنودگی ہے۔"

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں حوالات کی اسی کوٹھڑی میں ننگی دیوار سے سر لگائے لیٹا تھا۔ مٹی کے تیل کا دیا اپنی جگہ پر اصلی حالت میں روشن تھا۔ تھوڑی دیر قبل نیلگری سے میں نے جس کیف آگیں اور نشاط انگیز ماحول میں الوداعی مکالمت کی تھی وہ سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے پہلو میں چلا گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے نیلگری دراز تھی۔

میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میرا ہاتھ نسوانی خطوط سے چھو گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کن انکھیوں سے اپنے پہلو میں دیکھا۔

ایک اطمینان بخش سانس میرے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ دھنو تھی جو نیند کی حالت میں پھسلتے ہوئے میرے پہلو سے آلگی تھی۔ سردی کے باعث اس نے اپنے وجود کو جھینگے کی طرح موڑ رکھا تھا۔ اس کا منہ میری پسلیوں سے ٹکا ہوا تھا اور وہ گہری گہری گرم سانسیں لے رہی تھی۔ اللہ نے عورت کو مرد کی پسلیوں سے تخلیق کیا ہے۔ سب کو اپنی جنم بھومی سے پیار ہوتا ہے!

میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا پھر کھسک کر اپنے اور دھنو کے درمیان کچھ فاصلہ پیدا کیا۔ میرے بدن کی جنبش سے دھنو کسمسائی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

دھنو کی کھلی ہوئی آنکھوں میں مجھے نیلگری مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے پورے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں ہڑبڑا کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا وجدان؟" دھنو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی "تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کیا بات ہے وجدان' مجھے سچ سچ بتاؤ؟"

میں دھنو کو نیلگری کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا لہٰذا خاموش بیٹھا رہا۔ اس وقت سردی ہونے کے باوجود بھی

زندگی دوستوں کے لیے ایک دعا کردوں کسی دشمن کے لیے بھی
ان کے لیے جن کے سینے دھواں دیتے ہیں
آنسوؤں آہوں اشکوں اور حوصلوں کی داستان
عبرت انگیز' حیرت انگیز' ناقابل فراموش
ریاض الرحمان خان کی آپ بیتی جگ بیتی
اس جوان جہت سے زندگی کا روپ مختلف تھا۔
دل فگاروں کے لئے سب رنگ ڈائجسٹ کا انمول سلسلہ
بازی گر
وہ تحریر جو دلوں کی دھڑکن ہے
کتابی شکل میں چار حصے شائع ہوچکے ہیں
قیمت فی حصہ -/60 روپے' ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200

میرا جسم پسینہ اگل رہا تھا۔ نیلگری کی باتوں میں اتنی تپش تھی کہ میرے بدن کا خون' پسینہ بن کر خارج ہو رہا تھا۔ اس نے شاید اپنی تحریک آور گفتگو سے میرے اندر خوابیدہ آتش فشاں کو چھیڑ دیا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے حوالات کے اندر ٹہلنے لگا۔ اپنے دماغ کا درجہ حرارت کم کرنے کے لیے میں نے جو گرز بھی اتار دیے تھے۔ چند لمحوں کی چہل قدمی کے بعد میرے حواس قابو میں آگئے۔ مجھے اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے یوگا کا سہارا لینا پڑا تھا۔

ماسٹر ہپناٹائز پائی آنجہانی نے مجھے سانس کی ایک خاص مشق سکھائی تھی جس کے ذریعے ذہنی انتشار اور جذباتی ہیجان سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی۔ میں نے حوالات کے ٹھنڈے فرش پر ٹہلتے ہوئے سانس کی وہ مشق کی تھی۔

میں دوبارہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھا تو دھنو نے پوچھا "وجدان! تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟"

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ تاہم میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں دھنو۔"

"کیا کوئی بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

دھنو کے اس سوال نے میری مشکل آسان کردی' میں نے جلدی سے کہا "ہاں دھنو' وہ ایک خواب ہی تھا۔ کپکپی طاری کردینے والا۔"

وہ بولی "ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں اس میں اس قسم کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔" پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

میں سمجھ گیا' وہ کچھ کہنے والی تھی مگر دانستہ خاموش ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا "دھنو' کیا تم نے بھی کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں۔" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی "ایک خوفناک خواب دیکھ رہی تھی۔"

"تم نے خواب میں کیا دیکھا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ جواب دینے کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے خود بھی بہت تعجب ہو رہا تھا۔ رات کے آخری پہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دینا غیر معمولی بات تھی۔ میں نے اپنی پوری توجہ انجن کی آواز پر مرکوز کردی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک نہیں' دو گاڑیاں تھیں جو لمحہ بہ لمحہ تھانے کے قریب پہنچ رہی تھیں۔ ان کے انجن اپنی آواز سے بتا رہے تھے کہ وہ جیپیں تھیں یا پھر جیپ نما بڑی گاڑیاں تھیں۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ دونوں گاڑیاں تھانے کے سامنے آکر رک گئیں۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں پھر میری سماعت نے چلتے ہوئے قدموں کی چاپیں سنیں۔

وہ تین چار افراد کے قدموں کی آوازیں تھیں جو تھانے کے اندر پہنچ کر کہیں معدوم ہو گئی تھیں۔ میرا قیافہ یہ کہتا تھا کہ وہ لوگ تھانے دار کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دھنو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا "یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟"

"اللہ ہی جانتا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ دعا کے سے انداز میں بڑبڑائی "لارڈ بدھا... ہم پر رحم کرے۔"

میں نے غور سے دھنو کو دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پر نام کے سے انداز میں جوڑ رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ زیر لب دعائیہ کلمات دہرا رہی تھی۔ ظاہر ہے' وہ اپنے [illegible] (گوتم بدھ) سے مخاطب تھی۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی اس لیے میں وقت کا درست اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ رات تقریباً اپنا سفر ختم کر چکی تھی اور اب تب میں صبح ہونے والی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں نیلگری سے ہونے والی الوداعی خوابناک ملاقات کے بارے میں ذہن کو دوڑاتا' ایک کانسٹیبل آنکھیں ملتا ہوا حوالات کے دروازے پر نمودار ہوا۔ شاید اسے نیند سے جگا کر ہماری جانب بھیجا گیا تھا۔ وہ بے چارہ "حکم حاکم' مرگ مفاجات" کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔

کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور خمار آلود آواز میں ہم سے کہا "تھانے دار صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں نے اور دھنو نے الجھی ہوئی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

کانسٹیبل نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "صرف تمہیں بلایا ہے۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کانسٹیبل کے ساتھ تھانے دار کے پاس پہنچ گیا۔

تھانے دار کے کمرے میں چار افراد موجود تھے یعنی ایک تھانے دار اور تین اجنبی افراد۔ ان تینوں میں ایک صاحب حیثیت اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ باقی دو اس کے ملازم دکھائی دیتے تھے۔ بارعب شخص تھانے دار کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کے ملازم صورت ساتھی اس کے دائیں بائیں باڈی گارڈز کی طرح کھڑے تھے۔ وہ تینوں اپنی حیثیت کے مطابق سندھ کے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔

کانسٹیبل جب مجھے تھانے دار کے کمرے میں پہنچا کر چلا گیا تو تھانے دار نے دوستانہ انداز میں مجھ سے کہا "بیٹھ جاؤ وجدان۔"

میں ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ تھانے دار نے مجھے میرے حقیقی اور اصلی نام سے مخاطب کیا تھا۔ میں نے رینجرز کے کپتان صالح رحیم کو اپنی داستان سناتے ہوئے نام درست بتا دیے تھے۔ ہماری رپورٹ میں ہمارے اصلی نام درج ہو گئے تھے چنانچہ تھانے دار بھی ہمیں وجدان اور دھنو کے نام ہی سے جانتا تھا۔

تھانے دار نے صاحب حیثیت شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "وجدان! یہ اس علاقے کے وڈیرا سائیں ہیں۔ یہ میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ میں نے ان سے تمہاری بات کی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارا کام بہت اچھے طریقے سے ہو جائے گا۔"

تھانے دار کی باتوں کو میں سمجھ نہیں سکا' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا "سائیں' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔" پھر میں نے وڈیرا سائیں کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔

تھانے دار نے کہا "یہ رئیس خان صاحب ہیں۔ میرے دوست اور اس علاقے کے وڈیرا سائیں۔ میں نے ان سے تمہاری مشکل کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ یہ تمہیں یہاں سے نکال کر کراچی تک پہنچا سکتے ہیں۔"

"کراچی تک ہم خود بھی چلے جائیں گے۔" میں نے تھانے دار کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "بس سائیں' آپ لوگ ہمیں یہاں سے جانے دیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "کیا آپ نے پنڈت کشوری لال سے بات..."

تھانے دار نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور کہا "کشوری لال سے معاملہ فٹ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے پچاس ہزار روپے ادا کرے گا۔ میں تو تمہارے بندوبست کے بارے میں فکرمند تھا۔ وہ انتظام ہو گیا ہے۔" پھر وہ وڈیرا سائیں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "سائیں' آپ خود ہی وجدان کو اپنا پروگرام سمجھائو۔"

"پروگرام بہت سادہ ہے۔" رئیس خان نے کہا "میرے یہ دونوں بندے آج "مٹھی" جانے والے ہیں۔ تم دونوں گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ "مٹھی" تھرپارکر کا صدر مقام ہے۔ یہاں سے آٹھ نو گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ شام سے پہلے تم مٹھی پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے تم اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہو' چلے جانا۔"

وڈیرا کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔ وہ نہایت دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ تھانے دار نے کہا "وجدان! وڈیرا سائیں صرف میری دوستی کی خاطر تمہارے ساتھ بھلائی کرنے کو تیار ہوئے ہیں۔"

"دوستی اور کاروبار ساتھ ساتھ چلتے رہیں تو کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔" رئیس خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "جوان! تھانے دار صاحب سے ہماری دوستی ذرا کاروباری نوعیت کی ہے۔ میرے علاقے میں تھانے دار صاحب جو بھی کیس "ڈیل" کرتے ہیں اس میں ہم برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یعنی تمہارے پچاس ہزار روپے سے.... بیس ہزار روپے تھانے دار کی جیب میں جائیں گے اور بیس ہزار میں رکھوں گا۔"

"اور باقی کے دس ہزار روپے؟" میں نے چونک کر

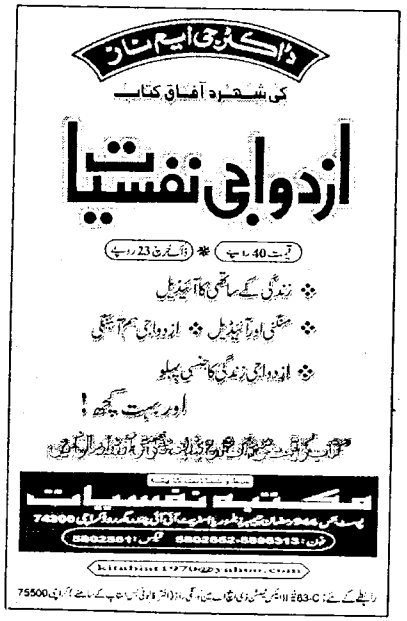

وڈیرے کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا "وہ تمہارا "زادِ راہ" ہے۔ ہم تمہیں یہاں سے خالی ہاتھ تھوڑی رخصت کریں گے۔"

اس کے ساتھ ہی وڈیرے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دس ہزار روپے کی ایک گڈی نکالی اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "گن لو' پورے دس ہزار روپے ہیں۔"

وہ سو سو کے نوٹوں والی ایک مکمل گڈی تھی۔ بینک کی مہر کے ساتھ اس میں مخصوص پن بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ سب استعمال شدہ نوٹ تھے۔ میں نے گننا ضروری نہ سمجھا اور نوٹوں کی گڈی کو جیب میں رکھ لیا۔

میں ایک بات پر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جرائم پیشہ لوگ پولیس والوں کو بھتہ دیتے ہیں۔ اپنی "آمدنی" میں سے ایک مخصوص حصہ متعلقہ تھانے میں پہنچاتے ہیں مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ ایک پولیس افسر مجھے چھوڑنے کے لیے جو رشوت وصول کر رہا تھا' اس رقم میں اس علاقے کا وڈیرا بھی حصے دار تھا۔ خیر' دنیا میں ہر طرح کے علاقے اور ہر قسم کے لوگ بستے ہیں اس لیے مختلف جگہوں پر الگ الگ "اصول و قواعد" دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

تھانے دار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "وجدان! "مٹھی" تک تو تم دونوں بغیر ایک پیسہ خرچ کیے بخیر و خوبی پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد اگر تم اپنے تئیں آگے سفر جاری رکھو گے تو یقیناً پیسہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مٹھی سے کراچی پہنچنے کے دو راستے ہیں یا تو تم میرپور خاص اور حیدر آباد سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچ جاؤ یا پھر مٹھی سے پہلے بدین جاؤ اور پھر ٹھٹھہ سے ہوتے ہوئے کراچی کا رخ کرو۔ ویسے بدین سے حیدر آباد کے راستے بھی کراچی پہنچا جا سکتا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور اگر رقم بچانا چاہتے ہو تو پھر سیدھا سیدھا یہ کرو کہ مٹھی سے ٹرک پر سوار ہو جاؤ۔ وڈیرا سائیں کے آدمی مٹھی میں جس شخص کے پاس جا رہے ہیں' وہ ٹرانسپورٹر ہے۔ پورے سندھ میں بلکہ پورے پاکستان میں اس کے ٹرک چلتے ہیں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے!"

تھانے دار نے بات ختم کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "آپ کی یہی بڑی مہربانی ہے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت مل رہی ہے۔ بس آپ لوگ ہمیں مٹھی تک ہی پہنچا دیں۔ آگے ہم خود سفر کر لیں گے۔"

میں نے تھانے دار کی پیشکش کو یکسر رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنا فیصلہ واپس نہ لے لے۔ اگر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا تو ہمارے لیے مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ پیار محبت اور افہام و تفہیم سے مسئلہ حل ہو رہا تھا تو مجھے مل جل کر چلنا چاہیے تھا۔

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

تھانے دار کے اس جملے پر وڈیرے نے کہا "سائیں! تم دونوں نے تو سب ٹھیک کر لیا مگر میری تسلی تو ابھی تک کروائی نہیں گئی۔"

"کیسی تسلی؟" میں نے چونک کر وڈیرے کو دیکھا۔

وڈیرے کے بجائے تھانے دار نے کہا "وجدان! بظاہر بات تو بہت احمقانہ اور جاہلانہ سی ہے لیکن تم یقین جانو' پچھلے کچھ عرصے سے تھر کے علاقے میں اس خبیث نے بہت تباہ کاری مچائی ہوئی ہے وہ بھیس بدل بدل کر وارداتیں کرتا ہے مگر کوئی ابھی تک اس کو گرفتار نہیں کر سکا۔ اس کے ساتھ ایک حسین اور نوجوان لڑکی بھی ہوتی ہے۔ وہ صرف انسانوں کی جان لیتا ہے۔ ان کو پہلے بے ہوش کرتا ہے پھر ان کی گردن پر دانت گاڑ کر جسم کا سارا خون چوس جاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک صحرائی عفریت ہے۔ تم میری باتوں کو مذاق تو نہیں سمجھ رہے؟"

میں نے تھانے دار کی تقریر کا یہ مفہوم نکالا تھا کہ کوئی خون آشام قاتل ان کے علاقے میں آ گیا تھا جو پے در پے کئی انسانوں کی جان لے چکا تھا اور پورے صحرا میں خوف اور سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ چونکہ میرے ساتھ حسین و جمیل دھنو بھی تھی اس لیے وہ خاصے محتاط ہو گئے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کچھ مجھے بتانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ بالآخر یہی سوال میری زبان پر آ گیا۔

"سائیں! آپ کی بات کچھ کچھ میرے پلے تو پڑی ہے لیکن آپ یہ ذکر مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟ رئیس خان صاحب کس قسم کی تسلی کرنا چاہتے ہیں؟"

تھانے دار ناخل کرتے ہوئے بولا "میں نے جس عفریت کا ذکر کیا ہے نا' دراصل اسی سلسلے میں رئیس خان تسلی کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر اس عفریت کا مجھ سے کیا تعلق؟"

"تم ہمارے لیے اجنبی ہو۔" رئیس خان براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "ہم صرف اس بات کی تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ عفریت تم نہ ہو۔ تھانے دار سائیں نے بتایا ہے نا' وہ شیطان روپ بدل بدل کر وارداتیں کرتا ہے۔"

وڈیرا رئیس خان اس وقت خاصا سہما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے حواریوں کی بھی یہی حالت تھی' تھانے دار بھی گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ ان کی کہانی سن کر میں دل میں بہت ہنسا مگر زبان سے میں نے کچھ نہ کہا اور نہ ہی ان کا مذاق اڑایا۔ بس اتنا پوچھا۔

"چلو' مان لیا۔ آپ جو کہانی سنا رہے ہیں وہ صد فی صد سچی ہے اور اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ وہ خون آشام قاتل کہیں میں ہی نہ ہوں مگر یہ بھی تو بتائیں کہ آپ مجھ سے کس طرح اور کس قسم کی تسلی چاہتے ہیں؟ کیا اس عفریت کی کوئی نشانی بھی ہے؟"

"ہاں' اس کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔" تھانے دار نے کہا "اس بھیڑیا صفت شخص کے دائیں کان کے پیچھے چاند کی شکل کا ایک ہلالی نشان ہے۔ بالکل جیسے ابتدائی تاریخ کا چاند ہو۔ اس نشان کی رنگت سرخ ہے۔"

میں نے کہا "لیکن میرے دائیں کان بلکہ کسی بھی کان کے پیچھے اس قسم کا کوئی سرخ ہلالی نشان نہیں ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" رئیس خان نے کہا "مگر میں دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ تم میرے دو وفاداروں کے ساتھ سفر کرنے والے ہو۔ میں ان کی زندگی کو کسی قسم کے خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا! یہ دونوں افراد میرے لیے بہت اہم ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے پیشکش کرنے والے انداز میں کہا "آپ چاہو تو میرے دائیں کان کا اچھی طرح معائنہ کر لو۔"

وڈیرا مطمئن نظر آنے لگا پھر وہ اٹھ کر میرے قریب آیا اور میرے کان کو پکڑ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں ان توہم پرستوں کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم دل ہی دل میں مجھے ان کی اس حماقت پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ جسے میں بمشکل ضبط کیے بیٹھا تھا۔

مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ میرے دائیں کان کی لو کی پچھلی طرف' مسور کے برابر ایک سیاہ تل تھا۔ سرخ ہلالی نشان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر کے معائنے کے بعد رئیس خان دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا پھر تھانے دار کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا "سائیں! اللہ کا شکر ہے' یہ وہ خطرناک قاتل نہیں ہے۔ میں نے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر تسلی کر لی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانہ کرنے کو تیار ہوں۔"

تھانے دار کے چہرے پر بھی اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ بولا "اب تو صبح ہونے ہی والی ہے اور کچھ نہیں تو جاتے جاتے یہ لوگ چائے ہی پی جائیں۔"

"یہ تو آپ کی بہت بڑی نیکی ہو گی سائیں۔" رئیس خان نے کہا "میرے بندوں نے بھی ابھی ناشتا نہیں کیا۔ ذرا ان کے لیے بھی چائے وغیرہ کا بندوبست کر دو۔"

تھانے دار اپنے ماتحتوں کو مختلف قسم کے احکام دینے لگا۔

اگلے بیس پچیس منٹ میں ہم ہلکا پھلکا ناشتا کر کے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ دھنو کو جب میں نے اپنی معجزاتی رہائی کے بارے میں بتایا تھا تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ جب ہم تھانے سے نکلے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔

باہر دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ اگلی گاڑی پجارو تھی جبکہ اس کے پیچھے بڑے سائز کی ایمبولینس ٹائپ ایک گاڑی تھی۔ وڈیرا رئیس خان پجارو کی جانب بڑھتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے بولا۔

"میر بخش! دونوں مہمانوں کو بڑی گاڑی میں بٹھاؤ۔"

میر بخش نامی شخص ہمیں پیچھے کھڑی ایمبولینس ٹائپ گاڑی کی طرف لے جانے لگا تو میں نے پوچھا "کیا وڈیرا

ناکام ہونا چھوڑیئے
کامیاب ہونا سیکھیے
کامیابی
زندگی میں کامیاب ہونے کے رہنما اصول اور طریقے
قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ
کتاب سنٹر
kitabist1970@yahoo.com

سائیں بھی ہمارے ساتھ جائیں گے؟"

"نہیں' وہ یہاں سے سیدھا اپنے گھر جائیں گے۔" میر بخش نے جواب دیا "مٹھی تک ہم آپ لوگوں کو پہنچائیں گے۔"

میر بخش کا ساتھی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اسے اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اس دوران میں رئیس خان کی پجارو حرکت میں آگئی تھی۔ میں اور دھنو پچھلی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار ہونے کا راستہ بھی عقبی سمت میں تھا۔

ہم گاڑی کے اندر بیٹھ چکے تو میر بخش نے زوردار آواز سے دروازہ بند کردیا اور خود جاکر گاڑی کے اگلے حصے میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور مٹھی کی جانب ہمارا سفر شروع ہوگیا۔

سامان کے نام پر ہمارے پاس وہی سفری بیگ تھا جس میں کپڑوں کے علاوہ ہمارے روز مرہ استعمال کی چند چیزیں تھیں۔ تھانے دار نے یہ بے ضرر سا بیگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اگر بیگ نہ بھی دیتا تو ہم خوش تھے۔ آزادی سے بڑی نعمت دنیا میں اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ ہمیں یہ آزادی مبلغ پچاس ہزار روپے کے عوض حاصل ہوئی تھی۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور وہ یہ کہ جو رقم مجھے دی گئی تھی وہ رئیس خان نے اپنے پاس سے دی تھی۔ اس سے تو یہی بات ظاہر ہوتی تھی کہ تھانے دار نے ابھی پنڈت کشوری لال سے رقم وصول نہیں کی تھی۔ وڈیرے کو وہ رقم ملنے کی ٹھوس امید تھی جبھی اس نے اپنے پاس سے مجھے رقم ادا کردی تھی۔ بعد میں پنڈت سے پچاس ہزار روپے نکلوا کر وہ بیس ہزار اور تیس ہزار آپس میں بانٹ لیتے۔ تھانے میں بات چیت کے دوران میں میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس سلسلے میں تھانے دار سے پوچھوں لیکن پھر میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ دراصل ہمیں اس جھمیلے سے نجات ملنے کی اس قدر خوشی تھی کہ میں کسی تردد میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اوکھلی میں سر دے دیا تھا تو پھر موسلوں کا کیا ڈر!

راستے میں پہلے موڑ پر وڈیرے کی پجارو دائیں جانب مڑگئی۔ ہماری گاڑی کی رفتار میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ میں اور دھنو گزشتہ چھتیس گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات پر گفتگو کرنے لگے۔ یہ وقت ہم پر بہت بھاری گزرا تھا۔ ان لمحوں کی سنگینی اور سفاکی کو ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے تھے۔

بات کرتے کرتے اچانک دھنو کو کھانسی آگئی' پھر اس کی کھانسی طویل ہونے لگی۔ میں نے بھی محسوس کیا جیسے گاڑی کی اندرونی فضا میں گھٹن سی در آئی ہو۔ وہ گاڑی ہر طرف سے بند تھی۔ ائرکنڈیشنڈ ہونے کے سبب اسے ائرٹائٹ کردیا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے بھی ٹھکا لگا اور سانس لینا دشوار محسوس ہونے لگا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ہمارے ساتھ کوئی "کارروائی" ہوچکی ہے۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں کوئی زہریلی چیز شامل ہوچکی تھی جو لمحہ بہ لمحہ ہماری سانسوں کو مشکل سے مشکل ترین کرتی جارہی تھی۔

دھنو کی حالت بہت خراب ہورہی تھی۔ اب وہ باقاعدہ سینہ پکڑ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کیبن والے شیشے کو بجا کر گاڑی کے اگلے حصے میں بیٹھے ان دو افراد کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا لیکن لگتا تھا وہ پتھر کے بت بن گئے ہوں جو پلٹ کر دیکھنا نہ جانتے ہوں۔

مجھے اپنے سینے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ دھنو بے دم اور بے حواس ہوکر گاڑی کے فرش پر ڈھے گیا۔

میرے اندر مہم جوئی کی جتنی قوت باقی بچی تھی' اس کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے گاڑی کے عقبی دروازے میں نصب ہینڈل پر طبع آزمائی شروع کردی لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ دروازہ لاک ہوچکا تھا۔ دراصل اس دروازے میں کوئی خودکار لاک لگا ہوا تھا۔ جب اس دروازے کو زور سے بند کیا گیا تھا تو وہ آٹومیٹک لاک بند ہوگیا تھا۔

میں نے اپنے جسم و جان کی پوری قوت صرف کرکے دروازے کے ہینڈل کو جھنجوڑ ڈالا مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب میرے اعصاب اور حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں نفوذ شدہ اس زہریلی گیس نے میرے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی ہو۔

وہ موت کی پیام بر سیاہ گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور میں زندگی سے دور ہوتا جارہا تھا۔ میرا سفر روشنی سے تاریکی کی طرف تھا۔ ان نازک لمحات میں میرے ذہن میں جو خیال آیا' وہ یہ تھا... اگر مجھے کچھ ہوگیا تو اس معصوم صورت' کانچ کی گڑیا دھنو پر کیا بیتے گی؟

پھر میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

تاریکی موت ہی کا ایک روپ ہے۔

موت جتنی بے رحمی سے زندگی کو چاٹ جاتی ہے' اتنی ہی بے دردی سے تاریکی روشنی کو کھا جاتی ہے۔ اندھیرے اجالے کا یہ کھیل درحقیقت زندگی اور موت کا کھیل ہے۔ جس میں جیت ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو دوسرے پر بھاری پڑے' اس پر سبقت لے جائے۔

ہم جس مہلک صورت حال سے دوچار ہوئے تھے وہ ہمارے لیے غیر متوقع اور ناگہانی تھی۔ دھنو میری آنکھوں کے سامنے بے دم ہوکر سیاہ گاڑی کے فرش پر ڈھے گیا تھا جب کہ میں نے زندگی کی بازی جیتنے کے لیے آخری حد تک ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن میری پیش نہ چلی اور حالات کے جبر نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کردیا تھا۔

میں نہیں جانتا' یہ بے گانگی کب تک مجھ پر طاری رہی تھی اور اس دوران میں ہمارے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے تاہم ہوش میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ میرے ذہن نے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ حواس پر چھائی ہوئی دھند دھیرے دھیرے زائل ہوئی تو میرا ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور میں اپنے گردوپیش کو محسوس کرنے لگا۔

میرے جسم کو لگنے والے ہلکے ہلکے ہچکولے اس بات کا پتا دے رہے تھے کہ میں کسی گاڑی میں محوِ سفر تھا گاڑی اور سفر کے خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ماضی قریب کا احوال روشن ہوگیا اور پھر یکے بعد دیگرے وہ ناخوش گوار واقعات یاد آنے لگے۔ میں ان ناگہانی واقعات کی ناخوش گواریت اور تلخی کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک سنگین دھوکا کیا گیا تھا۔ انسان ہمدردی اور سلوک کے واقعات تو بھول سکتا ہے مگر بے رحمی' سفاکی اور دھوکا دہی کے واقعات کو فراموش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

جیسے جیسے میرے حواس بحال ہورہے تھے' میں خود کو پیش آنے والی صورتِ حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں اور دھنو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ اور سرحدی محافظوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ سرحدی محافظوں نے ضروری کارروائی کے بعد ہمیں ہمارے "مہربان" پنڈت کشوری لال کے ہم راہ مقامی پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ پھر تھانا ان چارج... ہم پر مہربان ہوا اور ہمیں مبلغ پچاس ہزار کے عوض چھوڑنے پر تیار ہوا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہمیں بہ حفاظت مٹھی تک پہنچانے کا بندوبست بھی کردیا تھا۔ ایک مقامی وڈیرا رئیس خان' تھانا انچارج کا حصے دار تھا اور ہمیں اسی کے آدمیوں کے ساتھ نگر پارکر سے مٹھی تک جانا تھا۔

ہمیں ایک ایمبولینس نما سیاہ گاڑی میں بٹھایا گیا تھا پھر ہمارے سفر کو شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمارے ساتھ وہ کچھ ہوگیا تھا جس کی ہمیں ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ سیاہ گاڑی مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ تھی' ہمیں گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار کرایا گیا تھا جبکہ وڈیرے کے آدمی اگلے حصے یعنی ڈرائیونگ کیبن میں تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان مضبوط شیشے کی دیوار کا انتظام خصوصی طور پر کیا گیا تھا ورنہ عام طور پر ایمبولینس میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

جب ہمیں اس سیاہ گاڑی میں بیٹھایا جارہا تھا تو میرے خواب و خیال میں بھی کہیں یہ بات نہیں تھی کہ ہمیں اس چوہے دان میں قید کیا جارہا ہے۔ عقبی دروازے کے مقفل ہونے کا انکشاف تو اس وقت ہوا تھا جب مجھے زندگی بچانے کی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا' سفر کے دوران میں پہلے دھنو کو ٹھکا لگا تھا پھر وہ کھانسنے لگی تھی پھر گاڑی کی اندرونی فضا میں مجھے بھی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی' اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس ائرکنڈیشنڈ فضا میں کہیں سے کوئی زہریلی چیز داخل کی گئی تھی جو ہماری سانسوں کو گھٹا کر مشکل سے مشکل تر بنا رہی تھی۔ ڈرائیونگ کیبن میں موجود وہ دونوں افراد اس زہریلی شے کے مہلک اثرات سے محفوظ تھے اور ہماری کسی پکار کسی فریاد پر کان دھرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دراصل یہ انہی کی کارستانی تھی۔ میں جس فضا کو زہر آلود سمجھا تھا وہ درحقیقت ہوش و حواس سے بے گانہ کردینے والی فضا تھی' بے ہوشی طاری کرنے والی فضا' وہ دونوں بدمعاش ہمیں بے ہوش کرنا چاہتے تھے اور اپنی اس مذموم کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوگئے تھے۔

اس خوف ناک خیال نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔ کھلی آنکھوں سے میں نے جو پہلا منظر دیکھا وہ دھنو کے سراپا پر مشتمل تھا' وہ ہنوز گاڑی کے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس پر کسمپرسی اتر آئی ہو' دھنو کی کیفیت نے میرے دل میں درد کی ایک لہر جگادی' مجھے یاد آیا' جب میں گاڑی کا عقبی دروازہ کھولنے میں ناکام رہا تھا اور ذہن تیزی سے تاریکی میں ڈوب رہا تھا تو ان نازک ترین لمحات میں' میں دھنو ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا اس وقت میں اس تشویش میں مبتلا تھا کہ اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہوگیا تو دھنو پر کیا گزرے گی۔

میں اب مکمل طور پر ہوش و حواس میں آچکا تھا اور مجھے

یہ یقین ہوگیا تھا کہ خدا کا شکر ہے' مجھے ایسا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا' تاہم دھنو کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ ضرور کچھ گڑ بڑ ہے وہ آڑی ترچھی بے سدھ پڑی تھی۔ اسے چھونے کے لیے میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سکتے میں رہ گیا۔

دھنو کی جانب ہاتھ بڑھانے کی خواہش کو میں عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اس کوشش کے دوران میں مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ میں اپنے ہاتھ کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت نہیں دے سکتا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ میرے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں مقید ہیں۔

میں نے تشویش ناک انداز میں دھنو کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی کارروائی کی گئی تھی تاہم طریقۂ کار زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب نائیلون کی مضبوط رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ انہیں زیادہ خطرہ مجھ ہی سے تھا۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ ہماری بے ہوشی کے دوران میں ہمارے ساتھ یہ کارروائی کی گئی تھی۔ جب انہیں یقین ہوگیا ہوگا کہ ہم انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہے یا ان کے کسی عمل کا ردِ عمل ظاہر نہیں کریں گے تو انہوں نے گاڑی روک کر مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی ہوگی اور دھنو کے ہاتھ نائیلون کی ڈوری میں جکڑ دیے ہوں گے۔ بعد ازاں گاڑی کا عقبی دروازہ دوبارہ مقفل کر کے گاڑی آگے بڑھا دی ہوگی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ہمیں اغوا کیا جا رہا تھا۔ اس طے شدہ بات کے ساتھ ہی ذہن میں جو پہلا سوال سر ابھارتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اس لق و دق صحرا میں ہمارا ایسا کون سا دشمن تھا جس نے ہمیں اغوا کروایا تھا اور کیوں؟

میرا خیال بار بار رئیس خان کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ تھانے سے ہمیں اسی شخص نے "نجات" دلائی تھی اور اسی کے آدمیوں کے ساتھ ہم سفر پر روانہ ہوئے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ رئیس خان ہمیں کیوں اغوا کروا رہا تھا وہ تو ہمارے سفر کے آغاز پر ہی ہم سے جدا ہوگیا تھا۔ رئیس کے ایک آدمی میر بخش نے بتایا تھا کہ وڈیرا اپنی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا تھا اور ہمیں ان دونوں کے ساتھ ٹھہرا کر کے صدر مقام مٹھی تک جانا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں مصروف تھا کہ ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند ذہن میں چمکا۔ کہیں ہمارے اغوا میں ان دو افراد ہی کا ہاتھ تو نہیں؟ ممکن ہے' یہ دونوں ا... پر یہ کارروائی کر رہے ہوں جس سے ان کا کوئی خاص ذا... وابستہ ہو!

پھر مجھے وہ واقعات یاد آنے لگے جب تھانے میں... خان نے اپنا خوف دور کرنے کے لیے میرا "چیک اَ... تھا۔ وہ میرے دائیں کان کے عقب میں کوئی سرخ بالو... تلاش کرتا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی خون آشام ا... عفریت اس صحرا میں وارد ہو چکا ہے جس کے ساتھ... خوب رو اور دل کش حسینہ بھی ہے۔ وڈیرا میرے کان... عقب میں جھانک کر تسلی کرنا چاہتا تھا کیوں کہ دھنو کے... میں میرے ساتھ ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی... وڈیرا میرے کان کے تنقیدی معائنے کے بعد مطمئن... تھا۔ ان لوگوں کی ذہنی پسماندگی اور توہم پرستی کے بارے... سوچ کر مجھے ایک مرتبہ پھر ہنسی آگئی۔

میں نے بے اختیار ڈرائیونگ کیبن کی طرف... اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ دونوں مردود سامنے دھیان رکھے... اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔ میرے اندر بڑی سرعت... یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے ان دونوں سے بے حد محتاط رہنے... ضرورت ہے۔ ممکن ہے' وہ گاہے گاہے بیک ویو مرر... ہمارا جائزہ لے رہے ہوں!

میں نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کے فرش پر بے سدھ... دھنو کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم میں حرکت نام کی کوئی... نہیں تھی۔ میری تشویش دو چند ہوگئی۔ میرے ذہن... مختلف قسم کے خدشات سر اٹھانے لگے کہ خدانخواستہ... دھنو۔۔۔؟

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ میں اس سے... سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنی موجودگی میں دھنو کے ساتھ... اونچ نیچ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہوتے ہ... اگر اسے کوئی مہلک گزند پہنچ جاتی تو میں خود کو کبھی معا... نہیں کر سکتا تھا۔

مجھ کچھ کرنا تھا... بہت کچھ کرنا تھا۔ دھنو کے لیے... لیے' ہم دونوں کی بہ حفاظت آزادی کے لیے۔ دھنو کی جا... بہت نازک تھی۔ اس کے سینے کے زیر و بم سے اندا... ہوتا تھا کہ وہ سانس لے بھی رہی ہے یا نہیں۔ طویل اور... بے ہوشی اس کے ذہن کے نازک اور حساس سیلز (Cells) کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے ڈرائیونگ کیبن کی طر... دیکھا' وہ دونوں بہ دستور ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہے...

ہم میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی دھنو کی طرح گاڑی کے فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اپنے بدن کو لگنے والے ہچکولوں کی مدد میں دھیرے دھیرے دھنو کی جانب سرکنا شروع کر دیا اور چند لمحات کے بعد میرا جسم دھنو کے بدن کے ساتھ جا لگا۔ میں نے دھنو کے لمس پر اپنی بھرپور توجہ مرکوز کر دی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں اس خوش گوار نتیجے پر پہنچا کہ دھنو میں زندگی کی حرارت موجود تھی۔ اس کی سانس بہت تھم تھم کر چل رہی تھی۔ وہ اس وقت گہری بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس خیال نے مجھے قلبی تقویت پہنچائی کہ دھنو زندہ تھی تاہم میری تشویش ابھی پوری طرح رفع نہیں ہوئی تھی۔ دھنو کو بے خبری کی اس حالت میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ ہمیں جو صورتِ حال درپیش تھی اس سے نکلنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا ضروری تھا اور..... "اس عملی قدم" کے لیے میرے ہاتھوں کا آزاد ہونا لازمی تھا۔ میں اپنے ہاتھوں سے پیوست ہتھکڑی سے چھٹکارا پانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ اپنی باطنی اور روحانی صلاحیتوں کا عام استعمال صرف اس وقت کروں گا جب جان پر بن آئے گی اور وہ بھی مثبت انداز میں ورنہ مادی مسائل سے نمٹنے کے لیے میں حتی الوسع مادی کوشش ہی کروں گا۔ سب سے پہلے میں اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو آزماؤں گا۔ جب معاملہ ان صلاحیتوں کے بس کا نہ رہا اور ضروری بھی ہوا تو ٹھیک ہے' پھر میں اپنے اندر موجود پُراسرار قوت "چی" سے ضرور کام لوں گا۔

میرے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں اپنی جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس الٹی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں بدل سکتا تھا۔

شاؤلن ٹیمپل میں' میں نے کنگ فو کے ساتھ ساتھ یوگا اور ہمناسٹک کی تربیت بھی لی تھی۔ جمناسٹک میں جسمانی لچک بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاص طور پر "سرسالٹ" وغیرہ میں تو پورے جسم کو فضا میں ایک گولے کی شکل دینا ہوتی ہے جسے ایسی طرح مارشل آرٹس میں بھی جب "رولنگ" کی جاتی ہے تو جسم ایک بال کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ میں نے اپنی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں لانے کے لیے "رولنگ ٹیکنیک" پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرا یہ فیصلہ قدرے رسکی تھا۔ رسکی... ٹیکنیک کے حوالے سے نہیں بلکہ اس میں خطرہ اس بات کا تھا کہ ڈرائیونگ کیبن میں موجود ہمارے اغوا کنندگان کہیں میرے جسم کی حرکات و سکنات کو دیکھ نہ لیں۔

اس واضح خطرے کے باوجود بھی میں نے اپنے فیصلے پر عمل کا ارادہ کر لیا کیوں کہ کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی تھا۔ رسک لیے بغیر مات نہیں بن سکتی تھی۔ میں اپنی خاطر تو کسی مناسب موقع کا انتظار کر سکتا تھا مگر دھنو کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں اس وقت ایمبولینس نما سیاہ گاڑی کے فرش پر دھنو کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ذہن میں اس کارروائی کو دہرایا جس میں مجھے "رولنگ ٹیکنیک" استعمال کرتے ہوئے..... اپنے ہتھکڑی زدہ ہاتھوں کو سامنے کی طرف لانا تھا۔

سب سے پہلے مجھے سرسالٹ کے انداز میں اپنے پورے وجود کا ایک گولا سا بنانا تھا۔ گھٹنوں کو پیٹ کے اندر دھنسانا تھا' ایڑیوں کو کولھوں سے پیوست کرنا تھا اور گردن کو جھکا کر سینے میں دبانا تھا۔ اس کے بعد اپنی کمر کی بھرپور لچک کا استعمال کرتے ہوئے ہتھکڑی زدہ ہاتھوں کو کولھوں کے نیچے سے گزارتے ہوئے سامنے کی طرف لانا تھا۔ گویا کندھوں کو محور مان کر جسم کے گولے کو بازوؤں کے درمیان سے گزارنا تھا۔ اس طرح کہ ہتھکڑی والا... ہاتھ میری پشت کے بجائے پیٹ پر سامنے کی طرف آ جائے۔ اس پوزیشن میں' میں ہتھکڑی سمیت بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔

میں نے ایک محتاط نگاہ ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھے ہوئے ان دو افراد پر ڈالی پھر مطمئن ہو کر "ایکشن" کے لیے تیار ہو گیا۔ فرش پر لیٹے لیٹے میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں "ایک قدم" بھی آگے بڑھاتا' ایک زوردار دھماکا ہوا۔

وہ ساعت شکن دھماکا گاڑی کا ٹائر پھٹنے سے ہوا تھا۔ گاڑی ایک زور دار جھٹکے سے فضا میں اچھلی پھر چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی بریک کی تیز چرچراہٹ بلند ہوئی۔ ٹائر پھٹنے سے گاڑی کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی اس لیے ڈرائیور کو بہ حالتِ مجبوری بریک لگانا پڑے تھے۔

شاید ایسے ہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے' "ہمتِ مرداں' مددِ خدا"۔ میں نے ایک مثبت اقدام کے لیے ہمت سے کام لینے کا آغاز کیا ہی تھا کہ قدرت نے مجھے اس "کام" کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لیے ایک سنہری موقع فراہم

کردیا۔

گاڑی کچی سڑک سے اتر کر صحرائی جھاڑیوں میں پھنس گئی تھی۔ میں اس دوران میں ہتھکڑی والا "معرکہ" مار چکا تھا اور اب دھنو کے اوپر اس طرح پڑا تھا کہ نہ تو دھنو میرے بوجھ تلے دب سکے اور نہ ہی ڈرائیونگ کیبن میں موجود افراد کو میرے ہتھکڑی والے ہاتھ نظر آئیں۔ میں نے نہایت مہارت سے اپنے وجود کو مطلوبہ زاویے پر سیٹ کر رکھا تھا۔

میری آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ تقریباً ان معنوں میں کہ میں پلکوں کی درز میں سے ڈرائیونگ کیبن پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ جب میں دھنو کے اوپر آیا تھا تو وہ خفیف سا کسمسائی تھی شاید یہ اس جھٹکے کا ردِعمل تھا جو ٹائر پھٹنے سے گاڑی کو لگا تھا' تاہم اس وقت دھنو دوبارہ ساکت ہو چکی تھی جو کوئی تسلی بخش بات نہیں تھی۔

"میری نگاہ" ڈرائیونگ کیبن کے شیشے پر جمی ہوئی تھی۔ گاڑی رکتے ہی وہ دونوں ڈرائیونگ کیبن سے باہر نکل آئے تھے یعنی وہ گاڑی سے نیچے اتر گئے تھے۔ ایک بات تو طے تھی کہ ٹائر تبدیل کیے بغیر آگے سفر جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

گاڑی سے باہر نکلنے کے بعد وہ دونوں مجھے نظر نہیں آ رہے تھے تاہم ان کے قدموں کی چاپ اور باتوں کی آواز سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ گاڑی کی عقبی جانب آ رہے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح چاق و چوبند ہو گیا اسی وقت میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی رفتار سے پیدا ہوا اور میں نے اپنی سوچ کے نتیجے میں بے اختیار گاڑی کے فرش پر سیٹوں کے نیچے نظر دوڑائی۔ میری متلاشی نظر پلک جھپکتے میں اس چیز تک پہنچ گئی جس کے بارے میں میرے ذہن نے سوچا تھا۔

وہ گاڑی کا ایک فاضل ٹائر تھا جیسا کہ ہر گاڑی میں ایمرجنسی کی صورتِ حال کے لیے ایک اسپیئر ٹائر رکھا جاتا ہے۔ مذکورہ ٹائر اس سیٹ کے نیچے رکھا تھا جس پر بے ہوش ہونے سے پہلے دھنو بیٹھی ہوئی تھی۔ اب ایک بات یقینی تھی کہ گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے کے لیے انہیں گاڑی کے پچھلے حصے کو کھولنا پڑتا جہاں فرش پر ہم دونوں پڑے تھے۔

یہ اچھا موقع تھا۔ وہ جیسے ہی گاڑی کا عقبی دروازہ کھولتے' میں بھرپور "کارروائی" کر سکتا تھا۔ مجھے پورا وثوق تھا کہ میں ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ بھی بڑا ٹھیک ٹھاک ان سے نمٹ سکتا تھا۔ یہ بات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا کہ وہ دونوں مسلح تھے۔ تھانے میں جب وہ وڈیرا رئیس خان کے دائیں بائیں کھڑے تھے تو ان کے ہاتھوں میں' میں نے کلاشنکوفیں دیکھی تھیں پھر جب وہاں سے روانہ ہوئے تھے تو بھی یہ ہتھیار ان کے پاس ہی تھے۔

میں کسی بھی ایکشن کے لیے تیار تھا کہ ایک فوری [illegible] نے مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے [illegible] بہتر یہ ہو گا کہ پہلے انہیں گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے دیا جا [illegible] تاکہ ازاں بعد مجھے وہاں سے روانہ ہوتے وقت کسی [illegible] کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں سانس روک کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد میری امید بر آئی۔ دروازے کے لاک [illegible] چابی گھومنے کی آواز آئی پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل [illegible] میں نے اپنی نیم وا پلکوں کی اوٹ سے دیکھا۔ میر بخش [illegible] دراز قامت شخص مجھ پر کلاشنکوف تانے کھڑا تھا جب کہ [illegible] کا ساتھی دبلا پتلا آدمی گاڑی کے اندر گھس آیا تھا۔ یقیناً [illegible] ٹائر نکالنا چاہتا تھا۔ گاڑی میں داخل ہونے سے پہلے [illegible] دونوں نے ہمیں ہلا جلا کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ ہم وہاں [illegible] جہاں کی ہم کو بھی اپنی کچھ خبر معلوم نہیں۔ اس موقع پر [illegible] نے اپنی بے ہوشی کی بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر گاڑی کا پھٹا ہوا ٹائر نکال [illegible] اس کی جگہ صحیح سلامت ٹائر فٹ کر دیا گیا۔ اب میرے عمل [illegible] وقت سر پر آن پہنچا تھا۔ جیسے ہی وہ مجروح ٹائر کو گاڑی [illegible] اندر رکھ کر دروازہ بند کرنے لگتے' مجھے حرکت میں آ جانا تھا [illegible] جو بھی ہو جاتا' اس سے نمٹنا تھا۔

ٹائر کی تبدیلی کے دوران وہ دونوں آپس میں سندھی [illegible] بات چیت بھی کرتے رہے تھے۔ میں سندھی زبان کو [illegible] طرح نہیں سمجھتا تھا تاہم دس فی صد مفہوم میرے پلے [illegible] تھا۔ وہ دونوں اس ناگہانی افتاد پر جھلائے ہوئے تھے۔ مجھے [illegible] کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ مقررہ وقت پر کسی [illegible] پہنچنا چاہتے تھے اور ٹائر پھٹنے کی وجہ سے وہ آدھا گھنٹا لیٹ [illegible] چکے تھے۔

گاڑی کی عقبی سمت چلتے ہوئے قدموں کی آواز آئی [illegible] میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایک ہی شخص تھا اس کے ساتھی [illegible] ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ یہ گاڑی [illegible] بائیں جانب کا دروازہ تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ [illegible] بخش کلاشنکوف بردار پسنجر سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس سے [illegible] اور بات بھی صاف ہو گئی کہ مجروح ٹائر گاڑی میں رکھنے [illegible] لیے ڈرائیور کو آنا تھا اور وہی گاڑی کا عقبی دروازہ بند کرنے [illegible] والا تھا۔

میرے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ظاہر ہے [illegible] کسی مسلح شخص کی بہ نسبت نہتے آدمی سے نمٹنا آسان [illegible]

جیسے ہی ڈرائیور بچھے ہوئے ٹائر کو سیٹ کے نیچے کھسکا کر سیدھا ہوا' میں نے ہتھکڑی کا ایک بھرپور وار اس کے چہرے پر کیا۔ یہ ایک دو ہتڑ تھا جس کی طوفانی ضرب نے ڈرائیور کو بلبلانے پر مجبور کر دیا۔

ڈرائیور کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ سن کر میر بخش نے ایک جھٹکے سے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر اس دوران' میں ڈرائیور کو اپنی باہوں میں رکھ کر گاڑی سے اس طرح باہر پھینک چکا تھا جیسے کسی توپ سے گولا داغا جاتا ہے' اس کے ساتھ ہی میں خود بھی اچھل کر گاڑی سے باہر آ چکا تھا۔

گاڑی رکنے سے ایکسٹینشر میں کوئی ایسی خرابی واقع ہو گئی تھی کہ اس نے خاموشی سے "چپ" سادھ لی تھی اسی لیے ڈرائیور اپنی سائڈ کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا میر بخش نے بھی اپنی سائڈ کا شیشہ گرا لیا تھا اسی وجہ سے ڈرائیور کی "بلبلاہٹ" اپنے تمام تر صوتی اثرات کے ساتھ میر بخش کی سماعت تک پہنچ گئی تھی۔

میں جب میر بخش کے سر پر پہنچا تو وہ گاڑی سے باہر آ چکا تھا پھر قبل اس کے کہ وہ کلاشنکوف کا رخ میری جانب کرتا' میں نے اسٹیپ لے کر ایک زوردار فرنٹ پلش کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔ وہ چوڑے سینے کا مالک اور دراز قامت شخص تھا۔ پھر اس کے بدن کی مضبوطی میں بھی کوئی کلام نہیں تھا مگر میری کک بھی کوئی عام سی ٹھوکر نہیں تھی۔ اس میں غم و غصہ وافر مقدار میں شامل تھا۔

میر بخش گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جا پڑا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ وہیل سے ٹکرایا مگر اس کا جسم رکا نہیں۔ میری کک کے زبردست پلش نے اسے لڑھکاتے ہوئے ڈرائیور سائڈ کے کھلے ہوئے دروازے سے گاڑی کی دوسری سمت ریتلی زمین پر پہنچا دیا تاہم اس نے اس دوران میں کلاشنکوف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

جب میر بخش ڈرائیونگ کیبن میں لڑھک رہا تھا تو گاڑی کے وسیع ڈیش بورڈ پر مجھے ایک کلاشنکوف رکھی نظر آئی۔ یہ یقیناً ڈرائیور کا ہتھیار تھا جسے میں نے گاڑی کے عقب میں لگ بھگ بیس فٹ دور ریت میں اچھال دیا تھا۔

میری نگاہ کے چاروں جانب ریت ہی ریت دکھائی دیتی تھی۔ اس لق و دق صحرا میں کہیں کہیں جھاڑیوں کا وجود بھی تجسس کو کام میں لاتے ہوئے اندازہ لگایا کہ وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم علی الصباح تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا' ہم تقریباً سات گھنٹے بے ہوش رہے تھے' اور دھنو تو ابھی تک گاڑی کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔

میں عقابی نظر سے میر بخش کو دیکھتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور کلاشنکوف کو میری طرف سیدھا کر چکا تھا۔ یہ بہت نازک لمحات تھے۔ اگر میں ایک لمحے کی بھی کوتاہی کر جاتا تو کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھار مجھے چھلنی کر دیتی۔

میں نے جست بھر کر "ہینڈ اسپرنگ" لگایا پھر فرنٹ سمر سالٹ (FRONT SOMERSAULT) لگاتے ہوئے میر بخش کے اوپر سے گزر کر اس کے عقب میں اپنے قدموں پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت مجھے اپنے پیچھے گولیوں کی "تڑتڑاہٹ" سنائی دی۔ میں ایڑیوں پر اباؤٹ ٹرن ہوا۔ وہ فائرنگ میر بخش کی کلاشنکوف سے کی گئی تھی۔ اس نے اس جگہ کو نشانہ بنایا تھا جہاں ہینڈ اسپرنگ لگانے سے پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے واضح طور پر نوٹ کیا کہ میر بخش نے میرے قدموں میں گولیاں برسائی تھیں۔ اس مقام کی ریت فضا میں اچھل گئی تھی۔

میر بخش کی اس "حرکت" پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ وہ مجھے جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ صرف زخمی کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ میری جان کا دشمن ہوتا تو فائرنگ کا رخ میرے سینے یا سر کی جانب ہوتا۔

میر بخش میری قلابازیوں پر محوِ حیرت تھا۔ اس نے میرے قدموں میں فائرنگ کی تھی مگر میں پلک جھپکتے میں اس کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔ میں نے اسی وقت ایک لمبا سا اسٹیپ لے کر سائڈ کک اس کے پہلو میں رسید کر دی۔ سائڈ کک کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر یہ مناسب جرک کے ساتھ صحیح ٹارگٹ پر پڑ جائے تو مضبوط سے مضبوط مدِمقابل کے قدم بھی اکھاڑ دیتی ہے۔

میر بخش اس ناگہانی افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ توہین سے میرا "دیدار" کرنے کی خاطر مڑا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اسے یہ دیدار بہت "مہنگا" پڑے گا۔ میری سائڈ کک نے اس کے پہلو کی بھرپور مزاج پرسی کی اور وہ زمین پر قلابازیاں کھاتے ہوئے مجھ سے پندرہ قدم دور جا گرا۔

ایک مارشل آرٹسٹ کے مدِمقابل اگر کوئی مارشل آرٹسٹ ہی ہو تو فی داؤ پیچ کا مظاہرہ نسبتاً آسان ہوتا ہے اور مقابلے میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے جو دیکھنے والوں کو بھی محظوظ کرتا ہے۔ یہاں میرا مقابلہ ایک جٹ قسم کے پہلوان

سے تھا اس لیے میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا۔ مدِمقابل کی "حرکات" کے مطابق میں بھی "توڑ" پیش کر رہا تھا۔

اس مرتبہ میر بخش کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ گئی تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ کلاشنکوف اس کے نزدیک ہی ریت پر پڑی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھا اور سب سے پہلے کلاشنکوف کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس دوران میں' میں قدرے اس کے قریب پہنچ چکا تھا تاہم ہمارے درمیان اب بھی آٹھ دس فٹ کا زمینی فاصلہ حائل تھا۔

وہ اپنی کلاشنکوف کو مجھ پر تانتے ہوئے پھنکارا "شرافت سے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ ورنہ!" اس کے ساتھ ہی اس نے دھمکی آمیز انداز میں کلاشنکوف کو حرکت دی۔

وہ سندھی لب و لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ تھانے میں یہ دونوں افراد بالکل خاموش کھڑے رہے تھے' جب ہم گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو اس وقت میں نے میر بخش سے وڈیرے کے بارے میں ایک سوال پوچھا تھا جس کا اس نے جواب بھی دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اب مجھ سے کوئی لفظ بولا تھا اور خاصا خطرناک بولا تھا۔

میں نے اپنی نظر میر بخش کے شانوں پر ٹکا کر رکھی تھی تاکہ وہ کلاشنکوف کو کوئی مہلک حرکت دینے کا ارادہ کرے تو میں بروقت بچاؤ کر سکوں۔ کسی بھی قسم کی فائٹ کے دوران میں اپنے مدِمقابل کے جسم کے دو مقامات کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اول اس کی کمر' دوم اس کے شانے یعنی کندھے۔ بازوؤں اور ٹانگوں کی ہر حرکت کو کمر کی بدلتی ہوئی پوزیشن سے قبل از وقت جانا جا سکتا ہے' اسی طرح ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکت کو جاننے کا مرکز کندھے ہیں۔ جو مارشل آرٹسٹ یا فائٹر ان دو مقامات کو نگاہ میں رکھتا ہے' وہ مدِمقابل کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے کیوں کہ وہ دشمن کے وار سے پہلے ہی سمجھ جاتا ہے کہ وہ کون سی کک مارنے والا ہے یا کون سا ہینڈ اٹیک کرنے والا ہے۔ اس جج منٹ میں اگر مہارت حاصل ہو جائے تو صرف سیلف ڈیفنس اور بلاکنگ کا سہارا لے کر کوئی بھی میدان مارا جا سکتا ہے۔

میں نے میر بخش کو بہ دستور اپنی نظر میں رکھتے ہوئے اس کی دھمکی کے جواب میں کہا "میر بخش! اگر میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کر دوں تو!"

"تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔"

"کیا تم مجھے جان سے مار دو گے؟" میں نے پوچھا۔

"جان سے نہ بھی مارا تو تمہارے ہاتھ پاؤں ضرور توڑ دوں گا" وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "پھر تمہارا عمر مختاجی اور اپاہجی میں بسر کرنا۔"

میں نے اسے ناؤ دلانے کی خاطر کہا "اگر مرد کے بچے ہو تو ہتھیار پھینک دو اور خالی ہاتھ ایک نہتے کا مقابلہ کرو۔"

میر بخش مضبوط جسم کا مالک پہلوان صفت شخص تھا۔ تو میرے جمناسٹک کے کمالات نے اسے دو مرتبہ ریگستان کی ریت پھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کو برہم کرنے کے ساتھ ساتھ پوری طرح تول ناپ بھی رہا تھا۔ میں اس قسم کی اسٹائل میں ریڈ الرٹ تھا کہ اگر وہ مجھ پر فائرنگ کرنے کے لیے ذرا سی بھی جنبش کرتا تو میں اس کے نشانے کو شافی خطا کر سکتا تھا۔ اس لیے میں مطمئن تھا۔

وہ میرے طنزیہ تملا کر بولا "وجدان! تم ہمیں غصہ دلا کر کوئی حماقت کرنے پر نہیں اکسا سکتے۔ ہم جانتے ہیں' تم کتنے خطرناک ہو۔ تمہیں اگر ذرا سی بھی ڈھیل دی گئی تو تم سر سوار ہو جاؤ گے۔"

"اچھا!" میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں "تمہیں میرے بارے میں یہ نادر معلومات کہاں سے حاصل ہوئی ہیں؟"

"زیادہ بکواس نہیں کرو" وہ دہاڑا "اور چپ چاپ جا کر گاڑی میں بیٹھو۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے چونک کر میرے عقب میں دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں اس پوزیشن میں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے سیاہ گاڑی ہمارے پہلو میں آ گئی تھی۔ میرا رخ اسی جانب تھا جدھر گاڑی کا رخ تھا یعنی میر بخش کا چہرہ اس طرف تھا جدھر سے ہم آئے تھے گویا وہ گاڑی کے عقب میں دیکھ کر چونکا تھا۔

اس کے چونکنے کے انداز نے مجھے بات کی تہ تک پہنچا دیا۔ میں نے تھوڑی دیر قبل گاڑی کے عقبی حصے میں سے ڈرائیور کو باہر پھینک دیا تھا۔ یقیناً وہ اٹھ کر میری پشت پر آ چکا تھا۔

میں نے ڈرائیور کی آمد کی آواز پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان حائل فاصلے کا محتاط اندازہ لگایا پھر اس کی جانب دیکھے بغیر ایک "بیک فلک" (BACK KICK) کرتے ہوئے میں ہوا میں اچھلا اور میری دو ہیل فلائنگ کک ڈرائیور کی پیشانی پر لگی۔ اس کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔

جب وہ زمین پر گر رہا تھا تو میں نے اس کے ایک ہاتھ میں آہنی راڈ کی جھلک دیکھی تھی جو چہرہ تھامتے ہوئے اس کی پیشانی سے ٹکرا گئی تھی۔ اس دہری چوٹ نے اسے گرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ڈرائیور نے کہیں سے آہنی راڈ نکال لی تھی اور میری غیر خبری میں پشت سے حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میرے بروقت عمل نے اس کے مذموم عزائم کو ریت میں رول دیا تھا۔

"اب تم کوئی حرکت نہیں کرو گے!" میری سماعت سے میر بخش کی سرسراتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

میں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور کہا "اگر میں حرکت نہیں کروں گا تو پھر برکت کیسے پیدا ہو گی؟"

وہ چڑ کر بولا "تم اپنی ناپاک زبان بند رکھو اور میں نے تم سے جو کہا تھا' اس پر عمل کرو۔"

"میں بھی تو وہی کہہ رہا ہوں میر بخش" میں نے کہا۔

وہ الجھن زدہ انداز میں بولا "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "یہی کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ اگر میں حرکت نہیں کروں گا تو تمہارا حکم کس طرح مان سکوں گا۔ بغیر حرکت کیے میں گاڑی میں کس طرح بیٹھ سکتا ہوں۔"

میں بات کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس کی جانب سرک رہا تھا۔ وہ میرے عزائم کو بھانپ گیا اور تنبیہی لہجے میں بولا۔

"تم نے اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "نہ میں چالاک ہوں اور نہ ہی کسی قسم کی چالاکی دکھانے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھ سے خوف زدہ ہو حالاں کہ تمہارے ہاتھ میں ہتھیار بھی ہے۔"

"خود کو بے بس اور کم زور ظاہر کرنے میں تمہاری کوئی چال پوشیدہ ہے" میر بخش پھنکارتے ہوئے بولا "ورنہ تھوڑی دیر پہلے میں تمہاری جو پھرتیاں دیکھ چکا ہوں' اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تم کتنے "سیدھے" ہو۔"

میں نے کہا "اگر میں سیدھا نہیں ہوتا تو کیا تم لوگ اتنی آسانی سے مجھے اور میری ساتھی کو اغوا کر سکتے تھے؟ میں اگر ہوشیار قسم کا بندہ ہوتا تو تم لوگوں کو مصیبت میں ڈال دیتا جب کہ تم لوگوں نے میری کلائیوں میں ہتھکڑی بھی ڈال رکھی ہے۔"

"مصیبت میں تو تم نے ہمیں ڈال ہی دیا ہے" وہ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اس ہتھکڑی نے بھی تمہارے ہاتھ نہیں بگاڑا۔ تم کسی مداری کی طرح ہوا میں کرتب دکھا رہے ہو اور تمہارے ہاتھوں سے زیادہ تمہاری ٹانگیں چل رہی ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ میں نے ہتھکڑی لگی ہونے کے باوجود بھی جمناسٹک اور کنگ فو کے کچھ ہاتھ ان دونوں پر آزما ڈالے تھے۔ میں نے گاڑی ہی میں الٹی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں بدل ڈالا تھا۔ اب میرے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب تھے۔ دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی کے مضبوط آہنی کڑے فٹ تھے۔ ان دونوں کڑوں کو ملانے والی زنجیر کی لمبائی اتنی تھی کہ میں پہلو بہ پہلو اپنی دونوں ہتھیلیوں کو کہیں بھی ٹکا سکتا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے "ہینڈ اسپرنگ" اور "بیک فلک" کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ دونوں ہتھیلیاں گرم ریت پر جما کر کیا تھا۔ ویسے یہی کام میں ہتھیلیوں کے بجائے دونوں پنجوں سے بھی کر سکتا تھا اور فنگر ٹپس سے بھی۔ مجھے شاولن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں انتہائی مشکل اور کٹھن "پش اپس" بھی لگاتا سکھایا گیا تھا۔

میں نے میر بخش کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "دیکھو میر بخش! کسی کے ہاتھ چلتے ہیں' کسی کی ٹانگیں اور کسی کی زبان۔ تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے؟"

"تمہاری تو یہ تینوں چیزیں چلتی ہیں" وہ جلنے بھننے انداز میں بولا۔

میں نے پُرتمسخر انداز میں اسے دیکھا پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا' اس کی نظر میرے ہاتھوں پر گئی اور وہ اچھل پڑا۔ میں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

"یہ... یہ... ہتھ... کڑی تو تمہیں... الٹی لگائی گئی تھی...؟"

"ہاں لگائی تو الٹی ہی تھی تم لوگوں نے" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ سیدھی کس طرح ہو گئی؟"

"جادو کے زور پر" میں نے کہا۔

"کیا تم جادو بھی جانتے ہو؟"

"ہاں" میں نے متحمل لہجے میں کہا "کہو تو مظاہرہ کر کے دکھاؤں!"

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "نن... نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہیں کوئی جادو وادو نہیں آتا۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے" پھر اس کا لہجہ سخت ہو گیا "میں تم سے آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں' سیدھی طرح تم گاڑی میں جا کر بیٹھو ورنہ مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میر بخش! تم دونوں جس راستے پر قدم رکھ چکے ہو اس کی منزل تو موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم اپنی جان کی فکر کرو۔ اگر زندہ بچ پاؤ گے تو راستہ اختیار کرنے کی نوبت آئے گی نا!"

اس قسم کے میرے کاٹ دار جملوں نے میر بخش کی رگ بدمعاشی کو پھڑکا دیا۔ اس کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا' خوں خوار لہجے میں بولا "میں اب تک تم سے رعایت برت رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے آنکھیں دکھانے لگو" پھر اس نے کلا شنکوف کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے گاڑی کی جانب اشارہ کیا "چلو' ادھر گاڑی میں بیٹھو۔ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہیں"

اسی وقت گاڑی کے عقبی حصے سے کسی کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ یقیناً وہ دھنو کی آواز تھی جو گرمی کی شدت کے باعث ہوش میں آ رہی تھی۔ اس گاڑی کو صحرا میں کھڑے لگ بھگ ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ گاڑی کے ائر کنڈیشنر نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا پھر عقبی درد ازہ بھی کافی دیر سے کھلا پڑا تھا' گاڑی کے اندر کی رہی سہی کولنگ بھی جاتی رہی ہو گی۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ' ریت کی تپش اور آسمان سے برستی آگ نے دھنو کی گہری نیند کو اچاٹ کر دیا تھا۔ وہ گہری نیند جو طویل بے ہوشی کی صورت میں اس کے جسم و جاں میں اُتر آئی تھی۔ دھنو کے کراہنے کی آواز سن کر میر بخش چونک اٹھا تھا۔ اس اثنا میں میر بخش کا دبلا پتلا ساتھی بھی خود کو جھاڑتا سہلاتا ہمارے قریب پہنچ گیا تھا۔ میر بخش نے ڈرائیور ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نواز علی! میں اس کو سنبھالتا ہوں۔ تم گاڑی کے اندر جا کر لڑکی کی خبر لو"

مجھے میر بخش کی زبانی اس وقت پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ اس کے ڈرائیور ساتھی کا نام نواز علی تھا۔ میں نے نواز علی کے راستے میں حائل ہوتے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ! اگر تم نے میری ساتھی کی سمت ایک قدم بھی بڑھایا تو ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا"

میر بخش غصیلے لہجے میں بولا "نواز علی! اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا نا' میں اس کو سنبھال....."

اس کا جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ اسی وقت دھنو گاڑی کی عقبی جانب سے نمودار ہوئی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی ڈوری میں بہ دستور بندھے ہوئے تھے۔

میں نے صورتِ حال کی پروا کیے بغیر چلا کر کہا "دھنو! گاڑی کے اندر چلی جاؤ۔ باہر کے حالات سازگار نہیں ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے دھنو کی سمت قدم بھی بڑھا دیے۔ مجھے اپنے عقب میں کلا شنکوف بردار میر بخش کی چنگھاڑ سنائی دی "رک جاؤ' نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

میں نے میر بخش کی دھمکی کو اہمیت نہ دی اور دھنو کو گاڑی کے اندر جانے کا کہتے ہوئے خود بھی اس جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

میر بخش نے مجھے روکنے کے لیے میرے قدموں پر کلا شنکوف کا برسٹ مارا۔ تیز رفتار گولیاں ریت اڑانے کے سوا کچھ نہ کر سکیں کیوں کہ انہیں کسی کی زندگی چاٹنے یا کسی کو زخمی کرنے کے احکام نہیں دیے گئے تھے۔ اس سے ایک بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ میر بخش مجھے کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتا تھا ورنہ اتنے نزدیک سے اس کا نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ بھی برسٹ کی صورت میں۔ میرے بچ نکلنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مجھے صحیح و سالم کہیں پہنچانا چاہتے ہیں۔ کلا شنکوفیں اور فائرنگ صرف مجھے کنٹرول کرنے کے لیے تھی۔

دھنو نے میرے کہنے کے مطابق گاڑی کی جانب پیش قدمی شروع کر دیا تھا اور مجھے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ نواز علی میر بخش مجھ پر ہتھیار استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے چنانچہ میں کھل کھلا کر میدان میں آ گیا۔

میں نے اپنے قریب کھڑے نواز علی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے روکنے کے لیے دونوں بازو آگے بڑھا چکا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے دبوچنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے اپنا قدم پیچھے ہٹ کر اسے جھکائی دی پھر نیچے بیٹھتے ہوئے بڑی تیزی سے "فرنٹ سوئپ" مار دی۔

وہ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ میری پنڈلی کے بلیڈ نے نواز کی پنڈلی کے گوشت پر ایک قیامت خیز ضرب لگائی تھی۔ وہ ٹانگ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور سندھی زبان میں مغلظات میں تولنے لگا۔

مارشل آرٹس کے سینٹرز میں دو کھلاڑیوں کے درمیان جب فائٹ ہوتی ہے تو پنڈلی کے بلیڈ (پنڈلی کی سامنے والی ہڈی) کی حفاظت کے لیے تھین گارڈ استعمال کیے جاتے ہیں مگر اسٹریٹ فائٹ میں اس قسم کا استعمال ممکن نہیں ہوتا۔ میں تو شاؤلن ٹیمپل کا تربیت یافتہ تھا جہاں انسانی جسم کو فولاد میں ڈھالا جاتا ہے۔ میں نے کبھی کسی قسم کا

ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا خصوصاً اسٹریٹ فائٹ میں میرا یہ زمرد افعانہ ہوتا تھا اور جب تک کوئی جان ہی کو نہیں آ جاتا تھا' میں اٹیک نہیں کرتا تھا۔ ایک سچے مارشل آرٹسٹ کی یہی پہچان بھی ہے۔

نواز علی کو زمین بوس ہوتے دیکھا تو میر بخش آپے سے باہر نکل آیا۔ وہ خوں خوار انداز میں میری جانب بڑھا اور میرے قدموں کا نشانہ لے کر فائرنگ کر دی۔

میں اس کے ٹریگر دبانے سے پہلے ہی ہوا میں اچھل چکا تھا اور "بیک سمر سالٹ" لگاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ میر بخش کی فائرنگ کا بڑا بھیانک نتیجہ برآمد ہوا۔ نواز علی کی ایک کرب ناک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ وہ میرے قدموں کے نزدیک ہی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ جب میرے قدم وہاں نہیں رہے تو وہ براہِ راست گولیوں کی زد میں آ گیا۔ کلا شنکوف کے ہلاکت خیز برسٹ نے نواز علی کا جسم چھلنی کر دیا۔ اس کے مضروب و مجروح بدن نے ایک دو چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھائے اور پھر ساکت ہو گیا۔ وہ اب اس تپتے ہوئے صحرا میں نہیں رہا تھا۔ یہ بات صرف خدا ہی جانتا تھا کہ اس کی روح اب کسی ٹھنڈی جگہ پر تھی یا.....!

میر بخش وحشت زدہ نظر سے اپنے ساتھی کی لاش کو تک رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز کو اس نے اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حقیقتِ حال سے سب کچھ عیاں تھا۔ نواز علی کی خون اگلتی بے گور و کفن لاش سامنے موجود تھی۔ میر بخش اس سچائی کو جھٹلا نہیں سکتا تھا اس لیے سکتے کی کیفیت میں کھڑا ایک ٹک نواز کی لاش کو تک رہا تھا۔

میں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے میر بخش کے قریب پہنچ گیا پھر میری سائڈ فلائنگ کک اس کے سینے پر کسی وزنی ہتھوڑے کے مانند پڑی۔ ایک کرب ناک کراہ کے ساتھ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے اس کے چہرے پر آہنی دو ہتڑ رسید کر دیا۔

وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے کلا شنکوف چھوٹ گئی۔ اس مرتبہ کلا شنکوف کافی فاصلے پر گری تھی۔ وہ فوری طور پر اسے اٹھا نہیں سکتا تھا۔

وہ کلا شنکوف کو کیا اٹھاتا' اسے تو اپنے اٹھنے کے لالے پڑے ہوئے تھے کیوں کہ اس دوران میں' میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس کی اٹھنے کی ہر کوشش کو ناکام یاب بناتے ہوئے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر رہا تھا۔

فائرنگ کی آواز پر دھنو ایک مرتبہ پھر گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ اس بار اس نے دیکھا تو بازی پلٹ چکی تھی۔ صورتِ حال مکمل طور پر میرے کنٹرول میں تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں دھنو کو سمجھایا کہ وہ ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھ کر باہر کے حالات سے لطف اندوز ہو۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھی کلا شنکوف کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا تھا۔

اس دوران میں میر بخش اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ آہنی ہتھکڑی کی بھرپور ضرب نے اس کے چہرے کی کھال کو کئی جگہ سے ادھیڑ دیا تھا تاہم وہ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ آگے نکال رکھے تھے۔ انداز ایسا تھا جیسا مجھے دبوچنا چاہتا ہو۔ میں کھلے ہاتھ کا وار نہیں کر سکتا تھا مجھے ڈیفنس یا اٹیک دونوں صورتوں میں اپنے دونوں ہاتھ ایک ساتھ استعمال کرنا تھے۔ ہتھکڑی نے میرے دونوں بازوؤں کو قریب سے قریب تر کر دیا تھا۔

حکم ہے' ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ بھائیوں کو دو بازوؤں سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ کاش..... اے کاش' اسلامی دنیا کا کوئی عالم' کوئی مفکر' کوئی فلسفی' کوئی لیڈر' کوئی ڈاکٹر' کوئی انجینئر یا کوئی سائنس داں ایسی ہتھکڑی ایجاد کر دے جو امتِ مسلمہ کے بازوؤں کو قریب سے قریب تر کر دے!

میر بخش نے دونوں ہاتھوں سے جھپٹا مار کر مجھے قابو کرنا چاہا مگر میں بجلی کی سی سرعت سے ہوا میں اچھلا اور "فرنٹ سمر سالٹ" کرتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا تاہم سنبھلنے میں مجھے تھوڑی تاخیر ہو گئی۔

اس دوران میں میری لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میر بخش عین میرے عقب میں پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا' اس نے سندھ کی روایتی کشتی "ملا کھڑا" کے انداز میں مجھے کمر سے دبوچ لیا۔

ملا کھڑا درحقیقت شہ زوری آزمانے کا ایک انداز ہے۔ دونوں پہلوان ایک دوسرے کو شلواروں کے نیفے میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور شہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حریف کو زمین پر گرانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو پہلوان دوسرے کو چت کر لیتا ہے' کام یابی اس کے حصے میں آتی ہے۔

میر بخش کے ڈیل ڈول اور جثے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ملا کھڑا کے کئی اکھاڑے جیتے ہوں گے اور اب تو وہ اپنے فن کا عملی مظاہرہ بھی کر رہا تھا۔ میں نے شلوار نہیں

پہنی ہوئی تھی چناں چہ اس نے میری جینز کے بیلٹ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جما لیے تھے اور مجھے نیچے گرانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اس کی شہ زوری میں کوئی کلام نہیں تھا تاہم میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں تمام اسٹوڈنٹس کو مختلف موویز بھی دکھائی جاتی تھیں جن میں دنیا بھر کے ہر علاقے سے متعلقہ فنونِ حرب کی فلمیں ہوتی تھیں۔ اساتذہ کا لیکچر بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا اور ہمیں بتایا جاتا تھا کہ کسی دیسی داؤ کا کیا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ یہ فنی و دستاویزی فلمیں ایک مخصوص ہال میں دکھائی جاتی تھیں۔ یہیں پر میں نے دنیا کے عظیم ترین مارشل آرٹسٹوں کے فن پر مشتمل دستاویزی فلمیں بھی دیکھی تھیں۔

مجھے سب سے زیادہ "بروس لی" کا ذاتی اسٹائل "جیٹ کون ڈو" پسند آیا تھا۔ بروس لی کی فنی مہارت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور دل ہی دل میں، میں نے اسے اپنا آئیڈیل مان لیا تھا۔

میر بخش کی زور آزمائی جاری تھی۔ وہ حتی الامکان اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح مجھے زمین پر گرا دے۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونا میرے لیے چنداں مشکل نہیں رہا تھا۔ تاہم میں اسے بھرپور موقع دینا چاہتا تھا تاکہ اس کے دل میں ملال نہ رہے۔

اس نے پورے زور سے مجھے آگے دھکیلا۔ میں اس کی "خواہش" کے مطابق دو قدم آگے کھسک گیا پھر اچانک ہی میں نے اپنے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میر بخش بھی زمین پر گرتے گرتے بچا تاہم میرے بیلٹ پر اس کی پکڑ سلامت رہی۔ اس کارروائی کے دوران میں اس کی ٹھوڑی میرے سر سے ٹکرا گئی تھی۔ میری کھوپڑی کا تو کچھ نہ بگڑا البتہ ٹھوڑی پر لگنے والی چوٹ کے باعث اس کے منہ سے ایک سسکاری خارج ہوئی۔ پھر آنِ واحد میں اس نے مجھے جھٹکا دے کر فضا میں اٹھا لیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی بھاری گٹھری کو زمین سے اٹھایا جاتا ہے۔ میں دونوں ہاتھوں کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی مجھے جمناسٹک کی ٹیکنیک کا سہارا لینا پڑا۔

میں میر بخش کے کھاتے میں، ہوا میں بلند تو ہو ہی چکا تھا۔ اس لیے میرا کام کچھ آسان ہو گیا۔ میں نے وہیں اپنی باڈی کو رول کیا اور "بیک سمر سالٹ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے میر بخش کے اوپر سے گزر گیا تاہم اس پرواز کے دوران میں، میں نے اپنے بازو اس طرح اس کی گردن میں ڈال دیے تھے کہ ہتھکڑی کی زنجیر اس کے نرخرے پر آن گرائی تھی۔

وہ مجھے اٹھا کر پٹخنا چاہتا تھا لیکن میرے داؤ میں زنجیر کے دباؤ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے منہ سے پھنسی پھنسی غراہٹیں برآمد ہونے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھ زنجیر پر ڈال رکھے تھے اور اپنی گردن کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اچانک ہتھکڑی کا پھندا اس کی گردن سے نکالا اور اس کی "تشریف" پر "فرنٹ جرک کک" رسید کی۔ میری ٹھوکر میں بلا کا پش تھا۔ میر بخش دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میری ہتھکڑی کی آہنی ضرب سے اس کا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا اور کئی مقامات سے کھال پھٹ گئی تھی جو وہ گرم ریت پر لوٹ پوٹ ہوا تو خون آلود چہرے کے ذرات وافر مقدار میں چپک گئے۔ جب وہ اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ بھیانک صورت اختیار کر چکا تھا۔

میں چاہتا تو دو منٹ میں اس کا قصہ پاک کر سکتا تھا میں خواہ مخواہ کسی انسان کے خون میں اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ میر بخش کے ساتھی ڈرائیور نواز کی موت حادثاتی طور پر واقع ہو گئی تھی۔ مجھے ان کی گفتگو سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بظاہر اغوا کسی اور شخص کے ایما پر کر رہے تھے۔ چناں چہ میرا اصل دشمن کوئی اور تھا۔ یہ بے چارے تو اس کے پیادے چاٹنے تھے یا پھر کرایے کے بندے۔ میر بخش کو اس لیے بھی زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی زبان سے بہت کچھ اگلوانا تھا، اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے تھوڑی بہت "خاطر داری" تو ضروری تھی نا!

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ درجنوں ذرات اس کی آنکھوں میں بھی چلے گئے تھے۔ اس کی حالت بڑی دہشت ناک ہو رہی تھی۔

وہ پھولی ہوئی سانس کے درمیان شکستہ لہجے میں بولا "بہت برا کر رہے ہو جدان۔۔۔ بہت برا!"

میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "میں یہ برا کس کے لیے کر رہا ہوں؟"

"اپنے حق میں۔۔۔ اور کس کے حق میں۔"

"تم میری پروا کرنے والے کون ہوتے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا "تمہیں میرے حق کی فکر کیوں ہو رہی ہے؟"

وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولا "تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی لیے اتنا اکڑ رہے ہو۔ تمہارا بہت برا حشر ہونے والا ہے۔ اب بھی وقت ہے، شرافت سے گاڑی میں۔۔۔"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے ایڑی پر گھومتے ہوئے ایک زوردار وہیل کک اس کے چہرے پر جڑ دی۔ اس کا زخمی چہرہ کچھ اور زخمی ہو گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے مجھے مختلف بے لباس گالیوں میں تولنے لگا۔ جب اس کی ناپاک زبان پر میری مرحومہ ماں کا نام آیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔

میں نے طیش کے عالم میں اس پر تابڑ توڑ ٹائیک شروع کر دیے۔ میں اسے ٹھوکروں میں اڑا رہا تھا اور اس کے جسم کے مختلف حصوں پر آہنی دو ہتڑ پڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بے بس ہو کر کسی حقیر کیچوے کی طرح میرے قدموں میں پڑا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو شخص میری ماں کو گالی دے رہا تھا۔ اب وہی مجھ سے رحم کی اپیل کر رہا تھا۔ اس کی ساری تن فن غائب ہو چکی تھی۔

وہ منت آمیز لہجے میں گھگیایا "مجھے مت مارو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

"تمہیں کیوں نہ ماروں!" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "کیا تم زندہ رہ کر کوئی عظیم الشان کارنامہ انجام دینا چاہتے ہو۔ تم جیسے معاشرے کے ناسوروں کو تو بیت کے اندر گاڑ دینا چاہیے اور میں تمہارے ساتھ کچھ اسی قسم کا سلوک کرنے والا ہوں۔ اس صحرا کی تپتی ہوئی ریت تمہارے برہنہ بدن کا مزاج پوچھے گی تو نانی دادی آنکھوں کے سامنے گھوم جائے گی۔"

"رحم سائیں، رحم" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ آپ بہت طاقت ور ہو۔ آپ فائٹ ہو۔ میں اپنی شکست مانتا ہوں۔ میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں" پھر اس نے ہاتھ بڑھانے کا عملی مظاہرہ کیا۔

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے جوگر سے ایک بھرپور ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ میں نے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"مردود! دوستی ہمیشہ برابری کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ تم اس وقت میرے قدموں میں کسی مرغل چوہے کی طرح پڑے ہو، میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟"

وہ فدویانہ انداز میں بولا "سائیں! آپ مجھے دوست نہ بناؤ، کوئی بات نہیں مگر مجھے اپنے قدموں سے دور نہ کرو۔ میں اب آپ کا وفادار بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "وفاداریاں اتنی جلدی تبدیل نہیں ہوتیں۔"

"سائیں، میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ کے اندر چھپے ہوئے ایک عظیم انسان کو تلاش کر لیا ہے۔ آپ مجھے وفاداروں میں شامل کر لو گے تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔"

میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقعی میرے وفاداروں میں شامل ہونا چاہتے ہو؟"

"ہاں سائیں" اس کے ہاتھ بہ دستور جڑے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "وفادار بننے کے لیے وفاداری کے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے، اپنی وفاداری ثابت کرنا پڑتی ہے۔"

"میں ہر امتحان، ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں سائیں!" وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے کہا "اس ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟"

وہ ریگ زار میں اپنے ساتھی ڈرائیور نواز علی کی لاش کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "چابی نواز کی جیب میں تھی۔"

"چلو، تمہاری وفاداری کی آزمائش شروع ہوتی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

بندہ خاصا سمجھ دار تھا۔ وہ میرے لہجے کی معنی خیزی تک بہ آسانی پہنچ گیا۔ وہ گھٹنے ریت پر ٹیک کر کراہتے ہوئے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نواز علی کی لاش کی جانب بڑھ گیا۔ احتیاطاً میں بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔

نواز علی کی جیب سے ہتھکڑی کی چابی نکال کر میر بخش نے میری کلائیوں کو آہنی بندش سے آزاد کر دیا۔ میں نے دونوں کلائیوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اب یہی ہتھکڑی تم اپنے ہاتھوں میں پہن لو۔"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آزمائش میں پورا اترنے کے دعوے دار بھی ہو اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کر رہے ہو۔ مجھے تو تمہاری نیت میں کھوٹ کی آمیزش لگتی ہے۔"

میرے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ وہ پورے وجود سے کانپ اٹھا۔ لرزتے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ بات نہیں ہے سائیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں" وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ "میں یہ ہتھکڑی

.... پہن رہا ہوں۔"

پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو آہنی ہتھکڑی میں جکڑ لیا۔ میں نے ہتھکڑی کے لاک بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی اور کہا۔ "چلو' اب گاڑی میں چل کر بیٹھتے ہیں ابھی تمہاری وفاداری کو اور بہت سے کڑے مراحل سے گزرنا ہے۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل میں گاڑی کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ میں نے ریت میں پڑی ہوئی میر بخش کی کلاشنکوف اٹھالی۔ اسی آتشیں ہتھیار کی مہلک گولیوں نے نواز علی کا جسم چھلنی کر کے اسے فنا کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کی لاش کسی لاوارث کتے کی طرح تپتی ریت پر پڑی تھی۔

میں نے میر بخش کی کلاشنکوف کو ڈیش بورڈ پر رکھ دیا پھر پہلی فرصت میں دھنو کے ہاتھوں کی نائیلونی بندشیں کھولیں۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی وہ اپنی کلائیوں کو سہلانے لگی۔

صحرا میں پڑنے والی دھوپ نے قیامت مچا رکھی تھی۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ دھنو کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ میں نے میر بخش سے پوچھا۔

"گاڑی میں پانی وغیرہ کا کیا بندوبست ہے؟"

"پانی بہت سائیں" وہ ہتھکڑی لگے ہاتھ مخصوص انداز میں جوڑتے ہوئے بولا۔ پھر ڈرائیونگ کیبن میں موجود ایک واٹر کولر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تقریباً پورا بھرا ہوا ہے۔"

پہلے یہ کولر میری نظر میں نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا' واٹر کولر کے ساتھ ہی پھلوں کی ایک ٹوکری بھی رکھی تھی جس میں تازہ انگور' سیب اور سنگترے دکھائی دے رہے تھے۔ گویا وہ کھانے پینے کے مکمل لوازمات کے ساتھ نگر پارکر سے روانہ ہوئے تھے۔

ہم نے پہلے ایک ایک گلاس پانی پیا۔ ٹھنڈا پانی زیادہ مقدار میں ایک ساتھ پینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے پہلے دھنو کو پانی پلایا' پھر پانی کا گلاس میر بخش کی جانب بڑھایا اور سب سے آخر میں خود پانی پیا۔

گاڑی کے باہر تھرکا ریگستان کربلا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں تقریباً آدھے گھنٹے تک اسی تپتی ہوئی ریت پر نبرد آزما رہا تھا اس لیے اب مزید کھلے آسمان کے نیچے موجود رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے گاڑی کے ائرکنڈیشننگ سسٹم میں تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی تو کام بن گیا۔ اس سے پہلے میرے حکم پر میر بخش گاڑی کی تمام چابیاں میرے حوالے کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے ایک مناسب جگہ پر لگا دیا تھا اور اس کے بعد ائرکنڈیشننگ سسٹم کا "معائنہ" کیا تھا اور وہ تھوڑی "منت خوشامد" کے بعد آمادۂ کار ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ ہی رہنے دیا اور کولر سے ٹھنڈا پانی لے کر میر بخش کے ریت میں اٹا ہوا خون آلودہ چہرہ دھلایا۔ اس "ستھرائی" کے دوران میں وہ کئی مرتبہ سسکارا اور کراہا تھا۔

جب اس کی حالت "قابل دید" ہو گئی تو میں اسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ اس سے پہلے میں گاڑی کا عقبی دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس وقت ہم تینوں ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب میں میر بخش سے تسلی بخش پوچھ گچھ کا ارادہ رکھتا تھا۔

پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے دھنو کو گاڑی کے پچھلے حصے میں آرام کرنے کی خاطر بھیج دیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا' دھنو کسی قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ میر بخش ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے مختلف مراحل "پر زور زبردستی" کی ضرورت بھی پیش آ سکتی تھی۔ ان مناظر سے دھنو کا دل اور دماغ متاثر ہو سکتا تھا۔ وہ میری تجویز پر آرام کرنے گاڑی کے عقبی حصے میں چلی گئی۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میر بخش! تمہاری وفاداری اب کڑی آزمائش سے گزرنے والی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔"

"میں تیار ہوں سائیں۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ "آپ پوچھو' کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

میں نے پوچھا "تم لوگ ہم دونوں کو اغوا کر کے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟"

"عمر کوٹ" اس نے جواب دیا۔

"عمر کوٹ!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر تمہارے وڈیرے سائیں رئیس خان نے تو بتایا تھا کہ تم دونوں تھرپارکر کے صدر مقام "مٹھی" جا رہے ہو اور وہاں تک ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جاؤ گے۔"

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ سے جھوٹ بولا گیا تھا سائیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے' ہم مٹھی نہیں جا رہے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

میں اندرون سندھ کے علاقوں سے واقف نہیں تھا اس لیے میں نے پوچھا۔ "کیا عمر کوٹ اور مٹھی ایک ہی سمت میں واقع ہیں؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں سائیں! دونوں کا راستہ جدا جدا ہے اور رخ بھی الگ الگ ہے۔"

"اس وقت ہم عمر کوٹ سے کتنی دور ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "ہم آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ تین چوتھائی سفر کٹ گیا ہے' ایک چوتھائی باقی ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ کون سا مقام ہے جہاں ہم اس وقت موجود ہیں؟"

"یہ کوئی مقام نہیں بلکہ اسے صرف ریگستان کہا جا سکتا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم نگر پارکر سے نکل کر ویراواہ' پیلو' تیگو سر بھگیسل' دھرندرو اور چھاچرو سے ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس سے آگے دھرمسال ہے' پھر ضلع عمر کوٹ کی حدود شروع ہو جائے گی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے وضاحتی انداز میں اضافہ کیا۔ "بس یوں سمجھیں سائیں' ریگستان کا یہ ویران علاقہ چار مقامات کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں "رام سر" ہے' جنوب میں "ہنج تر" ہے' جنوب مشرق میں "چھاچرو" ہے اور شمال مغرب میں "دھرمسال" ہے۔ "تر" کو مقامی لوگ بگاڑ کر "ٹر" بھی بولتے ہیں جیسے "ہنج تر" کے رہنے والے اسے "ہنج ٹر" کہتے ہیں۔"

میر بخش اپنی معلومات سے مجھے حیرت زدہ کر رہا تھا۔ لگتا تھا' اسے پورے تھرپارکر کا نقشہ زبانی یاد ہو۔ میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"کیا تم لوگوں نے ہمیں وڈیرا رئیس خان کے ایما پر اغوا کیا تھا؟"

"نہیں" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"پھر؟"

"ہم وڈیرا اکبر سومرو کے آدمی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "وہ عمر کوٹ میں رہتے ہیں۔ ہم نے انہی کے حکم پر تم لوگوں کو اغوا کیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "اس سلسلے میں رئیس خان کا کیا کردار ہے؟"

"اس نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا وڈیرا اکبر سومرو ہمیں کیوں اغوا کروا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کی کیا دشمنی ہے؟"

"وڈیرا سائیں آپ کا دشمن نہیں ہے۔" میر بخش نے جواب دیا۔

"تو گویا وہ ہمیں اغوا کروا کے کسی ان مٹ دوستی کا ثبوت پیش کر رہا ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

وہ معتدل لہجے میں بولا۔ "یہ بات نہیں ہے سائیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

میر بخش نے بتایا۔ "اصل میں وڈیرا سائیں کے پاس آج کل اس کا ایک دوست مہمان بن کر آیا ہوا ہے۔ وڈیرا سائیں اپنے دوست کو تمہارا تحفہ دینا چاہتے ہیں۔"

اس کے جواب نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے شک آمیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میر بخش! تم میرے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہے ہو؟"

"نہیں سائیں" وہ سراپا التجا بن گیا۔

میں نے کہا۔ "میر بخش! اگر تم نے مجھے چکر دینے کے لیے کوئی جھوٹا سچا یا سچا جھوٹ بولا تو یاد رکھنا میں تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی کاٹ کر تپتے صحرا میں پھینکا دوں گا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جب ریگستان میں تمہارے گوشت کے کباب بھونے جائیں گے تو وہ منظر کتنا دل دوز ہو گا۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگا پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رحم سائیں' رحم۔ آپ نے مجھے سام بنایا ہے۔ میں آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تمہیں کیا بنایا ہے؟"

"سام!"

"یہ "سام" کیا ہوتا ہے بھئی؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارے ہاں جب کوئی شخص کسی کو پناہ دیتا ہے تو پناہ لینے والے شخص کو "سام" کہا جاتا ہے۔ آپ نے مجھے پناہ دی ہے۔ ایک بھوتار کے قبضے سے میری جان چھڑائی ہے' مجھے نجات دلائی ہے۔"

میں میر بخش کی باتوں کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں' اس نے کیوں یہ فرض کر لیا تھا کہ میں نے اسے پناہ دی ہے اور کسی ظالم انسان کے چنگل سے چھڑایا ہے! میں نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ "تم کس "بھوتار" کا ذکر کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کس کی قید سے آزادی دلائی ہے؟"

"سائیں!" وہ میری جانب دیکھتے ہوئے سادہ سے لہجے میں بولا۔ "بھوتار ہمارے یہاں کا ایک لقب ہے۔ یہ ایسے وڈیروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ظالم ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی پرائیویٹ جیلیں ہوتی ہیں۔ وہ چوریاں اور ڈکیتیاں کرواتے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کو اپنے یہاں پناہ دیتے ہیں

آتش فشاں 133 حصہ 7

اور ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا اور ہاریوں پر بھی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کو علی الاعلان "بھوتار" کہا جاتا ہے۔ لوگ ان سے ملتے ہوئے "سائیں بسم اللہ بھوتار" اور "حکم سائیں بھوتار" کے جملے ادا کرتے ہیں مگر وہ اس کا برا نہیں مانتے بلکہ فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ "بھوتار" کے لفظ کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔"

میں.... حیرت اور دلچسپی سے میر بخش کی معلومات افزا باتیں سن رہا تھا۔ وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! وڈیرا اکبر سومرو بھی ایک "بھوتار" ہے۔ اس کی اپنی پرائیویٹ جیل ہے۔ وہ ہم لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے۔ جرائم پیشہ افراد سے اس کے رابطے رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں' اس کا وہ دوست جس کی خدمت میں وہ آپ کا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے وہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں۔ وہ شکل ہی سے کوئی غنڈا اور چھٹا ہوا بدمعاش دکھائی دیتا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "سائیں وجدان! میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔ میں سچائی اور نیکی کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ اب میں وڈیرے کی جانب پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں عمر بھر آپ کا وفادار رہنا چاہتا ہوں۔

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور امید افزا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں اکبر سومرو کے کسی بدمعاش' مہمان نما دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وڈیرا میرا تحفہ اس کی خدمت میں کیوں پیش کرنا چاہتا تھا؟ اگر وڈیرے کو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی تو اس کے دوست کو مجھ میں کوئی دلچسپی تھی؟ یہی سب جاننے کے لیے میں میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے' میر بخش" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے کوئی دروغ گوئی نہیں کر رہے ہو اور واقعی میرے وفادار بننے کے قابل ہو تو میں تمہیں ضرور "سام" بنالوں گا۔

"آپ جس طرح چاہو' اپنی تسلی کر سکتے ہو سائیں۔" اس نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے کہا۔ "مجھے پہلے تو وڈیرا اکبر سومرو کے دوست کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔"

وہ شروع ہو گیا۔ "سائیں! وہ شخص کوئی ہفتہ بھر پہلے پنجاب سے آیا ہے۔ لاہور کے کسی نزدیکی گاؤں سے اس کا تعلق ہے۔ وہ آپ کی تلاش ہی میں یہاں پہنچا ہے۔ اس نے آپ کے بارے میں بہت زیادہ جان کاری لے۔ وڈیرا سائیں کو بتایا تھا کہ تم آج کل میں غیر قانونی طور سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہونے والے ہو۔ امکان اس بات کا تھا کہ تم یا تو عمر کوٹ کی مشرقی "کھوکھرا پار" کے مقام سے سرحد پار کرو گے یا پھر "نگر پارکر" کے مقام پر تھرپارکر کے جنوبی حصے سے ملک میں داخل ہو گے۔ تمہیں گھیرنے کے لیے دو ٹیمیں تشکیل دی گئی تھیں میں اور نواز علی "نگر پارکر" میں موجود تھے۔ "کسو آدیگاؤں" نامی گاؤں ہماری مکمل نظر میں تھے جب کہ "کھوکھرا پار" جانے والی ٹیم "وا سرماہ" اور "بھٹیالا" پر رکھے ہوئی تھی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ تم نے نگر پارکر سرحد پار کر کے پنڈت کشوری لال کے پاس قیام کیا ہے نے فوراً وڈیرا سائیں تک تمہاری آمد کی اطلاع پہنچا دی اکبر سومرو نے "نگر پارکر" کے ایک وڈیرے کو ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا پیغام بھجوا دیا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جار رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا منصوبہ تو یہ تھا کہ تمہیں تمہاری ساتھی لڑکی کو پنڈت کشوری لال کے گھر سے اٹھا جائے گا لیکن ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی تم لوگ "رینجرز" والوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ہمیں تم لوگوں تھانے پہنچنے تک انتظار کرنا پڑا۔ وڈیرا رئیس خان نے دار کے ساتھ "میٹنگ" کر کے تم لوگوں کو آسانی سے حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات آپ کے سامنے سائیں۔"

میرا ذہن اس وقت نوع بہ نوع سوالات کی آماجگا ہوا تھا۔ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان میرے لیے کسی معمے سے ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں' وہ کون شخص تھا جو میر پروگرام سے مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ یہ میرے لیے بہت تشویش کی بات تھی۔ میر بخش نے بتایا تھا کہ اکبر سومرو مہمان کا تعلق لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے تھا۔ لاہور نواح میں پائے جانے والے گاؤں میں سے صرف ایک گاؤں نام سے واقف تھا۔ صرف نام سے واقف تھا' اسے دیکھا نہیں تھا۔ میں اس گاؤں کی گلیوں اور کوچوں کے دیدار لیے تو پاکستان آیا تھا۔ وہ گاؤں میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ مجھے اس کی مٹی' اس کی آب و ہوا اور اس کی کھلی فضا سے محبت تھی۔ یہی محبت مجھے کھینچ کر پاکستان لائی تھی اور میں اپنے آبائی گاؤں' اپنی جنم بھومی "موضع رکھاں والی"

پہنچنے کے لیے بے چین و بے تاب تھا۔

"رکھاں والی" کے خیال سے میرا دھیان اپنے دیرینہ دشمن ملک نوازش علی کی طرف چلا گیا۔ اسی خبیث الاخبث شخص کی وجہ سے میرے والد کو اپنی دھرتی' اپنا گاؤں' اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا.... کہیں ملک نوازش علی ہی تو مجھے گھیرنے کے لیے وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان بنا نہیں بیٹھا؟

میں جانتا تھا' رکھاں والی کے چوہدری ملک نوازش علی کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ وہ ایک سکہ بند اسمگلر تھا۔ اس کا باپ بڑا چوہدری ملک رمضان بھی اسی مذموم دھندے میں ملوث تھا گویا نوازش علی کو اسمگلنگ' غنڈا گردی اور بدمعاشی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ یہ ظاہر وہ ایک بڑا زمیں دار تھا لیکن درپردہ ہر برے کام میں اس کا ہاتھ شامل تھا۔

ملک نوازش کے ایک ہرکارے "دارا" نے کئی سال تک مجھے تگنی کا ناچ نچایا تھا وہ میری جان کا دشمن ہو گیا تھا پھر جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور میں نے زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینا سیکھ لیا تو دارا مجھ سے چھپتا پھرنے لگا تھا۔ پہلے وہ میرے تعاقب میں تھا' پھر میں اس کی تاک میں رہنے لگا اور بالآخر میں نے اسے جہنم واصل کر کے دم لیا تھا۔ دارا میرے ماں باپ کا قاتل تھا' اسے دوزخ رسید کر کے مجھے بہت سکون ملا تھا' میرے دل و جگر میں ایک ایسی ٹھنڈک اتر آئی تھی جیسے شبنم کے شفاف قطرے اپنا ٹھنڈا گداز پھول کی پتیوں کے سینے میں اتارتے ہیں۔

یہ ممکن تھا کہ نوازش علی عمر کوٹ پہنچ گیا ہو۔ وہ بہت باخبر آدمی تھا۔ اگر اسے میرے پروگرام سے آگاہی حاصل ہو گئی تھی تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ بھاری مالیت کے سونے کا ٹنٹا ابھی باقی تھا' وہ لالچی فطرت شخص مجھے آسانی سے بھلا نہیں سکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ میر بخش سے اپنے ان اندازوں کی تصدیق کر لوں۔ میں نے ملک نوازش کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے "رکھاں والی" کو "چھوڑا" تو اس وقت میری عمر صرف دو ماہ تھی لیکن والد صاحب کی ڈائری میں درج معلومات سے میں نوازش علی کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری باتیں اگرچہ بہت معلومات افزا ہیں لیکن تم نے ابھی تک مجھے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" پھر میں نے خود ہی وضاحت کر دی۔ "میں نے تم سے وڈیرا اکبر سومرو کے اس مہمان کے بارے میں پوچھا تھا جو مجھے "حاصل" کرنے لاہور سے یہاں پہنچا ہے؟"

میر بخش نے جواب دیا۔ "وجدان سائیں! میں اس شخص کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ جو مجھے معلوم تھا' وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سنی سنائی مجھ تک پہنچاتے رہے ہو؟"

"صرف ایک بار دیکھا ہے سائیں۔" اس نے بتایا۔

"اس کی عمر کیا ہو گی؟"

"میرے ہی جتنی ہو گی سائیں۔"

میرے اندازے کے مطابق میر بخش تیس کے اریب قریب تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری عمر تو مجھے تیس سال لگتی ہے!"

وہ بولا "جی سائیں' وڈیرا اکبر سومرو کے اس مہمان کی عمر بھی تیس سال کے قریب ہی ہو گی۔"

وہ ملک نوازش علی نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک نوازش اس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق لگ بھگ پچاس سال کا ہو گا۔

اب میں ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ شخص اگر نوازش علی نہیں تھا تو پھر کون ہو سکتا تھا۔ کہیں وہ بھی دارا کی طرح ملک نوازش علی کا کوئی "نمک خوار" تو نہیں تھا؟ دارا نے اگر مجھے ایک چوتھائی دنیا میں دوڑایا تھا تو یہ شخص میرے استقبال کے لیے عمر کوٹ پہنچ گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آثار بتا رہے تھے کہ آنے والے وقت میں نت نئے ہنگامے میرے منتظر تھے۔

میں نے میر بخش سے پوچھا۔ "کیا تم اس شخص کا نام جانتے ہو؟"

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "نہیں سائیں۔"

میں نے کہا "میر بخش! تم نے بتایا ہے کہ وڈیرا رئیس خان نے تمہارے وڈیرا سائیں اکبر سومرو کے کہنے پر تم سے بھرپور تعاون کیا تھا ورنہ اس "معاملے" میں رئیس خان کا کوئی ہاتھ نہیں؟"

"جی سائیں' میں نے آپ کو ایک سچی بات بتائی ہے۔"

"کیا رئیس خان اور اکبر سومرو کے درمیان دوستی پائی جاتی ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے سائیں' یہ دونوں ایک ہی قماش کے وڈیرے ہیں یعنی دونوں "بھوتار" ہیں۔ جس طرح ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بہ خوبی پہچانتا ہے اور اس سے بھرپور تعاون کرتا ہے بالکل اسی طرح

ایک بھوتار دوسرے بھوتار کے "کام" آتا ہے۔ اس حوالے سے رئیس خان اور اکبر سومرو آپس میں گہرے دوست ہیں۔"

میر بخش صرف ایک دیسی پہلوان ہی نہیں تھا بلکہ اس میں عقل اور دانش بھی پائی جاتی تھی گویا وہ جسمانی اعتبار سے پہلوان تھا مگر ذہنی طور پر اس سے آگے کی کوئی چیز تھا۔ اب تک اس نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ اس کے کلام سے سچائی کی خو پھوٹتی تھی۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا تھا کہ میر بخش پر بھروسا کیا جا سکتا تھا تاہم میں مزید تسلی کے لیے ابھی کچھ اور کھوجنا چاہتا تھا۔

"میر بخش!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ "اگر ہمارا اغوا ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا تو پھر وہ تھانے والا ڈراما کیا معنی رکھتا تھا؟"

"کون سا ڈراما سائیں!" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "رقم کے بٹوارے کا ڈراما۔"

وہ میرے الفاظ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! وہ سب کچھ تمہیں چکر دینے کے لیے تھا تاکہ تم ہم پر بھروسا کرنے لگو اور بے فکری سے ہمارے ساتھ چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کر دو۔"

"تو وہ پچاس ہزار روپے کی تقسیم.....؟"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "سائیں! تھانے دار اور رئیس خان میں یہ طے پایا تھا کہ پنڈت کشوری لال سے ملنے والے پچاس ہزار روپے سیدھے سیدھے تھانے دار کی جیب میں جائیں گے جس کے بدلے میں وہ تم دونوں کو چھوڑ دے گا۔"

"اور وہ جو مجھے دس ہزار روپے دیے گئے تھے؟"

رقم کا خیال آتے ہی میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا جس میں میں نے تھانے سے روانہ ہونے سے قبل استعمال شدہ نوٹوں کی وہ گڈی رکھی تھی۔ جیب کو چھوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ گڈی اب وہاں موجود نہیں تھی۔ سو سو روپے والے وہ استعمال شدہ سو نوٹ میری جیب سے نکال لیے گئے تھے۔

میں نے چونک کر میر بخش کی جانب دیکھا۔ وہ میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! وہ دس ہزار روپے وڈیرا رئیس خان نے آپ کو اپنے پاس سے دیے تھے جو وہ واپس لے گیا ہے۔"

"واپس لے گیا ہے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ "کب؟"

میر بخش نے بتایا۔ "سائیں! جب ہم تھانے سے روانہ ہوئے تھے تو رئیس خان کی پجارو ایک موڑ سے مڑ گئی تھی۔ وہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔ بعد جب آپ لوگوں کو بے ہوش کیا گیا تو وڈیرا پھر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم نے آپ دونوں کے ہاتھوں کو پابند کیا اور رقم رئیس خان کے حوالے کر دی۔ وہ اپنی رقم لے کر واپس چلا گیا اور ہم نے گاڑی اپنی منزل کی جانب بڑھا دی تھی۔"

میں حیرت اور دلچسپی سے میر بخش کی انکشاف انگیز باتیں سن رہا تھا۔ اپنی بے ہوشی کے ذکر پر میں نے اس سے پوچھا۔ "تم لوگوں نے ہم پر قابو پانے کے لیے ہمیں گولی مار کر بے ہوشی میں اتار دیا تھا۔ اگر اسی بے ہوشی کے دوران میرا .....؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں سائیں! ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا بہت سوچ سمجھ کر اور حساب کتاب سے کیا تھا۔ ہم آپ کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جس نیند آور گولی سے آپ دونوں کو بے ہوش کیا گیا تھا اس کا اثر زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے تک رہتا ہے۔ آپ لوگ رات میں کسی وقت ہوش میں آ جاتے لیکن۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن سائیں! گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تو گاڑی کو حادثے والے قیامت خیز جھٹکوں سے آپ کی نیند ٹوٹ گئی۔ آپ بے خبری کے عالم سے عالم باخبری میں آ گئے۔"

میں نے میر بخش کو یہ بتانا ضروری سمجھا کہ گاڑی کا ٹائر پھٹنے سے کافی دیر پہلے میں بے ہوشی سے نکل آیا تھا اور اپنے ہاتھوں کو نسبتاً آزاد کرنے کا مکمل تصور کر چکا تھا۔ میرے ہاتھ اگر کچھ کرنے کے قابل ہو جاتے تو میں پھر اپنے اور اس کے لیے بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ٹائر پھٹنے کے باعث گاڑی کو پہنچنے والے جھٹکوں نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو تو ہماری یہ "باخبری" بہت مہنگی پڑی ہے۔ تم دل میں یہ ضرور سوچتے ہو گے کہ کاش! گاڑی کا ٹائر نہ پھٹتا اور نہ تم اس مصیبت میں گرفتار ہوتے۔ کیوں؟ میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"شروع شروع میں تو میں نے ایسا ہی سوچا تھا سائیں!" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "لیکن پھر بعد میں میری سوچ بدل گئی، میرے خیالات بدل گئے۔ قدرت کی طرف سے جو ہوا، وہ میرے لیے زیادہ بہتر ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"سائیں! سیدھی سی بات ہے" میر بخش نے جواب دیا۔ "میں وڈیرا اکبر سومرو کے پاس دلی طور پر خوش نہیں تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔ میں دل سے جرائم کے خلاف ہوں مگر ہم جیسے لوگ من مانی نہیں کر سکتے اگر ہم ذرا سی بھی سرکشی دکھائیں یا ہماری کسی ادا سے بغاوت کی جھلک نظر آ جائے تو بھوتار سائیں ہم پر زمین تنگ کر سکتا ہے، ہم اس کے چنگل سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

وہ تھوڑی دیر رک کر متشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وجدان سائیں! اللہ سائیں نے آپ کی شکل میں مجھے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا ہے۔ آپ کی مہربانی سے میں اکبر سومرو کے ظلم و جبر سے نجات پا سکتا ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنی چاکری میں لے لیں تو میں آپ کا بے دام غلام بن کر زندگی گزار دوں گا۔ میں جان گیا ہوں، آپ بدی کے خلاف لڑنے والے ایک عظیم انسان ہو، اللہ سائیں آپ کو کامیابی دے گا۔ میرا مرنا جینا اب آپ کے ساتھ ہے سائیں۔ جو حکم ہو آپ کا، میں آنکھیں بند کر کے عمل کروں گا۔"

میں اطمینان بھری نظر سے میر بخش کو دیکھ رہا تھا۔ اس حوالے سے میں ہمیشہ خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ ظلم اور بدی کے خلاف اس کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ میں مجھے مخلص، ہم درد اور نیک نیت لوگ ملتے رہتے تھے، بعد ازاں جو میرے دوستوں کی حیثیت حاصل کر لیتے تھے۔ مجھے آقا بننے کا شوق تھا اور نہ ہی کسی انسان کو غلام بنانے کی تمنا تھی۔ میں تمام مثبت طرز فکر رکھنے والے لوگوں سے دوستی کی بنیاد پر ملتا تھا اور یہی انسانیت بھی ہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کی پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک مرتبہ پھر قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ اس بات کے آثار بہت واضح دکھائی دے رہے تھے کہ میر بخش میرے حلقے میں شامل ہونے والا تھا۔

میں نے میر بخش کی پوری بات سننے کے بعد کہا "ٹھیک ہے، اگر تمہاری باتیں صداقت کے معیار پر پوری اتریں تو میں نہ صرف تمہیں پناہ دوں گا بلکہ ہر ممکن تمہارے کام آنے کی بھی کوشش کروں گا لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔"

"وہ کیا سائیں؟" وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "جب وڈیرا اکبر سومرو کو پتا چلے گا کہ تم اس سے غداری کر کے میرے ساتھ مل گئے ہو تو وہ تمہارے اہل خانہ کی زندگی اجیرن کر دے گا۔ وہ جینا چاہیں گے تو جی نہ پائیں گے اور موت کی خواہش بھی برنہ آئے گی۔"

"آپ اس بات کی فکر نہ کرو سائیں۔" وہ مطمئن لہجے میں جلدی سے بولا۔

"کیوں بھئی؟"

اس نے بتایا۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔ بس اکیلی جان ہوں..... اور اس جان کو آپ پناہ دینے کا وعدہ کر چکے ہو سائیں اس لیے مجھے دنیا کی کوئی فکر نہیں رہی۔ ایک ظالم وڈیرے کی پشت پناہی حاصل ہونے سے ایک نڈر، بہادر..... اور ظلم و ستم کے خلاف کھلی جنگ لڑنے والے انسان کا ساتھ دینا ہزار درجے افضل ہے۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ میر بخش کے ادا کیے ہوئے ایک ایک لفظ سے سچائی ٹپکتی تھی۔ میں نے اس پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اچانک میرا خیال اس واقعے کی طرف چلا گیا جب تھانے دار نے مجھے کسی خون آشام بھیڑیا صفت انسان کی کہانی سنائی تھی جس کے ساتھ ایک خوب رو لڑکی بھی دیکھی گئی تھی۔ "وہ جوڑا" اپنے شکار کا خون چوس کر اسے زندگی کی قید سے رہائی دلانے کا "فریضہ" انجام دے رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں میر بخش سے استفسار کیا تو وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"سائیں! اس کہانی میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں۔"

"پھر وہ جھوٹی کہانی مجھے کیوں سنائی گئی تھی؟"

"آپ کی اصلیت کی تصدیق کے لیے۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "سائیں! آپ کو یاد ہو گا، وڈیرا رئیس خان نے اس خونی قاتل کی ایک واضح نشانی بتائی تھی!"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔ "رئیس خان نے کہا تھا کہ اس خطرناک انسان کے دائیں کان کے پیچھے سرخ رنگ کا ایک ہلالی نشان ہے۔ بعد ازاں اس نے میرے دائیں کان کا تفصیلی جائزہ بھی لیا تھا۔"

"بالکل سائیں، ایسا ہی ہوا تھا۔" میر بخش تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "دراصل رئیس خان کی بتائی ہوئی مفروضہ قاتل کی وہ پہچان ایک جھوٹی کہانی تھی، ایک بہانہ تھا۔"

میں نے کہا "اس کو یہ بہانہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے بتایا نا' وہ آپ کی اصلیت کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن میرے وائیں کان کے پیچھے سرخ ہلالی نشان نہیں ہے؟"

"مسور جتنا تل تو ہے نا!"

میں نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ سیاہ تل تو ہے۔"

"بس' وہ یہی سیاہ تل دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔" میر بخش نے مجھے حیرت میں مبتلا کرتے ہوئے بتایا۔ "اسے بتایا گیا تھا کہ تمہارے وائیں کان کی لو کے پیچھے مسور کی دال کے برابر سیاہ تل ہے اور تمہیں شناخت کرنے کے لیے یہی سب سے زیادہ مستند نشانی ہے۔"

میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔ "وڈیرا رئیس خان کو میرے بارے میں یہ بات کس نے بتائی تھی؟"

"وڈیرا سائیں اکبر سومرو نے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور وڈیرا سائیں کو یہ بات اپنے مہمان دوست سے پتا چلی تھی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان اور میرا "طلب گار" وہ شخص میری توقع اور اندازے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ میرے وائیں کان کی لو کے پیچھے واقع سیاہ تل کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے اور میرے دشمنوں میں تو صرف ایک شخص میری اس نشانی سے واقف تھا جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔

وہ شخص شیطان صفت' کمینہ خصلت' درندہ صفت اور حیوان جبلت دارا تھا۔ دارا کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے اس کی عبرت ناک موت کا منظر یاد آگیا۔ میں نے اس قاتلوں کے قاتل اور موت کے سوداگر کو مار کر انسانیت پر احسان کیا تھا وہ نہ صرف میرے ماں باپ کا قاتل تھا بلکہ اس کے ہاتھ سیکڑوں بے گناہوں کے خون میں بھی رنگے ہوئے تھے اور اس کے پھیلائے ہوئے منشیات کے زہریلے جال نے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کو عبرت نگاہ بنا دیا تھا۔ ان ستم نصیب لوگوں کی گردنیں نشے کے نادیدہ پھندے میں جکڑی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہوئی سولی پر ٹنگے ہوئے تھے۔

دارا کے بارے میں بڑے وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ دنیا میں پائے جانے والے انسان نما شیطانوں میں وہ اول درجے پر "فائز" تھا۔ میں نے اس معاشرتی ناسور کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں اس تاریخ ساز دن کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ رشی کیش قصبے سے کچھ آگے ہمالیہ کی گود میں ایک مقام "گنگوتری" کے نام سے موسوم ہے۔ دریائے گنگا کا آغاز اسی پہاڑی سلسلے سے ہوتا ہے اسی لیے گنگوتری کو "گنگا" بھی کہا جاتا ہے۔ دریائے گنگا اور گنگا جل (گنگا کا پانی) ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس اور متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ اسی "گنگوتری" کو (GATEWAY to GOD) بھی کہا جاتا ہے۔

گنگوتری کے "سنکری مندر" میں میرے اور دارا کے درمیان ایک خون ریز معرکہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں میں نے اسے دو سو فٹ گہرے پہاڑی کھڈ میں پھینک کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس موقع پر میری دو ساتھی عورتیں جانکی اور چترا پریتم بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں جب کہ دارا کے علاوہ اس کے دو ہم قماش "نیرو" اور "پنڈت پرکھیا راج" بھی جہنم رسید کر دیے گئے تھے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے میری پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ثابت قدمی سے دشمنوں کے دانت کھٹے کیے تھے۔

اور اب.... میرے سامنے بیٹھا ہوا میر بخش یہ انکشاف کر رہا تھا کہ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان دوست میرے کان کی اس نشانی سے واقف ہے۔ جس کے بارے میں دارا کے سوا میرا اور کوئی دشمن کچھ نہیں جانتا تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ [illegible] وہ "مہمان دوست" لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے آیا تھا۔ دارا اور ملک نوازش علی کا تعلق بھی لاہور کے نواحی گاؤں "رکھاں والی" سے تھا۔ چناں چہ' یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اکبر سومرو کے دوست کا ملک نوازش سے کوئی تعلق ہو گا!

اگر یہ فرض کر لیا جاتا تو پھر یہ بات یقینی ہو جاتی تھی کہ دارا نے اپنی موت سے قبل' میری سیاہ تل والی نشانی کے بارے میں ملک نوازش علی کو ضرور بتا دیا ہو گا۔

میں کچھ دیر تک میر بخش کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ "کیا تم واقعی وڈیرے کے مہمان دوست کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں سائیں' مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "میں نے اس کی بس ایک جھلک دیکھی ہے' باقی باتیں سنی سنائی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم اس شخص کے حلیے کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

میر بخش نے اس شخص کا جو حلیہ بیان کیا اس کے مطابق وہ ایک ہٹا کٹا اور مضبوط جسم کا مالک انسان تھا۔ قد آور تھا' آنکھوں میں ذہانت جھلکتی تھی اور عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔

اس حلیے پر تو میر بخش بھی اسی فی صد پورا اترتا تھا۔ وہ بھی صحت مند جسم کا مالک تھا' طاقت ور بھی تھا۔ قد بھی چھ فٹ کے قریب تھا' عمر میں بھی وہ اس شخص کے برابر ہی تھا۔ میر بخش کے بتائے ہوئے حلیے سے میں اس شخص کے بارے میں کوئی واضح اندازہ قائم نہیں کر سکا۔

میں نے کہا۔ "میر بخش! تمہارے وڈیرے کا دوست تو خاصی اونچی چیز معلوم ہوتا ہے جو میرے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔"

"سائیں! اب میں وڈیرے کا آدمی ہوں' اور نہ ہی وہ میرا وڈیرا سائیں ہے۔"

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے اکبر سومرو سے ہر تعلق توڑ کر آپ کو اپنا آقا تسلیم کر لیا ہے۔ ہاں' یہ بات آپ کی بالکل درست ہے۔ وہ شخص واقعی بہت اونچی چیز ہے۔ اسی لیے تو وڈیرے کے بنگلے پر اس کی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔ "میر بخش! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ جب تم لوگوں کو پتا چلا کہ ہم بارڈر کراس کر کے "نگر پارکر" کے سرحدی گاؤں میں داخل ہو چکے ہیں تو تم نے وڈیرا اکبر سومرو کو اس بارے میں اطلاع دی تھی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "تم نے اکبر سومرو تک ہماری آمد کی اطلاع کس طرح پہنچائی تھی؟"

"موبائل فون کے ذریعے۔" اس نے جواب دیا۔

میں اچھل پڑا۔ "موبائل فون!"

پھر اس سے پہلے کہ وہ میری حیرت کو رفع کرنے کے لیے زبان سے ایک لفظ بھی نکالتا' گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں کہیں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی کی آواز چیخ چیخ کر اپنی شناخت پیش کر رہی تھی کہ اس کا مخرج کوئی موبائل فون ہے۔

میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جو جوابی تاثر ابھرا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ وڈیرا اکبر سومرو کی کال تھی۔ اسی دوران میں میر بخش نے گاڑی کے ڈیش بورڈ کو کھول کر موبائل فون برآمد کر لیا تھا۔

وہ خاصے بڑے سائز کا موبائل فون سیٹ تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون کو پاکستان میں متعارف ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے اور ننھے منے فون سیٹ مارکیٹ میں نہیں آئے تھے جیسا کہ آج کل دکانوں میں اور اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں "سجے" نظر آتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میر بخش فون آن کر کے گفتگو آغاز کرتا' میں نے تنبیہی لہجے میں اس پر واضح کر دیا۔ "سب ٹھیک ہے' تم دونوں ہم لوگوں کو لے کر پہنچ رہے ہو۔"

میرے لہجے میں پوشیدہ دھمکی اور آواز کے اتار چڑھاؤ میں شامل سنگینی نے میر بخش کے ذہن میں میرا مقصد نقش کر دیا تھا۔

میر بخش اور اکبر سومرو کے درمیان ٹھیٹ سندھی میں پانچ منٹ تک بات چیت ہوتی رہی۔ بعد میں میر بخش کی زبانی مجھے جو احوال معلوم ہوا اس کے مطابق ان کے درمیان کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ میں سندھی زبان کو پوری طرح نہیں سمجھتا تھا بس کچھ الفاظ کے معنی معلوم ہو جاتے تھے۔

"میر بخش! تم اس وقت کہاں ہو۔ کہیں "چھاچرو" سے گزرے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک تم لوگوں کو "دھرمسال" سے آگے نکل آنا چاہیے تھا۔" اکبر سومرو نے بے چین انداز میں پوچھا تھا۔

اس کے بیان سے اندازہ ہوا کہ چھاچرو میں اس کا کوئی آدمی ضرور موجود تھا۔ جس نے ہماری سیاہ گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور دھرمسال میں بھی اس کے کسی وفادار کی موجودگی کی بو مل رہی تھی۔

میر بخش نے جواب دیا تھا۔ "سائیں بھوتار! بس ہم دھرمسال پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"نہ بابا' اتنی دیر کیوں ہو گئی۔" وڈیرے نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"سب خیریت ہے سائیں بھوتار!" میر بخش نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "بس چھاچرو اور دھرمسال کے درمیان ریگستان میں اچانک گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ ہم نے ٹائر تبدیل کر لیا ہے۔ بس اب روانہ ہونے ہی والے ہیں۔"

سائیں نے پوچھا۔ "وہ دونوں کیسے ہیں؟"

"پوری طرح بے ہوش ہیں سائیں بھوتار۔"

"ان پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"ہم پوری طرح محتاط ہیں۔"

"میرے دوست کا دعویٰ ہے کہ وہ لڑکا وجدان بہت شاطر اور خطرناک ہے۔" وڈیرا اکبر سومرو نے کہا۔ "میں اس "نامی گرامی" لڑکے کو جلد از جلد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس

طرف سے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

میر بخش نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔" آپ فکر نہ کرو سائیں بھوتار! ہم ان دونوں کو لے کر آپ کے پاس پہنچنے والے ہیں۔"

وڈیرے نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا تھا۔

میر بخش موبائل فون ایک طرف رکھتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولا۔"اب کیا ہو گا سائیں؟"

"وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ خوف زدہ ہو گیا۔"سائیں! آپ نے ہدایت کی تھی کہ میں وڈیرا اکبر سومرو سے یہ کہوں..... سب ٹھیک ہے' ہم تم دونوں کو لے کر عمر کوٹ پہنچ رہے ہیں۔" وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد الجھن زدہ لہجے میں گویا ہوا۔"میں نے آپ کی تاکید کے مطابق وڈیرے سے گفتگو کی ہے۔ کیا آپ واقعی مجھے عمر کوٹ وڈیرے کے بنگلے پر بھیجنا چاہتے ہو؟"

"ہاں' میرا ارادہ تو یہی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مگر سائیں.....!"

اس نے پریشان ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے کہا"اگر مگر کچھ نہیں چلے گا میر بخش۔ تمہیں وہی کرنا ہو گا جو میں کہہ رہا ہوں اور میں تم سے ہی کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے تم سیدھے وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر جاؤ گے۔"

"لیکن میں نے تو وڈیرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میر بخش نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔ "سائیں! آپ مجھے "سام" بنا چکے ہو۔ اس کے باوجود بھی.....؟"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔" میر بخش! تم میری خدمت میں رہنے کے خواہش مند ہو نا۔ مجھے آقا بنا لیا ہے تم نے اور میرے ہر حکم کی تکمیل تم بے چون و چرا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو پھر یہ تردد کیوں؟"

"سائیں! کیا آپ بھی میرے ساتھ چلو گے؟" اس نے ایک اہم سوال کیا۔

میں نے حوصلہ شکن جواب دیا۔"نہیں!"

"آپ کے بغیر میں وڈیرا اکبر سومرو کے پاس پہنچوں گا تو وہ میرا جو حشر کریں گے اس کا تصور ہی کر کے میری روح فنا ہو رہی ہے۔" وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا"میر بخش! میری ایک بات ذہن میں بٹھا لو۔ ظالم اور جابر شخص سے کبھی ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند کرنا چاہیے۔ یاد رکھو' ظالم کے سامنے خاموش رہنا مظلوم کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔ تم تو ماشاء اللہ' اچھے خاصے صحت مند ہو' طاقت ور ہو پھر یہ بزدلوں والی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ تم جیسے ڈرپوک لوگوں کے لیے میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"سائیں! میں نہ تو ڈرپوک ہوں اور نہ ہی بزدل۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔"بس بات اتنی سی ہے سائیں کہ میں اکیلا' وڈیرا اکبر سومرو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

میں نے کہا۔" جب یہ سمجھو کہ سامنے والا تم سے طاقت' اختیار اور اقتدار میں کہیں زیادہ مضبوط ہے تو پھر حکمتِ عملی سے کام لینا چاہیے۔"

"حکمتِ عملی!" وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" دیکھو میر بخش! جس طرح لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے بالکل اسی طرح کسی چال باز کو اپنی چال سے کاٹا جا سکتا ہے۔ اسی کو حکمتِ عملی کہتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا سائیں!" وہ مزید الجھ گیا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔"میر بخش! تم وڈیرا اکبر سومرو کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وڈیرے کی طاقت کا توڑ بھی تمہیں بتاؤں گا۔ تم میری ہدایات پر عمل کرو گے۔ پھر دیکھنا' کس طرح سب بگڑے کام سنور جاتے ہیں۔"

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ یہ میری ذات پر اس کے اعتماد کا نتیجہ تھا۔ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔"سائیں! اس سلسلے میں آپ کی ہدایات کیا ہوں گی؟"

میں نے چند لمحے خاموش رہ کر بولنا شروع کیا۔"جیسا کہ میں نے بتایا ہے' کسی مکار کو مکاری ہی کی مار ماری جا سکتی ہے۔ میں بھی وڈیرا اکبر کو چالاکی اور ہنرمندی سے اپنے دام میں لاؤں گا۔"

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم اکیلے ہی وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر پہنچو گے' ایک سنسنی خیز اور خوفناک کہانی کے ساتھ۔ تم نہایت ہی ڈرے سہمے انداز اور خوف زدہ آواز میں اسے بتاؤ گے کہ میں یعنی وجدان علی کوئی خطرناک قسم کا جادو جانتا ہوں۔ جب تم گاڑی کا ٹائر بدل کر آگے روانہ ہوئے تو اسی وقت مجھے ہوش آگیا تھا پھر جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ تم لوگوں نے ہمیں اغوا کر لیا ہے تو میں نے کالے' نیلے یا پیلے... پتا نہیں' کس رنگ اور

کے جادو کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ پہلے اس جادو کے زور پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے پر مجبور کیا۔ جب گاڑی رک گئی تو میں نے تمہیں زبردستی اس بات پر آمادہ کیا کہ تم ہم دونوں کو نہ صرف گاڑی کے پچھلے حصے سے نکالو بلکہ ہمارے ہاتھوں کو بھی بندشوں سے آزاد کر دو۔ تم نے نہ چاہتے ہوئے سحری اثرات کے تحت میرے حکم کی تعمیل کی۔ اس موقع پر ڈرائیور نواز علی نے جواں مردی کا مظاہرہ کرنا چاہا تو میں نے تمہارے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف سے فائر کروا کر نواز علی کا قصہ پاک کر دیا۔ تم نے ہم دونوں کو زیر کرنے کے لیے ہمارے قدموں میں فائرنگ کرنا چاہی تو میں بار بار تمہارا نشانہ خطا کرواتا گیا۔ گولیاں ضائع ہوتی رہیں مگر تم میرا بال بھی بانکا نہ کر سکے۔ اس طرح تم' یہاں ہونے والی فائرنگ میں استعمال شدہ گولیوں کا حساب دینے سے بھی بچ جاؤ گے۔"

میں تھوڑی دیر کو رکا تو میر بخش نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا وڈیرا میری اس کہانی پر یقین کر لے گا؟"

"اس کے باپ کو بھی یقین کرنا پڑے گا۔" میں نے بڑی صفائی سے کہا۔"میں اس کے یقین کا مکمل بندوبست کر کے تمہیں رخصت کروں گا۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے کہا"گاڑی سے باہر آجاؤ۔"

"کہاں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "تم نواز علی کی لاش اٹھانے میں میری مدد کرو گے۔"

"نواز علی کی لاش کو اٹھا کر کہاں لے جانا ہے؟" وہ بھی گاڑی سے باہر آگیا۔

میں نے کہا"اس گاڑی کے عقبی حصے میں "پٹنا" ہے' سیٹوں کے درمیان۔"

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا۔"تم وڈیرا اکبر سومرو کو بڑے رقت آمیز انداز میں بتاؤ گے کہ جب میں نے تم لوگوں کو اپنے ٹرانس سے آزاد کیا تو تم پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ ازاں بعد تم نے نواز علی کی لاش کو اپنے کندھے پر اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا اور سیدھے عمر کوٹ پہنچ گئے تھے۔"

"وڈیرا یہ بھی تو پوچھے گا کہ جب آپ نے ہمیں اپنے ٹرانس سے آزاد کیا تو خود آپ کہاں گئے؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ جب تم اپنے ہوش میں آئے تو ہم "ٹرن چھو" ہو چکے تھے۔" میں نے کہا۔"بھئی میں تو جادوگر ہوں۔ کہیں بھی غائب ہو سکتا ہوں اور اپنے ساتھ ساتھ' اپنی ساتھی لڑکی کو بھی غائب کر سکتا ہوں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔"کہانی تو خاصی سنسنی خیز ہے۔ اب یہ وڈیرے کے دماغ میں بھی اتر جائے تو اچھا ہے۔"

"اترے گی' ضرور اترے گی میر بخش!" میں نے پُروثوق لہجے میں کہا۔"یہ وڈیرے سائیں اور کسی بھی علاقے کے اندرون میں بسنے والے لوگ بہت توہم پرست ہوتے ہیں۔ جادو ٹونے اور نادیدہ قوتوں پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ دونوں دوست مجھے ایک خطرناک شخص تو قرار دے ہی چکے ہیں۔ اب ان پر جب میرا یہ جوہر کھلے گا تو ان کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ پھر میرے "جادوئی کمالات" کے کچھ ثبوت بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اس لیے وڈیرا تمہاری وردناک کہانی پر کان دھرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

میر بخش نے پوچھا۔"کیسے ثبوت وجدان سائیں؟"

"نواز علی کی لاش" میں نے میر بخش کی مدد سے نواز ڈرائیور کی لاش کو گاڑی کے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔"اور یہ نائیلون کی ڈوری جس سے میری ساتھی کے ہاتھ باندھے گئے تھے اور..... یہ ہتھکڑی!" میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر یہ تو میرے ہاتھوں میں لگی ہوئی ہے۔"

"میں اسے تمہارے ہاتھوں سے نکال دیتا ہوں۔" میں نے چابی سے ہتھکڑی کھولتے ہوئے کہا۔

دھند اس دوران میں حیرت بھری نظر سے ہم دونوں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس وقت کسی اہم "کارروائی" میں مصروف تھا اس لیے اس کے بولنے کی ضرورت نہیں۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"کہو' اب تو تم مطمئن ہو یا.....؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"سائیں! وڈیرا اکبر سومرو نے ہنگامی حالات میں رابطے کے لیے مجھے موبائل فون دے رکھا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے' میں نے اتنے بڑے واقعے کی اطلاع اسے کیوں نہیں دی تھی۔ اس سوال کا میں کیا جواب دوں گا؟"

میں نے کہا۔"اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔"تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے پہلی فرصت میں وڈیرے کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہی تھی بلکہ

تم تو اسی وقت اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب میں "جادوئی آپریشن" میں مصروف تھا مگر میں نے تمہاری کوشش کو اپنے سحری اثرات سے ناکامیاب بنا دیا اور ....." میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر میر بخش کو دیکھا اور اپنی بات مکمل کر دی۔ "اور اس موبائل فون کو بے کار یعنی ناکارہ کر دیا۔"

"اوہ!" وہ چونک اٹھا پھر پوچھا۔ "تو کیا آپ واقعی موبائل فون کو برباد کرنا چاہتے ہو سائیں؟"

"ہاں' یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "اور یہ کام تمہارے ہاتھوں سے ہو گا۔ تم کلاشنکوف کا ایک برسٹ مار کر اس موبائل فون کے پرخچے اڑاؤ گے اور اس کی باقیات کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا پھر لرزیدہ لہجے میں بولا۔ "سائیں! یہ موبائل فون تو بہت قیمتی ہے' سائنس کی بالکل نئی ایجاد ہے۔"

میں نے کہا "یہ تمہاری کم علمی ہے میر بخش۔ موبائل فون سائنس کی ایجاد تو ہے بلکہ اسے سائنس کا اعجاز کہنا چاہیے..... لیکن یہ ابھی ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ پاکستان میں بھی یہ چند سال پہلے متعارف کروایا گیا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اسے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہارے اس "نکتے" کا تعلق ہے کہ یہ فون بہت قیمتی ہے تو میں یہ کہوں گا کہ بعض اوقات کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے قیمتی چیزوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔" پھر میں نے گاڑی کے فرش پر پڑی نواز علی کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ موبائل فون اس انسانی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے میر بخش؟"

وہ نواز علی کی خون چکاں لاش کو دیکھ کر ایک جھرجھری لے کر رہ گیا اور بڑی شدت سے انکار میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں نے کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ جب نواز علی میرے سحری اثرات سے تمہاری فائرنگ کا نشانہ بن کر موت کے منہ میں جا سکتا ہے تو پھر ایک موبائل فون کی حیثیت ہی کیا ہے!"

بات میر بخش کی سمجھ دانی میں اتر گئی۔ اگلے چند لمحات میں اس نے میرے احکام کی تعمیل کر دی پھر پوچھا۔

"سائیں! اب آپ کہاں جائیں گے اور میری دوبارہ آپ سے ملاقات کب اور کیسے ہو گی؟"

میں نے کہا "ہم فی الحال تو کہیں نہیں جائیں گے۔ یہاں سے تمہارے ساتھ ہی آگے بڑھیں گے۔ ہماری آئندہ ملاقات کب اور کہاں ہو گی' یہ بات میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب ہم جدا ہونے لگیں گے۔"

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "اب ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ ہمیں فوراً اپنا سفر شروع کر دینا چاہیے۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھو گے سائیں یا میرے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں؟"

"تمہارے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں" میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔ "اور اب ڈرائیونگ بھی میں ہی کروں گا۔"

پھر میں دھنو کی جانب متوجہ ہو گیا اور نواز علی کی لاش کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔ "کیا تم اس کی موجودگی میں آرام سے رہ لو گی یا میں کسی اور قسم کی "سیٹنگ" کروں؟"

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ "وجدان! تم فکر نہ کرو۔ میں اس قسم کے منظر سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ جب تمہارے قدم میں' میں نے اپنا قدم رکھ دیا ہے تو پھر فکر' ڈر اور خوف کی کیا بات ہے۔ اب تو قدم قدم پر ایسے مناظر کا سامنا ہو گا۔ میں نے اب تک جتنا بھی وقت تمہارے ساتھ رہ کر گزارا ہے اس کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری زندگی بہت ہنگامہ خیز ہے۔ تم ہر وقت خطرات میں گھرے رہتے ہو اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان خطرات کا مقابلہ کرتے رہتے ہو۔ اگر تمہارے ساتھ چلنا ہے تو پھر دل کو مضبوط تو بنانا ہو گا۔"

اس نے ایک عجیب انداز میں میری آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ "وجدان! تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کتنی حوصلہ مند لڑکی ہوں۔ اگر میں کمزور دل ہوتی تو اپنے ماں باپ کی لاشوں کو دیکھ کر وہیں عبادت گاہ میں ہی جان دے دیتی۔ لیکن نہیں' وہ میرا حوصلہ' عزم اور مضبوط دلی ہی تھی کہ میں نے اپنی ماں' بھرجائی اور باپ کھونچی کی خوں چکاں لاشوں کو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ سے کھٹمنڈو شہر تک پہنچایا تھا۔"

دھنو بولتے بولتے جذباتی ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی جس واقعے کا ذکر کیا تھا' اس کی اندوہ ناکی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ دھنو نے واقعی بہت بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور ازاں بعد بھی وہ میری خاطر کئی بار ظلم و تشدد کی فضا سے گزری تھی۔ اس کی مضبوط دلی اور آہن اعصابی مجھ پر آشکار ہو چکی تھی۔ میں اس کی قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

والدین کے بہیمانہ قتل کا واقعہ یاد کر کے اس کا دل بھر آیا

تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں واضح طور پر درد کی ایک لہر کو اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے' اپنے ماں باپ کو خاک و خون میں لوٹتے ہوئے دیکھنا کتنا دل دوز اور جگر پاش منظر ہوتا ہے' یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ تپش وہیں ہوتی ہے جہاں پر آگ جلتی ہے۔

ہمارا یہ صدمہ مشترکہ تھا۔ دھنو کو جذباتی دیکھا تو مجھے بھی اپنے دل میں کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے بے اختیار دھنو کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے سینے کا تلاطم بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت ضبط کی آخری حد سے گزر رہی ہے۔

وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کے ضبط کا بندھن توڑنے کا سبب بن جاتا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں اس کے شانے تھپک کر خود سے الگ کر دیا پھر اضطرابی لہجے میں کہا۔

"تم یہیں بیٹھو دھنو' ہم آگے جا رہے ہیں۔"

دھنو نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جو دل کے آر پار ہو گئی۔ ہم دونوں گاڑی کا عقبی دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ کیبن میں آ گئے۔ میں نواز علی کی سندھی ٹوپی بھی اپنے ساتھ اٹھا لایا تھا۔

"اس ٹوپی کا کیا کریں گے سائیں؟" میر بخش نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کروں گا۔" میں نے وہ ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا اور گاڑی کو چلا کر پکی سڑک پر لے آیا۔ "اب پہلی نظر میں دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ نواز علی ہی ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ اگرچہ میں جتنے میں اس جیسا نہیں ہوں تاہم کام تو چلانا ہی پڑے گا۔"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے بتدریج گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جب گاڑی تیزی سے گزر رہی ہو تو دیکھنے والوں کی نظر کسی کے جثے پر کم ہی جاتی ہے۔ سب سے پہلے جو چیز نگاہ میں آتی ہے وہ "گیٹ اپ" ہے۔ ونڈ اسکرین سے جو میرا جو گیٹ اپ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے مطابق تو میں پہلی نظر میں سندھی ہی لگوں گا نا!"

"آپ بہت عقل مند اور موقع شناس ہیں سائیں" میر بخش نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے یہ بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "عقل مندی اور موقع شناسی وقت خود سکھا دیتا ہے میر بخش! بس اس کا صرف ایک ہی تقاضا ہوتا ہے۔"

"وہ کیا سائیں؟"

"وقت چاہتا ہے' انسان اس کے ساتھ ساتھ چلے۔"

"یہ تو بہت ہی اہم بات بتائی ہے آپ نے سائیں۔" وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ "لیکن اکثر انسان وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ یا تو وقت سے بہت آگے چلنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بہت پیچھے رہ جاتے ہیں چناں چہ وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ جواباً وہ اپنی ناکامیابیوں کو قسمت کی خرابی سے منسلک کر کے واویلا مچاتے رہتے ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات مکمل کر دی۔ "اور جو لوگ وقت کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں' وقت ان کا راستہ بن جاتا ہے جو انہیں ان کی مقصودہ منزل تک لے جاتا ہے۔"

میر بخش چند لمحوں تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "وجدان سائیں! آپ کے ساتھ جو "بی بی" ہے وہ آپ کی کیا لگتی ہے؟"

اس کا اشارہ دھنو کی جانب تھا۔ میں نے کہا "وہ میری دوست لگتی ہے۔"

"میرا مطلب تھا....!"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں میر بخش!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم یہی پوچھنا چاہتے ہو نا' میرا دھنو سے کیا رشتہ ہے؟ تو سنو' یہ میری دوست ہے' ایک مخلص اور بے لوث دوست جو کسی بھی نازک موقع پر میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔ وہ میرے لیے بڑے سے بڑا دکھ اٹھا سکتی ہے' تکلیف برداشت کر سکتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ مضبوط رشتہ بھی کوئی ہو سکتا ہے۔؟"

"نہیں سائیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "واقعی دوستی کا رشتہ تو بہت لاثانی اور قابل تعریف ہے۔"

میں نے کہا "میر بخش! اگر دھنو میرے لیے اتنا آگے جا سکتی ہے تو میں بھی اس کی خاطر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ہم سب دوست ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ ہماری دوستی حقیقی معنوں میں دوستی ہوتی ہے۔"

وہ کافی دیر تک متاثر کن انداز میں گردن ہلاتا رہا پھر بولا۔ "سائیں! آپ کی دوست دھنو واقعی بہت بہادر ہے ورنہ ایک خون آلودہ لاش کے ساتھ....!"

اس نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی تشفی کرتے ہوئے کہا۔

"میر بخش! میری دوستی میں بہادری شرط ہے۔ میرے تمام دوست اس وصف سے مالا مال ہیں۔ ہم برائی' ظلم' تشدد اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف بڑی بے جگری سے سینہ سپر ہیں۔ میں کسی شخص کو آنکھیں بند کر کے اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل نہیں کرتا بلکہ کسی کڑے امتحان میں ڈال کر اس کی آزمائش کرتا ہوں۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے۔"

"میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے سائیں؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "تم اپنے سابق مربی وڈیرا اکبر سومرو کے پاس پہنچنے والے ہو' ایک ایسی کہانی کے ساتھ جو میری تخلیق کردہ ہے۔ میں نے اس کہانی کو اسٹیج کرنے کے لیے تمہیں کچھ ہدایات بھی دی ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کر کے دکھایا تو میں سمجھوں گا تم امتحان میں پاس ہو گئے۔"

وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں بولتے بولتے رکا تو اس نے پُرعزم اور ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ "سائیں! میں سر دھڑ کی بازی لگا کر آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"شاباش" میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا۔ "میر بخش! اگر تم اس آزمائش میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر میں تمہیں بھی گلے لگاؤں گا۔ تم میرے دوستوں میں شمار کیے جاؤ گے۔ غلام' نوکر چاکر اور "سام" وغیرہ پالنے کا مجھے شوق نہیں ہے۔"

اس کا سینہ جوشِ جذبات سے پھول گیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے ونڈ اسکرین کے پار اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"سائیں! اب ہم "دھرمسال" سے گزرنے والے ہیں۔"

میں نے اس کی اطلاع سنتے ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی اور گردوپیش پر اپنی عقابی نگاہ رکھتے ہوئے "زن" سے دھرمسال کو پیچھے چھوڑتا چلا گیا۔

"اللہ سائیں کا شکر ہے سائیں۔" جب ہم کافی آگے آ گئے تو میر بخش کی زبان سے اطمینان بخش کلمہ جاری ہوا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "میر بخش! "چھاچرو" بھی ایسا ہی علاقہ ہے؟"

"میں سمجھا نہیں سائیں!" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا "چھاچرو" کی آبادی بھی "دھرمسال" کی طرح ہے؟"

"ہاں سائیں" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کم و بیش یہ دونوں گاؤں ایک جیسے ہی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم لوگ "چھاچرو" میں رکے بغیر ہی آگے بڑھ آئے تھے؟"

"وہاں رکنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا سائیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تب پھر وڈیرا اکبر سومرو کیوں اس کرتا ہے۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی سائیں!"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ وڈیرے کی موبائل فون پر جو گفتگو ہوئی تھی اس میں' تمہارے بیان کے مطابق وڈیرے نے کہا تھا..... میر بخش! "چھاچرو" سے گزرے ہوئے تمہیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک تو تمہیں "دھرمسال" سے آگے نکل آنا چاہیے تھا۔ تم اس وقت کہاں ہوں؟" میں نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میر بخش! وڈیرے کی اس بات سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ "چھاچرو" میں موجود اس کے کسی آدمی نے تمہاری گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا جب کہ تم بتا چکے ہو کہ ان دونوں بستیوں کی آبادی ایک جیسی ہے۔ "دھرمسال" کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وڈیرا اکبر سومرو صرف تم لوگوں کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کے کسی آدمی نے تمہیں وہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔"

"آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہو گا۔" میر بخش نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ "میر بخش! ہم کب تک عمر کوٹ پہنچ جائیں گے؟"

اس نے بتایا "ضلع عمر کوٹ کی حدود تو آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد شروع ہو جائے گی تاہم عمر کوٹ کا شہری حصہ مزید آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد آئے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا۔ "آپ کا کیا پروگرام ہے سائیں؟"

اس وقت سورج مغربی افق پر جھک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چمک دار تھال زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں سرخ رنگت اختیار کرنے والا تھا۔ پھر شام ہو جاتی۔ یعنی جب ہم ضلع عمر کوٹ کی حدود کو چھوتے' سورج اپنا آج کے دن کا سفر پورا کر کے مغرب میں منہ چھپا چکا ہوتا۔ میر بخش کی بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ عمر کوٹ کے شہری حصے میں پہنچتے پہنچتے رات بھیگ چکی ہوتی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں تو اپنا پروگرام اس وقت بتاؤں گا جب مجھے یہ پتا چلے گا کہ وڈیرا اکبر سومرو کا بنگلا کس طرف ہے۔ میں وڈیرے اور اس مہمان دوست سے زیادہ دوری پر نہیں جانا چاہتا!"

"سائیں! وڈیرے کا بنگلا اور جاگیر عمرکوٹ شہر کی مشرقی سمت میں ہے۔" میر بخش نے بتایا "وہاں جانے کے لیے عمر کوٹ کی حدود میں داخل ہو کر مجھے سیدھے رخ پر گاڑی موڑنا ہوگی جب کہ شہر میں داخل ہونے کے لیے سیدھا جانا پڑتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے' شہری حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہی تم دائیں جانب (مشرقی سمت) مڑجاؤ گے؟"

"جی سائیں" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

میں نے پوچھا "اس موڑ سے وڈیرے کے بنگلے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے۔"

"اور موڑ سے شہر عمرکوٹ کتنے فاصلے پر ہے؟"

"وہاں سے دس پندرہ منٹ میں شہر کے وسط میں پہنچا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم ہمیں شہر کے اندر پہنچا کر واپس آسکتے ہو؟"

"جو حکم سائیں" وہ فرماں برداری سے بولا پھر پوچھا "کیا آپ شہر میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ہاں' فی الحال تو یہی سوچا ہے۔" اس کے سوال کے جواب میں' میں نے کہا۔

"شہر میں کہاں رکیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"کسی ہوٹل وغیرہ میں" میں نے بتایا۔

اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔ میں نے اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"عمرکوٹ شہر میں ہوٹلوں کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"ہوٹل ہیں سائیں مگر آپ کی شان کے مطابق نہیں" اس نے بتایا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ سائیں کہ وہ عام سے ہوٹل ہیں" اس نے جواب دیا "آپ کے حساب سے تھرڈ کلاس کہے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "میر بخش! ہم اس وقت نہ تو کوئی حساب کتاب کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور نہ ہی میں اپنی کلاس ناپنا چاہتا ہوں۔ بس کسی معقول سے ہوٹل میں ہمیں ایک کمرا مل جائے تو گزارہ ہو جائے گا۔ کیا ایسا کوئی ہوٹل تمہاری نظر میں ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا "ہاں سائیں' ایسے ایک ہوٹل کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کو اس ہوٹل کے قریب چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔"

"بس ٹھیک ہے" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

میر بخش نے پوچھا "سائیں! آپ کے پاس رقم کی کیا پوزیشن ہے؟"

"رقم تو ہمیں تم دو گے میر بخش" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ضرور سائیں' ضرور" وہ مبنی بر آمادگی لہجے میں جلدی سے بولا۔

میں نے محسوس کیا' وہ ایک مرتبہ پھر کچھ الجھ سا گیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے میر بخش! تم مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"سائیں! میں آپ کی ساتھی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"تو اس میں الجھن یا فکر کی کون سی بات ہے؟"

اس نے سنجیدہ لہجے میں بتایا "سائیں! بی بی کا لباس خاصا ماڈرن ہے۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہے۔ عمرکوٹ یا کسی بھی چھوٹے شہر میں لڑکیاں اور عورتیں ایسا لباس نہیں پہنتیں۔"

"تو پھر؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

وہ بولا "سائیں! میرا خیال ہے' آپ بہت جلد دوسروں کی نظر میں آجاؤ گے۔ ان "دوسروں" میں ممکن ہے' وڈیرا اکبر سومرو کا بھی کوئی آدمی ہو۔ اس کے بعد آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ کیا کیا پریشانیاں جنم لے سکتی ہیں۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو میر بخش! بہرحال' فوری طور پر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے کے بعد اس مسئلے کو حل کریں گے۔ دھنو کا لباس تبدیل کروا دیا جائے گا۔"

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ میرے سفری بیگ میں ہمارے چند جوڑے کپڑے موجود تھے۔ اگرچہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سندھ کی تہذیب سے لگا کھاتا تاہم دھنو اگر ساڑی زیب تن کر لیتی تو بات بن سکتی تھی۔ بیگ میں اس کی ایک ساڑی رکھی تھی جو رانی روپ متی نے اسے تحفے میں دی تھی۔ جے پور میں قیام کے دوران میں روپ متی اور شوبھانے دھنو کو زیادہ تر ساڑی پہننے پر ہی زور دیا تھا۔

میر بخش نے اپنی جیب میں سے مبلغ دو ہزار روپے کی رقم نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا "سائیں! فی الحال تو یہی ہیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"یہ بھی بہت ہیں۔" میں نے وہ رقم اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "سائیں! جب آپ ہوٹل پہنچو گے تو اندھیرا پھیل چکا ہوگا اس لیے زیادہ خطرے کی کوئی بات نہیں مگر دن کے اجالے میں آپ کو بہت احتیاط کرنا ہوگی۔ آپ کی ساتھی اور آپ اس ماحول میں بہت مختلف نظر آتے ہو اس لیے فوراً نظروں میں آجاؤ گے۔"

میں نے کہا "تم فکر نہ کرو۔ میں کوشش کروں گا' کل ہم بھی اپنا گیٹ اپ تبدیل کر لیں میں مقامی رنگ میں رنگنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کافی عرصے تک یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو؟"

"فی الحال تو تین دن کے لیے ہوٹل میں کمرا لوں گا" میں نے کہا "اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس مدت کو بڑھا لوں گا۔"

وہ تجویز آمیز لہجے میں بولا "سائیں! آپ کو اس لمبے چوڑے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم گاڑی اور گاڑی میں موجود تمام چیزوں کو یہیں کہیں ویرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس وقت ہم آزاد ہیں' کوئی ہمارا راستہ روکنے والا بھی نہیں ہے۔"

میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم "امتحانِ وفاداری" سے بچنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"نہیں سائیں" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"پھر مجھے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟"

وہ ہکا بکا رہ گیا "کون سا میدان سائیں؟"

میں نے کہا "وہ میدان میر بخش جو وڈیرا اکبر سومرو اور اس کے مہمان دوست نے میرے سامنے پھیلایا ہے۔ میں بھی تو ذرا دیکھوں' وڈیرے کا وہ دوست کتنے پانی میں ہے۔ جس نے مجھے گھیرنے کے لیے یہ لمبا چوڑا جال بچھایا ہے.... اور جو یہ بھی جانتا ہے کہ میرے دائیں کان کی لو کے پیچھے مسور کے برابر سیاہ تل ہے" میرا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا تھا "میر بخش!" میں نے ہونٹ بھینچے' ایک گرم سانس خارج کی اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "جو شخص میرے بارے میں اتنی اہم معلومات رکھتا ہے اور میرے استقبال کی خاطر وہ لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے چل کر اس تپتے ہوئے ریگستان میں پہنچا ہے اس شخص سے "ملاقات" کیے بغیر میں ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کے "دیدار" کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ تم وڈیرے کے بنگلے میں واپس آکر کل مجھے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرو گے تو میں آئندہ کا لائحہ عمل تیار کروں گا۔ کل نہ آسکو تو پرسوں آجانا۔ میں پورے تین دن تک ہوٹل کے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا۔

"اگر تمہیں ہم ہوٹل میں نہ ملیں تو تم ہمارا انتظار کر لینا۔ ہم ہوٹل کے آس پاس ہی کہیں ہوں گے۔ زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ ہم ہوٹل میں مراد اور کلثوم کے ناموں سے ٹھہریں گے۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

"میر بخش! ایک وقت تھا' جب میں اپنے دشمنوں کے آگے دوڑا کرتا تھا۔ وہ میری جان کے گاہک بنے ہوئے تھے کیوں کہ میں اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ میرے والدین کے قاتل مجھے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنا چاہتے تھے لیکن میری خوش بختی مجھے بچاتی رہی اور میں حملہ آوروں کے ہر وار سے زندہ بچ نکلا۔ میں اپنے دشمنوں سے بہ خوبی واقف تھا لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیوں کہ میں ابھی معصومیت کے ہنڈولوں میں جھول رہا تھا۔ صغیر سنی نے میرے پاؤں میں بیش وزنی زنجیر ڈال رکھی تھی۔ پھر قدرت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میری سچائی اور مظلومیت کا مجھے انعام ملا۔ اللہ کی مرضی سے' اللہ کے چند بندوں نے مجھے ایسے کندۂ ناتراش خراش کچھ اس انداز میں کی کہ میں آتش و آہن کا ایک ناقابلِ تسخیر شاہ کار بن گیا۔ وہ دن اور آج کا دن" میں نے رک کر میر بخش کی جانب دیکھا جو بڑی محویت سے میری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "ہاں میر بخش! وہ دن اور آج کا دن' میں اپنے دشمنوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہوں اور وہ کسی "پسپا" حریف کی طرح خود کو چھپاتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہاں سندھ کے ریگستان میں کوئی "جیالا" آگے بڑھ کر "میرا استقبال" کر رہا ہے.... اور سیکڑوں میل کا طویل سفر کر کے وہ میری خاطر یہاں رکا ہوا ہے۔ میں اپنے ایسے جوشیلے اور ولولہ انگیز "میزبان" کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں۔ ذرا معلوم تو ہو' میری "چاہت" میں بے کل اور میری "جستجو" میں دشت نوردی کرنے والا وہ جی دار' دشمنوں کے کس قبیل سے تعلق

رکھتا ہے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں' اس کے سینے میں کتنا دم ہے؟ میں پڑھنا چاہتا ہوں' اس کے دماغ میں کتنا غصہ و غم ہے؟ میں برتنا چاہتا ہوں' اس کے بازوؤں میں کتنا خم ہے؟"

اگر میر بخش کا بس چلتا تو وہ میرے قدموں میں گر جاتا۔ اس وقت وہ مجھ سے بے انتہا متاثر نظر آتا تھا۔ اس کا اندرون اور بیرون سراپا نیاز بنا ہوا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی' اس کا لہجہ جذبات کی شدت سے بھیگا ہوا تھا۔

"سائیں وجدان! میں اپنے بخت پر بہت فخر محسوس کر رہا ہوں کہ قدرت نے مجھے آپ سے ملوا دیا ہے۔ آپ بہت عظیم انسان ہو" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا "سائیں! آپ بے فکر ہو جاؤ۔ میں جی جان سے کوشش کر کے آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا... اور آپ کی مطلوبہ معلومات جلد از جلد آپ تک پہنچاؤں گا۔"

میں نے کہا "فی الحال صرف اتنا ہی کرو جتنا میں نے کہا ہے۔"

"ٹھیک سائیں' جو حکم سائیں۔"

اسی وقت ہم ضلع عمرکوٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ میں نے کہا "میں گاڑی ایک طرف روک رہا ہوں۔ آگے ڈرائیونگ تم کرو گے!"

گاڑی روک کر ہم نے اپنی سیٹیں تبدیل کیں۔ اسی موقع پر میں نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر دھنو سے بھی مختصر گفتگو کی اور اسے یہ پُر مسرت نوید سنائی کہ ہم بہت جلد ایک معقول ہوٹل میں پہنچنے والے ہیں اس لیے وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نک سک بھی درست کر لے۔

ہمارا سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔

میں نے پوچھا "کراچی سے عمرکوٹ یا عمرکوٹ سے کراچی جانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"مختلف گاڑیاں مختلف وقت لگاتی ہیں" اس نے جواب دیا "جو کوچ حیدر آباد سے ہو کر آتی جاتی ہیں' وہ پانچ سے ساڑھے پانچ گھنٹے میں پہنچا دیتی ہیں جب کہ ڈائریکٹ آنے والی کوچز ساڑھے تین گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیتی ہیں۔"

میں نے پوچھا "عمرکوٹ کی سب سے نواحی مشہور چیز کون سی ہے؟"

"عمراروی!" اس نے جواب دیا۔

"عمراروی!" میں نے بڑبڑانے والے انداز میں دہرایا۔

"جی سائیں' عمراروی" وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے استفسار کیا "عمراروی کیا چیز ہے بھئی؟"

"آپ نہیں جانتے سائیں؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ معلومات کا دریا بہانے لگا۔

میر بخش نے دس پندرہ منٹ میں "عمراروی" کی پوری کہانی تفصیل سے مجھے سنا دی۔ یہ محبت کرنے والے دو دلوں کی ایک لوک کہانی تھی۔ پنجاب اور سندھ کی سرزمین اور آب و ہوا رومان پروری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ عمراروی کی رومانوی داستان نے مجھے بہت متاثر کیا۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک عمراروی زیر بحث رہی پھر میں نے میر بخش سے پوچھا۔ "تم ہمیں جس ہوٹل میں پہنچانے جا رہے ہو' کیا وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ہے؟"

"نہیں سائیں" اس نے نفی میں جواب دیا "عمرکوٹ شہر میں کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔"

"کیا یہاں ٹرین نہیں چلتی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"چلتی ہے" وہ سر ہلاتے ہوئے گویا ہوا "مگر کوئی مین لائن یہاں سے نہیں گزرتی۔ بس ایک چھوٹی ریلوے لائن ہے اور وہ بھی عمرکوٹ شہر سے ذرا ہٹ کر گزرتی ہے۔" پھر وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں نے جس ریلوے لائن کا ذکر کیا ہے "وہ کھوکھرا پار" بارڈ سے شروع ہو کر واسرہاء جلو جو نری' نیا چھور' ہاسیسر' ڈھورونارو' ہیرل' پتھورو اور شادی پلی سے ہوتے ہوئے ضلع "میرپور خاص" میں داخل ہو جاتی ہے۔ عمرکوٹ شہر کو یہ ریلوے لائن ٹچ نہیں کرتی۔"

میر بخش کی اس معلوماتی وضاحت میں صرف ایک ہی کام کی چیز تھی اور یہ تھی کہ عمرکوٹ شہر میں ریلوے اسٹیشن نہیں تھا۔

ہمارے درمیان اسی قسم کی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں اور ہم اس ہوٹل کے نزدیک پہنچ گئے جس کا ذکر میر بخش نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔ وہ ہوٹل بس اسٹینڈ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے نزدیک ایک پیٹرول پمپ بھی تھا۔ وہ عمرکوٹ کا واحد ہوٹل تھا جس میں کمرا بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ورنہ سرائے نما چارپائی ہوٹل تو کافی تعداد میں تھے۔ ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرنا تھا اس کی زیریں منزل پر "طعام" کا شعبہ تھا۔ "قیام" کے لیے اوپر کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں مطمئن تھا کہ ہمیں قیام کے لیے الگ کمرا مل سکتا تھا۔ میر بخش چاہتا تھا کہ خود ہمیں ہوٹل پہنچا کر آئے لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ میں نے گاڑی بھی ہوٹل سے مناسب فاصلے پر رکوائی تھی۔ دراصل میر بخش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ کسی ہوٹل میں داخل ہوتا۔ تپتے ہوئے صحرا میں' میں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ خاصی حد تک درست کر لیا تھا تاہم چہرے پر لگنے والی چوٹوں کے نشان ایسے نہیں تھے کہ جنہیں آسانی سے چھپایا جا سکتا۔ میں نے آہنی ہتھکڑی کا دوہتڑ اس کے چہرے پر رسید کر کے وہاں کی کھال کو کئی مقامات سے "بغاوت" پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے اور میر بخش مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔ اب اسے میری ہدایات کے مطابق سیدھا وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر جانا تھا اور..... وہاں جو حالات "پیش آتے" ان کی روداد کل یا پرسوں یا ترسوں آ کر مجھے سنانا تھی۔

میں اور دھنو سبک قدموں سے چلتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔

وہ ہوٹل عمرکوٹ کے حساب سے درجہ اول پر فائز تھا تاہم میرے نزدیک وہ ایک ساتویں یا آٹھویں درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم استقبالیہ پر پہنچے اور ایک "ڈبل بیڈ" روم کے لیے کلرک سے بات کی۔

استقبالیہ کلرک نے سر سے پاؤں تک ہمارا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں خاص طور پر دھنو کا بصری ایکسرے کرنے کی متمنی دکھائی دیتی تھیں۔ میں خاموشی سے کلرک کی "کارروائی" دیکھتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہو گیا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس کے فرائض منصبی کا حصہ نہیں ہے۔ شکر ہے' جلد ہی اسے اپنی "اوقات" کا ادراک ہو گیا تھا۔

وہ جلدی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "جی سائیں آپ کو کمرا مل جائے گا۔" پھر اس نے کمرے کا ایک دن کا کرایہ بتایا۔

میں نے میر بخش کی دی ہوئی رقم میں سے تین دن کے کرایے کے پیسے نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا "یہ تین دن کا کرایہ ہے۔ اگر اس سے زیادہ ٹھہرنا پڑ گیا تو مزید رقم دوں گا۔"

اس نے پوچھا "آپ دونوں کے نام کیا ہیں؟"

میں نے اپنا فرضی نام "مراد" اور دھنو کا فرضی نام "کلثوم" لکھوا دیا۔ کلثوم لکھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر دھنو کے سراپا کو تشنہ نگاہی سے ٹٹولا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کوئی سی چیز کھٹکنے نہیں دے رہی۔

اول تو دھنو کا حسن اور جوانی ہی دیکھنے والی آنکھ کو محو حیرت کرنے کے لیے کافی تھے پھر اس پر اس کے نقش و نگار اسے کسی اور ہی دنیا کا ظاہر کرتے تھے۔ کلرک کن انکھیوں سے دھنو کا جائزہ لیتے ہوئے رجسٹر میں ہمارے فرضی نام درج کرنے لگا۔

جب وہ یہ کام کر چکا تو میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ کا شناختی کارڈ؟"

ہمارے پاس شناختی کاغذات کے نام پر ایک پرزہ بھی نہیں تھا مگر میں نے اس حوالے سے اپنے ذہن کو پوری طرح تیار کر رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ' یہاں اس قسم کی صورتِ حال پیش آ سکتی ہے۔

میں نے کہا "چند روز پہلے میری جیب پر کسی جیب کترے نے ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ وہ میرا پرس اڑا لے گیا۔ شناختی کارڈ پرس میں تھا۔"

"کوئی اور کارڈ؟" کلرک نے دھنو کو دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا "جس سے آپ کی شناخت ہو سکے۔"

"کوئی نہیں" میں نے مایوسی سے گردن ہلائی "تمام کارڈز وغیرہ اسی پرس میں تھے۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے دھنو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کا شناختی کارڈ تو ہو گا؟"

"اس کی عمر ابھی اٹھارہ سال نہیں ہوئی" میں نے جلدی سے کہا "اس لیے کارڈ ابھی بنا نہیں۔"

"تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی سائیں!"

اس مشکل کو کسی اور طریقے سے "آسان" نہیں بنایا جا سکتا؟" میں نے معنی خیز انداز سے کہا اور لفظ "آسان" پر خاصا زور ڈالا۔

وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا' دھیمے لہجے میں بولا "تین دن کے قیام کے لیے پانچ دن کے حساب سے کرایہ دینا ہو گا۔"

"منظور ہے" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "یقیناً یہ دو دن کا اضافی کرایہ تو تمہاری جیب میں جائے گا۔ ہوں؟"

وہ آنکھ دبا کر بولا "آپ تو خود سمجھ دار آدمی ہو!"

میں اس کی نیت کو سمجھ چکا تھا چناں چہ مزید دو دن کا کرایہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا "رجسٹر میں تو تم تین دن کا قیام ہی ظاہر کرو گے نا؟"

"جی سائیں۔"

"اور شناختی کارڈ والی "فارملیٹی" کو کس طرح پورا کرو

گے؟"

"یہ میرا کام ہے" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں اپنا کام بہت اچھے طریقے سے انجام دے لوں گا۔"

اپنے رجسٹر میں اندراج وغیرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے کمرے کی چابی ہمارے حوالے کی اور بہ نفسِ نفیس ہمیں ہمارے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ ہمیں کمرے کا معائنہ کروانے کے بعد اس نے کہا۔

"کسی بھی قسم کی کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے اشارہ کر دیں۔ آپ کا کام سمجھیں ہو گیا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا "اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں ضرور بتائیں گے۔"

وہ ایک مناسب سا "شکریہ" ادا کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔

میں نے کمرے کے اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ عام سے سائز کا ایک کمرہ تھا۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بیڈ بچھا ہوا تھا' دوسری دیوار کے ساتھ بیڈ کے سرہانے کی سمت ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ میز اور کرسیاں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں تاہم کرسیوں پر کشن اور میز پر میز پوش موجود تھا۔

کمرے کی تیسری دیوار میں باتھ روم تھا اور چوتھی دیوار میں وہ دروازہ تھا جہاں سے ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تھے۔ جس دیوار کے ساتھ کرسیاں اور میز رکھی تھی' وہاں ایک کھڑکی بھی تھی جس سے ہوٹل کی سامنے والی سڑک کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میر بخش کو میں بتا چکا تھا کہ ہوٹل میں ہم کون سے فرضی ناموں سے قیام کریں گے تاکہ اسے ہم تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ بھی میں نے میر بخش کو چند موٹی اور اہم باتیں اچھی طرح سمجھا دی تھیں۔

اس منحوس گاڑی کے ہچکولے دار سفر نے میرا ایک ایک جوڑ' توڑ کر رکھ دیا ہے" دھنو دھڑام سے ڈبل بیڈ پر گرتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنا سفری بیگ چوبی میز پر رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوگرز کے تسمے کھولنے لگا۔ دھنو کے جوگرز اس کے پاؤں میں موجود تھے۔ آرام دہ بستر دیکھتے ہی اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ خوب پھیل کر ڈبل بیڈ پر دراز ہو گئی تھی۔

میں نے جوگرز اپنے پاؤں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "دھنو! ہم گزشتہ دو تین روز سے مسلسل سفر میں ہیں اور سفر بھی ایسا تکلیف دہ اور اعصاب شکن کہ ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیں ایک پل بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر سیاہ گاڑی کے اندر ہمیں بے ہوش کرنے کے لیے مخصوص گیس استعمال کیا گیا۔ بے ہوشی کی اس کیفیت نے بھی تمہارے اعصاب کو توڑ پھوڑ دیا ہو گا۔ اب تو دل و دماغ میں صرف ایک خواہش ہو گی کہ کہیں' کسی آرام دہ اور سکون بخش بستر پر گر کر گھنٹوں کی گہری اور بھرپور نیند لی جائے۔۔۔"

"وجدان! تم نے میرے دل کی بات کہی ہے" دھنو نے کروٹ بدل کر اوندھے ہوتے ہوئے کہا "واقعی' میں اس وقت یہی سوچ رہی ہوں۔"

میں نے کہا "میرے خیالات بھی تم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن سونے سے پہلے ہمیں چند ضروری کام کرنا ہوں گے۔"

"کیا تم ہوٹل سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں" میں نے کہا۔ "رات کے وقت اس اجنبی جگہ پر مٹرگشت کرنا مناسب نہیں ہو گا۔"

"پھر کون سے ضروری کام کا تم تذکرہ کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو ہمیں خوب اچھی طرح نہا دھو کر لباس تبدیل کرنا چاہیے' اس کے بعد کھانا کھانا چاہیے۔ سونے کا نمبر اس کے بعد آئے گا۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے سفری بیگ کھول لیا۔ اس بیگ میں ہمارے "نائٹ ڈریس" کے علاوہ چند جوڑی دوسرے کپڑے تھے۔ دھنو کی ایک بنارسی ساڑی بھی تھی جس کا رنگ نہایت ہی تیز اور چیختا ہوا سا تھا اور وہ رنگ تھا۔۔۔۔ نارنجی!

میں نے بیگ میں سے دھنو کا نائٹ گاؤن اور اپنا سلیپنگ سوٹ نکال کر بستر پر ڈال دیا۔ باتھ روم میں استعمال کے لیے مخصوص چپل باتھ روم کے اندر موجود تھی۔ دھنو خاموشی سے میری یہ کارروائی دیکھتی رہی۔ جب میں نے اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کی جانب دیکھا تو اس نے کہا۔

"وجدان! میں غسل کر کے گاؤن پہن لیتی ہوں مگر کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"وہ کیوں بھئی؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

جب میں نے سہ پہر میں "میر بخش اینڈ کمپنی" پر قابو پایا تھا تو گاڑی میں موجود ٹھنڈے پانی اور تازہ پھلوں سے لذتِ کام و دہن کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے اور دھنو نے سیب سنگترے اور انگور ڈٹ کر کھائے تھے۔ میں نے سوچا' ممکن ہے ابھی دھنو کو بھوک نہ لگی ہو اس لیے وہ کھانے سے انکار

کر رہی ہو۔

اس نے میرے سوال کا جواب دیا "دراصل' بدھ مت کے پیروکار سہ پہر کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔"

"یہ عجیب بات بتائی تم نے" میں نے کہا "وہاں سے پور میں تو تم شام تک بلکہ رات گئے تک کھانا پینا جاری رکھتی تھیں؟"

"وہ سب میں نے اپنے میزبانوں کی خوشی کی خاطر کیا تھا" اس نے بتایا "میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ مجھے عجیب نظر سے دیکھیں۔ وہاں ایک مجبوری تھی۔ تمہارے سامنے نہ تو کوئی مجبوری ہے اور نہ ہی تم سے کسی قسم کا پردہ ہے اس لیے میں نے سوچا ہے آج کے بعد لارڈ بڈھا کی تعلیم کا خیال رکھوں گی۔"

میں نے کہا "کھانے پینے کے حوالے سے میں نے یہ بات آج پہلی مرتبہ تمہاری زبان سے سنی ہے ورنہ میں نے بت سے بدھ مت لوگوں کو اس کی پابندی کرتے نہیں دیکھا۔"

"ہاں' یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو" وہ بولی "دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو' جہاں اس کی پیروی کرنے والے نظر آتے ہیں وہیں اس مذہب کے ماننے والے کچھ ایسے افراد بھی ملیں گے جو اس کے اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہوں گے۔"

میں نے تائیدی انداز میں کہا "تمہاری بات میں وزن ہے دھنو۔ میرا مشاہدہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ چلو' آج تم میرا ساتھ دینے کے لیے کھانا کھا لو۔ کل صبح سے تم اپنا پسندیدہ معمول اپنا لینا۔"

وہ میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے نائٹ گاؤن لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ میں نے روم سروس سے کہہ کر کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا۔ دھنو کے بعد میں نے باتھ لیا پھر ہم دونوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ مجھے تو بہت زور کی بھوک لگی تھی۔ دھنو میرا ساتھ دینے بیٹھی تھی لیکن میری خوشی کی خاطر وہ بھی اچھا خاصا کھا گئی۔

کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور باتیں کرنے لگے۔ ہماری گفتگو میں غالب حصہ سیاہ گاڑی میں ہمارے اغوا سے متعلق تھا۔ دھنو نے کہا۔ "وجدان! مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ وہ سب کچھ ہمارے ساتھ پیش آ چکا ہے۔"

"ہاں' بعض واقعات کا بڑی مشکل سے یقین آتا ہے" میں نے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے' میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "دھنو! زندگی میں بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو خواب جیسی لگتی ہیں اور بعض خواب حقیقت کا روپ دھار کر ہمیں گھیرے رہتے ہیں۔"

میں اس وقت چوبی کرسی پر بیٹھا تھا اور دونوں ٹانگیں میں نے بستر پر سیدھی رکھی ہوئی تھیں۔ دھنو ٹیک لگائے بستر پر نیم دراز تھی۔ وہ اچانک سیدھی ہوئی اور میرے پاؤں چھوتے ہوئے بولی۔

"لاؤ' میں تمہارے پاؤں دبا دوں۔ تم تھک گئے ہو گے۔"

میں نے ایک جھٹکے سے پاؤں کھینچ لیے اور کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"بتایا تو ہے' تمہارے پاؤں دبانا چاہتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"تم نے تپتے صحرا میں خوب "مارا ماری" کی ہے" وہ لگاوٹ سے بولی "یقیناً تم بہت تھک گئے ہو گے۔"

میں نے کہا "رات بھر گہری نیند لوں گا تو ساری تھکاوٹ اتر جائے گی۔"

وہ سمجھ گئی کہ میں اس سے ہرگز ہرگز پاؤں نہیں دبواؤں گا۔ سنجیدگی سے بولی۔ "تم رات بھر گہری نیند کس طرح سو سکو گے وجدان!"

"کیوں؟" میں نے الجھی ہوئی نظر سے اسے دیکھا "کیا تم مجھے جگائے رکھنا چاہتی ہو۔"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی "میں کیا جگاؤں گی۔ ایک تہائی رات تو گزر گئی" پھر اس نے وال کلاک کی جانب اشارہ کیا جہاں رات کے دس بج رہے تھے "دو تہائی رات باقی ہے اور تمہاری گفتگو کی جولانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی دور دور تک تمہارے سونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس صورت میں تم رات بھر گہری نیند کیسے سو گے؟"

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا "ہاں' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے واقعی ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم سونا چاہو تو سو جاؤ۔"

"نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی" وہ شوخی سے بولی "حالاں کہ کمرے میں پہنچتے ہی تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ شاید یہ نہانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک وجہ یہ چائے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم نے جو چائے پی ہے وہ خاصی اسٹرانگ تھی۔"

میں نے کہا "نہانے سے پہلے میں بھی سونے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ چلو کوئی بات نہیں' اگر

غسل اور اسٹرانگ چائے نے ہمیں ہشاش بشاش اور "فریش" کردیا ہے تو جی بھر کر باتیں کرتے ہیں۔ صبح دیر تک سو کر نیند پوری کرلیں گے۔"

دھنو کو یہ تجویز پسند آئی پھر ہمارے درمیان ہمیں پیش آمدہ تازہ ترین حالات کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

دھنو نے کہا۔ "میں سمجھ رہی ہو وجدان! تم نے اس علاقے میں قیام کا فیصلہ کیوں کیا ہے!"

"اگر خود ہی سمجھ رہی ہو تو اچھی بات ہے" میں نے کہا۔

"میں تمہیں سمجھانے کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ سب بہت ضروری ہے وجدان؟"

میں جانتا تھا' دھنو بدھ مت تھی۔ اس مذہب میں لڑائی بھڑائی کی سختی سے ممانعت کی جاتی ہے۔ کسی بھی جان دار کو مارنا گناہ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ بعض بدھ بھکشو تو راستہ چلتے ہوئے اپنی راہ کو جھاڑو غیرہ سے صاف کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ کوئی چیونٹی ان کے پاؤں کے نیچے آکر جان نہ گنوا بیٹھے۔ میں دھنو کے مسئلے کو بڑی گہرائی تک سمجھ رہا تھا مگر میری زندگی کی اپنی ایک روش تھی' اپنا ایک مزاج تھا جس میں کسی حتمی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے کہا "دھنو! تم نے اب تک میرے ساتھ رہتے ہوئے یہ جان لیا ہوگا کہ میری زندگی کس ڈھب پر گزر رہی ہے۔ اب تک تو تمہیں ان باتوں کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔"

"میں کوشش تو کرتی رہتی ہوں مگر۔۔۔" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا "بس یہ کوشش جاری رکھو۔ انشاءاللہ ایک نہ ایک دن کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "دھنو! ہر شخص اپنے مذہب' اپنے عقیدے سے مجبور ہوتا ہے۔ میں تمہاری مجبوری کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن درحقیقت حالات اور دنیا سے نظر چرانے کے مترادف ہے۔ اس دنیا اور دنیا میں بسنے والے لوگوں کی "ڈیمانڈ" کو دیکھنا پڑتا ہے' حالات اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑتا ہے اس لیے انسان اتنا نرم دل بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ کبھی نرم' کبھی گرم۔۔۔ ہر رنگ اور انداز کو اپنانا پڑتا ہے۔ یہ تو اپنی بقا کی جنگ ہے۔ اگر آپ کسی موذی کی سرکوبی نہیں کریں گے تو وہ آپ کو شدید ترین نقصان پہنچائے گا۔ میں نے شاؤلن ٹیمپل میں اور باہر بھی بہت سے بدھ بھکشوؤں کو مارشل آرٹس کی تربیت لیتے ہوئے اور ان فنون کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ "مارشل آرٹس" کیا چیز ہے؟"

میں سانس لینے کے لیے دو پل رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مارشل آرٹس کا سیدھا سیدھا اور واضح مطلب ہے۔۔۔ "جنگی فنون یا فنونِ جنگ"۔ جانتی ہو' جنگ کیا ہوتی ہے اور اس جنگ میں کیا ہوتا ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دھنو کو دیکھا اور کہا "جنگ دو فریقوں کے درمیان ہونے والی "مار دھاڑ" ہوتی ہے جس میں انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص کی جان لیتا ہے۔ اس جنگ میں جو شخص حق پر ہوتا ہے اس کے فعل (جنگ) کو سراہا جاتا ہے اور جو شخص ناحق لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد کرتا ہے اس کے فعل (جنگ) کی مذمت کی جاتی ہے۔ ذرا غور کریں' دونوں فریق ایک ہی عمل (جنگ) سے گزر رہے ہوتے ہیں مگر دونوں کے بارے میں الگ الگ تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جنگ کرنا بری بات نہیں بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ نے وہ جنگ کس "نیت" سے کی' کسی دوسرے انسان پر ہتھیار کس مقصد سے اٹھایا اور اپنے ہی جیسے کسی انسان کی جان کن حالات میں لی؟"

وہ ایک جذب کے عالم میں مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں نے مزید کہا "بھئی! میرے نزدیک تو سب سے اہم شے "نیت" ہے۔ میں تمہارے مذہب اور عقیدے کے حوالے سے کوئی بحث و مباحثہ یا مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا نقطہ نظر میں نے تم پر واضح کر دیا ہے۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو تمہیں ان سب باتوں کی عادت ڈالنا ہوگی اور۔۔۔ تم خود بھی تو مارشل آرٹس سیکھنے کی خواہاں ہو۔۔۔؟"

"وہ تو میں خود حفاظتی کی خاطر سیکھنا چاہتی ہوں" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

پھر ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ حائل ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "وجدان! ہم بھی جانے کس قسم کی باتوں میں الجھ گئے۔ تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ۔ میں تمہارے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ جو مجھے نہیں معلوم' وہ آج تم مجھے بتاؤ گے۔"

اس کی فرمائش پوری کرنے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہ آئی چنانچہ میں اسے اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کرنے لگا۔ اسی قصے کہانی میں رات کے بارہ بج گئے۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے اور نیند کے خمار سے

بوجھل ہونے لگیں۔

اب مزید جاگتے رہنا اپنی جان اور صحت کے ساتھ عظیم ناانصافی کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا سو جانا ہم پر فرضِ اولین کی طرح عائد ہو گیا تھا۔

میں نے ایک تکیہ اور کمبل نما چادر اٹھا کر چوبی میز کی جانب جاتے ہوئے کہا "دھنو تم آرام سے پھیل کر بستر پر سو جاؤ۔ میں اس میز پر سو جاؤں گا۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی پھر بولی "تم ادھر بستر پر کیوں نہیں سوؤ گے؟"

"بس' تم اکیلی ہی سو جاؤ" میں نے مبہم سا جواب دیا۔

اس نے پوچھا "مجھ سے ناراض ہو۔"

"نہیں' تم سے خفا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے" اس نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا "کیا کسی خاص مقصد کے تحت بستر پر سونا نہیں چاہتے؟"

"ہاں' کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"وہ بات مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے' تم جان کر کیا کرو گی" میں نے کہا۔

وہ بولی "میں نے پوچھا' کسی خاص مقصد کے تحت بستر پر سونا نہیں چاہتے تو تم نے "ہاں" میں جواب دیا۔ اب خود ہی کہہ رہے ہو' کوئی خاص یا اہم بات نہیں ہے۔

وجدان! کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں جو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو!"

میں دھنو کو نیلگری کے "ممبینسر عزائم" کے بارے میں کیا بتاتا! دھنو کیا' میں اس سلسلے میں کسی سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمالیہ کی پراسرار شکتی ایک عجیب و غریب اور رنگین و سنگین چیلنج نما وارننگ دے کر مجھے ایک کڑے امتحان میں ڈال گئی تھی۔ دھنو چوں کہ "تلکو جھیل" والے مشن میں میرے ہم راہ تھی اور "گومپو" کی بدھ عبادت گاہ میں میری سرگرمیوں سے بھی کسی حد تک واقف تھی اس لیے وہ نیلگری کے بارے میں ابتدائی معلومات تو رکھتی تھی مگر اس سلسلے میں وہ خطرناک حد تک نہیں جانتی تھی۔

میں نے دھنو کے شکوے کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم خواہ مخواہ کسی وہم میں نہ پڑو۔ میرا بستر پر نہ سونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ تم اپنے ذہن کو پریشان کرتی پھرو۔"

وہ بولی "ٹھیک ہے' میں اس سلسلے میں اب تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی لیکن اگر تم اس چوبی میز پر بے سکونی کی نیند سوؤ گے تو میں اس آرام دہ بستر پر بے فکری سے نہیں سو سکوں گی۔ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے' اس صورتِ حال میں مجھے نیند ہی نہیں آئے گی۔

میں ہرگز بے سکونی میں نہیں رہوں گا" میں نے کہا "میری تربیت اور عملی زندگی بڑے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے۔ بنکاک میں مہاراج ونگ وانگ پائے کے جمنازیم میں' میں چٹائی بستر پر سوتا رہا ہوں۔ "چٹائی بستر" کا مطلب جانتی ہو؟" وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے خود ہی وضاحت کر دی "پتھر کا ننگا فرش اور پتھر ہی کا تکیہ۔ بس یہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ میں تو دو کرسیاں جوڑ کر بھی ان پر مزے کی نیند سو سکتا ہو' میز تو پھر بھی کافی کشادہ ہے۔"

اس نے سمجھ لیا کہ میں نے جو سوچ رکھا ہے اس پر عمل کر کے رہوں گا چنانچہ عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے میز کے ایک سرے پر تکیہ جمایا اور کمبل اوڑھ کر ٹانگیں پھیلا لیں پھر دھنو کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا' وہ بزدل یا ڈرپوک نہیں تھی۔ اس نے میرے ساتھ رہتے ہوئے بارہا بہادری اور جرات مندی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ لڑائی بھڑائی اور خون ریزی کے خلاف تھی اور اس بنیادی سوچ کی وجہ اس کا مذہب تھا۔ بدھ مت میں کسی زندہ چیز کی جان لینا یا اسے ضرر شدید پہنچانا کسی بھی طور جائز نہیں سمجھا جاتا۔ گوتم بدھ برائی کے بدلے میں بھی بھلائی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ایک رقیق القلب اور ہم درد دل رکھنے والا انسان تھا۔ ظلم' ناانصافی اور تشدد کے خلاف تھا۔ نروان کی تلاش میں گوتم نے تخت و تاج کو پائے حقارت سے ٹھوکر مار دی تھی۔

وہ کپل وستو کے راجا کا بیٹا تھا۔ راج کمار گوتم اگر محل میں رہتا تو اس کی زندگی عیش و آرام سے گزرتی۔ وہ جب تک محل میں رہا' ایسا ہوا بھی۔ مگر جب اس نے محل سے باہر کی تلخ' پر مصائب اور سفاک دنیا کا نظارہ کیا تو اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ اس نے محل کے عیش و سکون کو ٹھوکر ماری اور "سچائی" کی تلاش میں' جنگلوں میں نکل گیا اور اس نے اپنی مطلوبہ سچائی کو پا لیا۔ "سدھارتھ گوتم بدھ" اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی زندگی دکھوں اور برائیوں سے عبارت ہے۔ ان مصیبتوں اور برائیوں کا سرچشمہ انسان کی "خواہش" ہے۔ انسان کو اگر معلوم ہو جائے کہ کون سی "خواہش" نیک ہے تو وہ برائیوں اور مصیبتوں سے بچ سکتا ہے۔۔۔ اور نیک "خواہش" تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسے آٹھ چیزوں

کو اختیار کرنا چاہیے۔ نیک خیالات ' نیک ارادہ' نیک گفتاری' نیک چلن' نیک معاش' نیک عمل ' نیک علم اور نیک تسکین۔ ایسی تسکین۔ جو دھیان گیان' مراقبے اور تصور سے حاصل ہو اور اپنے اندر بے خودی اور مسرت کا لازوال خزانہ رکھتی ہو۔

گوتم بدھ ایک "عارف" تھا۔ یعنی سیدھا راستہ تلاش کرنے والا۔ ہندی زبان میں اسے "سدھارتھ" کہا جاتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں انسانیت اور انسان کی بھلائی پوشیدہ ہے مگر وہ انسانی فطرت کے عین مطابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ بدھ مت کا آغاز ہندوستان کے شہر بنارس سے سو میل شمال میں واقع ایک قصبے سے ہوا مگر اب یہ ہندوستان میں ناپید ہو چکا ہے البتہ' سری لنکا' تھائی لینڈ' کوریا' جاپان' چائنا' منگولیا اور تبت و نیپال میں اس مذہب کے پیروکار موجود ہیں۔

اس تناظر میں دھنو کی ذہنی کیفیت اور دلی احوال کو بہ خوبی سمجھا جا سکتا تھا کیوں کہ بنیاد طور پر وہ بہرحال "گوتم بدھا" کی پیروکار تھی۔

پھر میرا ذہن موجودہ حالات کی طرف چلا گیا۔ میں اپنے اس "طلب گار" کے بارے میں سوچنے لگا جو ڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر مہمان بن کر آیا ہے اور وڈیرے سے اس کا دوستی کا رشتہ ہے۔ یہی سب سوچتے ہوئے جانے کس وقت میں نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دھنو بستر پر موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کی تلاش میں کمرے میں نگاہ دوڑائی تو وہ مجھے اپنے بہت قریب دکھائی دے گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔

دھنو میز کے قریب ہی' پائنتی کی جانب ایک کرسی پر بیٹھی اس طرح سو رہی تھی کہ اس کا سر میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں میرے پاؤں کے اوپر بھی آگئی تھیں۔ وہ اس وقت گہری نیند میں نظر آ رہی تھی۔ جانے کس وقت وہ بستر سے اٹھ کر میرے نزدیک آگئی تھی!

اس کے چہرے پر معصومیت پوری طرح کھلی ہوئی تھی۔ میں نے بہ آہستگی اپنے پاؤں کو سر کا گرد دھنو کی زلفوں کے لمس سے آزاد کیا۔ میں اس کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم وہ جس بے ڈھنگے انداز میں سو رہی تھی وہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اسے جگا کر کہوں' جاؤ بستر پر سو جاؤ۔ پھر میں نے سوچا' یہ تو اس کی نیند توڑنے کے مترادف ہوگا۔

میں چند لمحوں تک شش و پنج میں رہا پھر ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے دھنو کو کرسی سے اٹھا کر بستر پر لٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ سوچتے ہی میں نے کھنکھارے بغیر خود کو سمیٹا اور بڑی احتیاط سے میز کے اوپر سے نیچے اتر آیا۔ پھر میں نے دھنو کو کسی نازک آبگینے کے مانند اپنے بازوؤں میں محفوظ کر کے نرم و گداز بستر پر پہنچا دیا۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ دھنو کی کھلی ہوئی آنکھوں کے پیچھے مجھے نیلگری مسکراتی نظر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہوں "وجدان مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟ میں تو آخری سانس تک تمہارے تعاقب میں رہوں گی۔"

میں نے زور سے سر کو جھٹک دیا۔ دھنو نے بوجھل آواز میں پوچھا "کیا ہوا وجدان؟"

"کچھ نہیں" میں بوکھلا گیا پھر کہا "تمہیں کیا ہوا تھا۔ تم اچھا خاصا بستر چھوڑ کر وہاں کرسی پر کیوں سو گئی تھیں؟"

وہ ناسودہ جماہی لیتے ہوئے بولی "مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو اس کرسی پر جا بیٹھی پھر پتا نہیں' کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔"

"چلو' اب سو جاؤ" میں نے کہا۔

"میں بستر پر اکیلی نہیں سو سکوں گی وجدان۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا "کس بات کا ڈر لگ رہا ہے' کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔ کمرے میں ایسی تو کوئی شے مجھے نظر نہیں آ رہی!"

"میں نے اپنے ڈر اور خوف کو بیان نہیں کر پا رہی ہوں" وہ عجیب سے' الجھن زدہ انداز میں بولی "تم بھی وہاں میز پر جا کر سو گئے تھے اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

میں نے سوچا' دھنو کو سلانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو قربانی دینا ہی پڑے گی۔ میں نے اس مصلحت کے تحت کہا "میں اب یہیں بستر کے ایک کونے پر موجود رہوں گا۔ تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔"

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے بستر کی پائنتی پشت گاہ کے ساتھ تکیہ کھڑا کر کے ٹیک لگائی اور نیم دراز ہو گیا پھر میں نے جاگتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر میں نے محسوس کیا کہ اس کا سونے کا ارادہ نظر نہیں آتا۔ وہ بار بار اپنے سر کو چھونے لگتی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر کہا "اب کیا ہے؟"

"اب ڈر تو نہیں لگ رہا" وہ اپنی فطری معصومیت سے بولی "لیکن ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"کون سا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے بھئی؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "میرے سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔"

اس وقت ہمارے پاس اسپرین یا کوئی بھی درد کش دوا موجود نہیں تھی اور رات کے اس پہر باہر سے منگوانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ میں نے دھنو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا سر دبا دیتا ہوں' کوئی دوا وغیرہ تو ہے نہیں۔"

"تم وہ کیوں نہیں کرتے!" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ..... وہ جو تم نے میرے ٹخنے پر کیا تھا" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"کیا 'چی' کی قوت سے سر کے درد میں افاقہ نہیں ہو سکتا؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا" میں نے کہا "لاؤ اپنا سر' میں کچھ کرتا ہوں۔"

پھر میں اٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دھڑام سے اس نے اپنا سر میرے پیٹ پر رکھ دیا۔

میں نے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا "دھنو! یہ کیا کر رہی ہو؟"

"جو تم نے کہا' وہی کر رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک اٹھا۔

"تم نے کہا' لاؤ اپنا سر۔ میں اپنا سر لے آئی۔"

دھنو کی وضاحت پر میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں نے ہتھیار ڈال دیے' پھر اس کے دردِ سر رفع کرنے کے لیے کا کل افشانی کرنے لگا۔ اپنے بدن کی پراسرار حرارت کو اس کے تن میں اتارنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ پرسکون ہو کر آسودگی کی نیند میں ڈوب گئی۔

○☆○

آئندہ روز ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا۔

گزشتہ رات ہم دیر سے سوئے تھے لہٰذا صبح تاخیر سے آنکھ کھلی۔ اس وقت دیوار گیر گھڑی نو بجا رہی تھی۔ گھنٹوں کے حساب سے نیند کے لیے ہمیں مناسب وقت مل گیا تھا اس لیے جب ہم بیدار ہوئے تو ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ غسل نے پوری کر دی۔

ہم نے باری باری ایک طویل باتھ لیا پھر ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد تیار ہو کر ہوٹل سے نکل آئے۔ اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ذرا گھوم پھر کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہتے تھے تاکہ اس اجنبی ماحول سے کچھ مانوسیت پیدا ہو جائے۔ ہم اس ارادے سے باہر نکلے تھے کہ دوپہر کا کھانا کھا کر ہی لوٹیں گے۔ ویسے ہم ہوٹل سے زیادہ دور جانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے کیوں کہ میر بخش کی آمد کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔

دھنو نے نارنجی رنگ کی بنارسی ساڑی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ہیل والی سینڈل تھی۔ میں ڈریس پینٹ اور دھاری دار شرٹ میں ملبوس تھا' پاؤں میں وہی جوگرز تھے۔ دھنو چوں کہ ساڑی کے ساتھ جوگرز استعمال نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے سینڈل پہن لی تھی۔

دھنو کو کسی میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ قدرت نے بڑی فرصت اور فراغت میں اسے بنایا تھا۔ حسن و جوانی کا خزانہ عنایت کرتے ہوئے بھی دست قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس کی ہرنی ایسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کسی کاجل کی محتاج نہیں تھیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو شرمانے والے نازک و گداز ہونٹ قدرتی سرخی سے مزین تھے۔ اس کے سڈول بدن اور طویل قامت پر سج کر ہر لباس اپنی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کی معصوم صورت میں چھپی شوخی اور شرارت ماحول میں زندگی بھر دیتی تھی اور اس کی مترنم آواز روح میں سرمستی گھول دیتی تھی۔

ہم ٹہلتے ہوئے بس اسٹینڈ کی جانب نکل گئے۔ تھوڑی دیر تک بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے پھر نزدیک ہی ایک معقول سے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑے۔

جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا وہاں موجود ہر شخص گردن گھما کر دھنو کو دیکھ رہا تھا۔ راستے بھر میں یہی کیفیت رہی تھی۔ دھنو تھی ہی ایک قابل دید لڑکی۔ وہ ایک ایسا دل خوش کن نظارہ تھی جو دیکھنے والوں کی نظر کو ساکت اور قدموں کو جامد کر دیتا تھا۔

واپسی کے سفر میں مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی ہمارے

تعاقب میں ہو۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا تاہم میرا یہ احساس خالی از علت نہیں تھا۔ جلد ہی ثابت ہو گیا کہ میری چھٹی حس نے مجھے مس گائیڈ نہیں کیا تھا۔

ایک کھلی جیپ دائیں پہلو سے گزر کر ہمارے سامنے سڑک پر رک گئی۔ بریک کی تیز آواز پر ہم نے چونک کر جیپ کی طرف دیکھا۔ جیپ میں تین افراد سوار تھے۔ شکل و صورت سے وہ تینوں چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا ان میں ایک یامین عرف یامی شاہ نامی غنڈا تھا' باقی دونوں اس کے چمچے تھے۔ یامی شاہ جیپ کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈرائیونگ کے فرائض اللہ دتا انجام دے رہا تھا جب کہ پچھلی سیٹ پر براجمان گن بردار شخص کا نام غلام رسول تھا۔

جیپ چوں کہ اچانک روک دی گئی تھی اس لیے ہمارے دو قدم تسلسل میں اسی جانب اٹھ گئے اور ہم عین اس کے قریب پہنچ گئے۔ ہم دونوں پہلو بہ پہلو اس طرح چل رہے تھے کہ دھنو سڑک والی سائڈ پر تھی۔

جیپ میں بیٹھے ہوئے غنڈے یامی شاہ نے ہوس زدہ نظر سے دھنو کو سر تا پا گھورا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! پیدل کیوں چل رہے ہو۔ خود تھک رہے ہو اور ساتھ اس لڑکی کو بھی تھکا رہے ہو۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ' ہم چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "بہت شکریہ' ہم خود ہی چلے جائیں گے۔"

"نہ بابا' اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے" یامی شاہ اپنی مونچھوں پر انگشتِ شہادت سے مساج کرتے ہوئے بولا "ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کو کہاں جانا ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے جہاں بھی جانا ہے' چلے جائیں گے۔"

یامی شاہ نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ وہ اپنی تجربہ کار نگاہ سے مجھے ناپنے تولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگت والا ایک پستہ قامت شخص تھا۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم اور چہرے پر خباثت' آنکھوں میں کینگی جھلکتی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع اور انداز سے بھی لڑائی بھڑائی کا شوقین لگتا تھا۔ مجھے ان کے تماش کا تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا تاہم ناموں کے بارے میں بعد میں پتا چلا تھا۔

یامی شاہ جب میرا جائزہ لے چکا تو بولا "اس علاقے کے نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"میں تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا" میں اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے' بابا تم ہمیں جانتے نہیں ہو؟"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔"

"بڑی گرمی ہے تمہارے اندر!" یامی شاہ نے مو نظر سے مجھے دیکھا' پھر دھنو کو تکتے ہوئے بولا "یہ کیوں ٹھار کھڑی ہے سائیں؟"

اس کے ساتھ ہی یامی شاہ نے ایک ایسی حرکت کی پر میں ردِعمل ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنی بات کرتے ہی دھنو کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

میں پھرتی سے آگے بڑھا اور یامی شاہ کے بازو کو سے پکڑ لیا' منہ سے ایک لفظ ادا کیے بغیر میں نے اس کی کو اپنے ہاتھ کی جکڑ میں دبانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ میں چیلنج کرنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں جھا لگا۔

میرے زور لگانے کے جواب میں وہ بھی زور آزما کرنے لگا جس کے نتیجے میں دھنو کا بازو دبنے لگا۔ میں نے کو تکلیف سے بچانے اور یامی شاہ کو تکلیف میں مبتلا کی خاطر ایک فوری ایکشن لیا۔ میں نے یامی شاہ کو چھوڑتے ہوئے' اسی ہاتھ کا ایک میڈیم پنچ اس کے منہ دیا۔

دھنو کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ڈرائیور سے جا ٹکرایا۔ اس کے چہرے پر مجھے تکلیف آثار نظر آئے۔ یامی شاہ نے اپنے ہاتھ سے فوراً چہ دیکھا اور جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا بالائی پھٹ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے ہونٹ کو صاف کیا پھر ایک مخصوص انداز میں ڈرائیو دتا کی طرف دیکھا۔

اللہ دتا ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر جیپ سے باہر دھنو نے جب صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کیا تو میرا دباتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں بولا "وجدان! جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ خواہ مخواہ کسی پھڈے پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ تو اب آسانی سے نہیں جان چھوڑیں گے" دھنو کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا "ان تیور میرے ہاتھ پاؤں میں سنسنی دوڑا رہے ہیں۔ انہیں شرافت کا ابتدائی قاعدہ پڑھانا ہی پڑے گا۔"

میری بات ابھی ختم ہوئی تھی نہیں تھی کہ اللہ دتا

نے غنڈے نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں آگے بڑھ کر' اپنے گھونسے سے میرے چہرے کا نشانہ لینے کی کوشش کی تھی۔

میں نے کمر کی لچک کا استعمال کرتے ہوئے اپنے چہرے کو انتہائی پیچھے ہٹا لیا۔ ردِعمل کے طور پر وہ اپنی ہی جھونک میں سیدھا مجھ پر آ رہا۔ میں اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ میں نے پہلو میں سرکتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

نتائج حسبِ توقع برآمد ہوئے۔ اللہ دتا منہ کے بل' ابراتا ہوا جیپ کے بونٹ سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی جس کی صدا نے یامی شاہ کو جیپ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اس دوران میں اللہ دتا اپنے چہرے کو ٹٹولتا ہوا سیدھا ہو چکا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا اور بڑے جوش و خروش سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کے پیٹ میں ایک نپی تلی سائڈ کک جڑ دی۔ وہ اچھل کر پیچھے کی جانب گیا اور یامی شاہ سے ٹکرا گیا۔

یامی شاہ نے جھنجلاہٹ کے عالم میں اللہ دتا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا پھر خوں خوار انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام نما نفرت کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہماری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے لہٰذا اس تماشے کو ختم کرو' اور ہمیں جانے دو۔"

"دشمنی تو اب پیدا ہو گئی ہے بابا" وہ تیز نظر سے مجھے گھور رہا تھا "یہ تماشا آسانی سے ختم نہیں ہو گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" میں نے اس کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ دھنو کی جانب جو میری پشت پر کھڑی تھی' اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"کیوں' کیا یہ تمہاری بچھڑی ہوئی کوئی رشتے دار ہے جس کی تلاش میں تم دربدر کی خاک چھانتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو یا پھر تم نے اچانک اسے بہن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

وہ میرے لہجے کی کاٹ سے تلملا کر رہ گیا' بولا "لگتا ہے' تمہیں شرافت کا مظاہرہ تم کر رہے ہو اس کی دل کھول کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

ہونٹ خاصا متورم ہو چکا تھا مگر ذہن کی خباثت اور آنکھوں کی بے حیائی میں فرق نہیں آیا تھا۔

میں نے کہا "تمہارا یہ ناپاک خواب تو مرنے کے بعد بھی پورا نہیں ہو گا۔"

"مرو گے تم!" وہ سلگ اٹھا۔ اور یہیں سب کے سامنے مرو گے۔"

وہ ایک چلتی ہوئی سڑک تھی۔ ہمیں آپس میں الجھتے ہوئے دیکھ کر بہت سے افراد رک گئے تھے اور دلچسپی سے "تماشا" دیکھ رہے تھے۔ تاہم ان کے "موڈ" سے لگتا تھا کہ اگر وہاں کوئی واقعی مر مرا گیا تو بھی وہ مداخلت یا بیچ بچاؤ نہیں کریں گے۔

میں نے اتمامِ حجت کے طور پر یامی شاہ سے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ اگر ایک مرتبہ یہ میدان جم گیا تو پھر سراسر نقصان ہی ہو گا!"

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اچھل کر آگے بڑھا اور اپنے بازوؤں کے حلقے میں مجھے جکڑ لیا۔ اس کے بازوؤں میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی جس کا وہ بھرپور استعمال بھی کر رہا تھا۔ میں اس کے اس فوری عمل کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اس کے دام میں آ گیا۔ اب "جواب" لازم ہو گیا تھا۔ یامی شاہ کی غنڈا گردی زبانی کلامی قابو میں آنے والی نہیں تھی۔

میرے دونوں بازو' اس کی بانہوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور وہ اپنے بدن کی پوری قوت سے میرا کچومر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے خاصا کم تھا اس لیے اس کی زور آزمائی کا نشانہ صرف اور صرف میرا پیٹ ہی بن رہا تھا۔ میں نے سڑک چھاپ غنڈوں سے نمٹتے ہوئے حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ کوئی خطرناک "ٹیک" کیے بغیر ہی کام چلایا جائے اس صورت میں' میں "سیلف ڈیفنس" اور "جوڈو" وغیرہ کی ٹیکنیک کا زیادہ استعمال کرتا تھا۔ یہاں بھی میں نے یہی حکمتِ عملی اپنا رکھی تھی۔

میں نے فوراً اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا' نتیجے میں یامی کی گرفت میرے بازوؤں پر کم زور ہو گئی۔ میں ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اٹھک بیٹھک میں نے بجلی کی سی سرعت سے لگائی تھی اور یامی کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ وہ حیران نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت کو دو چند کرنے کے لیے اس کے پھیلے ہوئے چٹانی سینے پر "ہینڈ پش" کا بوسہ دیا۔ یہ ایک اوپن ڈبل ہینڈ پش تھا جس کی حقیقت کو صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو اسے استعمال میں

لاتے ہوں یا پھر وہ لوگ جنہوں نے اس کا "مزہ" چکھا ہو!

یامی شاہ کے قدم اکھڑ گئے اور وہ چار فٹ پیچھے سڑک کے عین بیچ میں جا گرا۔ اس دلت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کا غضب آسمان کو چھونے لگا۔ وہ اپنے لباس کو سنبھالتے ہوئے اٹھا اور پھنکار کر میری جانب بڑھا۔

اس نے کسی ارنا بھینسے کی طرح اپنے سر سے ایک زور دار ٹکر میرے پیٹ میں رسید کرنا چاہی' میں اپنے قدموں پر فضا میں اچھلا اور چھے فٹ کی بلندی کو چھو کر واپس زمین پر آگیا۔ اس دوران میں یامی شاہ میرے نیچے سے گزر کر اپنی جیپ کو "سلامی" دے چکا تھا۔ ٹکر مارتے ہوئے اس کا چہرہ چوں کہ زمین کی طرف جھکا ہوا تھا اس لیے اپنی جھونک میں اس کی کھوپڑی ایک زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے جیپ سے ٹکرائی تھی۔

چوٹ کھا کر یامی شاہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی مانند ڈکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ اپنے "گرو" کی یہ "عزت" افزائی اس کے چیلوں سے دیکھی نہ گئی اور وہ وفاداری کے جوش میں مجھ پر پل پڑے۔

ڈرائیور اللہ دتا میرے ہاتھوں پہلے ہی خاصی ہزیمت اٹھا چکا تھا لیکن یامی شاہ کا حق نمک ادا کرنا بھی ضروری تھا تاہم وہ غلام رسول سے چند قدم پیچھے تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے قریب آنے سے کترا رہا تھا۔

غلام رسول نے کلاشنکوف کو نال کی جانب سے تھام کر کسی لٹھ کی طرح اسے میرے سر پر آزمانا چاہا۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔ میں نے بائیں بازو سے "فیس بلاکنگ" کی میرے بازو کا بیرونی حصہ غلام رسول کی کلائیوں سے ٹکرایا اور کلاشنکوف میرے سر کو چھونے سے پہلے ہی اس طرح ہوا میں معلق ہو گئی جیسے کسی جادوئی بٹن کے ذریعے اسے رکنے کے احکام مل گئے ہوں۔

میں بلاکنگ کی خاطر ایک اسٹیپ اندر آچکا تھا چناں چہ بلاکنگ کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے ایک دھواں دھار گھونسا غلام رسول کی ناک پر رسید کر دیا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے دھنو کے قدموں میں جا گری۔

دھنو نے پہلی فرصت میں اس مہلک ہتھیار پر قبضہ کر لیا تاہم میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر واضح کر دیا کہ وہ ہلاکت خیز آتشیں ہتھیار کو استعمال کر کے کسی حماقت کا ثبوت دینے کی کوشش نہ کرے۔ ان مقامی غنڈوں کے لیے تو خالی ہاتھ پاؤں ہی کافی تھے۔ دھنو نے میرا بصری پیغام ریسو کر لیا۔

غلام رسول میرا فولادی پنچ کھا کر زمین پر گرا خاک چاٹ رہا تھا۔ ماں باپ نے کتنے چاؤ سے اس کا نام "غلام رسول" رکھا ہو گا لیکن اس بدقماش نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر یامی کی چاکری کو ترجیح دی تھی۔ اس نے خود نے اس کی بدبختی پر مہر ثبت کر دی تھی۔ اب خاک ہی اس کا نصیب تھی۔ اسے زندگی بھر خاک چاٹنا تھی اور خاک سے خاک ہو کر' خاک اوڑھ کر سو جانا تھا۔

جس دوران میں میری نظر غلام رسول پر جمی ہوئی تھی اللہ دتا نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پیچھے سے "ہگ" کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ زور آزمائی شروع کرتا میں نے کمر کو دائیں پہلو پر ٹوئسٹ کیا اور میری الیو (کہنی) کسی نوک دار ہتھوڑی کی مانند اس کے گال پر پڑی۔ میری کمر پر اس کے بازوؤں کے حلقے کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی تو میں نے یہ عمل بائیں پہلو پر جھک کر دائیں کہنی سے دہرا دیا۔ اللہ دتا اپنے چہرے کو تھام کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا منہ پہلے ہی جیپ کے بونٹ سے ٹکرا کر خاصی تواضع کروا چکا تھا۔ پھر اس کے پیٹ میں لگنے والی سائڈ کک کے اثرات بھی ابھی باقی تھے۔

میں اللہ دتا کو چھوڑ کر غلام رسول کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ زمین سے اٹھنے کے بعد میرے قریب پہنچ چکا تھا اور خود آور ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف بڑھتی ہوئی اس کی ٹانگ کو پاؤں سے پکڑ لیا پھر ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اسے دائیں جانب گھما دیا۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتا کر دور جا گرا۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ یامی شاہ کوئی خطرناک چلنے کا ارادہ رکھتا ہے میں نے اسے دھنو کی جانب لپکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وہ دھنو کو اپنی گرفت میں لا کر کمزور بنانا چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمبا اسٹیپ لیا پھر "ہگ فلیک" کرتے ہوئے ہوا میں اچھلا اور "ہگ سمرسالٹ" کرتے ہوئے یامی شاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر میرے چہرے تکنے لگا۔

میں نے اس کی حیرت کو توڑنے کے لیے بہ آسانی اس دائیں بازو کی لپیٹ میں اس کی گردن کو جکڑ کر نیچے کی طرف جھکایا اور دائیں پاؤں کی ایڑی اس کے زمین کی طرف چہرے پر رسید کر دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی گردن کو گرفت میں

لیے میں نے اپنے بازو کو "ہگ رول" کیا اور یامی شاہ کو ہوا میں اٹھاتے ہوئے پیچھے "تھرو" کر دیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر کرب ناک انداز میں چیخ اٹھا۔ وہ سیدھا پشت پر اپنی ہی جیپ کی آہنی باڈی سے ٹکرایا تھا اور اس بار چوٹ اس کی کمر پر آئی تھی۔

میں یامی شاہ کے حواریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ گرتے پڑتے خود کو سمیٹتے سنبھالتے میرے سر پر پہنچ گئے تھے۔ اس مرتبہ میں نے ان کے ساتھ کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا اور انہیں اپنے کھلے ہاتھ و پاؤں کی ضربات میں نہلا کر رکھ دیا۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ دونوں ہانپتے کانپتے زمین بوس ہو گئے تھے۔ اب ان سے کسی قسم کے ضرر رساں ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔

میں ہاتھ جھاڑ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اپنے عقب میں جیپ کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ میں نے آہن واحد میں پلٹ کر دیکھا اور میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ جیپ میں اللہ دتا اور غلام رسول سے نبرد آزما تھا' اس دوران ٹمبا یامی شاہ جیپ میں پہنچ چکا تھا پھر اس کے اندر فطری بزدلی نے اسے وہاں سے سر پر پاؤں (ایمسیلی ریٹر پر پاؤں) رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بزدل انسان نازک موقع پر اپنی جان بچانے کے لیے جان سے قیمتی اور عزیز سے عزیز ترین چیز کو بھی پلک جھپکتے میں قربان کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اللہ دتا اور غلام رسول تو اس حد تک گئے تھے۔ وہ اگر انہیں میرے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔

دھنو کلاشنکوف سمیت میرے قریب آگئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گن لے کر اسے ان لوڈ کیا اور خالی ہتھیار واپس دو "خاک نشینوں" پر پھینک دیا پھر ہم وہاں رکے بغیر اپنے ہوٹل آگئے وہاں پر موجود لوگوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو دن کے دو بجے تھے۔ میں نے کمرے کو اندر سے لاک کر دیا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ کر واقعے پر گفتگو کرنے لگے۔

دھنو نے کہا "جو کچھ بھی ہوا ہے' ٹھیک نہیں ہوا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو" میں نے تائید کی "مگر یہ سب کچھ یہ سب کچھ ہمیں مجبوری کرنا پڑا ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔"

وہ اٹھتے ہوئے انداز میں سر کو جھٹکتے ہوئے بولی "ہم جس جگہ پر ہیں اور ہمارے حالات اس بات کی اجازت

مشہور زمین چور نک ڈیلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے۔
ان حیرت انگیز چوریوں کی کہانیاں جو وقتاً فوقتاً ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔
نک ڈیلوٹ کی چوریاں نمبر 1 دستیاب ہیں

نک ڈیلوٹ کی چوریاں نمبر 2

وہ دلچسپ کہانیاں جن کو آپ بار بار پڑھیں گے اور لطف اندوز ہوں گے
قیمت فی حصہ -/60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
دونوں حصے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ -/25 روپے
فوری منگوانے کے لیے رابطہ فرمائیں
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
فون: 5862551 فیکس: 5862552-4896313
kitabiat1970@yahoo.com

نہیں دیتے کہ ہم لوگوں سے الجھتے پھریں اور اس طرح زیادہ سے زیادہ افراد کی نظروں میں آجائیں۔ تم نے دیکھا' وہاں سڑک پر کتنے زیادہ افراد جمع ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ بہت جلد گردو پیش میں گشت کرنے لگے گا۔ لوگوں کی زبانوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہمارے لیے عن قریب کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے!"

دھنو کی تشویش بجا تھی۔ یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ آج جس نوجوان شخص نے یامی شاہ جیسے بدمعاش کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا وہ کہاں اور کون سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ خاصی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر دھنو نے کہا "وجدان' ہمیں پہلی فرصت میں اپنا ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے لیکن سردست یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یوں سمجھ کہ فی الحال ایسا کرنا مناسب نہیں" میں نے کہا۔

وہ بولی "یہی تو پوچھ رہی ہوں۔ مناسب یا ممکن کیوں نہیں؟"

میں نے جواب دیا "ہم یہاں میر بخش کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک وہ ہم سے رابطہ نہیں کر لیتا' یہ جگہ چھوڑی نہیں جا سکتی.... اور تم جانتی ہو' میر بخش سے میری ملاقات کتنی اہم ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں' یہ تو بات ہے" پھر ایک طویل سانس لینے کے بعد اضافہ کیا "دراصل حالات کی افراتفری نے میرے ذہن کو اس طرف سے غافل کر دیا تھا۔"

ہم اس تازہ ترین صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھنو نے کہا۔

"وجدان! میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا ہے۔"

اس کے لہجے کی مضبوطی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا "کس قسم کا اہم فیصلہ؟"

وہ بولی "میں جلد از جلد تم سے مارشل آرٹس سیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اپنی حفاظت کے لیے؟" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ میرے سوال کی گہرائی میں پہنچتے ہوئے بولی "خود حفاظتی کے لیے بھی اور سامنے والے کو مزہ چکھانے کے لیے بھی۔"

"اور.... وہ تمہارا نظریہ.... برائی کے بدلے میں برائی کرنے اور ظلم سہہ کر خاموش رہنے کا نظریہ کیا ہوا؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

"اب چھوڑو نا' ان باتوں کو" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

مجھے اس کے لہجے سے پہلی مرتبہ سرکشی جھلکتی دکھائی دی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سڑک پر پیش آنے والے واقعے نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ میرا خیال تھا' یہ تحریک کا سبب پیدا ہوئی تھی اس کے اندر۔ میں نے اس نازک صورتِ حال کو اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا اور عام سے انداز میں کہا "ٹھیک ہے' جیسے تمہاری خوشی میں نے تو پہلے بھی انکار نہیں کیا تھا اور اب بھی جی جان سے تمہیں فنونِ ضرب و حرب سکھانے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ گمبھیرانہ انداز میں گویا ہوئی "وجدان! میں نے تم پر رکھا ہے' اگر روم میں رہنا ہے تو وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔" پھر وہ میری آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے بولی "میرا روم (ROME) تو تم ہو وجدان! میں تمہارے روم میں رہنا چاہتی ہوں.... اس لیے مجھے وہی کرنا ہے جو تمہیں پسند ہے اور جو تم کرتے ہو" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بڑے مضبوط لہجے میں اضافہ کیا "لہٰذا مارشل آرٹس تو اب مسٹ ہے!"

"مجھے تمہارے اس فیصلے سے خوشی ہوئی ہے دھنو" میں نے کہا۔

"اسی خوشی میں ملاؤ ہاتھ" وہ اپنا نرم و ملائم دودھیا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

دھنو کے ہاتھ کا گداز میرے احساس کو گدگدا گیا۔ اس لطیف لمس نے میرے وجود میں جگنو بھر دیے تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں نادیدہ میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ جھیل سی آنکھوں میں میرے لیے محبت کی طغیانی تھی۔ محبت جو بے قدموں انسان کے اندر اتر آتی ہے اور اس احساس کو پھول کی طرح کومل اور خوش بو کی طرح مقدس ہے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں دھنو کی میں نہیں بلکہ نیلگری کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔

اس نے مجھے چونکا دیا۔ ایک طویل جست بھر کر میں اس حصار سے باہر آیا اور حتمی لہجے میں کہا۔

"دھنو! آج کے بعد تم ساحل ہو۔"

"ساحل.... کیا مطلب؟" وہ اس اچانک جملے سے الجھ گئی۔

میں نے کہا "ساحل کا مطلب ہے' سمندر کا کنارا.... یعنی کوسٹ.... سی کوسٹ۔"

"وہ تو میں سمجھتی ہوں" وہ جلدی سے بولی "لیکن تمہارا یہ کہنا کہ آج کے بعد میں ساحل ہوں.... کیا معنی رکھتا ہے؟"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں نے تم سے کہا تھا نا' تمہارا یہ نام "دھنو" تم پر جچتا نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تمہارا نام بدل دوں گا اور تم نے مجھے اس کی اجازت بھی دے دی تھی۔"

"اوہ! اب سمجھی" وہ اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "تو دھنو! میں نے ابھی اسی وقت تمہارا نام "ساحل" رکھ دیا ہے۔ آج کے بعد تم ساحل ہو۔ کہو' یہ نام تمہیں کیسا لگا؟"

"تم نے تجویز کیا ہے اس لیے بہت اچھا ہے۔"

"اور ویسے؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ویسے بھی لفظ "ساحل" اپنے اندر وسیع معانی رکھتا ہے" وہ سنجیدگی سے بولی۔

مجھے ہر لحاظ سے یہ نام پسند آیا ہے.... اور خوشی اس بات کی ہے کہ یہ نام تم نے رکھا ہے۔"

"تھینک یو ساحل" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی فطری شوخی سے بولی "شکریہ کس بات کا وجدان! یہ فلسفہ تو تم نے ہی مجھے پڑھایا ہے کہ دوستی میں "تھینک یو" کو کبھی جگہ نہیں دینا چاہیے۔"

میں اس شرارت کی پڑیا کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے حالات حاضرہ کی طرف آتے ہوئے پوچھا "وجدان! تم نے پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں ساحل کو کوئی مناسب سا جواب دیتا' دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ہم دونوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ "کون ہو سکتا ہے؟" ساحل نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

"یہ تو دروازے پر جا کر ہی معلوم ہو گا" میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

وہ سنجیدگی سے بولی "ذرا احتیاط سے وجدان۔"

میں نے بند دروازے کے قریب پہنچ کر بہ آوازِ بلند پوچھا "کون ہے؟"

آواز اونچی تھی اس لیے باہر پہنچ گئی۔ دوسری جانب سے جو جواب ملا وہ اطمینان بخش تھا۔ میں نے میر بخش کی آواز کو پہچانتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

جب وہ کمرے کے اندر آ گیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ساحل اس دوران میں بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ میں میر بخش کی رپورٹ سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے میرے استفسار پر مختصر مگر جامع الفاظ میں وہاں پیش آنے والے حالات کے بارے میں بتا دیا۔

میر بخش کے مطابق' وڈیرا اکبر سومرو اور اس کے مہمان دوست نے اس کی کہانی پر یقین کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے منسوب جادوئی چکر پر ایمان لے آئے تھے تاہم وہ میری تلاش سے دست کش نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے جہاں جہاں میرے پائے جانے کے امکانات موجود تھے' اپنے آدمی پھیلا دیے تھے اور بڑی سرگرمی سے مجھے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ یہ تمام ردِعمل میری توقع کے خلاف اور تشویش ناک تھا۔

"سائیں! اللہ سائیں کا شکر ہے' وڈیرے کو میری کسی بات پر شک نہیں ہوا" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"کیا تم اس بات سے مطمئن ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سائیں"

جواب دینے کے بعد اس نے میرے چہرے کی گمبھیرتا کو دیکھا اور پوچھا "کیوں سائیں' کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا۔ آپ تو مطمئن نظر نہیں آ رہے ہو!"

"کوئی گڑبڑ اگر ہوئی نہیں تو عن قریب ہو جائے گی" میں نے سنجیدگی سے کہا "اور جہاں تک میرا تعلق ہے' میں واقعی مطمئن نہیں ہوں۔"

"سائیں! آپ تو عجیب بات کر رہے ہو!" وہ الجھ گیا۔

میں نے کہا "میر بخش! تمہارے وڈیرے سائیں کا ردِعمل قدرتی نہیں ہے۔ مجھے اس کے پیچھے کسی گہری سازش کے آثار نظر آ رہے ہیں۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کیسی سازش سائیں؟"

میں نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا "میر بخش! یہاں آتے ہوئے تم نے پوری احتیاط سے کام لیا ہے نا؟"

"جی سائیں' میں پورے راستے چوکس رہا ہوں" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

کہیں تمہارا خفیہ تعاقب تو نہیں کیا گیا؟" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

وہ ٹھوس لہجے میں بولا "نہیں سائیں' میں نے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی ہوٹل میں قدم رکھا ہے۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ۔"

میر بخش کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے قدرے مطمئن ہو گیا پھر اس سے پوچھا "کیا تم کسی یامی شاہ نامی بدمعاش کو جانتے ہو؟"

وہ چونک اٹھا " ہاں سائیں' اچھی طرح جانتا ہوں" "کون ہے وہ شخص؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

میر بخش نے بتایا "یامی شاہ یہاں کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔ وڈیرا اکبر سومرو سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ وہ کئی مرتبہ وڈیرے کے بنگلے پر جا چکا ہے۔ وہاں میں اس سے مل بھی چکا ہوں" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "لیکن سائیں! آپ یامی شاہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"آج دوپہر میں ہمارا" "آمنا سامنا" ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ دتا اور غلام رسول نامی دو افراد بھی تھے۔ میں نے ان تینوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ یامی شاہ اپنے چیلوں کو پٹتا چھوڑ کر چپ میں فرار ہو گیا۔"

"اوہ!" وہ متاسفانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اس دنگا فساد کی نوبت کیوں آئی سائیں؟"

میں نے بتایا "یامی شاہ نے میری ساتھی ساحل سے دست درازی کی کوشش کی تھی مجبوراً مجھے اس کی کوشش ناکام بنانا پڑی۔ اسی پر بات بڑھ گئی اور پھر میدان کارزار گرم ہو گیا۔"

میر بخش نے بیڈ پر دراز ساحل کو دیکھا اور الجھے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا "سائیں آپ کی ساتھی کا نام تو دھنو۔۔۔"

"ہاں' یہ نام تھا اس کا بھی" میں نے میر بخش کی بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے قطع کلامی کی اور کہا "اب یہ ساحل ہے۔۔۔ صرف ساحل"

وہ اس تبدیلی نام پر کوئی تبصرہ کیے بغیر بولا "سائیں! جو واقعہ آپ نے بتایا ہے' وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے' بنگلے پر آمد و شد کی وجہ سے یامی شاہ بھی وڈیرے کے دوست اور اس کے مشن سے آگاہ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے' کہیں اس نے آپ کو پہچان نہ لیا ہو۔"

"مجھے تو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوا" میں نے لاپروائی سے کہا۔

میر بخش نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا "سائیں! آپ کو فوری طور پر یہ ہوٹل چھوڑ دینا چاہیے۔"

"ہم بھی یہی سوچ رہے تھے" ساحل نے پہلی مرتبہ محفل میں حصہ لیتے ہوئے کہا "بس تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے" پھر وہ بستر سے اٹھ کر ہمارے قریب آ گئی۔

میں نے سفری بیگ کو سمیٹتے ہوئے کہا "میر بخش! تمہارا انتظار تو اب باقی نہیں رہا۔ ہمیں جلد از جلد ٹھکانہ بدل لینا چاہیے۔"

میر بخش بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔ یہ دستک ایک گھنٹا پہلے میر بخش کی آمد پر ہونے والی دستک سے قطعی مختلف تھی۔

ہم تینوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمارے ذہنوں میں اس وقت کوئی نہ کوئی سنسنایا ہوا سوال ضرور موجود تھا جس کا مفہوم ایک ہی معنی دیتا تھا یعنی۔۔۔ کون ہو سکتا ہے؟

یہی بات میر بخش کی زبان سے پھسل گئی "سائیں! یہ کون آ گیا؟"

"ہم تمہارے باپ ہیں! باہر سے ایک دہاڑتی ہوئی آواز اندر پہنچی۔

"اگر تم نے دس سیکنڈ کے اندر دروازہ نہ کھولا تو اسی بے ہودگی سے ہم دروازہ توڑ کر اندر آ جائیں گے" اسی گرجدار آواز میں دھمکی دی گئی۔

میں نے دروازے کے بولٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں دروازہ کھول دوں گا۔ تم یہ تو بتاؤ' ہو کون اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"ہمارا تعلق پولیس سے ہے" جواباً بتایا گیا "ہم یہاں کیوں آئے ہیں' یہ بات دروازہ کھلنے پر بتائیں گے۔"

پولیس کا نام سن کر ہم قدرے مطمئن ہو گئے۔ معاملہ ہمارے خدشات سے خاصا مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خوف ناک انداز میں ایک مرتبہ پھر دروازے کو دھڑ دھڑاتے' میں نے دروازہ کھول دیا۔

میں ثابت قدمی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اسی دوران میں اسی "معیار" کی ایک دستک مزید دی جا چکی تھی۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں استفسار کیا۔ "کون ہے؟"

میں چکرا کر رہ گیا تھا!

اس مردود کو تو میں نے بدست خود فنا کے گھاٹ اتارا تھا۔ ہمالیہ کی آغوش میں پیش آنے والا وہ خونیں واقعہ میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ میرا حافظہ اس تلخ اور ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والے المیے کو کسی بھی صورت رخصت کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس سنسنی آمیز اور ہلاکت خیز معرکے میں اگر میں دارا جیسے معاشرتی ناسور کو جہنم کا ایندھن بنانے میں کامیاب ہوا تھا تو دوسری جانب میری دو عزیز از جان ساتھی عورتوں نے بھی زندگی کی بازی ہاری تھی اور یہ سب کچھ اسی کمینے دارا کا کیا دھرا تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ المناک مناظر میری تصوراتی آنکھ میں گھوم گئے۔ ہمالیہ کے دامن میں' گنگوتری کے علاقے میں واقع شنکری مندر کی اجاڑ ویران عمارت میں دارا اپنے حواریوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔ ہمارے درمیان ایک کھلی جنگ ہوئی تھی جس میں ہر طرح کا ہتھیار استعمال کیا گیا تھا۔ جانکی اور چترا پر تیم کی اندوہناک موت کے بعد مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا اور میں نے اپنا خنجر رستے تک دارا کے سینے میں پیوست کر دیا تھا۔ جب میں نے خنجر کھینچا تو دارا کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹا تھا۔ مجھ پر وحشت سوار تھی اور میں دارا کے جسم کو بے دردی سے اپنے خنجر کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کے سینے میں جا بجا شگاف پیدا ہو گئے تھے اور اس کا پیٹ بھی کھل گیا تھا۔ کٹے ہوئے پیٹ میں سے آنتوں کا پھندا باہر نکل کر جھول رہا تھا۔ موت دارا سے چند سانسوں کے فاصلے پر کھڑی تھی اور وہ عیار شیطان اس موقع پر بھی ایک چال چل گیا تھا۔ وہ' زخموں سے چور جانکی کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے دو سو فٹ گہرے چٹانی کھڈ میں جا گرا تھا۔ اس کی موت یقینی تھی۔ چھلنی سینے اور چاک شکم کے ساتھ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

یہ تمام خیالات بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن سے گزرے اور میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔ میرے سامنے کھڑا وہ بناکٹا دراز قامت شخص ہرگز ہرگز دارا نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی لمحے میرے پہلو میں کھڑے میر بخش کی وحشت بھری سرگوشی نے میرے خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی "مہربان سائیں' یہ تو وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان دوست ہے۔"

میر بخش کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اکبر سومرو کا مہمان دوست اور میرا طلب گار وہ شخص انیس بیس کے فرق سے دارا ہی تھا۔ دراز قامت' صحت مند اور مضبوط جسم۔ خال وخد میں دارا سے گہری مشابہت۔ چاق و چوبند اور عقابی نگاہ رکھنے والا۔ اس کی عمر اس وقت لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس نے بلیو جینز پر پولو کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور کھڑے ہونے کے انداز سے لڑائی بھڑائی کا مشاق دکھائی دیتا تھا۔

وہ ہوٹل کے کمرے کے دروازے میں اکیلا نہیں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین افراد اور بھی تھے جو سندھ کے روایتی لباس میں تھے۔ وڈیرے کے مہمان دوست کے دائیں ہاتھ پر یامین عرف یامی شاہ کھڑا معاندانہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ باقی دو افراد میرے لیے نئے تھے جو تھوڑے فاصلے پر پیچھے کھڑے تھے۔ وہ دارا نما آدمی کے ساتھی نظر آتے تھے۔

میر بخش کی سنسنی خیز سرگوشی پر جب میں نے چونک کر اس شخص کو دیکھا تھا تو اس کے لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دماغ کو زیادہ تھکانے کی ضرورت نہیں۔ میں دارا نہیں ہوں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا "تم دارا ہو بھی نہیں ہو سکتے' اس کا مجھے کامل یقین ہے کیونکہ میں نے اس لعین کو اس جگہ بھیج دیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ بہرحال تم بتاؤ' کون ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جبڑوں کی جنبش سے میں نے اندازہ لگایا کہ دارا کے بارے میں میرے اظہار خیال نے اسے سلگا دیا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ وہ دارا کا کوئی بہت ہی قریبی شخص تھا۔ عین ممکن تھا' وہ اس کا جڑواں بھائی ہو۔ دارا سے اس کی عمر قدرے کم تھی۔ اس حساب سے وہ دارا کا چھوٹا بھائی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا ذہن کسی "ہم شکل" کی طرف بھی گیا تاہم میں نے اس خیال کو فی الفور اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ایسے اتفاقات عام طور پر نکشن فلموں اور کہانیوں میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔

دروازے میں استادہ قد آور شخص دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھولنے بند کرنے لگا۔ اس عمل کے دوران میں اس کے بازوؤں کے بائی سپس (مچھلیاں) بے قراری سے پھڑکنے لگے۔ وہ کسرتی بدن کا مالک تھا مگر اس میں تحمل کی کمی نظر آتی تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار

شامل تھی۔

"تم نے دارا کو جہاں پہنچا دیا ہے' میں تمہیں اس سے بھی آگے پہنچا کر آؤں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں چوہدری صاحب کے سامنے پیش کرنا ہے۔ پہلے وہ اپنا حساب بے باق کرلیں پھر میری باری آئے گی۔"

میں اس کی بات کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ سوالیہ لہجے میں پوچھا "تم کس چوہدری کا ذکر کررہے ہو۔ میرا اس چوہدری سے کیسا کھاتا چل رہا ہے؟"

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو وجدان۔" وہ طیش کے عالم میں بولا "جب میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر تمہیں زندہ حالت میں چوہدری صاحب کے قدموں میں ڈالوں گا تو تمہاری ساری لاعلمی دور ہوجائے گی۔"

میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

"صرف نام ہی نہیں' میں تمہارا پورا شجرہ بھی گنوا سکتا ہوں۔" وہ زہرخند لہجے میں بولا "تم وجدان علی بن عابد علی بن چوہدری حاکم علی ہو۔ رکھاں والی میں پیدا ہوئے' سنگاپور میں پروان چڑھے' بنکاک اور شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی اور ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں من مانیاں کرتے رہے۔ وہیں تم نے پَر پُرزے نکالے اور خود کو جانے کیا سمجھنے لگے۔"

میں نے مصنوعی حیرت کی اداکاری جاری رکھی اور کہا "تم تو واقعی میری زندگی سے گہری واقفیت رکھتے ہو مگر ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا' نہ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ تمہیں کیا دشمنی ہے۔ تم میری تلاش میں یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں تمہاری ماں کا یار ہوں۔" وہ اچانک مغلظات پر اتر آیا "اور تمہاری اس بہن سے عقد ثالث کرنے آیا ہوں۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے میری ساتھی ساحل کی جانب اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا' وہ ایسی برافروختہ کرنے والی باتوں سے میرے تحمل میں نقب لگانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے تاؤ دلا کر کسی غلطی کی جانب لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے آگ لگا دینے والے جملوں کے جواب میں نہایت ہی سادہ سے لہجے میں کہا۔

"اگر یہی تمہارا تعارف ہے تو تم نہایت ہی گھٹیا اور ذلیل شخص ہو۔ تم شکل صورت ہی میں نہیں بلکہ سیاہ کاریوں میں بھی دارا کا پرتو ہو۔"

دارا کے ذکر پر وہ تلملا کر رہ گیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا "اب اپنی گندی زبان پر میرے بھائی کا نام نہ لانا ورنہ ٹانگیں چیر کر بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

اس کا انکشاف میرے اندازے کے عین مطابق تھا۔ وہ دارا کا بھائی ہی تھا۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد میں مزید سنجیدہ ہوگیا اور اس کے زخموں پر چاٹ مسالے کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔

"چھوٹے شیطان" میرے انداز.... میں سادگی اور بے پروائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی "اگر تم مجھے کتوں کے آگے ڈال دو گے تو پھر اپنے چوہدری کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ پہلے تمہارا چوہدری مجھ سے کچھ حساب کتاب کرے گا پھر تمہاری باری آئے گی!"

وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا "بس اسی مجبوری نے میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے ورنہ میں تمہیں وہیں تمہارے نہ دکھا دیتا تو میرا نام بھی تارا نہیں۔"

"تو تمہارا نام تارا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سخت لہجے میں دریافت کیا "تم تینوں شرافت سے ہمارے ساتھ وڈیرا سائیں کے بنگلے پر چلتے ہو یا پہلے تم لوگوں کی کچھ خاطر تواضع کردی جائے۔"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا "تمہارا بھائی بھی ایسی ہی خواہش دل میں رکھتا تھا مگر وہ ہمیشہ مجھ ہی سے "خاطرداری" کروا تا رہا۔ تم ہمیں کسی قسم کی شرافت کے مظاہرے پر مجبور نہ کرو اور خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔"

"میں خاموشی سے اور خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں وجدان۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "میں کافی دنوں سے عمرکوٹ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ ہمارے آدمیوں نے تمہارے پاکستان آنے کے بارے میں ہمیں پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ تم کبھی چوہدری صاحب سے ملے نہیں ہو اس لیے ان کی پہنچ سے آگاہ نہیں ہو۔ جس طرح ہمیں بھائی دارا کے "حالات" کا فوراً پتا چل گیا تھا اسی طرح ہم تمہاری نقل و حمل پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے ہمیں یہ بھی معلوم ہے' تمہاری اس ساتھی کا نام دھنو ہے اور اس کا تعلق بدھ مت سے ہے۔"

وہ اپنی دانست میں ان باتوں سے مجھے مرعوب یا متاثر کرنا چاہتا تھا لیکن میں اب وہ پہلے والا بچہ نہیں رہا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم نے مجھے پختہ کار بنا دیا تھا۔ دارا کی ماسٹر کاپی "تارا" پر نگاہ پڑتے ہی اور میر بخش کے اس انکشاف

کے بعد کہ وہ وڈیرا سائیں کا مہمان و دوست ہے' میں یہی سمجھا تھا کہ وہ شخص یعنی تارا میر بخش کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوگا مگر جب میں نے اس کے دست راست پریامی شاہ کو دیکھا تو میرا ذہن کسی اور جانب چلا گیا تھا۔ آج دوپہر میر بخش نے مجھے میرے اصل نام سے پکار کر کہا تھا۔ "وجدان علی! ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ خوامخواہ کسی پھڈے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے!"

ازاں بعد میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ یامی شاہ وڈیرا اکبر علی کے بنگلے پر آتا جاتا رہتا ہے اور وہ وڈیرے کے مہمان و دوست کے مشن سے بھی آگاہ ہے۔ ممکن ہے' یامی شاہ ہی نے تارا نامی میرے بارے میں اطلاع پہنچائی ہو۔ وہ میرے ہاتھوں بری طرح ذلیل و رسوا ہو کر اپنی جیپ میں موقع واردات سے فرار ہوا تھا۔ اس سے اسی قسم کی حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

یہ تمام خیالات اور امکانی باتیں نہایت ہی سرعت سے میرے ذہن سے گزر رہی تھیں۔ ظاہری طور پر میں تارا کے روبرو کھڑا اس سے حریفانہ مکالمت کررہا تھا۔

"تم میرے اور میری ساتھی کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو' میں اس کی تصدیق یا تردید نہیں کروں گا تارا۔" میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا "مجھے بتاؤ تمہارا چوہدری مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ وہ میرے فراق میں کیوں گھل رہا ہے۔"

"چوہدری صاحب کا نام ادب سے لو وجدان۔" تارا نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "یہ تم نے کیا "تمہارا چوہدری' تارا چوہدری" لگا رکھی ہے۔ چوہدری نوازش علی ہمارے چوہدری صاحب ہیں۔ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔"

میں نے ترکی بہ ترکی کہا "وہ میرا نہیں' تمہارا چوہدری ہے اس لیے میں اسے "تمہارا چوہدری" کہہ رہا ہوں۔ اس میں ماننے کی کون سی بات ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "خیر' بتاؤ' چوہدری ملک نوازش علی مجھ سے کیا چاہتا ہے۔"

"وہ تم سے ماضی کا حساب کرنا چاہتے ہیں۔" تارا نے سرد لہجے میں کہا "تم نے اور تمہارے باپ نے ان کا بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کروڑوں روپے مالیت کے سونے کی اسمگلنگ کرتے ہوئے اس کا انداز خاصا ترش ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ اگر تمہارا چوہدری مجھ سے کوئی پرانا حساب صاف کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اسی نیت سے پاکستان آیا ہوں۔ چوہدری نوازش علی بھی دشمنی کے کھاتے میں میرا بہت ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ میں اس کے حلق میں انگلی ڈال کر ایک ایک پائی وصول کروں گا۔ میں اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔" میرا لہجہ جذباتی ہوگیا "یہ ٹھیک ہے' مجھے اور میرے والدین کو در در کی ٹھوکریں کھلانے والا شخص تمہارا بھائی دارا تھا۔ وہی غلیظ انسان میرے والدین کی موت کا سبب بھی بنا مگر وہ تو دشمنی کی بساط کا ایک چھوٹا سا مہرا تھا۔ ان مہروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ تم بھی تو ایک ادنیٰ سے مہرے ہی ہو تارا!"

میں نے گھور کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب تب میں مجھ پر پل پڑے گا۔ خاص طور پر دارا کے ذکر پر اس کے جبڑے بھنچ جاتے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تارا! تم جیسے تمام ناپاک مہروں کو حرکت دینے والا شیطان ملک نوازش علی ابھی زندہ ہے جس نے میرے ماں باپ کو ان کی زمینوں اور گھربار سے بے دخل کیا۔ انہیں گاؤں نہیں' شہر نہیں بلکہ اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں ماضی کے کھاتے میں لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا حساب لے کر پاکستان آیا ہوں۔ اور میرا پہلا ٹارگٹ چوہدری ملک نوازش علی ہے۔" میں ایک لمحے کو رکا پھر گہری سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا ہوا' تم سے ملاقات ہوگئی۔ تم چوہدری کے گماشتے ہو' اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے ایک حقیر کیڑے ہو۔ اس تک میرا پیغام پہنچا دو۔ وہ اپنے اردگرد فولادی دیواریں اٹھوالے' محافظوں کے مسلح دستے تعینات کردے۔ میں بہت جلد اس کی گردن پر اپنے ناخن جمانے آرہا ہوں۔"

"بند کرو یہ بکواس۔" تارا دہاڑ کر بولا۔ اپنی اور اپنے چوہدری کی شان میں کہے ہوئے میرے الفاظ نے اسے چیخنے پر مجبور کردیا تھا "اگر اب تم نے اپنی زبان سے ایک بھی بے ہودہ لفظ نکالا تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

"میری زبان کو گدی ہی سے پیوست رہنے دو اور اپنا راستہ ناپو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "ورنہ میں ہوٹل کے عملے کو بلا کر۔"

"ہوٹل کے عملے کو بلاؤ یا مقامی پولیس کو۔" یامی شاہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے پہلی مرتبہ لب کشائی کی "ہم یہاں' تمہیں لینے آئے ہیں اور لے کر ہی جائیں گے۔ اب جو تم پر

منحصر ہے' اپنے قدموں پر چل کر صحیح سلامت جانا چاہو یا پھر۔؟"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تارا کی طرف دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ اس نے تارا کے خیالات کی درست ترجمانی کی ہے یا نہیں۔

"یامی شاہ!" میں نے اس کے نحوست مآب سیاہ چہرے پر سلگتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "تمہارے" پھر" کے بعد میں جملہ پورا کرتا ہوں۔۔یا پھر میری طرح ہڈیاں تڑوا کر' دم دبا کر اور پیٹھ دکھا کر موقع سے فرار ہو جاؤ۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرے طنزیہ کلمات کو بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ وہ دوپہر کے وقت اپنے دو ساتھیوں کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ کر جس طرح اپنی کھلی جیپ میں فرار ہوا تھا' وہ بزدلی کی ایک عظیم مثال تھی۔ تاہم اس وقت تارا کی موجودگی میں وہ اپنی ہزیمت کو بھول کر خوا مخواہ کی اکڑ دکھا رہا تھا۔

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے وجدان۔" یامی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "دوپہر کو تمہارا پلڑا بھاری تھا اس وقت ہمارا پلڑا بھاری ہے۔"

"یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ اس وقت تمہارا پلڑا بھاری ہے؟" میں نے تُرش لہجے میں کہا۔

تارا نے کہا "جس پلڑے میں باٹ زیادہ ہوں وہی بھاری ہوتا ہے۔"

"اگر باٹ کھوکھلے ثابت ہو جائیں تو!" میں نے یامی شاہ کی طرف اشاراتی نظر سے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا "میں تمہارے اس باٹ کو تو ٹھوک بجا کر اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔"

میرے اس تبصرے پر یامی شاہ تلملا کر رہ گیا۔ تاہم اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔

تارا نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "زیادہ تقریریں جھاڑنے کا شوق تم بنگلے پر جا کر پورا کر لینا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ چلو' آگے نکلو۔ باہر وہی گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"وہی گاڑی۔" کے الفاظ پر زور دیتے ہوئے تارا نے میر بخش کی طرف خوں خوار نظر سے دیکھا اور کہا "تم جیسے نمک حرام کا جو حشر وڈیرا سائیں کریں گے اسے دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے تھے' ہم نے تمہاری بچکانا کہانی پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ بے وقوف انسان! اکبر سومرو کو فوراً شک ہو گیا تھا کہ تم سے جا ملے ہو اسی لیے تمہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تاکہ تم ذریعے دشمن کا شکار کیا جا سکے۔ ہمیں امید تھی کہ فرصت میں اپنے نئے آقا اور ہمارے دشمن سے ملو ایسا ہی ہوا اور میں تمہاری بے خبری میں تمہارا تعاقب ہوئے عمر کوٹ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تم نے پجارو والی ٹریکٹر ٹرالی میں سفر کر کے خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا تمہیں نہیں معلوم کہ تارا کی آنکھوں میں کتنے کیمر ہیں۔ میں تمہاری دم پر پاؤں جما کر یہاں پہنچا ہوں اور تصدیق کے لیے راستے میں مجھے یامی شاہ مل گیا۔ یہ سائیں کو وجدان اور اس کی ساتھی دھنو کے بارے بتانے جا رہا تھا۔ میں نے کھلی جیپ میں اسے دیکھ کر اور جب اس کی بات سنی تو پھر یہاں پہنچنے میں ہم نے لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ عمر کوٹ پہنچ کر ہم میر بخش یعنی خفیہ تعاقب کرتے ہوئے اس ہوٹل تک پہنچے ہیں۔"

تارا کی وضاحت نے میرے ذہن میں اٹھنے والے سے سوالات کے جواب فراہم کر دیے تھے۔ میر بخش انکشافات پر انگشت بدنداں تھا۔ تارا خاموش ہوا لرزاں لہجے میں بولا۔

"تارا سائیں! آپ بتا رہے ہو کہ وہی گاڑی باہر کر رہی ہے۔ کیا یہ گاڑی۔۔؟"

تارا نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا "میر بخش' یہ اسی گاڑی کا ذکر ہے جس میں تم فرضی جادوئی کے ساتھ کل رات بنگلے پر پہنچے تھے۔ وہی سیاہ ایسو گاڑی!"

"اوہ!" میر بخش نے متاسفانہ انداز میں کہا "سائیں اگر آپ اسی گاڑی میں میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے تو پھر کیا اس گاڑی نے کوئی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی راستے بھر اپنے عقب میں دیکھتا آیا ہوں۔ اگر وہ سیاہ گاڑی میرے تعاقب میں ہوتی تو میری نظر میں آئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔"

تارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "وہ گاڑی اس تمہاری نظر میں نہیں آئی کہ اب وہ سیاہ نہیں بلکہ سرخ ہو چکی ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میر بخش حیرت سے اچھل پڑا کچھ سوچتے ہوئے بولا "ہاں' ایک سرخ گاڑی کو تو میں نے وقفے وقفے سے اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا جس کی ذرا اونچی سیٹ پر کوئی لمبی مونچھوں والا۔۔۔ شخص بیٹھا تھا۔"

تارا نے اپنے عقب میں کھڑے موٹے تازے میانہ قد طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ وہی شخص ہے جو بڑی مونچھیں لگائے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اور گاڑی کے پچھلے حصے میں تھے۔ نقلی مونچھوں والے کا نام موسیٰ ہے اور یہ دوسرا شخص عبداللہ ہے۔ یہ آزاد تمہارے لیے اجنبی ہیں۔ اس انتخاب کی وجہ بھی واقف ہی ہے۔"

میر بخش نامی شخص کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے موچھیں نظر آ رہی تھیں۔ یقینی طور پر اس نے نقلی سیاہ مونچھیں اتار دی تھیں اور اب اپنے اصلی حلیے

میر بخش آپ حیرت میں غوطہ زن تھا "سائیں! یہ بات نہیں آ رہی کہ کالی گاڑی سرخ کس طرح بن گئی!"

"جادوئی کمال سے۔" تارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں "تم نے بھی صحرا میں پیش آنے والے ایک "طلسمی" کی کہانی نہیں سنائی تھی۔ ہم نے تم سے کوئی وضاحت نہیں مانگی تھی لیکن اگر تم نہ بھی پوچھو تو میں تمہیں سیاہ گاڑی سرخ میں بدلنے کی وجہ ضرور بتاؤں گا۔" تارا نے ایک کا توقف دے کر باری باری ہم تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی "ہم سارضی طور پر گاڑی کو نظر سے بچانے کے لیے اس کی پر سرخ کلانک چسپاں کر دیا ہے۔ یہ کام اتنی مہارت سے کیا ہے کہ پہلی نظر میں اس کارروائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ والا اسے سرخ گاڑی ہی سمجھتا ہے۔ یہ مجبوری اس بھی پیش آگئی کہ بنگلے پر موجود تمام گاڑیوں کو تم اچھی پہچانتے ہو۔ سرخ رنگ کی بند گاڑی تمہاری نظر میں کسی طور مشکوک نہیں ٹھہر سکتی تھی۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔" میر بخش نے سہمی ہوئی نظر سے تکتے دیکھا۔

"برا تو اب ہو گا میر بخش۔" تارا نے سنسناتے ہوئے کہا "تم یہ بات تو اچھی طرح جانتے ہو گے کہ وڈیرا کے موخداروں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ دناک عذاب کے لیے خود کو تیار کر لو۔"

اس موقع پر میر بخش نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے "تارا! تم مجھے وڈیرا سائیں کا ڈراوا مت دو۔ اب میں چاکری میں نہیں ہوں۔ وجدان نے مجھے اپنا دوست اب میرا جینا اور مرنا وجدان کے ساتھ ہے۔ میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وجدان کا ساتھ دوں گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" تارا پھنکارا "جب وجدان کا بخار اترے گا تو وڈیرا سائیں کے خوف سے کپکپاتے پھرو گے اور یہ وجدان۔۔" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر مجھے حقارت سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا "میں ابھی تمہاری نظر کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس کے حصول کی خاطر میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ آج بنگلے پر پہنچ کر میں چوہدری صاحب کو فون کروں گا تو وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھیں گے پھر اکبر سومرو کے توسط سے ان دونوں کو لاہور کے نواحی گاؤں "رکھاں والی" پہنچانے کا بندوبست کیا جائے گا اور تم!"

تارا نے میر بخش کو نفرت بھری نظر سے دیکھا اور حتمی لہجے میں بولا "تمہیں بنگلے کے سامنے گردن تک زمین میں گاڑا جائے گا پھر تمہارے چہرے پر شہد مل کر خطرناک موذی مکھیاں تم پر چھوڑ دی جائیں گی جو اپنے سوئیوں سے زیادہ تیز ڈنک بے دریغ تمہارے چہرے کے گوشت میں اتارنا شروع کر دیں گی۔"

میں نے تارا کو منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا "دھمکی بازی میں تم اپنے بھائی سے کسی بھی طرح کم کمینے نہیں ہو مگر میں نے اس بدذات کا جتنا برا انجام کیا تھا' تم اس سے بھی زیادہ عبرت ناک اختتام کو پہنچو گے۔ جب بساط بچھ ہی گئی ہے تو دو بدو مقابلہ ہو گا۔"

"آج پتا چل جائے گا' تم میں کتنا دم ہے!" تارا نے مجھے گہری نظر سے گھورا۔

میں نے چٹانی لہجے میں کہا "میں بھی یہ دیکھنے کے لیے بے قرار تھا کہ تم میں کتنا خم ہے۔ آج میں تمہارے کس بل نکال کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔"

اس دھمکی آمیز گفتگو نے سب سے زیادہ ہراساں ساحل کو کیا تھا۔ وہ سراسیمہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی آنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس دوران میں چوہدری کے اندر داخل ہو چکے تھے۔ عبداللہ نامی شخص نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ عبداللہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ اس نے چھوٹی مگر خاصی دبیز مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کی ناک کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں رکھی نظر آتی تھیں۔

"تم میرے کس بل نکالو گے!" تارا تحقیر آمیز انداز میں بولا۔

"کیوں۔" میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا "کیا اس کام کے لیے تم نے کسی اور کو ٹھیکا دے رکھا ہے؟"

وہ میرے کڑوے کسیلے جملوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں دجدان۔ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چل پڑو ورنہ مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

میں نے پیش آمدہ صورتِ حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تارا! شرافت اور خاموشی کے تمام امکانات تو معدوم ہوچکے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہوگا' ڈنکے کی چوٹ پر ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم وہ دوسرا طریقہ اختیار کرلو۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے ساحل کو کور کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایک مضبوط اسٹانس بنا کر کھڑا ہوگیا۔ اس موقع پر تارا جیسے کچے پکے سے کسی بھی گھٹیا حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

تارا نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جو مستند طور پر گھٹیا تھی۔ تاہم یہ میری توقع سے کہیں زیادہ پست تھی۔ کسی بھی مرد' خصوصاً شہ زور کو اس قسم کی ہلکی حرکت زیب نہیں دیتی۔ تارا نے اپنے لباس میں سے اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا ایک پسٹل نکال کر مجھ پر تان لیا پھر یامی شاہ اینڈ کمپنی کو اشارہ کرتے ہوئے عسلیے لہجے میں دہاڑا۔

"ان دونوں حرام زادوں کو اتنا مارو کہ یہ زندہ رہیں مگر کیچوؤں سے بھی کمتر ہوجائیں۔ ہم انہیں کسمپرسی کی حالت میں بنگلے پر لے کر جائیں گے۔"

"واہ وا۔" میں نے تالی بجاتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا "تم تو وارا سے بھی گئے گزرے ثابت ہورہے ہو۔ ہم نہتوں پر گن تان کر تم خود کو شہ زور ثابت کرنا چاہتے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایک صحت مند زنخے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہو۔"

وہ میرے انگارا جملوں سے جل بھن کر سوختہ ہوگیا اور شدید ردِعمل کے طور پر اس نے ساحل کی جانب جست بھری۔

ساحل کو میں نے مکمل اوٹ فراہم کر رکھی تھی۔ لہٰذا اس تک پہنچنے کے لیے تارا کو میرے پاس سے گزرنا تھا۔ میں پہلے ہی فرنٹل ہارس پوزیشن میں اسٹانس بنائے کھڑا تھا۔ میں نے تارا کی جست کے جواب میں ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ کک اس کے سینے پر رسید کردی۔ میری کک میں بے پناہ تھرسٹ تھا۔ تارا ہوا میں بیک ورڈ اچھلا اور پشت کے بل دروازے سے ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ یامی نے بجلی کی سی سرعت سے مذکورہ پسٹل کمرے کے فرش پر سے اٹھالیا۔

تارا اپنے بڑے بھائی دارا ہی کی طرح قد آور فرد کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ میں چھ فٹ دو انچ کا تھا۔ وہ کم و بیش میرے برابر ہی تھا تاہم میری بھرپور سراپا نے اسے تیورا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے سر کو جھٹک کر اپنے حواس بحال کیے جانے والی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ اس دوران میں نے حق چھچھ گیری ادا کرتے ہوئے پسٹل واپس تارا کو اور اس کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے تارا کو مخاطب کرتے ہوئے سمجھانے لہجے میں کہا "ہماری آپس میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اپنے آدمیوں کو کیوں ہاتھ پاؤں سے مجروح کرنا چاہتے دشمنی کیسے کہتے ہیں؟"

میں نے کہا "تمہارا بھائی میرے والدین کا قاتل کی تباہی و بربادی کا ذمے دار تھا۔ اس نے مجھے ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا تھا۔ میرے کئی ساتھی مکاری اور عیاری کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سیکڑوں انسانی کا خون اس نے اپنے ہاتھوں پر مل رکھا تھا۔ میں شیطان کو جہنم رسید کرکے انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان ہے اور تم۔"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تارا کی آنکھوں میں اور آتشیں لہجے میں کہا "اور تم بھی اگر اپنے مذموم سے باز نہ آئے اور میرے کسی ساتھی کا بال بھی بانکا سمجھ لینا میں تمہیں بھیانک موت کے حوالے کرنے میں لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔"

تارا کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس چلتا تو مجھے ڈالتا۔ اس مرتبہ مجھ پر براہِ راست حملہ کرنے کے بجائے نے یامی شاہ اینڈ کمپنی کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اپاہجوں کی طرح کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے نے تمہیں اس کی بکواس سننے کے لیے نہیں بلوایا۔ اور اس خبیث کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دو۔"

حکمِ حاکم' مرگِ مفاجات کے تحت تارا کے تینوں ہماری جانب بڑھے۔ میر بخش اس تیزی سے صورتِ حال سے کرنٹ پکڑ چکا تھا۔ وہ مارشل نہیں تھا تاہم لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھا۔ وہ وقت کسی بھی قسم کے متوقع حملے کے لیے بالکل چاق کھڑا تھا۔

میں توقع کررہا تھا کہ یامی شاہ میری طرف آئے لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کترا رہا تھا۔ میں اس کے احتراز کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ دوپہر کو پیٹرول پمپ کے نزدیک عین چلتی ہوئی سڑک پر میں نے اس کی جو گت بنائی تھی' وہ اس کی "یاد" کو ابھی تک اپنے بدن سے "چپکائے" ہوئے تھا۔

یامی شاہ نے میر بخش کا رخ کیا تو موسیٰ اور عبداللہ میری جانب بڑھ آئے۔ میں نے ان کے قدموں کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ بھی دیسی اسٹائل ہی کے لڑاکا تھے لہٰذا میں نے مارشل آرٹس کی مروّجہ تکنیک میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ عبداللہ دراز قامت اور دبلا پتلا تھا۔ وہ ہوا میں مکا لہراتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے مکے سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے کمر کی لچک کو استعمال کرتے ہوئے چہرے کو لیفٹ جرک دی' عبداللہ کا مکا میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر آگے بڑھ گیا تاہم اس عمل کے دوران میں عبداللہ کا جسم میرے بہت قریب آگیا تھا۔ میں نے اس کی کمر پر ڈبل ہینڈ پس آزمایا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ موسیٰ سے ٹکراتے ہوئے لٹو کی طرح گھوم گیا۔

اسی اثنا میں موسیٰ مجھ پر پل پڑا۔ اس کا قد زیادہ نہیں تھا تاہم جسمانی اعتبار سے وہ خاصا موٹا تازہ اور صحت مند تھا۔ وہ نہایت ہی عسلیے انداز میں اپنے تابڑ توڑ مکوں سے میرے سینے کو نشانہ بنانے لگا۔

میں بیک فٹ پر حرکت کرتے ہوئے اس کے مکوں کو بلاک کرنے لگا۔ اس کوشش میں ایک دو گھونسے میرے جسم پر لگے بھی تاہم وہ زیادہ ضرر رساں ثابت نہیں ہوئے۔ میں نے موسیٰ کی ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے ایک چال چلی۔ حملے کے جوش و خروش میں اس نے اپنی گردن جھکا رکھی تھی جیسا کہ عام طور پر باکسر حضرات دفاعی کھیل کے دوران میں گردن جھکا کر چہرہ چھپا لیتے ہیں تاکہ حریف کے گھونسوں سے محفوظ رہ سکیں۔

یہاں صورتِ حال قدرے مختلف تھی۔ موسیٰ دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ کھیل کا مظاہرہ کررہا تھا۔ میں نے اس کی کوتاہی نما غلطی سے فائدہ اٹھایا اور ایک "ہیمر پنچ" عین اس کی کھوپڑی کے وسط میں رسید کردیا۔

یہ ایک مخصوص قسم کا مکا ہوتا ہے اور بالکل ایک وزنی ہتھوڑے کے اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ ریڈ برکس اور ٹاکلز بریکنگ میں عموماً اس پنچ کی افادیت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے موسیٰ کی کھوپڑی کو نشانہ بناتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کا "ناریل" پھٹنے نہ پائے۔ اس احتیاط کے باوجود بھی وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے ایک کرب ناک چیخ مار کر زمین بوس ہوگیا۔ شاید میں نے پنچ میں زیادہ توانائی صرف کردی تھی یا پھر موسیٰ ہی کم ہمت واقع ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑا تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

اس دوران میں میر بخش اور یامی شاہ کے درمیان ایک خوفناک معرکہ جاری تھا۔ وہ دو بے قابو سانڈوں کے مانند ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ بنیادی طور پر وہ سندھ کی روایتی کشتی "ملاکھڑا" کا مظاہرہ کررہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یامی شاہ' میر بخش پر حاوی آرہا تھا۔ یامی شاہ ایک سکہ بند بدمعاش تھا۔ وہ تو میرے مارشل آرٹس اور جمناسٹک نے اس کے حواس مختل کردیے تھے ورنہ وہ کسی سے کم نہیں تھا۔

میں میر بخش کی مدد کو آگے بڑھا تو عبداللہ تاڑ کی طرح میری راہ میں استادہ ہوگیا۔ دبلا پتلا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی لمبا نظر آتا تھا۔ اس مرتبہ عبداللہ نے مجھ پر مکے سے حملہ نہیں کیا بلکہ اپنی ایک بانس ٹانگ کو میرے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے میرے نازک اعضا کو نشانہ بنایا تھا لیکن میں چونکہ اس کی طرف سے غافل نہیں تھا اس لیے میں نے بڑی سرعت سے اوئر بلاکنگ کرتے ہوئے "کراس ہینڈ" پر اس کا وار روکا اور میکانکی انداز میں ایک نپی تلی راؤنڈ ہاؤس کک اس کے چہرے پر جڑ دی۔

عبداللہ اپنے چہرے کو تھامتے ہوئے پیچھے ہٹا اور ایک سسکاری لیتے ہوئے چہرے کو دبانے لگا۔ وہ ٹنول کر یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میری کک نے اس کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ نقصان تو پہنچ چکا تھا' جب اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو وہاں خون موجود تھا۔ اس کا بالائی ہونٹ پھٹ چکا تھا اور وہاں سے بڑی تیزی سے خون رس رہا تھا۔ میں عبداللہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر میر بخش کی جانب بڑھ گیا۔

یامی شاہ نے میر بخش کو زمین پر گرالیا تھا اور اسے بری طرح رگید رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر یامی شاہ کے کالر میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اسے میر بخش کے اوپر سے کھینچ لیا۔ جب یامی شاہ نے گردن سیدھی کرکے صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کی تو میں نے ایک فولادی پنچ اس کی ناک پر رسید کردیا۔

اس کی ناک سے لہو جاری ہوگیا۔ شاید اس کا بانسا پھر گیا

تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ میرے دل میں یا علی شاہ کے لیے بہت غصہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا اور پسپا کرتے ہوئے دیوار سے لگا دیا۔ دیوار سے پشت ٹکتے ہی وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمیں بوس ہوگیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہوگیا ہو۔

اسی لمحے مجھے ساحل کی چیخ سنائی دی۔ میں نے بجلی کی سی رفتار سے مڑ کر دیکھا۔ تارا ساحل کی پشت پر کھڑا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ساحل کے بالوں کو مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی خوفناک نال ساحل کی گردن سے پیوست تھی۔ ساحل یقینی طور پر موت کے دہانے پر کھڑی تھی۔ کسی بھی لمحے اعشاریہ تین آٹھ کی گولی اس کی گردن میں سے گزرتے ہوئے دوسری جانب ایک وسیع شگاف پیدا کرسکتی تھی۔ تارا نے ساحل کو اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ اگر بالفرضِ محال گولی چلانا بھی پڑجائے تو وہ کلی طور پر محفوظ رہے۔

حالات اچانک سنگین صورت اختیار کرگئے تھے۔ تارا نے گمبھیر لہجے میں مجھے وارننگ دی "وجدان! اگر دھنو کی زندگی تمہیں عزیز ہے تو دہی کرو' ہو میں کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ہر صورت میرے ساتھ وڈیرے کے بنگلے پر جانا ہوگا۔"

"مجھے اپنی ساتھی کی زندگی اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ خود اپنی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی "تم ساحل کو چھوڑ دو' اس کی گردن سے پسٹل کی نال ہٹادو۔ ہم دوستانہ ماحول میں بھی معاملات طے کرسکتے ہیں۔"

"تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "دھنو کو ایک لمحے کے لیے بھی فری نہیں کروں گا اور یہ تم نے دوستانہ ماحول کی کیا بات کی ہے۔ ہم ازلی دشمن ہیں' ہمیشہ دشمن ہی رہیں گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری اور تمہارے چوہدری ملک نوازش علی کی دشمنی میرے ساتھ ہے۔ تم ساحل کو کیوں بیچ میں لا رہے ہو؟"

"یہ ساحل نہیں' دھنو ہے۔" تارا نے پسٹل کی نال کا دباؤ ساحل کی گردن پر بڑھاتے ہوئے کہا "تم کبھی اسے کلثوم بنالیتے ہو اور کبھی ساحل لیکن یاد رکھو' اس قسم کی چالیں ہم پر بے اثر ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے' یہ بدھ مت کی پیروکار ہے اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اسی لیے تم اسے بغل میں دبائے پھر رہے ہو۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "یہ تم نے ٹھیک کہا' ہماری اصل دشمنی تم سے ہے مگر اس دشمنی کے راستے میں تمہارا جو بھی ساتھی آئے گا' وہ ہماری دشمنی کا نشانہ ضرور بنے گا۔ گیموں کے ساتھ گھن پسنے کی مثال تو تم نے سن رکھی ہوگی!"

میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا تھا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح تارا کو باتوں میں لگا کر ساحل کی نجات کا راستہ نکال سکوں۔ وہ میرے مکالمہ بازی کے پھندے میں پاؤں ڈال چکا تھا۔ میں نے پھندے کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ اس دوران میں' میں اپنے اور تارا کے درمیانی فاصلے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی فوری کارروائی کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔

میں نے عام سے انداز میں کہا "مثالیں تو میں نے بہت سن رکھی ہیں تارا لیکن تمہاری بزدلی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ غرایا۔

میں نے کہا "تم ایک لڑکی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے کمزور بنانے کی کوشش کررہے ہو۔ یہ کوئی جواں مردی تو نہ ہوئی۔ میں نے تمہاری بہادری کے بہت سے غائبانہ قصے میر بخش کی زبانی سنے ہیں مگر اب تمہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے وہ قصے کہانیاں جھوٹ کا پلندا تھیں۔ اگر تم واقعی با مرد ہو تو پھر ساحل کو چھوڑ دو اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی شہ زوری کو آزماؤ۔ میں بھی تو دیکھوں' دارا کا چھوٹا بھائی کس پائے کا فائٹر ہے!"

وہ میرے چڑھاوے میں کچھ زیادہ نہ آیا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا "وجدان! میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا مگر یہاں نہیں بلکہ بنگلے پر پہنچ کر۔ ابھی میرے پاس کسی قسم کا میدان جمانے کی فرصت نہیں ہے۔"

میں تارا کو مزید باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا کہ میر بخش نے میری اب تک کی "محنت" پر پانی پھیر دیا۔ یا علی شاہ کی گرفت سے آزاد کروانے کے بعد میں اس کی طرف سے غافل ہوگیا تھا کیونکہ ساحل کی چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ تارا سے میری مکالمت کے دوران میں میر بخش سنبھل چکا تھا اور اب حق دوستی نبھاتے ہوئے اس نے ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ وہ جوشِ جذبات میں آکر تارا پر چملانک لگا بیٹھا تھا۔

میر بخش کی اس اچانک حرکت پر تارا کے ساتھ ساتھ میں بھی بوکھلا گیا تھا۔ تارا نے فطری ردِعمل کے طور پر ساحل

کی گردن سے پسٹل ہٹا کر میر بخش پر فائر کردیا ایک زوردار دھماکا ہوا مگر میر بخش فضا میں اچھل کر زمین پر گرنے کے بجائے سیدھا تارا پر آیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میر بخش کی قسمت اچھی تھی کہ وہ براہِ راست گولی کی زد میں نہیں آیا تھا ورنہ اعشاریہ تین آٹھ کی ظالم گولی اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتی۔ تاہم وہ بالکل محفوظ بھی نہیں رہا تھا۔ پسٹل سے نکلنے والی گولی اس کے دائیں بازو کو کندھے کے قریب سے چھو کر گزری تھی اور اسے قابلِ تلافی نقصان پہنچا گئی تھی۔ میر بخش اپنا گھائل بازو تھام کر زمین سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اس موقع کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ہر شے کو فراموش کرتے ہوئے تارا کو اپنی نگاہ میں رکھا اور اس کی "خاطر تواضع" شروع کردی۔ وہ ساحل کے ساتھ ہی زمین پر گرا تھا۔ تاہم پسٹل ابھی تک اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں نے زمین پر گرے ہوئے تارا کے پسٹل بردار ہاتھ پر اپنے پاؤں سے ایک بھرپور ٹھوکر ماری۔

پسٹل تارا کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے کونے میں چلا گیا۔ یہ ایک طرح سے اور بھی برا ہوا کیونکہ پسٹل جس مقام پر پہنچا تھا وہاں عبداللہ موجود تھا جو اپنے زخمی ہونٹ کو دبا کر خون بند کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ جب اس نے پسٹل کو اپنے قدموں کے قریب پایا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ پسٹل اٹھانے کے لیے فوراً زمین کی طرف جھک گیا۔

میں نے عبداللہ کے عزائم کو بھانپتے ہوئے حلق سے "یل" کی تیز آواز نکالی اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے اس کی طرف آیا پھر اس سے پہلے کہ وہ زمین سے پسٹل اٹھا کر کوئی ایکٹیو "حرکت" کرتا' میری سائیڈ فلائنگ کک اس کے جبڑے پر پڑی۔ یہ عین وہی وقت تھا جب وہ پسٹل اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو رہا تھا۔

عبداللہ پسٹل سمیت ہوا میں اچھلا اور چوبی کرسی پر جا گرا۔ اس کا بالائی ہونٹ میں پہلے ہی زخمی کرچکا تھا' اب میرے پاؤں نے جو اس کے جبڑے کی مزاج پرسی کی تو وہ دہری تکلیف میں مبتلا ہو کر کراہنے لگا۔ میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ کرسی سے الجھا ہوا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اٹھنے سے پہلے ہی کرسی کے عقب سے مجھ پر فائر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے زمین پر بیٹھتے ہوئے بڑی سُرعت سے بیک سوئپ کی۔ میرے پاؤں کی ایڑی عبداللہ کی کنپٹی پر لگی جب کہ گھٹنے کے اندرونی حصے نے کرسی کو دور دھکیل دیا۔

کنپٹی پر لگنے والی چوٹ نے عبداللہ کو بے حال کردیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس کا چہرہ پے در پے ٹھوکروں کا نشانہ بن رہا تھا۔ اس مرتبہ لگنے والی ٹھوکر بڑی "کارگر" تھی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار کے پاس جا پہنچا۔ عبداللہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

دوسری جانب تارا اور میر بخش میں ٹھن گئی تھی۔ میں نے ان کی جانب متوجہ ہونے سے قبل پسٹل پر قبضہ جمایا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بہت تیزی سے ابھرا۔ مجھے پسٹل کے بل پر موجودہ صورتِ حال کو اپنے حق میں کرلینا چاہیے۔ میں نے یہ خیال مکمل ہوتے ہی ذہن کو جھٹک دیا۔

میں اپنے دل میں پختہ عزم کرچکا تھا کہ دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت میں اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر اکتفا کروں گا اور جہاں یہ صلاحیتیں بالکل ناکامیاب ہوجائیں گی وہاں پھر کسی اور چیز کے بارے میں سوچوں گا۔ کسی اور سہارے میں بھی میری روحانی قوتوں کو اوّلیت حاصل تھی۔ اسلحے وغیرہ کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا تھا۔

موجودہ صورتِ حال میں یہ پسٹل ہی سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوسکتا تھا جو اب میرے ہاتھ میں تھا۔ جس طرح سانپ کا زہر نکال دیا جائے تو وہ ایک حقیر کیچوے کی حیثیت اختیار کرجاتا ہے' بالکل اسی طرح اگر کسی گن میں سے گولیاں نکال لی جائیں تو وہ دھاتی کھلونے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں رہتا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل کا کلپ نکال کر اپنی جیب میں ڈالا اور خالی پسٹل کو ایک طرف پھینک دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو تارا' میر بخش پر بھاری پڑ رہا تھا۔ میر بخش کے زخمی بازو سے اب باقاعدہ خون جاری ہوگیا تھا اور کندھے پر سے اس کی قمیص سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم وہ تارا کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں دوست! میں تمہاری مدد کو آگیا ہوں۔"

وہ زیادہ جوش و خروش سے تارا پر حملے کرنے لگا مگر میں نے دیکھا کہ میر بخش کے اٹیک میں زیادہ دم نہیں تھا۔ اس کے بالعکس تارا بڑی بے باکی سے اسے چوٹیں پہنچا رہا تھا۔ تارا کا ایک زبردست مکا کھا کر میر بخش ڈگمگا گیا تو میں نے اسے کندھوں سے تھام کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تم ساحل کا خیال رکھو میر بخش۔ میں اس سور نما سورما کو دیکھتا ہوں۔"

میں ٹائیگر اسٹانس میں قدم جما کر تارا کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اسی وقت مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ تارا بھی ایک مارشل آرٹسٹ تھا۔ میرے اسٹانس کے جواب میں اس نے فرسٹ ایزی اسٹانس بنایا اور غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"وجدان! میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان یہاں ایک ٹیکنیکی جنگ چھڑ جائے مگر تم نے مجھے مجبور کردیا ہے۔"

"مجبور تو تم اس وقت ہوگے تارا' جب اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔" میں نے اس کے چہرے اور کمر کو بیک وقت نظر میں رکھتے ہوئے کہا "آج میں تمہیں "مجبوری" کا مفہوم بڑی وضاحت سے سمجھاؤں گا۔ بہرحال' مجھے تمہاری ایک ادا نے خوش کردیا ہے۔"

"کون سی ادا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

میری نظر اس کی کمر کی ذرا سی جنبش کو بھی نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ فائٹ کے دوران میں کمر کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کا مدِمقابل اپنے ہاتھ یا پاؤں کو جو بھی حرکت دیتا ہے اس کا براہِ راست تعلق اس کی کمر سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کمر کی جنبشوں کو سمجھنا آتا ہو تو پھر آپ فوراً یہ جان سکتے ہیں کہ مدِمقابل آپ پر کس طور حملہ کرنے والا ہے۔ اس طرح آپ کو اپنے حریف پر قابو پانے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

میں نے تارا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مارشل آرٹس جانتے ہو۔ اب تم سے دو دو ہاتھ کرنے میں مزہ آئے گا۔"

"کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں یہ "مزہ چکھنے" کا پورا موقع فراہم کروں گا۔" وہ تیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا "ابھی کیا تم بٹیر لڑا رہے ہو جو تمہیں فرصت نہیں؟"

اس نے خوں خوار نظر سے مجھے دیکھا اور زبان سے کچھ بولنے کے بجائے اپنی بائیں ٹانگ کو حرکت دی۔ وہ لیفٹ راؤنڈ ہاؤس میرے کندھے پر آزمانے کے موڈ میں تھا مگر میں اس کے کولھے کی جنبش کو تاڑ چکا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے رائٹ کراسنٹ کک اس کے چہرے پر جمادی۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے رائٹ ہینڈ سے اس کی راؤنڈ ہاؤس کک بلاک بھی کردی۔ بلاکنگ اور کاؤنٹر اٹیک میں ایک ردھم کا خیال رکھا گیا تھا چنانچہ میں نہ صرف تارا کی کک سے بچ گیا بلکہ اس کے چہرے پر چوٹ لگانے میں بھی کامیاب رہا۔

تارا ڈگمگایا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ وہ ایک گرم مزاج شخص تھا۔ اس میں تحمل کی خاصی کمی پائی جاتی تھی۔ میں نے تارا کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے غصہ دلانے والی حرکات اپنا کر اس کے فن اور طاقت کا جلوس نکال دیا۔

تارا کسی زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ وہ اس کا حق بھی رکھتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک درندے کی صفات رکھتا تھا اور تھوڑی دیر پہلے میری کراسنٹ کک نے اسے زخمی بھی کردیا تھا۔

تارا نے میرے چہرے پر پنچ آزمانے کی کوشش کی۔ وہ واضح طور پر میری ٹھوڑی کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے فضا میں اچھل کر اس کے پنچ کو اپنے ہاتھوں کی "ایگل گرپ" میں لیا اور دایاں گھٹنا اس کی ٹھوڑی پر رسید کردیا۔

یہ ایک "جواب آں غزل" تھا۔ تارا نے میری ٹھوڑی کو مجروح کرنا چاہا تھا۔ میں نے جواباً اس کی ٹھوڑی کو "مبارک باد" پیش کردی تھی۔ تارا کی زبان دانتوں تلے دب کر کٹ گئی اور خون نے اس کے دہانے کو سرخ کردیا۔ اس وقت وہ ایک مردار خور گدھ دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے اپنے دانتوں اور زبان کو پہنچنے والے نقصان کا احساس نہ ہو۔ اس نے حلق سے غراہٹیں خارج کرتے ہوئے مجھے فرنٹ کک ماری۔ اس کے جوتے کا تلوا میرے کندھے پر لگا۔ کک میں زیادہ جان نہیں تھی۔ میں نے بہ آسانی اسے سہا اور اندر آتے ہوئے ایک فولادی پنچ اس کے سینے پر رسید کیا۔

تارا نے مکا کھاتے ہی میری کلائی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر ایک مروڑا دیا اور میرے چہرے کو کسی حد تک زمین کی جانب جھکانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا اگلا ارادہ میں فوراً بھانپ گیا۔ وہ میرے چہرے پر ایک بھرپور ٹھوکر اپنے پاؤں سے لگانا چاہتا تھا۔

میں نے اچانک جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے خود کو کسی بے جان شے کے مانند زمین پر گرادیا۔ ردِعمل کے طور پر تارا اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اگر اس موقع پر وہ میرا ہاتھ چھوڑ دیتا تو اپنا توازن برقرار رکھ سکتا تھا لیکن اس نے تو میری کلائی کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں دبوچ رکھا تھا جیسے کوئی بھوکا کتا ہڈی کو اپنے جبڑے میں دبا تا ہے۔

تارا لڑھک کر مجھ پر آیا مگر میں اسی لمحے رول کرکے تین فٹ آگے نکل گیا۔ میری گراؤنڈ رولنگ سے تارا کے ہاتھوں کو

شدید جھٹکا لگا۔ وہ اس وقت انتہائی غیر متوازن تھا چنانچہ میری کلائی پر سے اس کی گرفت ختم ہوگئی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو تارا بھی پش اپ لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ میں نے اپنے دائیں پاؤں کو اس طرح حرکت دی جیسے میں اس کے قدموں یا پنڈلی کو ٹھوکر مارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ ایک طرح کی بلف کک تھی۔ میں نے تارا کو ایک خوب صورت جھانسا دیا تھا۔ میرا پاؤں اپنے جسم کے انتہائی زیریں حصے کی جانب جاتے دیکھ کر وہ اپنے چہرے اور جسم کے بالائی حصے کے دفاع کی طرف سے غافل ہوگیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار پہلوؤں میں گر گئے تھے۔

اسی لمحے میری رائٹ فرنٹ ٹو سائیڈ کک نے اس کے چہرے پر ایک طوفانی ضرب لگائی۔ اس کے قدموں کی جانب بڑھا ہوا میرا دایاں پاؤں ایک جرک کے ساتھ اوپر اٹھا تھا اور پاؤں کا بلیڈ سیدھا تارا کی ناک پر جا لگا تھا۔

تارا کے دانتوں اور زبان سے تو پہلے ہی خون جاری تھا۔ اس نئی افتاد نے اس کی ناک سے خون کا فوارہ جاری کردیا۔ اب وہ اپنے ناک منہ کا نہیں رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے پیچھے ہٹا تو میں نے ایک طویل اسٹیپ لے کر رائٹ سائیڈ کک اس کی کمر پر رسید کردی۔

تارا توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے چوبی میز پر جا گرا۔ مذکورہ میز اس کے وزنی جثے کی آمد اور ٹکراؤ کو برداشت نہ کرسکی اور ایک احتجاج آمیز آواز پیدا کرکے چاروں پاؤں سے زمیں بوس ہوگئی۔ اب وہ میز ایک تختے کی صورت اختیار کرچکی تھی جس کے "مجروح پاؤں" اس کے اردگرد پڑے ہوئے تھے۔ میز کے چوبی تختے پر تارا بے حس و حرکت پڑا نظر آرہا تھا۔ شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کوئی شدید چوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر اسے "آئوٹ" کردیا تھا۔

میں نے طائرانہ نگاہ سے کمرے کی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ وہاں خاصی انتشار پھیل چکی تھی۔ ایک گولی بھی فائر کی گئی تھی مگر مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک ہوٹل کے عملے میں سے کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ہوٹل والوں کو اس کمرے میں ہونے والی کارروائی کی کوئی خبر نہ ہو۔ ہاں' یہ عین ممکن تھا کہ وہ دانستہ چشم پوشی سے کام لے رہے ہوں اور کسی مصلحت کے تحت خاموش ہوگئے ہوں۔

میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ یامی شاہ وہاں کا معروف غنڈا تھا اور وڈیرا اکبر سومرو سے بھی اس کے گہرے روابط تھے۔ تارا چونکہ وڈیرے کا مہمان تھا اس لیے اس کی اہمیت یامی شاہ سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ وجہ ہوسکتی تھی کہ تارا اینڈ کمپنی کے معاملے میں ہوٹل والوں نے مکمل چپ سادھ لی تھی۔

تارا کے ساتھ آنے والے تینوں ڈشکروں کو میں نے کاسٹک سوڈا سے دھو کر کمرے کے فرش پر ڈال دیا تھا اور وہ آڑھے ترچھے' اوندھے سیدھے پڑے اپنے زخموں کی "سنکائی" کررہے تھے۔ یامی شاہ پہلے بھی میرے ہاتھوں اپنی بے عزتی کروا چکا تھا اور اب ایک دیوار کے ساتھ بے ہوش پڑا تھا۔ باریک مونچھوں والے موٹے تازے موسیٰ کو میرے ایک ہی "ہیمر پنچ" نے لمبا لٹا دیا تھا البتہ عبداللہ زخمی حالت میں ایک طرف پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ اس ٹیم کا سرغنہ یعنی تارا چاروں خانے چت پڑا تھا۔

میر بخش نے نحیف آواز میں مجھ سے کہا "وجدان سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اپنے زخمی کندھے کو تھام رکھا تھا۔ تارا نے تھوڑی دیر پہلے اسے اچھی خاصی کٹ چڑھائی تھی۔ اگر اس کا بازو زخمی نہ ہوتا تو ممکن تھا' وہ بھی تارا کو دو چار کرارے ہاتھ جڑ دیتا۔ میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر کہا۔

"پہلے میں تمہارے بازو کو دیکھ لوں۔"

"میرے بازو کو کچھ نہیں ہوا۔" میر بخش دانتوں پر دانت جماتے ہوئے بولا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں ورنہ یہ شیطان ہمیں جانے نہیں دیں گے اگر یہ ہوش و حواس میں آگئے تو ہمارے فرار کی ہر راہ مسدود کردی جائے گی۔"

اس کی آواز میں نقاہت اور درد کی آمیزش تھی۔ ساحل نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "میر بخش ہم یہاں سے بہت جلد روانہ ہوجائیں گے مگر پہلے تمہارے بازو کا کچھ بندوبست کرلیں۔ اگر زیادہ خون بہہ گیا تو تمہارے اور ہمارے لیے بہت مشکل ہوجائے گی۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے زخمی بازو کو قمیص میں سے باہر نکال لیا۔ قمیص کی آستین میر بخش کے لہو میں تربتر ہوچکی تھی۔ میں نے بغور کندھے کے زخمی حصے کا معائنہ کیا اور ایک اطمینان بھری سانس میرے سینے سے خارج ہوگئی۔ اعشاریہ تین آٹھ کی گولی بازو کی جلد کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ تاہم

تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر اس کے بازو پر کوئی پٹی وغیرہ باندھ دی جاتی تو خون کا رساؤ رک سکتا تھا۔

ساحل نے میکانکی انداز میں حرکت کی اور اپنا اسکارف سفری بیگ میں سے نکال کر میری جانب بڑھادیا۔ اس نے شاید میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا یا یہ اس صورتِ حال کا نتیجہ تھا جس سے ہم اس وقت دوچار تھے۔ کہتے ہیں' مصیبت کے دوران میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں بلکہ جسمانی طور پر تو وہ ناقابلِ یقین کارنامے بھی انجام دے لیتا ہے لیکن یہ سب کچھ اسی طور ممکن ہے جب انسان ان مشکل لمحات میں اپنے حواس کو قابو میں رکھے ورنہ عام طور پر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ کوئی افتاد پڑتے ہی انسان سب سے پہلے اپنے ہوش و حواس کھوتا ہے اور وہ اپنی عام صلاحیتوں کو بھی بروئے کار نہیں لا سکتا۔

میں نے ساحل کے ہاتھ سے اسکارف لے کر میر بخش کے بازو پر ایک پٹی کی صورت باندھ دیا۔ اس عمل سے پہلے میں نے اس کا بازو آستین کے اندر سے گزار دیا تھا۔ میں نے اسکارف لپیٹتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ خون آلود آستین اچھی طرح چھپ جائے۔

اس دوران میں میر بخش ہلکی کراہوں کے ذریعے اپنی تکلیف کا اظہار کرتا رہا۔ میں نے اس کی "مرہم پٹی" کے بعد ساحل سے کہا "تم فوراً وہ بیگ اٹھا کر میر بخش کے ساتھ باہر نکلو۔ میں بھی آتا ہوں۔"

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" وہ متوحش لہجے میں بولی۔

"میرے ارادے نیک ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں بے ہوش موسیٰ کی جانب بڑھ گیا۔

میر بخش نے کہا "وجدان سائیں! آپ کو جو کرنا ہے' جلدی جلدی کرلیں۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ یہاں سے ہم تینوں ایک ساتھ ہی نکلیں گے۔"

میں کسی جرحِ بحث میں پڑنے کے بجائے بے ہوش موسیٰ کے پاس آگیا۔ میں جانتا تھا' ساحل اور میر بخش میرے بغیر وہاں سے ہلیں گے بھی نہیں پھر کسی قسم کی تکرار میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

باریک مونچھوں اور میانے قد کا مالک موٹا تازہ موسیٰ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے ہیمر پنچ نے شاید اس کے دماغ کے کچھ نٹ بولٹ گل کردیے تھے۔ میں بڑی سُرعت سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ تارا نے کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ ایمبولینس نما گاڑی کو موسیٰ ہی چلا کر وہاں لایا تھا۔ تاہم اس دوران میں اس نے کنگ سائز نقلی مونچھیں لگا رکھی تھیں۔ مجھے نانوے فیصد امید تھی کہ گاڑی کی چابی اس کی کسی جیب میں ہوگی۔ ہمیں وہاں سے فرار ہونے کے لیے اس سواری کی ضرورت تھی' ایمبولینس نما گاڑی ہمارے لیے بہترین ثابت ہوسکتی تھی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد موسیٰ کی ایک اندرونی جیب سے چابیوں کا گچھا مل گیا۔ رنگ میں موجود چابیوں کو دیکھ کر واضح ہوجاتا تھا کہ یہ اسی گاڑی کی چابیاں تھیں کیونکہ ان چابیوں کو پہلے بھی گزشتہ روز اپنے تجربے میں لا چکا تھا۔

میں چابیوں کا گچھا سمیٹ کر سیدھا کھڑا ہوا تو میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ میں نے سوچا' ہمیں اپنے تعاقب کی راہ مسدود کردینا چاہیے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ یامی شاہ کی کھلی جیپ کی چابی بھی اڑالی جائے۔

ایسا سوچتے ہی میں دیوار کے قریب ڈھیر یامی شاہ کے پاس چلا گیا اور اس کی جیب ٹٹول کر جیپ کی چابی نکال لی۔ یامی شاہ اور موسیٰ اگرچہ زندہ تھے۔ تاہم اس وقت وہ گہری بے ہوشی میں تھے۔ انہیں ہوش میں آنے میں کم از کم دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔

کمرے سے رخصت ہونے سے قبل میں نے وڈیرا اکبر سومرو کے دوست مہمان اور ابنِ شیطان تارا کی "خیریت" جاننا ضروری سمجھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ہنوز چوبی تختے پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کے وجود میں کسی قسم کی حرکت نہیں پائی جارہی تھی۔ میں نے اس کے سینے پر کان لگا کر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس کا دل بڑی معدوم اور دھیمی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ وہ بے حس و حرکت کیوں ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے سر کے آس پاس کا جائزہ لیا تو میری حیرت دور ہونے کا سامان نظر آگیا۔

تارا میز کی چوبی "ٹاپ" پر چت پڑا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے کے نزدیک ہی تازہ تازہ خون کا ایک چھوٹا سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تختے کا کوئی کونا یا پائے کا کوئی سرا اس کے سر کے عقبی حصے سے ٹکرا گیا تھا۔ اس چوٹ کے باعث تارا وقتی طور پر بے ہوش ہوگیا تھا۔ ہمارے فرار کے لیے حالات سازگار تھے۔

میں جیسے ہی تارا کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہوا' میر بخش نے اضطراری لہجے میں کہا "سائیں' آپ وقت ضائع کررہے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی طاقت سے واقف نہیں۔ اگر ہم نے دیر کردی تو ہمارے لیے بے شمار مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔"

"ہاں وجدان۔" ساحل نے تصدیقی لہجے میں کہا "میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔"

"اچھا بھئی' چلو۔" میں نے ان دونوں کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

ساحل کے نزدیک پہنچ کر میں نے سفری بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسی وقت میر بخش تیزی سے چلتے ہوئے دیوار کے نزدیک گیا اور خالی پسٹل اٹھا کر اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"اس کا کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بہت کام کی شے ہے سائیں۔" وہ میرے نزدیک آتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا "خالی گن کس کام کی؟"

"یہ ابھی خالی ہے' بعد میں اسے بھر کر کام میں لایا جاسکتا ہے۔" میر بخش نے کہا۔

وہ پسٹل کو خالی کرتے ہوئے مجھے دیکھ چکا تھا ورنہ وہ مجھ سے یہ سوال ضرور کرتا کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ گن خالی ہے! میں اس خالی پسٹل کو ساتھ لے کر جانے کے حق میں نہیں تھا مگر اس وقت میر بخش کی خواہش کو دیکھتے ہوئے میں خاموش رہا اور ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلیں گے اور کسی سے الجھے بغیر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! میں تو ڈرائیونگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" پھر اس نے دائیں بازو کو کندھے کے قریب سے چھوا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "یہ ڈیوٹی میں سنبھال لوں گا۔ تم دونوں گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھو گے۔"

"ہم کس گاڑی میں جائیں گے وجدان؟" ساحل نے استفسار کیا "چابیاں تو تم نے دونوں گاڑیوں کی حاصل کرلی ہیں۔"

میں نے کہا "ہمارے لیے ایمبولینس نما گاڑی زیادہ محفوظ رہے گی۔ وہ ایک بند گاڑی ہے۔"

"اوہ' پھر وہی منحوس سیاہ گاڑی!" ساحل نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "اب وہ سیاہ کہاں رہی ہے ساحل!"

"اسے' عارضی طور پر سرخ کاغذ چسپاں کرکے سرخ بنا دیا گیا ہے۔" میر بخش نے کہا "مگر ہمیں گاڑی کے رنگ اور میک کے چکر اور بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وجدان سائیں کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ کھلی جیپ کی بہ نسبت وہ بند گاڑی ہمارے لیے زیادہ مفید اور محفوظ ثابت ہوگی۔"

ہم ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے احتیاطاً کمرے کو لاک کردیا۔ مجھے معلوم تھا' ہوٹل کا عملہ اس لاک دروازے کو بہ آسانی کھول سکتا تھا مگر مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ ہمارے جانے کے بعد وہاں کیا ہوگا' یہ سوچنا قبل از وقت تھا۔

میں اگر چاہتا تو بے ہوش موسیٰ اور تارا کو زندگی کی قید سے رہائی دلا سکتا تھا اور یم بے ہوش عبداللہ کو بھی مزید ضرر پہنچا سکتا تھا مگر مجھے ان کی جان لینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں وڈیرا اکبر سومرو کے مہمان دوست یعنی تارا سے ملاقات کا صرف اس لیے مشتاق تھا کہ اس کے بارے میں میر بخش کی زبانی بہت کچھ سن لیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ شخص کس مقصد کی خاطر لاہور کے ایک نواحی گاؤں سے میری تلاش میں سندھ کے ریگستان کی ریگ چھان رہا تھا۔ لاہور کے کسی نواحی گاؤں کے ذکر پر میرا ذہن فوراً رکھاں والی اور چوہدری ملک نوازش علی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس سے میرے تصور میں کچھ خاکہ سا تو بن گیا تھا لیکن صورتِ حال کی وضاحت نہیں ہوتی تھی مگر تارا سے "بنگامی ملاقات" کے دوران میں سب کچھ واضح ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ چوہدری نوازش علی مجھے کیوں اپنے پاس دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کروڑوں کی مالیت کے سونے کو بھول نہیں سکا تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کے گہرے روابط تھے اور وہ پاکستان میں میری آمد سے آگاہ ہوگیا تھا۔ اس نے تارا کو میرے "استقبال" کے لیے عمرکوٹ بھیج دیا تھا۔ مجھے ٹریپ کرنے میں تارا کا ذاتی مفاد بھی پوشیدہ تھا۔ وہ مجھ سے اپنے بڑے بھائی کے قتل کا بھیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔

تارا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وڈیرا اکبر سومرو اور چوہدری ملک نوازش علی کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ انہیں "فیملی ٹرم" کے کھاتے میں فٹ کیا جاسکتا تھا۔ یہ دونوں اشخاص فیوڈلز تھے۔ دونوں کا مزاج اور زندگی گزارنے کے طور طریقے یکساں تھے اس لیے بھی وہ خاندانی طور پر ایک دوسرے کے بہت نزدیک آگئے تھے۔ انہیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے بھی کہا جاسکتا تھا۔

یہ سارے حالات جاننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وڈیرا اکبر و سومرو کے بنگلے یا جاگیر پر جانے کی ضرورت

نہیں تھی۔ مجھے تو چوہدری نوازش سے ایک دیرینہ حساب بے باق کرنا تھا اور سونے کا ٹنٹا بھی نمٹانا تھا۔ اس مقصد کی خاطر ہمیں فی الفور لاہور کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ میں نے پاکستان میں داخل ہوتے وقت یہی سوچا تھا کہ کچھ عرصہ کراچی میں گزاروں گا پھر لاہور کا رخ کروں گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ وطنِ عزیز کی سرحد پار کرتے ہی ہم پر پے در پے افتادیں ٹوٹتی رہیں۔ پہلے ہم "رینجرز" کے ہتھے چڑھ گئے پھر نقلی پولیس کا ڈراما چلتا رہا۔ اس کے بعد چوہے بلی کا کھیل شروع ہوگیا اور اب... اب ایک مرتبہ پھر ہمیں فرار ہونے کا نادر موقع میسر آگیا تھا۔ میں اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ہم بخیر و عافیت ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ وہاں ہوٹل کے سامنے وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ سرخ بھوپ والی سیاہ گاڑی آگے تھی جبکہ یامی شاہ کی کھلی جیپ اس کے پیچھے کھڑی کی گئی تھی۔ ہمیں کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ہوٹل کے سامنے درجن بھر افراد جمع ہوچکے تھے۔ تاہم ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی، وہ یہ کہ جب ہم ایمبولینس نما گاڑی میں سوار ہورہے تھے تو ہوٹل کے عملے کے کچھ افراد ہمارے کمرے کی جانب دوڑے تھے۔

میں نے تو یہی طے کیا تھا کہ میر بخش اور ساحل کو گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھاؤں گا مگر عین وقت پر میر بخش نے ایک مفید بات میرے ذہن تک پہنچائی۔

"وجدان سائیں! آپ مجھے بھی ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھنے دیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کہا "آپ اس علاقے میں پہلی مرتبہ آئے ہیں اس لیے یہاں کے راستوں اور مقامات کے بارے میں آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ آپ کی راہنمائی کے لیے ڈرائیونگ کیبن میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔"

اس نے پتے کی بات کہی تھی۔ میں نے قائل ہوکر اسے پسنجرز سیٹ پر سوار کیا اور خود دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ساحل کو میں پہلے ہی گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھا چکا تھا۔ میں نے گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھمائی اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

یہ وہی بند گاڑی تھی جس میں ہم نگر پار کر سے عمر کوٹ تک پہنچے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ وہاں میرے اور میر بخش کے درمیان زبردست مڈبھیڑ ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں میر بخش کا ایک ساتھی نواز علی میر بخش کی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا تھا۔ میری جواں مردی اور راہِ راست کی مسافرت نے میر بخش کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ میرا بے دام کا غلام بننے پر تیار ہوگیا۔ تاہم میں نے اسے ایک آزمائش میں ڈال کر اپنا دوست بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میر بخش اس آزمائش میں پورا اترا تھا۔

گاڑی بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ اس وقت سہ پہر ڈھل چکی تھی اور شام کی آمد آمد تھی۔ دنیا بھر سے زیادہ ایک گھنٹے بعد رات کا اندھیرا پھیلنے لگتا۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس وقت ہم کس طرف جارہے ہیں؟"

وہ بولا "وجدان سائیں! اس وقت ہم عمر کوٹ شہر سے باہر نکلنے والے ہیں اور اتفاق سے گاڑی مین روڈ پر جارہی ہے۔ یہ روڈ عمر کوٹ سے سیدھی میرپور خاص تک جاتی ہے۔"

پھر اس نے وضاحت کی کہ عمر کوٹ کی طرح میرپور خاص بھی سندھ کا ایک ضلع ہے، بلکہ میرپور خاص ڈویژن ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے پوچھا "اس سڑک کے علاوہ عمر کوٹ سے کتنی سڑکیں نکلتی ہیں اور وہ کون کون سی سمت کو جاتی ہیں؟"

میں اپنی معلومات بڑھانے کی غرض سے سوال کررہا تھا۔ میر بخش نے جواب دیا "عمر کوٹ شہر سے چھ سات سڑکیں نکلتی ہیں جن میں سے اکثر پختہ اور ایک دو نیم پختہ ہیں۔ ایک نیم پختہ سڑک تو وہی ہے جس پر سفر کرتے ہوئے ہم دھرمسال سے یہاں پہنچے تھے۔ ایک سڑک سیدھی کھوکھراپار بارڈر تک جاتی ہے۔ ایک "ڈھورو نارو" سے ہوتے ہوئے ضلع سانگھڑ میں داخل ہوتی ہے۔ ایک عمر کوٹ سے سیدھی مغرب میں "سامارو" سے گزر کر میرپور خاص چلی جاتی ہے اور ایک سڑک جنوبی سمت میں "نبی سر" اور "سیڈو" وغیرہ سے گزرتے ہوئے میرپور خاص کے انتہائی جنوب میں پہنچ جاتی ہے۔"

میر بخش کی فراہم کردہ معلومات نے گرد و پیش کا مکمل نقشہ میرے ذہن میں ابھار دیا۔ میں نے اس سے پوچھا "جس سڑک پر ہم محوِ سفر ہیں اس پر میرپور خاص سے پہلے کون کون سے مقامات آئیں گے؟"

"ابھی چند منٹ میں ہم "صوفی فقیر" نامی ایک مقام سے گزرنے والے ہیں۔" اس نے بتایا "اس کے بعد "اکڑی" نامی گاؤں آئے گا پھر "شادی پلی" اور اس کے بعد ہم ضلع میرپور خاص میں داخل ہوجائیں گے۔ شادی پلی نامی قصبہ عمر کوٹ اور میرپور خاص کی ضلعی سرحد کے بہت قریب ہے۔ اگر ہم اسی طوفانی رفتار سے ڈرائیونگ کرتے رہے تو مغرب کے بعد شادی پلی میں ہوں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ بات کرتے ہوئے میر بخش دھیرے دھیرے کراہ بھی رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے بازو میں تکلیف بڑھ رہی ہے۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے میر بخش!"

"کچھ نہیں سائیں۔" وہ پٹی والا بازو دباتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "تم نہ بھی بتاؤ تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ تمہارے زخمی بازو میں تکلیف ہے۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔

میں نے ڈرائیونگ پر نگاہ مرکوز رکھتے ہوئے اس کا دھیان بٹانے کی خاطر پوچھا "میرپور خاص سے کراچی جانے کے لیے ہمیں کون سا روٹ اختیار کرنا ہوگا؟"

وہ بولا "اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم میرپور خاص شہر میں پہنچیں گے جو کہ ضلع کا شمالی حصہ ہے۔ وہاں سے حیدر آباد اور پھر کراچی لیکن..."

اس نے اسپیڈو میٹر کی جانب دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "لیکن کیا میر بخش؟"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری گاڑی میں پیٹرول بہت کم رہ گیا ہے۔" وہ فیول بتانے والے ڈائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "میرپور خاص میں ہمیں ٹنکی فل کروانا ہوگی۔"

"کروالیں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تمہارے پاس کچھ رقم تو ہوگی؟"

اس نے بتایا "ہاں سائیں! میں آپ کی طرف آتے ہوئے اپنی جمع پونجی بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ کم از کم دس ہزار روپے تو ہوں گے اس وقت میرے پاس۔"

"تم نے کل شام مجھے جو دو ہزار روپے دیے تھے ان میں سے کچھ رقم میرے پاس بھی بچی ہوئی ہے۔" میں نے بتایا "میرا خیال ہے، اچھا گزارہ ہوجائے گا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں۔" پھر اس نے پوچھا "آپ کا آگے کا کیا پروگرام ہے سائیں؟"

میں نے کہا "فی الحال تو ہم کراچی جائیں گے۔ وہاں کچھ قیام کرنے کے بعد پھر لاہور جانا ہے۔"

"یعنی اب آپ وڈیرا اکبر سومرو کی طرف نہیں جائیں گے!"

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا "میں جس مقصد کی خاطر وڈیرے کے بنگلے پر جانا چاہتا تھا وہ مقصد تو پورا ہوگیا۔ اکبر سومرو سے نہ تو میری کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی دوستی۔ میں تو وہاں اس لیے جارہا تھا کہ اس کے مہمان دوست کا "دیدار" کرسکوں۔ وہ بے چارہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں سے، مجھ سے ملنے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ تارا نے ہوٹل تک پہنچ کر میرا کام آسان کردیا۔ میں تارا اور اس کے مشن سے بخوبی آگاہ ہوگیا ہوں اس لیے واپس جانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ وہ بولا "وجدان سائیں! آپ نے تو تارا کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی ہے۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوگا۔"

"وہ نکل کھڑا ہوا نکل بیٹھ جائے یا پھر نکل لیٹ جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے گاڑی کی اسپیڈ کو کچھ اور بڑھاتے ہوئے کہا "جب تک وہ ہمارے تعاقب کے قابل ہوگا، ہم اس کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! ہمیں ہر صورت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یامی شاہ اور تارا جیسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔"

"ان کی ساری خطرناکی تو میں نے ہوٹل کے کمرے میں ناک کے راستے نکال دی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "اگر آئندہ انہوں نے میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو رہی سہی کسر بھی پوری کردوں گا۔"

میر بخش نے اپنی دانست میں ایک اہم پہلو کی جانب میری توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ "وجدان سائیں! جب ہم ہوٹل کے کمرے سے نکلے تھے تو تارا کا ایک ساتھی نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد دوسروں کو بھی ہوش میں لانے کی ترکیبیں آزمائے گا اور پھر ہوٹل کے باہر جو لوگ جمع تھے وہ..."

"وہ ہمارے وہاں سے نکلتے ہی کمرے کی جانب بڑھ گئے جن میں ہوٹل کے عملے کے لوگ بھی شامل تھے!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "چنانچہ ہمیں اپنے تعاقب سے محتاط رہنا چاہیے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! آپ نے تو ذرا ذرا سی بات پر توجہ رکھی ہے۔"

"رکھنا پڑتی ہے میر بخش!" میں نے کہا "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، میں نے تو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور خون ریز صورتِ حال کا متعدد بار سامنا کیا ہے اور ہمیشہ حاضر دماغ رہا ہوں۔"

"ہاں سائیں۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا "حاضر دماغی اس قسم کے معاملات میں بہت ضروری ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے، تارا، یامی شاہ اور موسیٰ میں سے از خود کوئی ہوش میں آنے والا نہیں۔ وہ مزید دو تین گھنٹے "آرام" فرمائیں گے۔ البتہ نیم بے ہوش یا نیم ہوش مند عبداللہ اور ہوٹل کے عملے سے چند بعید نہیں۔ وہ یقیناً بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی کوشش کریں گے۔ یامی شاہ وغیرہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔" میر بخش تائیدی لہجے میں بولا "میں تو سمجھتا ہوں، ہمیں جلد از جلد بہت دور نکل جانا چاہیے۔"

"ہوں۔" میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ ایک ممکنہ حد تک مزید بڑھادی اور کہا "ہم اس گاڑی کو میرپور خاص پہنچ کر کسی ایسی جگہ چھوڑ دیں گے جہاں سے فوری طور پر نظر میں نہ آسکے۔ میں نے سوچا ہے، آگے کا سفر ہم کسی بس وغیرہ میں کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "سائیں! یہ آئیڈیا بہت اچھا ہے۔" پھر چونکنے والے انداز میں بولا "اگر آپ میری بات مانو سائیں تو ہم اور بھی محفوظ سفر کرسکتے ہیں۔"

"ہاں کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو!"

اس نے کہا "اس لغنتی گاڑی کو تو ہم میرپور خاص میں کہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے پھر پبلک ٹرانسپورٹ سے ہم حیدر آباد تک سفر کریں گے اور حیدر آباد سے آگے ٹرین کے ذریعے کراچی تک چلے جائیں گے۔"

"تمہاری تجویز میں جان ہے میر بخش۔" میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا "لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ اس وقت حیدر آباد سے کراچی کے لیے ہمیں ٹرین مل جائے گی؟"

"سائیں!" وہ پُر یقین انداز میں بولا "کراچی میں داخل ہونے والی آخری ٹرین "شالیمار ایکسپریس" ہے جو لاہور سے علی الصباح چلتی ہے اور لگ بھگ آدھی رات کو کراچی پہنچتی ہے۔ مجھے امید ہے، جب ہم حیدر آباد پہنچیں گے تو اس ٹرین کا وقت ہوچکا ہوگا۔ ہم بہ آسانی حیدر آباد اسٹیشن سے شالیمار پکڑ سکتے ہیں۔"

"چلیں دیکھتے ہیں، آگے کیا صورتِ حال پیش آتی ہے۔" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "پہلے عمر کوٹ سے تو نکل جائیں۔"

میر بخش ایک مرتبہ پھر اپنے گھائل بازو کو دبانے لگا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کے درد میں اضافہ ہورہا تھا اور تکلیف برداشت کی حد سے آگے گزر رہی تھی۔ ہم کافی دیر پہلے "صوفی فقیر" کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور "اکڑی" کے نزدیک پہنچنے والے تھے۔ اکڑی کے بعد "شادی پلی" کا سرحدی سفر تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر بدستور نظر مرکوز رکھتے ہوئے میر بخش سے گفتگو جاری رکھی اور کہا "میر بخش! میں جانتا ہوں، تم بازو کی تکلیف کے باعث بڑی اذیت میں ہو لیکن تم فکر نہ کرو، میرپور خاص پہنچتے ہی میں سب سے پہلے تمہاری مرہم پٹی کرواؤں گا۔ اس کے بعد ہی ہم آگے کا قصد کریں گے۔"

وہ بولا "سائیں! پٹی تو آپ نے کردی ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے زخمی بازو کی طرف اشارہ کیا اور کہا "اگر مزید کچھ ضرورت ہوئی تو کراچی جاکر دیکھ لیں گے۔"

میں نے کہا "میں باقاعدہ مرہم پٹی کی بات کررہا ہوں۔ یہ اسکارف تو ہنگامی حالات کیلئے تمہارا خون روکنے کے لیے باندھا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے، تم بچ گئے ورنہ گولی اگر تمہارے جسم کے کسی نازک حصے میں پیوست ہوجاتی تو اس وقت تم زندہ حالت میں میرے ساتھ سفر نہیں کررہے ہوتے۔"

"اللہ سائیں کے کام بہت نرالے ہیں وجدان سائیں۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "اللہ جسے رکھے اسے کون چکھے سائیں۔"

میں نے تصدیقی لہجے میں کہا "یہ بات تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو میر بخش! میں بھی بارہا موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا ہوں۔ اس لیے بجا ہوں کہ میری زندگی ابھی باقی تھی۔ زندگی اس لیے باقی تھی کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ صاحبِ قدرت اور طاقت ور ہے۔ واقعی، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

میں نے اپنی بات کے اختتام میں میر بخش کے الفاظ دہرائے تو وہ خوش ہوگیا، بولا "وجدان سائیں! وہاں ہوٹل میں جب آپ تارا سے گفتگو کررہے تھے تو چوہدری ملک نوازش علی اور دارا کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھاری مالیت کے سونے کا تذکرہ بھی میں نے سنا تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتاؤ۔ اب تو سائیں، میرا جینا مرنا آپ ہی کے ساتھ ہے۔"

میں نے میر بخش کو ایک کڑی آزمائش میں ڈال کر رُلایا تھا۔ اس نے سچا دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا چنانچہ میں نے گفتگو کو حذف کرتے ہوئے میں نے میر بخش کو چوہدری نوازش علی سے اپنی اور اپنے والدین کی دشمنی کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ دارا اور سونے کا ذکر بھی آیا اور میں نے میر بخش کو بتایا کہ چوہدری کے ہرکارے دارا نے کس طرح ایک طویل عرصے تک میرا جینا محال کیے رکھا تھا۔ سنگاپور، بنکاک اور ہندوستان و نیپال وغیرہ میں ہونے والے معرکے بھی زیرِ بحث آئے پھر ہمالیہ کی گود میں واقع سنکری مندر والا واقعہ بھی میں نے میر بخش کو بتایا۔ اس نے میرے جاں نثار ساتھیوں کے بارے میں متعدد سوالات کیے اور میں اسے ڈاکٹر جانکی، چترا پریتم، ٹھاکر بھوانت سنگھ اور دیگر ساتھیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اسی دوران میں رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ ہم "اکڑی" نامی مقام کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب "شادی پلی" ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر مزید کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی اور ہم "شادی پلی" سے گزر کر ضلع عمر کوٹ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اس سے آگے ضلع میرپور خاص کی حدود شروع ہوجاتی تھی۔ اس ضلعی سرحد پر ہمیں رکنا پڑا۔ ہم سے آگے بھی آٹھ نو مختلف قسم کی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ آثار سے یہی لگتا تھا، وہاں کسی قسم کی چیکنگ ہورہی تھی۔

جیسے ہی میں نے ایک جیپ کے پیچھے اپنی گاڑی روکی، میں چونک اٹھا۔ ضلعی سرحد پر مجھے پولیس کی بھاری جمعیت نظر آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے محسوس ہوگیا کہ وہاں پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔

میر بخش بھی صورتِ حال کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی اس نظر میں سیکڑوں سوال تھے اور سب سے اہم سوال یہی تھا کہ آیا یہ ناکا ہمیں گھیرنے کے لیے لگایا گیا تھا!

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "تم گاڑی ہی میں بیٹھو۔ میں نیچے اتر کر سن گن لیتا ہوں۔"

اس وقت تک اندھیرا خاصا گہرا ہوچکا تھا۔ میر بخش چاروں جانب دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "وجدان سائیں! اگر یہ سارا اہتمام ہماری خاطر ہے تو پھر اس صورتِ حال میں آپ کا کیا حکم ہے؟"

"میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "ایک بات تو طے ہے، ہمیں پولیس سے کوئی پنگا نہیں لینا چاہیے۔ پہلے کسی طرح میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہورہی ہے۔ اگر واقعی یہ ہماری خاطر ہے تو پھر پولیس والوں سے بات کرکے دیکھ لیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی۔"

میر بخش نے کہا "مجھے تو حیرت ہورہی ہے، پولیس والوں کو اتنی جلدی ہمارے فرار کی خبر کس طرح ہوگئی اور عمر کوٹ سے اتنی دور میرپور خاص کے بارڈر پر انہوں نے ناکا لگالیا ہے۔"

"تمہیں اس سلسلے میں قبل از وقت حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں میر بخش۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "ابھی یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ پولیس والے ہمارے ہی استقبال کے لیے یہاں موجود ہیں اور رہی یہ بات کہ انہوں نے بارڈر پر ناکا کیوں لگایا ہے تو اس کا سبب بھی بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔"

میں ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے لگا تو میر بخش نے کہا "سائیں! آپ نے ہوٹل کے کمرے میں پستول کو خالی کرکے میگزین (کلپ) اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اگر آپ وہ میگزین مجھے دے دیں تو میں پستول کو بھر کر "مفید تر" بنا سکتا ہوں۔"

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد گولیوں والا کلپ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھادیا اور تجسس انداز میں کہا "ٹھیک ہے، تم پستول کو لوڈ کرلو لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اس کا استعمال انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں کیا جائے گا اور وہ بھی ایک حد تک۔ میں خوامخواہ کسی انسان کی جان لینے کے حق میں نہیں ہوں اور خاص طور پر قانون کے محافظوں سے تو ہمیں کوئی دشمنی مول نہیں لینا۔"

"آپ بے فکر رہو سائیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ، آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

جب سے میں نے گاڑی روکی تھی، ساحل کو میں نے بے قرار پایا تھا۔ بیک ویو مرر میں، میں اس کے چہرے کے تاثرات کو بڑی وضاحت سے پڑھ چکا تھا۔ ہمارے درمیان موجود مضبوط شیشے کی وجہ سے بات چیت نہیں ہوسکتی تھی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ گاڑی سے اتر کر ساحل کے پاس جاؤں اور اسے ہوشیار رہنے کی تاکید بھی کردوں۔ ڈرائیونگ کیبن اور گاڑی کے پچھلے حصے میں ہلکی لائٹ موجود تھی جس میں گاڑی کے اندرونی ماحول کو بہ آسانی دیکھا اور سمجھا جاسکتا تھا۔

میں نے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی گاڑی سے پاؤں باہر نکالا' کسی گن کی سرد نال میرے دائیں کندھے سے پیوست ہوگئی۔ میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگیا پھر اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو سمجھ پاتا' نہایت ہی سفاک لہجے میں مجھے حکم دیا گیا۔

"شرافت سے اندر بیٹھو۔"

اس کے ساتھ ہی کندھے کو نال سے ٹہوکا بھی دیا گیا۔ میں نے باہر نکلے ہوئے پاؤں کو واقعی "شرافت" سے گاڑی کے اندر پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص نے دھڑ سے گاڑی کا دروازہ بند کردیا جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔

اب میں نے گردن گھما کر بغور اس شخص کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر سجے لباس سے میں نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا۔ وہ اندھیرے سے اچانک ہی نمودار ہو کر میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی جو اب میرے کندھے سے ہٹ چکی تھی۔ تاہم اس کی نال کا رخ ہنوز گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف تھا۔

"تم زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو۔" اس مسلح پولیس والے نے تحکمانہ انداز میں کہا "پیچھے دور تک ہمارے مسلح جوان موجود ہیں۔ تم فرار نہیں ہوسکو گے۔"

میں نے اس کے شانے پر سجے "پھولوں" سے اندازہ لگایا کہ وہ اے ایس آئی رینک کا پولیس افسر تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔

"اے' ایس آئی صاحب! میں کہیں فرار ہونے کی کوشش نہیں کررہا ہوں۔"

"تم مجھے چکر نہیں دے سکتے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں' تم مجھے شک کی نظر سے کیوں دیکھ رہے ہو۔" میں نے کہا "میں تو باہر نکل کر گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف جارہا تھا۔ وہاں ہماری ایک ساتھی موجود ہے۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

وہ خشک لہجے میں بولا "تمہیں جس کسی سے جو بھی ضروری بات کرنا ہے' وہ چیکنگ کے بعد کرنا۔ فی الحال چپ چاپ گاڑی کے اندر بیٹھے رہو۔"

"ٹھیک ہے سائیں۔" میں نے نہایت فرماں برداری سے کہا "اب میں یا میرا کوئی ساتھی گاڑی سے باہر قدم نہیں نکالے گا۔ پلیز یہ تو بتادو' یہ چیکنگ وغیرہ کس سلسلے میں ہورہی ہے؟"

اے ایس آئی نے میرے برابر میں بیٹھے ہوئے میر بخش کو بغور دیکھا۔ خدا کا شکر ہے' میر بخش نے اس وقت گہرے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ساحل نے اس کے بازو پر باندھنے کے لیے جو اسکارف دیا تھا وہ بھی نیوی بلیو کلر کا تھا۔ چنانچہ پہلی نظر میں یہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کے بازو پر کوئی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اے ایس آئی نے میر بخش پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر گاڑی کے عقبی حصے میں جھانکنے لگا جہاں ساحل موجود تھی۔ اس سفر کے دوران میں گاڑی کا ائرکنڈیشنر آن نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے حصے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی ہم جن حالات میں ہوٹل سے نکلے تھے اس میں ائرکنڈیشنر کے آن یا آف کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم "جو ہے' جہاں ہے' جیسا ہے" کی بنیاد پر گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے۔ تارا اور اس کے ساتھیوں نے گاڑی کو جیسے وہاں چھوڑا تھا' ہم اسے اسی حالت میں لے کر آگے بڑھ گئے تھے۔

اے ایس آئی گاڑی کے لحاتی معائنے کے بعد "ریڈ الرٹ" ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اس نے ہم میں اور گاڑی میں کوئی خاص بات نوٹ کی تھی جبھی وہ کلاشنکوف کو بھی زیادہ احتیاط سے تھام کر کھڑا ہوگیا تھا۔

میں نے بدستور نرم لہجے میں اپنا سوال دہرایا "سائیں! آپ نے بتایا نہیں' یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہورہی ہے؟"

"یہ بات تمہیں ڈی ایس پی صاحب بتائیں گے۔" وہ سپاٹ آواز میں گویا ہوا۔

"ڈی ایس پی صاحب کیوں؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے بتایا "وہ اس لیے کہ یہ چیکنگ انہی کی نگرانی میں ہورہی ہے۔"

"مگر چیکنگ کس بات کی ہورہی ہے؟"

وہ دائیں بائیں محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا "ڈی ایس پی صاحب کو ایک گاڑی کی تلاش ہے۔ ایسی گاڑی جس میں تین افراد موجود ہوں۔ ایک لڑکی دو مرد!"

اتنا کہہ کر اس نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کے عقبی حصے میں جھانکا۔ اے ایس آئی کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے بے چین کررہی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں کرید جاری رکھی۔ اس دوران میں ایک گاڑی کو

چیک کرکے جانے کی اجازت دی جاچکی تھی۔ چنانچہ مجھے اپنی گاڑی کو تھوڑا آگے بڑھانا پڑا۔ اے ایس آئی اب مائل بہ گفتگو نظر آرہا تھا۔

میں نے دوبارہ گاڑی روکنے کے بعد اے ایس آئی سے کہا "سائیں! اس گاڑی میں ہم بھی تو تین ہی ہیں۔ ایک لڑکی اور دو مرد۔ کیا تمہارے ڈی ایس پی صاحب کو ہماری ہی تلاش ہے؟"

"اگر تم لوگ ڈاکو ہو تو پھر تم ہی ڈی ایس پی صاحب کے مطلوبہ افراد ہو۔" اس نے محتاط لہجے میں بتایا "انہیں دو ڈاکوؤں اور ایک مغویہ کی تلاش ہے۔"

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اے ایس آئی کی بات سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ "ناکا" ہمارے لیے نہیں بلکہ ڈاکوؤں کی گرفتاری اور کسی مغویہ کی دستیابی کے لیے لگایا گیا تھا۔ میری طرح میر بخش نے بھی سکون کی سانس لی۔ اب میں پہلے سے زیادہ پراعتماد ہوچکا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں! آپ بھی عجیب بات کررہے ہو۔ کیا ہم آپ کو ڈاکو نظر آتے ہیں؟"

وہ غصے سے بولا "نہ بابا' اکڑ کیوں رہے ہو۔ اگر تم لوگ ڈاکو نہیں ہو تو آرام سے بیٹھو۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ انہوں نے تو دو خطرناک ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے ناکا لگایا ہے جو بھیس بدل کر فرار ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"اور یہ مغویہ لڑکی کا کیا چکر ہے سائیں؟" میں نے نرم لہجے میں کرید جاری رکھی۔

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا "ممتاز نامی ایک لڑکی کو خطرناک ڈاکو منگل سنگھ نے اغوا کرلیا تھا جس کی رہائی کے عوض اس نے لڑکی کے باپ سے پچاس لاکھ روپے مانگے تھے۔ لڑکی کا باپ ڈاکو کی دھمکیوں میں نہ آیا اور اس نے فی الفور پولیس سے مدد طلب کرلی۔ سننے میں آیا ہے' لڑکی کے باپ کا کوئی رشتے دار پولیس میں ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس نے پولیس میں رپورٹ کردی تھی۔" ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "منگل سنگھ لڑکی کو اغوا کرکے گھنے جنگلات میں لے گیا تھا۔ پولیس نے وہاں پہنچ کر کامیاب چھاپا مارا مگر منگل سنگھ لڑکی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اب پتا چلا ہے' وہ بھیس بدل کر میرپور خاص کی طرف نکلنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک ساتھی بھی ہمراہ ہے اور وہ تینوں ایک گاڑی میں سوار ہیں۔"

اے ایس آئی نے اپنی بے دھیانی میں کافی مفید معلومات فراہم کردی تھیں۔ ہمیں جو شک ہوا تھا' معاملہ اس کے بالعکس نکلا تھا۔ وہ ناکا ہمیں گھیرنے کے لیے نہیں بلکہ کسی منگل سنگھ نامی ڈاکو کو گرفتار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اندرون سندھ میں ہندو اچھی خاصی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کا مکمل دخل ہے۔ خاص طور پر انڈیا اور پاکستان کے بارڈر پر جو علاقے پائے جاتے ہیں وہاں ہندو اور مسلمان لگ بھگ برابر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض جگہ تو وہ مسلمانوں سے زیادہ طاقت میں ہیں۔

میں نے بھولے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "سائیں آپ کا عہدہ تو میں جان چکا ہوں۔ آپ اے ایس آئی ہو۔ ذرا یہ بھی بتا دو' آپ کا نام کیا ہے؟" پھر میں نے مسکھن لگاتے ہوئے کہا "ویسے آپ کے بدن پر پولیس کی وردی خوب جچ رہی ہے۔"

وہ خوش ہوگیا اور جوش بھرے لہجے میں پوچھنے لگا "آپ کو میرے عہدے کا کیسے پتا چلا؟"

"سائیں! آپ کے شولڈر کے پھول بول رہے ہیں۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مجھے گاڑی تھوڑی اور آگے بڑھانا پڑی۔ ہماری گاڑی جس مقام پر کھڑی تھی وہ جگہ اندھیرے میں تھی جبکہ ناکے والے مقام پر کچھ روشنی نظر آرہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اے ایس آئی کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔

میں نے اے ایس آئی کو یاد دلاتے ہوئے کہا "سائیں! آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

"میں جمشید ہوں۔" وہ بولا "اے ایس آئی جمشید احمد۔"

میں نے پوچھا "جمشید سائیں! لگتا ہے' پولیس کی خاصی بھاری نفری یہاں موجود ہے!"

"ہاں سائیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "ڈی ایس پی صاحب تو ہیں ہی۔ ان کے علاوہ "شادی پلی" کا تھانہ انچارج' دو اے ایس آئی' ایک ایس آئی اور درجن بھر کانسٹیبل بھی اس مشن میں شامل ہیں جو سب کے سب مسلح اور چوکس ہیں۔ ایس پی عمرکوٹ کی جانب سے بڑے سخت آرڈرز آئے ہیں اسی لیے منگل سنگھ کی گرفتاری کے لیے ڈی ایس پی صاحب خود موقع پر موجود ہیں۔"

میں نے کہا "اس تیاری سے تو لگتا ہے' منگل سنگھ ڈاکو

پولیس کے لیے بہت اہم ہے!"

"بہت اہم سائیں۔" اس نے تائید کی "ممتاز نامی لڑکی کسی صاحب حیثیت شخص کی بیٹی ہے اور اس نے پولیس میں بہت اوپر سے سورس لگائی ہے۔ ویسے بھی پولیس منگل سنگھ کو کافی عرصے سے تلاش کررہی تھی۔ اس کے کھاتے میں ڈکیتی' اغوا اور قتل جیسی کئی سنگین وارداتیں لکھی ہوئی ہیں۔ پولیس نے سرگرمی دکھاتے ہوئے اس کے ڈیرے پر چھاپا مارا تو وہاں اچھی خاصی مارا ماری ہوگئی جس کے نتیجے میں منگل سنگھ کے تین ساتھی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ منگل سنگھ اپنے ایک ڈاکو ساتھی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ مفوبہ ممتاز اسی کے قبضے میں ہے۔ پولیس نے اپنی خفیہ تحقیق سے یہ معلوم کرلیا کہ منگل سنگھ بھیس بدل کر عمرکوٹ سے میرپور خاص جانا چاہتا ہے چنانچہ ایس پی صاحب کے فوری احکام پر ڈی ایس پی صاحب نے دونوں اضلاع کی سرحد پر ناکا لگایا ہے۔"

اے ایس آئی جمشید احمد ہماری جانب سے مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہم منگل سنگھ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اسی لیے وہ مجھ سے گپ شپ کررہا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ منگل سنگھ یا اس کے ساتھی سے ہماری آشنائی نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے قبضے میں ممتاز نامی کوئی لڑکی تھی۔ اگر ساحل کو ممتاز فرض کر بھی لیا جاتا تو ایک مفوبہ کو اتنی آزادی سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے نہیں ہونا چاہیے تھا پھر جب سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اس "چیکنگ" کا ہماری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے' اس وقت سے میں بڑے اعتماد کے ساتھ اے ایس آئی سے گفتگو کررہا تھا۔ ہمیں ایک شعوری اطمینان حاصل ہوچکا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو ٹٹولنا جاری رکھا اور پوچھا "یہ ڈاکو منگل سنگھ کوئی سکھ ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں' منگل سنگھ ہندو ہے۔" اے ایس آئی نے بتایا۔

میں اور انجان بن گیا اور الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا "سنگھ اور ہندو! یہ کیا چکر ہے جمشید سائیں؟"

اس نے میری معلومات اور توقع کے مطابق جواب دیا "سنگھ ایک کاسٹ (ذات) ہے۔ سنگھ کوئی ہندو بھی ہوسکتا ہے اور کوئی سردار جی بھی۔ منگل سنگھ ہندو ہے۔ ادھر کنری کے جنگلات میں اس نے اپنا ڈیرا بنا رکھا ہے۔ چوری' ڈکیتی اور اغوا جیسے کئی مقدمات میں وہ ملوث ہے اور کبھی پکڑا نہیں گیا لیکن اب بچ کر نہیں جاسکے گا۔ اس کے تین ساتھی ہلاک ہوچکے ہیں جبکہ چوتھا ساتھی اس کے ہمراہ ہے۔"

میں نے پوچھا "سائیں! آپ بتا رہے ہو' منگل سنگھ نے کسی صاحب حیثیت شخص کی بیٹی ممتاز کو اغوا کر رکھا ہے لڑکی کا باپ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟"

میں نے محسوس کیا کہ اب وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بوریت محسوس کررہا تھا۔ اس نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا "ممتاز کے باپ کا نام قاضی سلطان ہے اور وہ "نئی سر" میں رہتا ہے۔ ممتاز اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"کیا خیال ہے سائیں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا "یہ قاضی سلطان نے اس معاملے میں پولیس کو ملوث کرکے بے وقوفی کا ثبوت نہیں دیا۔ اگر وہ صاحب حیثیت اور مال دار اسامی ہے تو اسے بیٹی کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے تھا... اور وہ بھی اکلوتی بیٹی۔ پچاس لاکھ کی رقم بیٹی سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھی؟"

اے ایس آئی جمشید چونکہ پولیس والا تھا اس لیے پولیس سے متعلق میرا اظہارِ خیال اسے کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ برا سا منہ بناتے ہوئے اس نے کہا۔

"سائیں! یہی بات تو آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کون سی بات جمشید سائیں؟"

"نہ بابا' آپ لوگوں نے پولیس کو پتا نہیں کیا سمجھ رکھا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا "اگر قاضی سلطان نے بیٹی کی واپسی کے لیے پولیس کی مدد حاصل کی ہے تو اس میں بے وقوفی والی کون سی بات ہے۔ پولیس کا تو کام ہی عوام کی مدد کرنا ہے۔"

میں نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں' پولیس کا کام عوام کی مدد بلکہ خدمت کرنا ہے مگر بے وقوفی سے میری مراد یہ تھی کہ اس طرح ڈاکو منگل سنگھ طیش میں آکر ممتاز کو بھی قتل کرسکتا ہے۔ آپ بتا چکے ہیں' اس کے کھاتے میں کئی قتل لکھے ہوئے ہیں۔"

اس نے بغور میرا جائزہ لیا اور کہا "لگتا ہے' تمہیں ڈاکوؤں کی اغوا کنندگان کی نفسیات وغیرہ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بابا' اگر قاضی سلطان' منگل سنگھ کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے اسے پچاس لاکھ روپے دے بھی دیتا تب بھی منگل سنگھ ممتاز کو زندہ نہ چھوڑتا۔ تم کو کچھ پتا نہیں ان ڈاکوؤں کے بارے میں۔"

"ٹھیک کہتے ہو سائیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت اے ایس آئی کو ایک ایسی بات یاد آگئی جو بہت پہلے یاد آنا چاہیے تھی۔ وہ اب تک میرے سوالات کے جواب دے رہا تھا حالانکہ پولیس افسر ہونے کے ناتے اسے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردینا چاہیے تھی۔ پتا نہیں' وہ کس قسم کا اے ایس آئی تھا۔ خیر' باتونی قسم کے افراد اس طرح کی حماقتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ اے ایس آئی بلاشبہ ایک باتونی شخص تھا جو میری باتوں میں لگ کر اپنے مقصد سے ہٹ گیا تھا۔ اب وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہوگیا اور اس نے پوچھا۔

"تم لوگ کدھر سے آرہے ہو سائیں؟"

میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا "ہم عمرکوٹ شہر کی طرف آرہے ہیں۔"

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"میرپور خاص جائیں گے۔" میں نے بتایا۔

اس نے مزید پوچھا "عمرکوٹ کے رہنے والے ہو یا میرپور خاص کے؟"

میں نے کہا "عمرکوٹ میں میرے رشتے دار رہتے ہیں۔ میں ان سے مل کر میرپور خاص جارہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' میرپور خاص کے رہنے والے ہو؟" اے ایس آئی نے سوال کیا۔

میں نے بتایا "میں دراصل کراچی کا رہنے والا ہوں۔ میرپور خاص میں بھی میرے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ میں آج کی رات میرپور خاص میں ان رشتے داروں کے پاس گزاروں گا۔ کل صبح ہم کراچی روانہ ہوجائیں گے۔"

"کراچی میں آپ کیا کرتے ہو سائیں؟"

اے ایس آئی نے ایک خطرناک سوال کرڈالا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب دیتا' اس کی پکار پڑگئی۔ سندھی لب ولہجے میں کسی نے بآوازِ بلند اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ اے ایس آئی جمشید احمد اس پکار کی جانب لپک گیا اور میں نے سکون کی سانس لی۔ اسی وقت مجھے اپنی گاڑی کو تھوڑا اور آگے بڑھانا پڑا۔

میر بخش نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔ "وجدان سائیں! یہ اے ایس آئی تو خوامخواہ چپک کر رہ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے' دفع ہوگیا۔ میں تو دل ہی دل میں پریشان ہورہا تھا۔ ویسے سائیں' ایک بات کا تو اطمینان ہوگیا۔"

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ یہاں کی "چیکنگ" سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "اے ایس آئی اپنے باتونی پن میں ہمیں بہت مفید معلومات فراہم کرگیا ہے۔ منگل سنگھ اور ممتاز نامی لڑکی کی کہانی خاصی اہم اور سنسنی خیز ہے۔ ایک بات یاد رکھنا میر بخش!" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "اگر تم چاہتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہو تو اپنے گردوپیش کے حالات وواقعات سے باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔ اے ایس آئی نے پندرہ بیس منٹ تک جو بک بک کی ہے اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ منگل سنگھ کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کسی بھی مرحلے پر ہمارے کام آسکتی ہیں۔"

وہ پوری بات سننے کے بعد بولا "میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا لیکن اس وقت تو میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں ہمارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تارا یا یامی شاہ وغیرہ میں سے کسی کو ہوش آگیا ہوگا اور انہوں نے فون کے ذریعے یا کسی اور طرح پولیس کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔"

"اس حوالے سے ابھی زیادہ مطمئن ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ ناکا اگر ہمارے لیے نہیں لگایا گیا تو کسی بھی وقت کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے واسطہ پڑسکتا ہے۔"

"آپ کیوں ڈرا رہے ہو سائیں!"

"میں ڈرا نہیں رہا بلکہ حقیقت بیان کررہا ہوں۔"

وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا "کبھی بھی اور کسی بھی حال میں مطمئن ہوکر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ ہم جس راہ کے مسافر ہیں وہ اتنی پرپیچ و پرخار ہے کہ اس پر چلتے ہوئے کہیں بھی' کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ہمیں اپنے دشمنوں کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں برتنا چاہیے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا "اب چند باتیں نہایت ہی اہم اور موقع محل کی مناسبت سے ہوجائیں۔" میرا جملہ ختم ہوا تو میر بخش نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے پوچھا "میر بخش! اے ایس آئی جمشید احمد کی آمد سے قبل میں نے تمہیں اعشاریہ تین آٹھ کی گولیوں والا کلپ دیا تھا' وہ کہاں ہے؟"

اس نے اپنی دائیں ران کے نیچے ہاتھ گھمایا اور مذکورہ کلپ برآمد کرتے ہوئے بولا "میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اسے چھپا دیا تھا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا پھر پوچھا "اور وہ خالی پستول کہاں ہے؟"

اس نے اپنے لباس سے وہ پستول نکال کر میرے حوالے کردیا۔ میں نے پستول اور گولیوں والا کلپ ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے دبادیا اور میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے جمشید کی باتیں سن لی ہیں۔ اس وقت موقع پر ڈی ایس پی صاحب' شادی پی کا ایس ایچ او' ایک ایس آئی' دو اے ایس آئی اور دو رجن بھر کانسٹیبل موجود ہیں اور ایک بات ذہن نشین کرلو کہ تمام افراد اے ایس آئی جمشید کی طرح باتونی اور احمق نہیں ہوں گے۔ اس نوعیت کا کوئی ایک "پیس" ہی ہوتا ہے لہٰذا....." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی اور کہا "لہٰذا ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس سے کوئی بھی قابلِ اعتراض یا قابلِ گرفت شے برآمد نہیں ہونا چاہیے۔"

میر بخش نے اثبات میں گردن ہلائی' میں نے کہا "اب میں جو کچھ کہنے جارہا ہوں' اسے غور سے سنو اور ذہن میں نقش کرلو۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میرا نام مراد ہے اور ساحل کا کلثوم اور تم۔ تم میر بخش ہی ہو۔"

میر بخش نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے اپنا بیان جاری رکھا "ڈی ایس پی اور ایس ایچ او بال کی کھال اتاریں گے اور اگر ہمارے بیان پر انہیں کسی قسم کا شک ہوگیا تو وہ ہماری کھال کے بال بھی اتار سکتے ہیں لہٰذا ہم سب کا بیان ایک جیسا ہونا چاہیے۔"

میر بخش پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں اور ساحل یعنی مراد اور کلثوم آپس میں کزن ہیں اور کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے میرپور خاص آئے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ وڈیرا اکبر سومرو سے ملنے عمر کوٹ آگئے۔ وڈیرے سے بھی ان کی دور پار کی رشتے داری نکلتی ہے۔ تم یعنی میر بخش وڈیرا اکبر سومرو کے ڈرائیور ہو اور ہم مہمانوں کو وڈیرے کی گاڑی میں میرپور خاص چھوڑنے جارہے ہو۔ راستے میں تمہارے بازو میں اچانک درد اٹھا۔ اس لیے میں بہ حالتِ مجبوری ڈرائیونگ کررہا ہوں۔ تمہارے درد والے بازو پر میں نے کس کر اسکارف باندھ دیا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "سائیں! آپ نے تو فوراً کے فوراً ایک بہت اچھی اور پُراثر کہانی تیار کرلی ہے۔ سننے والا فوراً اس پر یقین کرلے گا۔ لگتا ہے' جیسے بالکل سچی کہانی ہو!"

"ہر کہانی سچی ہوتی ہے میر بخش!" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "واقعات یا تو پیش آرہے ہوتے ہیں یا پیش آچکے ہوتے ہیں یا پھر پیش آنا ہوتے ہیں۔ یہ سب ماضی' حال اور مستقبل کا چکر ہے۔"

میر بخش عقیدت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اے ایس آئی جمشید پلٹ کر واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے آہستگی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر آگیا۔ ساحل کافی دیر سے صورت حال کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے "سب ٹھیک ہے" کہہ کر اسے اطمینان تو دلادیا تھا تاہم زبانی کلامی تسلی بھی ضروری تھی۔

میں گاڑی سے اتر کر عقبی حصے کی کھڑکی کے پاس آیا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں ساحل کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ پولیس والوں کی پوچھ تاچھ کے جواب میں ہمیں کیا کہنا ہے۔ وہ بڑی معاملہ فہم اور ذہین لڑکی تھی۔ فوراً میری بات سمجھ گئی۔ میں مطمئن ہوکر ڈرائیونگ کیبن میں آگیا۔

اے ایس آئی جمشید احمد نے جب دھمکی آمیز انداز میں مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کو کہا تھا تو ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ پیچھے دور تک پولیس کے مسلح افراد موجود ہیں لہٰذا میرے فرار کی ہر کوشش ناکامیاب بنادی جائے گی۔ میں نے اسی بات کی تصدیق کے لیے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ اگرچہ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا تاہم مجھے ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے جس سے اے ایس آئی کے دھمکی آمیز بیان کی تصدیق ہوسکتی۔ میں نے یہی سوچا کہ جمشید نے محض رعب میں لانے کے لیے وہ بات کہی ہوگی۔ پولیس والے اس قسم کے ہتھکنڈے عکس ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔

میں نے ساحل سے بات کرتے ہوئے اپنی آواز خاصی دھیمی رکھی تھی کیونکہ ہماری گاڑی کے پیچھے بھی دو گاڑیاں آکر رک چکی تھیں۔ ان میں ایک کار تھی اور دوسری پرائیویٹ بس جس میں بہت کم سواریاں تھیں۔ وہ مسافر بس آدھی سے زیادہ خالی پڑی تھی۔

میں نے جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی' مجھے اپنی گاڑی کو مزید آگے بڑھانا پڑا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ اور آئندہ کے پروگرام سے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

فاصلہ اکرکے آدھے گھنٹے بعد ہماری گاڑی کی چیکنگ کی [illegible] اب ہم اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں اچھی خاصی [illegible] میں نے دیکھا' ڈی ایس پی صاحب اپنی سرکاری [illegible] کے ساتھ ٹیک لگائے چائے نوش فرما رہے تھے جبکہ [illegible] ایچ.... شادی پی گاڑیوں کی چیکنگ کررہا تھا۔ ہم سے [illegible] والی جیپ رخصت ہوئی تو موٹی توند والا ایس ایچ او [illegible] جانب بڑھا۔ اس کی چال میں خاصی تیزی تھی اور وہ [illegible] نظر سے ہماری گاڑی کو اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔

[illegible] قریب آکر اس نے ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی [illegible] چاپ قدم بڑھائے اور مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں [illegible] چاپ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

ایس ایچ او (تھانہ انچارج) نے گاڑی کے اندر جھانکا [illegible] میر بخش کو بھی نیچے اترنے کا حکم دیا پھر اس نے گاڑی کے [illegible] حصے میں نگاہ دوڑائی۔ تاہم ساحل کو اس نے گاڑی کے [illegible] ہی رہنے دیا۔ اس کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہوگیا۔

"گاڑی کے کاغذات اور اپنا ڈرائیونگ لائسنس [illegible]" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس دوران میں دو مسلح کانسٹیبل ہمیں اپنی گنوں کے [illegible] پر رکھ چکے تھے۔ صورتِ حال خاصی نازک تھی۔ [illegible] پاس ڈرائیونگ لائسنس تو کیا' کوئی شناختی کارڈ بھی [illegible] تھا۔ یہی کیفیت ساحل کی بھی تھی۔ تاہم گاڑی کے [illegible] ڈیش بورڈ میں موجود تھے۔ میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ [illegible] کردہ کاغذات نکال لیے پھر نہایت ادب سے انہیں [illegible] انچارج کی طرف بڑھادیا۔

وہ گاڑی وڈیرا اکبر سومرو کے نام رجسٹرڈ تھی۔ تھانہ [illegible] نے کاغذات کا باریک بینی سے معائنہ کیا پھر میرے [illegible] پر نگاہ ٹکاتے ہوئے کہا "تم اکبر سومرو تو نہیں ہوسکتے۔ [illegible] کے ڈرائیور ہو؟"

"نہیں سائیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا [illegible] ہے۔" میں نے میر بخش کی طرف اشارہ کیا "اس [illegible] بخش ہے۔ یہ وڈیرا اکبر سومرو کا ڈرائیور بھی ہے اور [illegible] بنگلے پر چاکری بھی کرتا ہے۔"

[illegible] تھوڑی دیر پہلے میر بخش کو جو "کہانی" یاد کروائی [illegible] اسے وڈیرے کا ڈرائیور ہی بتایا تھا۔ ایسا میں [illegible] کیا تھا کہ وہ گاڑی وڈیرا اکبر سومرو کے نام رجسٹرڈ [illegible] صورتِ دیگر ہم پر اس گاڑی کی چوری کا شک کیا جاسکتا

تھانے دار نے میرے جواب کے بعد سوال کیا "اگر میر بخش اس گاڑی کا ڈرائیور ہے تو پھر تم ڈرائیونگ کیوں کررہے تھے؟"

اس موقع پر میر بخش نے جواب دیا "سائیں!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "عمر کوٹ سے اکڑی تک میں ہی گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے بعد میرے بازو میں اچانک درد اٹھا اور میں ڈرائیونگ کے قابل نہ رہا۔ مجبوراً مراد سائیں کو ڈرائیونگ کرنا پڑی۔ یہ دیکھیں۔" میر بخش نے اپنے بندھے ہوئے دائیں بازو کی طرف اشارہ کیا "مجھے بہت شدید درد ہورہا ہے۔ آپ اگر ہمیں جلدی جانے دو تو مہربانی ہوگی سائیں!"

"یہ کس قسم کا درد ہے میر بخش۔" تھانے دار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "جس کی تکلیف کے آثار تمہارے چہرے پر نظر نہیں آرہے؟"

"سائیں! برداشت کررہا ہوں۔" میر بخش نے دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ورنہ میرا حال تو میرے دل کو ہی پتا ہے۔ یہ درد کبھی کبھار ہوجاتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا ہے مگر وقتی فائدہ ہوتا ہے' مرض ختم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ یہ اعصابی درد ہے۔"

تھانے دار نے اس کی وضاحت سننے کے بعد کہا "تمہارے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس ہوگا؟"

میر بخش ایک لمحے کے لیے گھبرایا پھر سنبھلتے ہوئے بولا "سائیں! جلدی میں' میں اپنا لائسنس بنگلے پر بھول آیا ہوں۔"

"کوئی اور شناختی کاغذ؟"

"نہیں سائیں۔" میر بخش نے نفی میں سرہلادیا۔

اس دوران میں تھانے دار چبھتی ہوئی نگاہ سے ہم تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمارے چہروں کے پیچھے کچھ تلاش کررہا ہو۔ مجھے اس کا "دیکھنا" تشویش میں مبتلا کررہا تھا۔ اس کی نظر کا خصوصی مرکز ساحل تھی۔

وہ میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولا "تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں' اور بھی کوئی شناختی کاغذ نہیں اور تم وڈیرا اکبر سومرو کے ڈرائیور اور چاکر ہونے کے دعوے دار ہو۔ میں تمہاری بات کا کیسے یقین کراوں؟"

میر بخش سے کوئی جواب نہ بن پایا تو میں نے تھانے دار سے کہا "سر! میں مانتا ہوں' میر بخش اپنی کوتاہی سے ضروری کاغذات بنگلے پر بھول آیا ہے۔ آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں تو مہربانی ہوگی۔"

اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے ٹٹولا پھر سوال کیا "تمہارا کیا نام ہے جوان؟"

میں نے اپنا نام مراد بتایا۔

اس نے پوچھا "وہ لڑکی جو گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھی ہے، تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"وہ میری کزن ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا نام؟"

"کلثوم!" میں نے بتایا۔

"تم دونوں اس علاقے کے نہیں لگتے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر ہمارے چہروں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی اور پوچھا "کیا کہیں باہر سے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا "ہم دونوں کا تعلق کراچی سے ہے۔ میرپور خاص میں ہمارے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ ہم ان سے ملنے آئے تھے۔ یہاں عمرکوٹ کے وڈیرا اکبر سومرو سے بھی ہمارے دیرینہ خاندانی مراسم ہیں اس لیے صبح اس طرف آگئے تھے۔ وڈیرا سائیں کا ڈرائیور میر بخش ہمیں میرپور خاص چھوڑنے جارہا ہے۔ کل صبح ہم واپس کراچی چلے جائیں گے۔"

"میرپور خاص میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"رتن آباد میں۔" میں نے بتایا۔

پولیس والوں کے سوالات کا "مقابلہ" کرنے کے لیے میں نے میر بخش سے میرپور خاص کے کچھ علاقوں کے نام اور ان کے بارے میں سرسری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ انہی معلومات کی روشنی میں، میں نے ابھی تھانے دار کو جواب دیا تھا۔ "رتن آباد" میرپور خاص شہر کے قریب ہی تھا۔

"تمہارے پاس تو شناختی کاغذات ہوں گے؟" تھانے دار نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا "اتفاق سے نہیں ہیں۔"

"اور تمہاری کزن کلثوم کے پاس؟"

میں نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلادی۔

تھانے دار نے طنزیہ لہجے میں کہا "اور یہ بھی ایک اتفاق ہے؟"

اس موقع پر میں نے صورتِ حال کو سنبھالنا ضروری سمجھا اور نہایت ہی شائستہ لہجے میں کہا "تھانے دار صاحب! ہمارے شناختی کاغذات وغیرہ ہمارے سامان میں رکھے ہیں جو رتن آباد (میرپور خاص) میں ہمارے رشتے داروں کے گھر پڑا ہے۔ ہم صبح جلدی میں وہ کاغذات اپنے ساتھ رکھنا بھول گئے تھے۔"

میری وضاحت پر وہ شانت ہونے کے بجائے ہوگیا اور غصیلے لہجے میں بولا "تم دونوں صبح گھر سے نکلتے وقت اپنے شناختی کاغذات ساتھ نہ رکھ سکے اور میر بخش نامی ڈرائیور سے آتے ہوئے اپنا لائسنس اور دیگر کاغذات بھول گئے، یہ سب اتفاق ہے؟"

"آپ بلاوجہ ہم پر شک کررہے ہیں تھانے دار صاحب!" میں نے کہا۔

"بلاوجہ کے بچے!" وہ دہاڑا "یہ کیا ہے؟" اس کے ساتھ ہی اس نے ہماری گاڑی کی باڈی پر ایک زوردار لات رسید کی۔

"کیا ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

تھانے دار نے گاڑی کی باڈی پر چسپاں سرخ رنگ کے کاغذ کو کھرچا اور چیخ سے مشابہ آواز میں بولا "یہ ہے تمہارا باپ، ذرا غور سے دیکھو۔"

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ میر بخش اور ساجد کی کیفیت بھی مجھ سے ذرا مختلف نہیں تھی۔ گاڑی کی باڈی جہاں سے سرخ کاغذ کھرچا گیا تھا وہاں باڈی کا اصلی سیاہ رنگ جھانک رہا تھا۔ ہم افراتفری میں گاڑی کی اس "تبدیلی" کو ذہن میں نہیں رکھ سکے تھے۔ ہمیں عمرکوٹ سے نکلتے ہی چاہیے تھا کہ فوراً پوری گاڑی سے وہ سرخ کاغذ اتار پھینکتے یا کھرچ ڈالتے مگر اپنی بپتا میں اس طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس غفلت نے ہمیں بری طرح پھنسا دیا تھا۔

تھانے دار نے بھانپ لیا تھا کہ ہماری گاڑی پر کوئی وغیرہ چسپاں کیا گیا ہے اور اس نے اس کی عملی تصدیق بھی کردی تھی۔ اب وہ کھا جانے والی سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھنکارا "اب تم یہ کہو کہ یہ کاغذ بھی ایک اتفاق کے تحت تمہاری گاڑی سے چپک گیا ہے اور اتنی مہارت سے چپکا ہے کہ اس نے پوری گاڑی کو ڈھک کر سیاہ سے سرخ بنادیا ہے۔ کیوں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

تھانے دار کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی اور وہ طنز سے مجھے گھور رہا تھا۔

"وہ دراصل... بات یہ ہے کہ ہماری گاڑ..."

میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی ایک اور کوشش کی مگر تھانے دار نے میری بات کاٹ دی اور تحقیر آمیز لہجے میں بولا "تمہیں جو بھی بکواس کرنا ہے، ڈی ایس پی صاحب کے سامنے کرنا۔"

کے سامنے کرنا۔"

پھر اس نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ چار پولیس والے مستعدی سے ہمارے اردگرد جمع ہوگئے۔ وہ چاروں اسلحے سے لیس تھے۔ دو گن بردار کانسٹیبل پہلے ہی ہمیں ٹارگٹ بنائے ہوئے تھے۔ بعد میں آنے والے چار میں سے ایک ایس آئی (سب انسپکٹر) اور تین کانسٹیبل رینک کے تھے۔ تھانے دار نے سب انسپکٹر سے کہا۔

"تم اپنی نگرانی میں گاڑی کی مکمل تلاشی لو۔ اس سے پہلے اس لڑکی کو باہر نکال کر ایک طرف کھڑا کردو۔ ہری اپ!"

سب انسپکٹر اپنے سینئر کو سیلیوٹ کرکے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل بھی گاڑی کی طرف لپکے تھے۔ وہ خاصے جارحانہ موڈ میں تھے۔

تھانے دار نے ایک کانسٹیبل کو حکم دیا "تم میر بخش کے بازو پر بندھا ہوا کپڑا کھلواؤ۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں' اسے کس قسم کا درد ہوتا ہے!"

ان احکام کے بعد تھانے دار میری جانب متوجہ ہوگیا "تمہاری تلاشی میں خود لوں گا۔"

میں تلاشی سے نہیں گھبرا رہا تھا۔ میرے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوسکتی تھی جسے قابل دخل اندازی پولیس کہا جاسکتا۔ میرے بٹوے میں کچھ رقم موجود تھی۔ یہ وہی رقم تھی جو کل رات میر بخش نے مجھے دی تھی۔ ان دو ہزار روپوں میں سے میں نے ہوٹل کا کرایہ ادا کیا تھا یا پھر ہم نے کھانے وغیرہ میں استعمال کیے تھے۔

میری اصل پریشانی کی وجہ میر بخش تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری گاڑی کی تلاشی۔ میر بخش کے بازو کی پٹی اگر کھل جاتی تو یہ بات سامنے آنا ضروری تھا کہ وہ اسکارف وہاں کیوں باندھا گیا تھا۔ میر بخش کی قمیص کی وہ آستین شانے کے قریب سے خون میں لتھڑی ہوئی تھی اور دعوت دیتی تھی کہ بازو کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جائے۔ اگر میر بخش کی آستین الٹ دی جاتی یا اس کا بازو آستین میں سے نکال کر دیکھا جاتا تو گولی کی "کارستانی" روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی۔

گاڑی کی تلاشی اس حوالے سے ہمارے لیے مضر اور خطرناک ثابت ہوسکتی تھی کہ وہاں ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا ایک پسٹل اور لوڈڈ کلپ موجود تھا۔ پولیس والے تلاشی کے دوران میں تمام سیٹوں کو الٹ پلٹ کر ضرور دیکھتے۔ اس کے علاوہ سیاہ گاڑی پر چسپاں سرخ کاغذ کا "عقدہ" کھل چکا تھا۔ اچانک بہت سی مصیبتیں ہم پر ایک ساتھ نازل ہوگئی تھیں جن سے فوری طور پر چھٹکارا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں اگر ہر احتیاط اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس صورت حال سے دو دو ہاتھ میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا مگر میں اپنی دھرتی پر کسی بھی صورت قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہتا تھا۔

جس دوران میں تھانے دار میری تلاشی لے رہا تھا ساحل کو گاڑی سے باہر نکال کر ایک طرف کھڑا کرلیا گیا۔ دوسری جانب ایک کانسٹیبل نے میر بخش کے بازو پر بندھا اسکارف کھلوا دیا۔ اس کے بعد ہی صورت حال یکسر تبدیل سنگین ہوگئی۔ میر بخش کی جامہ تلاشی سے دس ہزار روپے برآمد کرلیے گئے۔

تھانے دار کو میری جامہ تلاشی سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ تاہم اس کی مایوسی کو اس کانسٹیبل کی آواز نے خوشی میں بدل دیا جس نے میر بخش کے بازو کا اسکارف کھولا تھا۔

"سر! یہ بندہ تو زخمی ہے۔" کانسٹیبل نے جوشیلے لہجے میں اعلان کیا۔

تھانے دار مجھے ایک مسلح کانسٹیبل کے حوالے کرکے میر بخش کی جانب بڑھ گیا اور اس کے زخمی بازو کا جائزہ لینے کے بعد زہریلے لہجے میں استفسار کیا "تو تمہارے اعضاء سے خون بھی نکلتا ہے؟"

ہمارا جھوٹ کھل چکا تھا اس لیے میر بخش نے توجیہہ پیش کرنے کے بجائے مکمل خاموشی اختیار کرلی۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت گاڑی کی طرف سے بھی ہمارے لیے بری خبر آگئی۔ تلاشی لینے والے سب انسپکٹر نے مذکورہ مع کلپ برآمد کرلیا تھا اور بڑی مسرت کے ساتھ تھانے دار کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"سر' یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔"

"بہت خطرناک مجرم کہو۔" تھانے دار نے کہا پھر والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے ماتحتوں کو "انہیں فوراً گرفتار کرلو۔"

ہمارے پاس گرفتاری دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمارے بہت سے جھوٹ پکڑے گئے تھے اور ہماری پاس سے چھپایا ہوا آتشیں اسلحہ بھی برآمد کیا گیا تھا۔ راہ پر چلتے ہوئے ہمارے پاس کوئی جائے فرار نہیں تھی بدمعاشی یا سینہ زوری کے حق میں' میں اس وقت چنانچہ ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی

ایک مرتبہ پھر گرفتار بلا ہوچکے تھے۔

ہماری گرفتاری کے احکام صادر کرتے ہی تھانے دار اپنے سینئر افسر ڈی ایس پی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ یقیناً وہ اس سلسلے کے کرتا دھرتا کو کوئی سنسنی خیز خبر سنانا چاہتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ڈی ایس پی فوراً ہی تھانے دار کے ساتھ ہمارے پاس آگیا۔ تھانے دار نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ہمیں جن تین افراد کی تلاش تھی وہ یہی ہوسکتے ہیں!"

اس انکشاف نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ گویا پولیس والے ہم پر ڈاکو منگل سنگھ' اس کے ساتھی اور مفویہ ممتاز کا شک کررہے تھے۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی کیونکہ کسی بھی طور ہمارا ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے تعلق نہیں تھا۔

ڈی ایس پی کو تھانے دار مختصر الفاظ میں ہماری غلط بیانیوں کے بارے میں بتا چکا تھا لہٰذا اس نے نفرت آمیز نظر سے ہمیں دیکھا اور تھانے دار سے کہا "انہیں فوراً تفتیشی سیل پہنچانے کا بندوبست کرو۔ وہیں پر ان تینوں سے باری باری پوچھ گچھ کی جائے گی۔"

اس موقع پر میں نے احتجاج کرنا ضروری سمجھا اور ڈی ایس پی سے مخاطب ہوتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا "سر! آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے' ہم نے آپ لوگوں سے کچھ غلط بیانی کی ہے۔ اس میں بھی ہماری بہت سی مجبوریاں پوشیدہ ہیں۔ اگر آپ ہماری بات تسلی اور اطمینان سے سن لیں تو آپ کو ہماری بے گناہی اور مصیبت زدگی کا یقین آجائے گا مگر ہم ہرگز ہرگز ڈاکو نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارا گرفتار پیشہ افراد سے کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ ہے۔ ہم کسی منگل سنگھ یا ممتاز کو نہیں جانتے۔"

"دیکھا آپ نے سر!" تھانے دار جوشیلے لہجے میں ڈی ایس پی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "یہ شخص منگل سنگھ اور ممتاز کا نام لے رہا ہے حالانکہ میں نے آپ سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمیں جن تین افراد کی تلاش تھی وہ یہی ہوسکتے ہیں۔ منگل سنگھ اور ممتاز وغیرہ کا تو کہیں ذکر نہیں کیا گیا پھر یہ شخص خود اپنا لاتعلقی پر زور دلیلیں دے رہا ہے؟"

تھانے دار کی بات ڈی ایس پی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے غور کر مجھے دیکھا اور پوچھا "ہاں بھئی! تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم نے یہاں منگل سنگھ ڈاکو کی گرفتاری کے لیے ناکا لگایا ہوا ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "یہ بات مجھے تھوڑی دیر پہلے آپ کے محکمے کے ایک ایس آئی نے بتائی ہے۔"

اس نے چونک کر تھانے دار کو دیکھا اور مجھ سے سوال کیا "کون اے ایس آئی؟"

میں نے اے ایس آئی جمشید احمد کا نام لے دیا۔

ڈی ایس پی نے تصدیقی نظر سے تھانے دار کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "جی سر' اس نام کا ایک اے ایس آئی اس مشن میں شامل ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھنے لگا "اے ایس آئی جمشید احمد نے تمہیں یہ بات کب اور کیوں بتائی تھی؟"

میں نے کہا "جمشید نے مجھے یہ بات کوئی آدھا گھنٹا پہلے یہیں بتائی تھی جب ہماری گاڑی آٹھ نو دوسری گاڑیوں کے پیچھے آکر رکی تھی۔" ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے مزید کہا "اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اس نے مجھے یہ بات کیوں بتائی تھی تو اس کا سیدھا سیدھا جواب یہ ہے کہ میں نے اس سے پوچھا اور اس نے بتا دیا۔ بس!"

ڈی ایس پی نے تھانے دار کو حکم دیا کہ وہ فوراً مذکورہ اے ایس آئی کو وہاں حاضر کرے۔ تھانے دار موٹی توند پر پتلون سنبھالتے ہوئے "یس سر' یس سر" کی گردان کرتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوگیا۔

"تم نے اپنا نام مراد اور اپنی کزن کا نام کلثوم بتایا ہے جبکہ تمہارا ساتھی میر بخش ہے۔ ان ناموں میں کس حد تک صداقت ہے؟"

میں نے ایک حد تک سچ بولتے ہوئے بتایا "میر بخش کا نام بالکل اصلی ہے جبکہ ہمارے نام فرضی ہیں۔ اس فرضیت کی بھی معقول وجوہات ہیں۔ اگر آپ ہماری مجبوریوں کا احساس کرلیں تو ہمیں بے گناہ پائیں گے۔ ہم کسی بھی طور کسی جرم میں ملوث نہیں ہیں۔"

"تمہاری مجبوریوں کی داستان تو میں بعد میں سنوں گا۔" ڈی ایس پی نے سخت لہجے میں کہا "ابھی تو آپ لوگوں کا بہروپ کھولنا ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی بھیس بدل کر فرار ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہوں نے مفویہ ممتاز کے حلیے میں بھی اچھی خاصی تبدیلیاں کررکھی ہیں۔"

ڈی ایس پی کی بچکانا دلیلوں سے مجھے بہت کوفت ہوئی۔ میں نے بیزاری سے کہا "سر! آپ تو ایک ذمے دار اعلیٰ افسر ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ ہمارے بارے میں اس قسم

کی بات کریں گے۔"

میرے پُر اعتماد لہجے نے ڈی ایس پی کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس نے گہری نظر سے مجھے گھورا تاہم گمبھیر آواز میں بولا "تم میری کس بات کا ذکر کررہے ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں ایسا کیا کہہ دیا ہے؟"

میں نے کہا "سر! ہم تینوں اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی سوانگ بھر رکھا ہے تو آپ کو نظر آجانا چاہیے اور پھر آپ نے میری ساتھی کلثوم کے رویّے میں "معنویہ" والی کوئی بات دیکھی ہے؟ آپ چاہیں تو اس سے تنہائی میں بات کرسکتے ہیں۔ اگر وہ معنویہ ممتاز ہی ہے تو ضرور آپ کو ہمارے بارے میں بتادے گی۔"

"میں تم سب سے باری باری تنہائی میں ملاقات کروں گا۔" وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "پہلے میں اس چغل خور اے ایس آئی کی تو خبر لے لوں۔"

جب تک تھانے دار اے ایس آئی جمشید احمد کو تلاش کرکے لاتا، میں نے مختلف سوال کرکے ڈی ایس پی سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ منگل سنگھ ڈاکو کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس کے نوجوان ساتھی کا نام گنڈا سنگھ تھا جس کی عمر کم و بیش بائیس سال تھی جبکہ معنویہ ممتاز اٹھارہ سال کی ایک دراز قامت لڑکی تھی۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ منگل سنگھ اور اس کے ساتھی گنڈا سنگھ کو کسی نے نہیں دیکھ رکھا تھا اس لیے وہ انہیں صورت شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میری عمر گنڈا سنگھ کے اریب قریب تھی اور میر بخش منگل سنگھ کے برابر تھا جبکہ ساحل دراز قامت ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز کی ہم عمر بھی تھی۔ اس لیے ان کا شک ہماری طرف جارہا تھا اور خاص طور پر اس صورتِ حال میں کہ ہماری گاڑی کا اصلی رنگ چھپانے کے لیے اس پر سرخ کاغذ چسپاں کردیے گئے تھے، ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے ایک پستول اور گولیوں والا بھرا ہوا میگزین برآمد ہوا تھا اور میر بخش کے بازو کے زخم کو چھپانے کے لیے ہم نے ایک فرضی وردوالی کہانی سنائی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں تھانے دار نے اے ایس آئی جمشید کو ڈی ایس پی صاحب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا "سر! جمشید نے اپنی کوتاہی تسلیم کرلی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ اتنے خطرناک ثابت ہوں گے۔"

تھانے دار واضح طور پر اپنے اے ایس آئی کی حمایت میں بول رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے اسے جھاڑا اور غصیلے لہجے میں کہا "اگر یہ لوگ خطرناک ثابت نہیں بھی ہوتے تو کیا اے ایس آئی کو یوں غیر متعلقہ لوگوں سے اس قسم کی اہم باتیں کرنے کا حق حاصل ہے؟"

"نہیں سر، بالکل نہیں۔" تھانے دار نے تیزی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا "کوتاہی تو بہرحال جمشید سے ہوئی ہے سر"

جمشید احمد گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک ناپسندیدہ نظر ہم پر ڈالنے کے بعد اوپر نہیں دیکھا تھا۔ ڈی ایس پی نے سخت لہجے میں تھانے دار سے کہا "جب کوئی شخص کوتاہی کرتا ہے تو اسے اس کی سزا بھی ملتی ہے۔ ملتی ہے یا نہیں؟"

"ضرور ملتی ہے سر!" تھانے دار نے تائید کی۔

ڈی ایس پی نے کہا "میں یہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم اپنے اے ایس آئی کی کوتاہی کے لیے کون سی سزا تجویز کرتے ہو۔" تھانے دار نے یہ الفاظ سنتے ہی سکون کی سانس لی۔ ڈی ایس پی نے مزید کہا "اب تم ان تینوں کو موبائل میں بٹھاؤ۔ میں انہیں پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ہاں، گاڑی کے باہر مسلح افراد کا پہرا بٹھادو تاکہ یہ کہیں فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے سر۔" تھانے دار نے فدویانہ لہجے میں کہا اور ہمیں دھکیلتا ہوا ڈی ایس پی کی جیپ کی طرف لے جانے لگا۔ وہ موبائل جیپ کے قریب ہی کھڑی تھی۔

پیچھے سے ڈی ایس پی نے کہا "انہیں گاڑی میں پہنچا کر تم باقی گاڑیوں کو جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کرو۔ سڑک پر زیادہ رش نہیں لگنا چاہیے۔"

تھانے دار ایک مرتبہ پھر "یس سر" کہتے ہوئے ہمارے ساتھ موبائل کی جانب قدم بڑھانے لگا جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس دوران میں سڑک پر ہماری گاڑی کے پیچھے کار اور پرائیویٹ بس کے عقب میں دو تین اور گاڑیاں آکر رک چکی تھیں۔ میں نے جب اپنی گاڑی کی طرف دیکھا تو وہ مجھے حرکت میں نظر آئی۔ ازاں بعد معلوم ہوا کہ ڈی ایس پی کی ہدایت پر ایک پولیس اہلکار نے ہماری گاڑی کو سڑک سے اتار لیا تھا تاکہ پیچھے والی گاڑیوں کے لیے راستہ ہموار ہوسکے۔ ہماری گاڑی کو ڈی ایس پی والی جیپ سے تھوڑے فاصلے پر روک دیا گیا۔ جب ہمیں موبائل میں بٹھادیا گیا تو ہم خاصے پریشان تھے۔ موبائل میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا تاہم موبائل سے باہر چار مسلح افراد ہماری نگرانی کے لیے مستعد کھڑے تھے۔

ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں

نہیں بلکہ فکرمند تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک نئی مصیبت نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ ساحل اور میر بخش کے چہروں پر تفکر کی گہری پرچھائیں تھیں۔ چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میر بخش نے تشویشناک لہجے اور دھیمی آواز میں کہا۔

"وجدان سائیں! ہماری کہانی تو فیل ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

ساحل اضطراری لہجے میں بولی "وجدان! تمہیں جلد از جلد کوئی نئی اور موثر کہانی سوچنا ہوگی ورنہ ہم خوا مخواہ منگل سنگھ کے سلسلے میں کسی بڑی مشکل میں پڑجائیں گے۔ پہلے ہی ہمارے حالات خاصے سنگین ہیں۔"

"ہاں سائیں! کچھ سوچو۔" میر بخش نے کہا "آپ ہی کوئی حل نکال سکتے ہو۔"

میں اس بارے میں مسلسل سوچ بچار کررہا تھا۔ اس سلسلے میں میرا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی غفلت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ پیش آمدہ صورت حال سے نکلنے کے لیے کوئی عمدہ اور نیا ہدف کہانی بننا بہت ضروری تھا ورنہ کسی بھی قسم کی تاخیر ہمیں کسی بہت بڑے وبال میں ڈال سکتی تھی۔

چند منٹ بعد میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میرا ذہن ایک نئی اور زیادہ موثر کہانی تیار کرچکا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دھیمے لہجے میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی بھی لمحے یہ لوگ ہم پر نگرانی کو اور زیادہ سخت کرسکتے ہیں لہٰذا ہمیں جو بھی طے کرنا ہے فوراً کرلینا چاہیے۔ ممکن ہے، قدرت نے ہمیں یہ موقع دیا ہو تاکہ ہم اپنی بچت کے سلسلے میں کوئی لائحہ عمل بنالیں۔"

"لائحہ عمل تو آپ ہی بنائیں گے سائیں۔" میر بخش نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا "ہم تو آپ کی پلاننگ پر عمل کریں گے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! میں تم میں کافی تبدیلیاں محسوس کررہی ہوں۔"

"مثلاً کون سی تبدیلیاں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ بولی "تم کافی بدلے ہوئے نظر آتے ہو۔ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔"

"پہلے میں کیسا تھا؟" میں نے استفسار کیا۔

"بہت نڈر اور فوراً عملی قدم اٹھانے والے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب میں بزدل اور غیر عملی ہوگیا ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"پھر تمہارا کیا مطلب تھا ساحل؟"

"مم۔ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی "وہاں ہندوستان اور نیپال میں تو تم بڑے سے بڑے پھڈے میں فوراً کود پڑتے تھے اور پولیس والوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر اپنے ملک میں داخل ہوتے ہی تم بہت زیادہ محتاط ہوگئے ہو اور ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانے لگے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ اگر اسی قسم کی صورتِ حال ہمیں انڈیا یا نیپال وغیرہ میں پیش آئی ہوتی تو کیا تم تب بھی اتنی ہی شرافت کا مظاہرہ کرتے؟"

میں نے ساحل کی پوری بات سنی اور زیرِ لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اس کے احساسات کو غلط ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم میرے خیال میں وہ ایک قسم کی غلط فہمی کا شکار ہورہی تھی۔ شاید وہ میری محتاط روی اور مصلحت اندیشی کو بزدلی کے خانے میں فٹ کررہی تھی یا پھر وہ کسی قسم کی الجھن کا شکار ہورہی تھی۔ میں نے اس موقع پر اس کی الجھن آمیز غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری سمجھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"دیکھو ساحل! زیادہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ تاہم میں یہاں پر یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان اور نیپال یا ہندوستان میں بہت فرق ہے۔ ان دونوں ملکوں میں میرا ٹکراؤ اکثر و بیش تر طاغوتی قوتوں سے ہوتا رہا یا پھر جرائم پیشہ پنڈتوں سے۔ وہاں کی پولیس ان لوگوں کے ہاتھوں میں کسی کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پولیس والے مجرموں کا ساتھ دیتے ہوئے ہماری راہ میں آتے تھے اور مجھے بھی چند مخلص اور ایمان دار پولیس افسروں کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے بعض پولیس والوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے کتراتا نہیں تھا مگر یہاں پاکستان میں۔۔۔"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ساحل! ہم دونوں غیر قانونی طریقے سے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں اور ابھی تک ہمارے پاس اصلی یا نقلی کسی بھی قسم کی کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔ یعنی ہماری پوزیشن بہت نازک اور کمزور ہے۔" میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر ساحل کی جانب دیکھا اور

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "پاکستان میں داخل ہوتے ہی ہمارا واسطہ پاک "رینجرز" سے پڑگیا۔ وہ تو ہماری خوش قسمتی سمجھ لو کہ کپتان صالح رحیم کو ہماری کہانی پر یقین آگیا اور اس نے ضروری کارروائی کے بعد ہمیں مقامی پولیس کے حوالے کردیا۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ پولیس کے قبضے سے ہمیں وڈیرا اکبر سومرو کے بندوں نے نکال لیا ورنہ پتا نہیں وہ ہمارا کیا حشر کرتے۔ اس کے بعد ہم عمرکوٹ میں یا می شاہ اور تارا جیسے لوگوں سے نبرد آزما رہے اور بالآخر یہاں ایک مرتبہ پھر پولیس والوں کے "مہمان" بن چکے ہیں۔"

میں نے خاموش ہو کر باری باری ساحل اور میر بخش کو دیکھا پھر کہا "ساحل! پاکستان میں آمد کے بعد جہاں بھی مجھے جرات اور بہادری آزمانے کا موقع ملا' میں نے اس کا مظاہرہ ضرور کیا ہے۔ اب پولیس والوں سے خواہ مخواہ کا ٹکراؤ میری سمجھ سے بالاتر ہے جبکہ وہ ہمیں کسی ذاتی دشمنی یا "پیدا" کے چکر میں بھی پریشان نہیں کررہے۔ اب سیدھی اور سادی بات یہ ہے کہ میں پولیس والوں کو کسی طرح رام کرکے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"وجدان! تم تو دل پر لے گئے۔" ساحل نے اپنے نازک ہونٹوں کو مسکراہٹ کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا "میں نے تو بس ایک بات کہہ دی تھی۔"

"تم نے ایک بات کہہ دی تھی۔" میں نے اسی کے الفاظ دہرائے "اسی لیے میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔ میں ان نازک حالات میں کسی قسم کی غلط فہمی کو جنم دینے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"کیا تم میری بات کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہو؟" وہ قدرے شوخ ہوگئی۔

میں نے کہا "میں اپنے ہر ساتھی کی بات کو اہم سمجھتا ہوں۔"

وہ سنجیدہ ہوگئی "آئی ایم سوری وجدان۔ میں نے اپنی بات سے تمہیں دکھ پہنچایا۔ دراصل موجودہ حالات نے مجھے خاصا اپ سیٹ کردیا ہے۔"

"ابھی تک تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے مجھے دکھ پہنچتا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "مگر اب تم۔"

"میں سمجھ گئی۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولی "تم میری "سوری" کی طرف اشارہ کررہے ہو نا!"

"عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا "اگر تم اپ سیٹ ہو تو بھول جاؤ ہم بہت جلد سیٹ اپ ہوجائیں گے۔"

میر بخش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "سائیں! آپ کسی لائحہ عمل کا ذکر کررہے تھے؟"

مجھے فوراً یاد آگیا کہ میں اپنے ساتھیوں کو کیا بتانے والا تھا۔ میں نے دھیمی مگر واضح آواز میں انہیں اپنی تازہ ترین پلاننگ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"میں نے جو سوچا ہے اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلو تاکہ ہمارے بیان میں کسی قسم کا تضاد پیدا نہ ہو۔" وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ میں نے کہا "اب ہم نے ڈی ایس پی کو یہ بیان دینا ہے کہ میں اور ساحل کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام مقصود احمد اور ساحل کا نام لیلیٰ ہے۔ لیلیٰ بنیادی طور پر چترالی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چترال سے کراچی شفٹ ہوئی ہے۔"

ساحل کے نقش و نگار کے باعث میں نے اسے چترالی بنا دیا تھا کیونکہ چینی' افغانی' چترالی' تھائی اور تبتی افراد کے نقش و نگار میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیان میں سچائی کا عنصر بڑھ جاتا۔ میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم مجھے کراچی کے چند علاقوں کے نام بتادو۔ کیا تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھے کراچی کے مشہور علاقوں کے نام بتادیے۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اور ساحل یعنی مقصود اور لیلیٰ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان کزن کا رشتہ ہے۔ میں اپنے چچا ایوب خان سے ملنے میرپور خاص آیا ہوا ہوں۔ لیلیٰ کو تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے وہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ تم!" میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کیا "تم میرے چچا کے ملازم ہو اور تمہارا نام میر بخش ہی ہے۔ جب میں نے اپنے چچا سے عمرماروی کا تاریخی قلعہ دیکھنے کی فرمائش کی تو اس نے تمہیں ہمارے ساتھ عمرکوٹ روانہ کردیا۔ ٹھیک ہے؟"

میرا مخاطب میر بخش تھا۔ اس نے میرے "ٹھیک ہے" کا جواب اثبات میں دیا۔ کل شام میر بخش نے مجھے "عمر ماروی" کی رومانی داستان پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ شاہ عمر نے "ماروی" کو لگ بھگ ایک سال تک اپنے قلعے میں مقید رکھا تھا تاکہ اسے خود سے "رضا و رغبت شادی کے لیے آمادہ کرسکے مگر ماروی اپنے منگیتر کھیت کی یاد میں ایک پل گزارتی رہی۔ بالآخر شاہ عمر نے ماروی کو واپس اس کے گاؤں بھیج دیا۔ شاہ عمر' ماروی کے حسن و جمال کا چرچا سن کے گاؤں "بھاول وے کاتر" پہنچا تھا اور ایک پنگھٹ کراس کے گاؤں "بھاول وے کاتر" پہنچا تھا اور ایک پنگھٹ پر اسے اغوا کرکے عمرکوٹ میں واقع قلعے میں لے آیا تھا۔ ماروی کا گاؤں عمرکوٹ سے اسی میل دور تھر کے علاقے میں واقع تھا۔ تاریخی اہمیت کا حامل شاہ عمر کا وہ قلعہ آج بھی عمرکوٹ میں موجود ہے اور "عمرماروی" کے قلعے کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد اسے دیکھنے جاتے ہیں۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "میر بخش' تم ہمیں عمرماروی کا قلعہ دکھانے آج صبح میرپور خاص سے عمرکوٹ لے کر گئے تھے۔ دوپہر کے بعد جب ہم واپس آنے لگے تو چند غنڈوں سے ہماری مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ اس ٹکراؤ کی وجہ ساحل یعنی لیلیٰ تھی۔ وہ لچے لفنگے قسم کے بے ہودہ مذاق کررہے تھے۔ ہم نے انہیں سمجھانے بجھانے کی حتی الامکان کوشش کی مگر وہ اپنی نیچ حرکتوں سے باز نہ آئے۔ بحالتِ مجبوری ہمیں ان سے دو دو ہاتھ کرنا پڑے۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہاں پر ہم یہ ظاہر کریں گے کہ میں یعنی مقصود نے مارشل آرٹس کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے غنڈوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ایک مرحلے پر غنڈوں کے سرغنہ نے پستول نکال کر ہم پر فائر کردیا جس کے نتیجے میں تم زخمی ہوگئے۔ اس بات میں بھی کسی قسم کی غلط بیانی شامل نہیں۔"

میر بخش نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ساحل پوری دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔ اس نے اپنے والے انداز میں کہا "کہانی تو بہت جان دار ہے۔ اب میں یہ ضرور پوچھوں گی.... پھر کیا ہوا؟"

ساحل کے انداز نے مجھے خاصی تقویت پہنچائی۔ اس کے لہجے سے زندہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھی' اب اس سے نکل آئی تھی۔ یہ ایک مثبت اور صحت مند علامت تھی۔

میں نے کہا "میں ضرور بتاؤں گا کہ پھر کیا ہوا۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا "میں نے اپنے فن کے بل بوتے پر غنڈوں کے سرغنہ سے پستول چھین لیا اور ان کی ایسی مرمت اور دھلائی کی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ وہ اس افراتفری میں اپنی گاڑی بھی وہیں چھوڑ گئے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ وہ دوبارہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے' وہ اپنے اور ساتھیوں کو جمع کرکے وہاں لے آتے چنانچہ ہم نے موقع واردات سے فوراً رخصت ہونے کا فیصلہ کیا اور انہی کی گاڑی میں بیٹھ کر میرپور خاص کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے گاڑی کو کیوں نہیں چھیڑا۔ شاید انہیں گاڑی کے ٹائر پنکچر ہونے کا علم نہ ہو۔ ہوسکتا ہے' انہوں نے ہمارا پیچھا کیا ہو اور ہمیں میرپور خاص میں داخل ہوتے دیکھ کر واپس چلے گئے ہوں۔ بہرحال ہم نے ایک بار پھر اپنی قسمت آزمائی کی اور بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم نے پولیس کو کیا بیان دینا ہے۔ میں اور ساحل کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام مقصود احمد اور ساحل کا نام لیلیٰ ہے۔ لیلیٰ بنیادی طور پر چترالی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چترال سے کراچی شفٹ ہوئی ہے۔"

ساحل کے نقش و نگار کے باعث میں نے اسے چترالی بنا دیا تھا کیونکہ چینی' افغانی' چترالی' تھائی اور تبتی افراد کے نقش و نگار میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیان میں سچائی کا عنصر بڑھ جاتا۔ میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم مجھے کراچی کے چند علاقوں کے نام بتادو۔ کیا تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھے کراچی کے مشہور علاقوں کے نام بتادیے۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اور ساحل یعنی مقصود اور لیلیٰ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان کزن کا رشتہ ہے۔ میں اپنے چچا ایوب خان سے ملنے میرپور خاص آیا ہوا ہوں۔ لیلیٰ کو تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے وہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ تم!" میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کیا "تم میرے چچا کے ملازم ہو اور تمہارا نام میر بخش ہی ہے۔ جب میں نے اپنے چچا سے عمرماروی کا تاریخی قلعہ دیکھنے کی فرمائش کی تو اس نے تمہیں ہمارے ساتھ عمرکوٹ روانہ کردیا۔ ٹھیک ہے؟"

میرا مخاطب میر بخش تھا۔ اس نے میرے "ٹھیک ہے" کا جواب اثبات میں دیا۔ کل شام میر بخش نے مجھے "عمر ماروی" کی رومانی داستان پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ شاہ عمر نے "ماروی" کو لگ بھگ ایک سال تک اپنے قلعے میں مقید رکھا تھا تاکہ اسے خود سے "رضا و رغبت شادی کے لیے آمادہ کرسکے مگر ماروی اپنے منگیتر کھیت کی یاد میں ایک پل گزارتی رہی۔ بالآخر شاہ عمر نے ماروی کو واپس اس کے گاؤں بھیج دیا۔ شاہ عمر' ماروی کے حسن و جمال کا چرچا سن کے گاؤں "بھاول وے کاتر" پہنچا تھا اور ایک پنگھٹ کراس کے گاؤں "بھاول وے کاتر" پہنچا تھا اور ایک پنگھٹ پر اسے اغوا کرکے عمرکوٹ میں واقع قلعے میں لے آیا تھا۔ ماروی کا گاؤں عمرکوٹ سے اسی میل دور تھر کے علاقے میں واقع تھا۔ تاریخی اہمیت کا حامل شاہ عمر کا وہ قلعہ آج بھی عمرکوٹ میں موجود ہے اور "عمرماروی" کے قلعے کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد اسے دیکھنے جاتے ہیں۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "میر بخش' تم ہمیں عمرماروی کا قلعہ دکھانے آج صبح میرپور خاص سے عمرکوٹ لے کر گئے تھے۔ دوپہر کے بعد جب ہم واپس آنے لگے تو چند غنڈوں سے ہماری مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ اس ٹکراؤ کی وجہ ساحل یعنی لیلیٰ تھی۔ وہ لچے لفنگے قسم کے بے ہودہ مذاق کررہے تھے۔ ہم نے انہیں سمجھانے بجھانے کی حتی الامکان کوشش کی مگر وہ اپنی نیچ حرکتوں سے باز نہ آئے۔ بحالتِ مجبوری ہمیں ان سے دو دو ہاتھ کرنا پڑے۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہاں پر ہم یہ ظاہر کریں گے کہ میں یعنی مقصود نے مارشل آرٹس کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے غنڈوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ایک مرحلے پر غنڈوں کے سرغنہ نے پستول نکال کر ہم پر فائر کردیا جس کے نتیجے میں تم زخمی ہوگئے۔ اس بات میں بھی کسی قسم کی غلط بیانی شامل نہیں۔"

میر بخش نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ساحل پوری دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔ اس نے اپنے والے انداز میں کہا "کہانی تو بہت جان دار ہے۔ اب میں یہ ضرور پوچھوں گی.... پھر کیا ہوا؟"

ساحل کے انداز نے مجھے خاصی تقویت پہنچائی۔ اس کے لہجے سے زندہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھی' اب اس سے نکل آئی تھی۔ یہ ایک مثبت اور صحت مند علامت تھی۔

میں نے کہا "میں ضرور بتاؤں گا کہ پھر کیا ہوا۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہنا شروع کیا "میں نے اپنے فن کے بل بوتے پر غنڈوں کے سرغنہ سے پستول چھین لیا اور ان کی ایسی مرمت اور دھلائی کی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ وہ اس افراتفری میں اپنی گاڑی بھی وہیں چھوڑ گئے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ وہ دوبارہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے' وہ اپنے اور ساتھیوں کو جمع کرکے وہاں لے آتے چنانچہ ہم نے موقع واردات سے فوراً رخصت ہونے کا فیصلہ کیا اور انہی کی گاڑی میں بیٹھ کر میرپور خاص کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے گاڑی کو کیوں نہیں چھیڑا۔ شاید انہیں گاڑی کے ٹائر پنکچر ہونے کا علم نہ ہو۔ ہوسکتا ہے' انہوں نے ہمارا پیچھا کیا ہو اور ہمیں میرپور خاص میں داخل ہوتے دیکھ کر واپس چلے گئے ہوں۔ بہرحال ہم نے ایک بار پھر اپنی قسمت آزمائی کی اور بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم نے پولیس کو کیا بیان دینا ہے۔ میں اور ساحل کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام مقصود احمد اور ساحل کا نام لیلیٰ ہے۔ لیلیٰ بنیادی طور پر چترالی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چترال سے کراچی شفٹ ہوئی ہے۔"

ساحل کے نقش و نگار کے باعث میں نے اسے چترالی بنا دیا تھا کیونکہ چینی' افغانی' چترالی' تھائی اور تبتی افراد کے نقش و نگار میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیان میں سچائی کا عنصر بڑھ جاتا۔ میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم مجھے کراچی کے چند علاقوں کے نام بتادو۔ کیا تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھے کراچی کے مشہور علاقوں کے نام بتادیے۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اور ساحل یعنی مقصود اور لیلیٰ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان کزن کا رشتہ ہے۔ میں اپنے چچا ایوب خان سے ملنے میرپور خاص آیا ہوا ہوں۔ لیلیٰ کو تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے وہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ تم!" میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کیا "تم میرے چچا کے ملازم ہو اور تمہارا نام میر بخش ہی ہے۔ جب میں نے اپنے چچا سے عمرماروی کا تاریخی قلعہ دیکھنے کی فرمائش کی تو اس نے تمہیں ہمارے ساتھ عمرکوٹ روانہ کردیا۔ ٹھیک ہے؟"

میرا مخاطب میر بخش تھا۔ اس نے میرے "ٹھیک ہے" کا جواب اثبات میں دیا۔ کل شام میر بخش نے مجھے "عمر ماروی" کی رومانی داستان پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ شاہ عمر نے "ماروی" کو لگ بھگ ایک سال تک اپنے قلعے میں مقید رکھا تھا تاکہ اسے خود سے "رضا و رغبت شادی کے لیے آمادہ کرسکے مگر ماروی اپنے منگیتر کھیت کی یاد میں ایک

ایوب خان میرپور خاص شہر میں صرافے کی ایک دکان چلاتا ہے جب کہ اس کی رہائش رتن آباد میں ہے۔ ہم لوگ خاندانی سنار ہیں۔ کراچی میں ہمارا بھی جیولری کا ہی بزنس ہے۔"

وہ دونوں اثبات میں سر ہلانے لگے۔ ساحل نے کہا "جس طرح میر بخش نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ پولیس والے تمہارے فرضی چچا کے بارے میں تفتیش کر سکتے ہیں اسی طرح میں بھی یہ کہوں گی کہ وہ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں تمہاری رہائش اور تمہارے جیولری کے بزنس کے بارے میں بھی متعدد سوالات کر سکتے ہیں۔"

"امکانات کی کمی نہیں۔" میں نے کہا "پولیس والوں سے کچھ بعید نہیں۔ وہ کسی بھی قسم کا سوال کر سکتے ہیں۔" پھر میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو۔ تمہیں یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ وہاں کی صرافہ مارکیٹ کس علاقے میں ہے۔"

"کراچی بہت بڑا شہر ہے سائیں۔" میر بخش نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بتایا "انسانوں کا ایک سمندر ہے۔ وہاں کئی صرافہ مارکیٹیں ہیں۔ ویسے وڈیرا اکبر سومرو زیورات اور جیولری کی خریداری ہمیشہ "صدر" کے علاقے سے کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' صدر کی جیولری مارکیٹ چلے گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "کراچی میں صدر کی صرافہ مارکیٹ میں ہماری دکان ہے۔ کیا سمجھے؟"

"بالکل سمجھ گئے۔" دونوں بہ یک زبان بولے۔

اسی وقت ڈی ایس پی وہاں پہنچ گیا۔ تھانے دار اپنی توند کو تھتھلاتے ہوئے اس کے پیچھے تھا۔

ہماری موبائل سے باہر ڈی ایس پی نے تھانے دار سے مختصر بات کی جس کے بعد تھانے دار ہماری موبائل میں سوار ہو گیا۔ وہ موبائل کے اگلے حصے میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمیں کنٹرول کرنے کے لیے دو مسلح پولیس اہلکار موبائل کے پچھلے حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس سیٹنگ سے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہاں سے ہمیں کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔ پھر فوراً ہی میری اس سوچ کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ڈرائیور نے موبائل اسٹارٹ کی اور اگلے ہی لمحے وہ حرکت میں آ چکی تھی۔

ہم تینوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے درمیان تھوڑی دیر پہلے جو گفتگو ہوئی تھی' وہ بہت اہم تھی۔ اب ہمیں اسی پروگرام کی روشنی میں حرکت کرنا تھی۔

پولیس موبائل کچے سے نکل کر سڑک پر آئی تو میں نے اپنے چیتے جیسے دور تک دیکھنا۔ رات کے اندھیرے میں جہاں تک میری آنکھوں نے کام کیا وہاں تک مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی' اس کا مطلب یہی تھا کہ ناکے پر موجود تمام گاڑیوں کو نمٹا کر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ناکا منگل سنگھ نامی کسی ڈاکو کو گرفتار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری سے پہلے ناکا ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر پولیس والے میر بخش کو منگل سنگھ اور مجھے اس کا ساتھی گنڈا سنگھ سمجھ رہے تھے تو غالب امکان یہ تھا کہ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہونے والا تھا۔ یقیناً وہ ہمیں کسی تفتیشی سیل میں لے جانا چاہ رہے تھے۔ میں نے اپنی معلومات کی خاطر مسلح پہرے داروں سے دوستانہ انداز میں بات چیت شروع کر دی۔ وہ دونوں موبائل کی دونوں سیٹوں پر بالکل آخر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں گنیں تھامے بالکل چوکس تھے۔

ایک سیٹ پر میں ساحل کے ساتھ بیٹھا تھا جب کہ سامنے والی سیٹ پر میر بخش بیٹھا تھا۔ گویا میر بخش اور ساحل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے پولیس والے سے پوچھا۔

"سائیں ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"تھانے کے علاوہ تمہیں کہاں لے جائیں گے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"متعلقہ تھانا یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"ہماری گاڑی تو وہیں رہ گئی!"

"وہ بھی آ جائے گی' تم فکر کیوں کر رہے ہو!"

"اور ڈی ایس پی صاحب؟"

"وہ اپنی ذاتی گاڑی میں آئیں گے۔"

میں نے معصومیت سے پوچھا "سائیں' ہمیں تھانے کیوں لے کر جا رہے ہیں؟"

وہ چڑ گیا اور قدرے برہم لہجے میں بولا "وہاں تمہاری دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مرغ پلاؤ اور زردے کی دیگیں چڑھائی گئی ہیں۔" "بی سر" سے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ وہ تم سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوں گے۔"

پولیس والا اپنے رینک کے اعتبار سے اے ایس آئی تھا۔ غالباً وہ ان دو اے ایس آئی میں سے ایک تھا جو اس ناکے پر تعینات کیے گئے تھے۔ ایک اے ایس آئی سے میں

بھرپور معلومات حاصل کر چکا تھا جو ازاں بعد ڈی ایس پی کی آمد اور برہمی کا نشانہ بھی بنا تھا۔ میں نے اس کے بعد سے اے ایس آئی جمشید احمد کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

میرے سامنے بیٹھا اے ایس آئی شاید جمشید والے واقعے کی وجہ سے بہت محتاط تھا۔ میں نے اس کی باتوں اور انداز سے بھانپ لیا کہ وہ میرے بھگنے میں نہیں آئے گا چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کر لی۔

چند منٹ بعد ہم متعلقہ تھانے کے اندر پہنچ گئے۔ پولیس کے قواعد و ضوابط اور تفتیش کے طریقوں سے مجھے گہری واقفیت تھی۔ ہمیں شادی پلی کے علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا لہٰذا تفتیش بھی شادی پلی سے متعلقہ تھانے میں ہونا تھی۔ اگر ہم واقعی منگل سنگھ' گنڈا سنگھ اور ممتاز ثابت ہو جاتے (جس کا امکان صفر کے برابر تھا) تو پھر نبی سر کے تھانے میں اطلاع پہنچائی جاتی کیونکہ ممتاز کے اغوا کی رپورٹ نبی سر کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی۔ باقی کارروائی اس کے بعد کی بات تھی۔

ہمیں تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی کی طلبی پر سب سے پہلے ساحل کو تفتیشی کمرے میں بلایا گیا۔ میں اور میر بخش ساحل کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد ہمیں ساحل کی صورت نظر آئی۔ میں خوش ہو گیا۔ ساحل کی حالت اور چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ سب خیریت گزری تھی۔ میں نے سوچا' اگر اب وہ پوچھ گچھ کے لیے میر بخش کو لے گئے تو مجھے ساحل سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن میری امید پر اوس پڑ گئی۔

جو پولیس والا ساحل کو لے کر حوالات کی طرف آیا تھا اس نے ہم دونوں کو حوالات سے باہر بلا لیا۔ اس دوران میں ساحل اس کے ساتھ باہر کھڑی تھی۔ ہمیں پولیس والے کے اشارے کی تعمیل کرنا پڑی کیونکہ وہاں دم مارنے کی جا نہیں تھی۔ ایک مسلح نگران ہم پر موت کے فرشتے کی طرح تعینات تھا۔

ہم کھلے ہوئے دروازے سے باہر آئے' اسی وقت ساحل کو حوالات کے اندر دھکیل کر دروازے کو لاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں چلنے کو کہا گیا۔

میر بخش اور میں کمپاؤنڈ پر چلتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے۔ وہ غالباً ہیڈ محرر کا کمرا تھا۔ مجھے وہیں بیٹھنے کو کہا گیا اور میر بخش کو وہ پولیس والا اپنے ساتھ لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈی ایس پی ہم تینوں سے باری باری علیحدگی میں پوچھ گچھ کرے گا اور وہ بھی اس طرح کہ فارغ ہونے والا اپنے دوسرے کسی ساتھی کو کچھ بریف نہ کر سکے۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم تینوں نے پولیس موبائل کے اندر ہی ایک پروگرام طے کر لیا تھا ورنہ اس طریقہ کار سے گزرتے ہوئے ہم کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاتے۔ تاہم ایک بات میرے لیے اطمینان بخش تھی اور وہ یہ کہ ساحل کی واپسی سے میں سمجھ گیا تھا' ہم پر ڈاکوؤں والا شبہ بہت جلد ختم ہونے والا تھا۔

بیس پچیس منٹ کے بعد میرا بلاوا آ گیا۔ پولیس والا مجھے اپنے ساتھ لے کر ٹرائل روم میں پہنچ گیا۔ میر بخش وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' اسے واپس حوالات میں بھیج دیا گیا تھا۔

پولیس والا مجھے ڈی ایس پی کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کمرے میں ڈی ایس پی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے مجرموں کی طرح کھڑا نہیں کیا گیا بلکہ ڈی ایس پی کے اشارے پر میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈی ایس پی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا "میں نے تمہاری ساتھی لیلیٰ کا طویل انٹرویو کیا ہے۔ وہ بہرحال مغویہ ممتاز نہیں ہے۔ اس کی عمر اور قد کاٹھ مغویہ جیسا ہے مگر وہ قاضی سلطان کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔ اس سے پوچھ تاچھ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی بھی صورت ہماری مطلوبہ لڑکی ممتاز نہیں۔"

اتنا کہہ کر ڈی ایس پی خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی بات سن کر اطمینان کی سانس لی اور خاموش رہا۔ ڈی ایس پی چند لمحے مجھے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تمہارا ساتھی میر بخش بھی ہمارے شک پر پورا نہیں اترا۔ ہمیں شبہ تھا کہ وہ منگل سنگھ ڈاکو ہو گا لیکن وہ ہر آزمائش سے گزر گیا۔ ہم نے اس کے چہرے کی جانچ پڑتال بھی کی ہے۔ اس نے کسی قسم کا سوانگ نہیں بھر رکھا۔ وہ جیسا نظر آ رہا ہے' اس کی حقیقت بھی وہی ہے یعنی وہ منگل سنگھ نہیں بلکہ تمہارے چچا ایوب خان کا ملازم ہے۔"

ڈی ایس پی اتنی نرمی سے بات کر رہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرے لیے یہ اطمینان بخش بات تھی کہ میرے دو ساتھی "پاس" ہو گئے تھے۔ میر بخش کو میں نے ٹرائل روم سے نکلنے کے بعد دیکھا نہیں تھا۔ تاہم ساحل کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا تھا کہ تھانے کی فضا اب ہمارے لیے خاصی سازگار ہو چکی تھی۔ یہ ایک اچھنبے کی بات تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ

ڈی ایس پی کوئی چال نہ چل رہا ہو۔ پولیس والوں سے اتنے نرم اور شائستہ رویّے کی توقع نہیں کی جاتی۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ ڈی ایس پی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"مسٹر مقصود! اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوں گے۔"

"میں تیار ہوں جناب۔" میں نے پُر اعتماد انداز میں کہا "آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں!"

اس کے بعد ڈی ایس پی نے جو سوالات کیے، میں نے ان کا جواب سوچی سمجھی اور طے شدہ اسکیم کی روشنی میں دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیش تر سوالات کے ذریعے وہ میر بخش اور ساحل کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے ہر سوال کا تسلی بخش اور منطقی جواب دے کر ڈی ایس پی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

وہ خاصا مطمئن نظر آیا بھی تاہم اس نے کہا "اب تمہارے چہرے کا احوال جانا جائے گا۔ ذرا پتا تو چلے، تم نے اپنے حلیے میں کتنی اور کس قسم کی تبدیلیاں کر رکھی ہیں!"

"وہ کس طرح جناب؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا "آپ میرے چہرے کا احوال کس طرح دریافت کریں گے؟"

"اس کام کے لیے ہمارے پاس ماہرین موجود ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "تھوڑی دیر پہلے انہوں نے تمہارے ساتھی میر بخش کے چہرے پر بھی خاصا "غور و خوض" کیا ہے۔"

پھر ڈی ایس پی نے میک اپ جانچنے اور پرکھنے کے دو ماہرین کو اس کمرے میں بلوا لیا۔ ڈی ایس پی کی حکم نما ہدایت پر انہوں نے میرے چہرے کو "ٹھونک بجا" کر اور گھس مل کر دیکھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ماہرانہ تحقیق کے بعد انہوں نے ڈی ایس پی کو بتایا کہ وہ میرا اصل چہرہ تھا۔ اس پر کسی قسم کا میک اپ یا ماسک میک اپ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی میں نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے کسی نوعیت کی کاسمیٹک سرجری کروا رکھی ہے۔

اس تسلی بخش رپورٹ کے بعد وہ ڈی ایس پی کے اشارے پر ٹرائل روم سے رخصت ہو گئے اور ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"مسٹر مقصود! یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم درحقیقت وہی ہو جو نظر آ رہے ہو لیکن اب تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہو گا کہ تم گنڈا سنگھ نہیں ہو۔"

"یہ ثبوت میں آپ کو کس طرح دے سکتا ہوں جناب؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں ڈی ایس پی سے پوچھا "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

اس نے کہا "بالکل اسی طرح جیسے تمہارے ساتھی میر بخش نے ثابت کیا ہے کہ وہ منگل سنگھ نہیں۔"

ڈی ایس پی کے ذو معنی انداز نے میرے جسم میں رینگتی ہوئی چیونٹیاں چھوڑ دیں۔ میں نے الجھن زدہ مگر اضطراری لہجے میں پوچھا "میر بخش نے کس طرح یہ ثابت کیا ہے کہ وہ منگل سنگھ نہیں؟"

"اپنا سر ٹھنڈا رکھو۔" ڈی ایس پی نے سنجیدگی سے کہا اور ایک مخصوص اشارہ بھی کیا۔

میں اچھل پڑا "کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟"

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" ڈی ایس پی نے بدستور سنجیدگی سے کہا "تم کوئی انگوٹھا چوستے بچے نہیں ہو جو میرا مطلب نہ سمجھ رہے ہو۔"

"مگر میں۔۔۔ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔

"جیسے میر بخش نے کیا ہے۔" ڈی ایس پی اپنی بات پر اڑا رہا "تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تم گنڈا سنگھ نامی کوئی ہندو نہیں بلکہ مقصود نامی ایک مسلمان ہو۔"

میں متذبذب نظر سے ڈی ایس پی کو تکنے لگا۔

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "اس آزمائش سے تو تمہیں ہر صورت گزرنا ہو گا۔"

مجھے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان کی پہچان کے لیے وہ کڑی آزمائش بڑی متنفد تھی۔ وقت کی مصلحت اور حالات کے تقاضے نے مجھے ڈی ایس پی کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ آنے والے چند سیکنڈز میں میں اس امتحان میں سرخ رو ہو چکا تھا۔

اب ایک مرتبہ پھر ہمارے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں زچ ہو گیا اور میں نے ڈی ایس پی سے کہا۔

"جب ہر طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم وہ لوگ نہیں جن کی گرفتاری کے لیے آپ نے ناکا لگایا ہوا تھا تو پھر ہمیں جانے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے۔ اب آدھی رات ہونے کو آ رہی ہے۔ ہمارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے؟"

ڈی ایس پی نے کہا "اگر تم لوگ ہمارے مطلوبہ مجرم نہیں ہو تو پھر کیا ہوا۔ تمہارے ہاتھ بھی صاف تو نہیں ہیں۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔"

کیا مطلب، ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟" میں چیخ کر

"جرم نہیں، جرائم کہو۔" ڈی ایس پی مکاری سے

ہ سمجھ گیا، اب وہ ہم سے کچھ "پیدا" کرنے کے چکر میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا "جناب! کون کون سے جرائم سرزد ہوئے ہیں؟"

سنجیدگی سے گنوانے لگا "تمہاری گاڑی کی ڈرائیونگ کے نیچے سے ایک خطرناک ہتھیار اور گولیوں کا میگزین رہا ہے۔ تمہارا ایک ساتھی بری طرح زخمی ہے اور تم بات کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے م ایک مشکوک گاڑی میں عمر کوٹ سے یہاں پہنچے ہو۔ گاڑی جو کسی وڈیرا اکبر سومرو کی ملکیت ہے اور اس کی چھپانے کے لیے اس کی باڈی پر سرخ کاغذ چسپاں کیا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم لوگ عمر میں کوئی سنگین واردات کرکے آ رہے ہو۔" وہ ایک خاموش ہو کر فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا "یہ کافی ہیں یا کچھ اور بھی بیان کروں؟"

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا اور معتدل لہجے کہا "ڈی ایس پی صاحب! میں پستول، گولیوں والے میر بخش کے زخمی بازو اور اس "سیاہ سرخ" گاڑی کے میں آپ کو تفصیل سے بتا چکا ہوں اور ساتھ ہی میں مجبوریوں کا تذکرہ بھی کر لیا ہے۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آتا؟"

وہ حتمی طور پر یہ طے کیے بیٹھا تھا کہ ہمیں آسانی سے چھوڑے گا۔ اس سے اس کی نیت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ ہمیں پولیس افسر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں زیادہ سے پریشان کرکے کسی "فائدے" کی تلاش میں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا "تم نے اپنی اور بے بسی کی جو کہانی سنائی ہے، اس پر میں آنکھ بند یقین کر لوں۔ مجرم تو بہت چالاک اور عیار ہوتا ایک سے ایک متاثر کن کہانی سنا کر پولیس کی سمیٹنا چاہتا ہے۔ اگر ہم اسی طرح مجرموں کی باتوں آئیں تو پھر ہو گیا کام!"

سن بات ختم کرکے میری جانب دیکھا۔ میں نے پوچھا "اگر آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے تو کا ارادہ ہے آپ کا؟"

میں تمہاری کہانی کی تصدیق کروں گا پہلے تو۔" وہ عیار نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

وہ طنزیہ انداز میں زیر لب مسکرایا اور بولا "میں سب سے پہلے عمر کوٹ میں وڈیرا اکبر سومرو سے رابطہ کروں گا جس کے نام یہ گاڑی رجسٹرڈ ہے۔ ہو سکتا ہے، تم لوگ وڈیرے کو یا اس کے کسی آدمی یا آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر آئے ہو۔ کچھ بھی ممکن ہے سائیں۔"

مجھے یقین ہو گیا، وہ ہمیں آسانی سے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے بات کو بڑھانے کے بجائے سمیٹنا چاہا کیونکہ بات اگر بڑھ جاتی تو ہمارے لیے مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس بے ہودہ صورتِ حال سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ضروری تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر میں یہ چاہوں کہ آپ کسی مزید تفتیش و تحقیق میں نہ پڑیں اور خاموشی سے ہمیں جانے دیں تو اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہو گا؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "کافی سمجھ دار لگتے ہو!"

"حالات کی سنگینی انسان کو سمجھ دار بنا دیتی ہے ڈی ایس پی صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "آپ مطلب کی بات کریں۔"

وہ فوراً پٹڑی پر آ گیا اور سادہ سے لہجے میں بولا "تم اپنی "رہائی" کے لیے کیا قربانی دے سکتے ہو؟"

وہ چونکہ کھل گیا تھا اس لیے میں نے بھی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا "ڈی ایس پی صاحب! ہماری جامہ تلاشی سے لگ بھگ گیارہ ہزار روپے آپ برآمد کر چکے ہیں۔ اس رقم کے علاوہ ہمارے پاس وہی گاڑی ہے جو اوپر سے سرخ اور اندر سے سیاہ ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ ریڈ اینڈ بلیک گاڑی تو وڈیرا اکبر سومرو کی ہے۔" ڈی ایس پی نے تیکھی نظر سے مجھے دیکھا "اس کی تو تم بات ہی نہ کرو۔"

میں نے کہا "جناب! گاڑی، گھوڑی اور عورت اسی کی ہوتی ہے جس کے قبضے میں ہو۔ اگر مذکورہ گاڑی وڈیرا اکبر سومرو کی ملکیت ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل کرپشن اور جعل سازی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ کسی بھی گاڑی کا انجن نمبر اور چیسس نمبر بہت آسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ملکیت تبدیل کرنا تو اس سے بھی کہیں زیادہ سہل ہے۔" ایک

لمحے کو رک کر میں نے طویل سانس لی اور کہا "آپ تو ماشاء اللہ کافی بارسوخ اور بااختیار پولیس افسر ہیں۔ آپ کے لیے کون سا کام مشکل ہے!"

"تم مجھے کرپٹ پولیس والا سمجھ رہے ہو؟" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

مجھے بھی تاؤ آگیا۔ میں نے کہا "آپ ہمیں چھوڑنے کے لیے جس قسم کے معاملات طے کررہے ہیں اور ہم سے کوئی قربانی دینے کی فرمائش کررہے ہیں۔ اس سے میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے' اسی کی روشنی میں' میں نے ایک بات کہہ دی۔ خدانخواستہ میں نے آپ کو بدعنوان افسر کہنے کی جسارت نہیں کی۔" ایسا انداز اختیار کرنا اس وقت میری مجبوری بن گئی تھی۔

میں نے دانستہ محتاط الفاظ استعمال کیے تھے اور کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ بھی دوستانہ رہے۔ میں نے سب کچھ کہہ بھی دیا تھا اور کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا یہی تھا کہ پولیس والوں سے کوئی پھڈا مول نہ لیا جائے۔ جس طرح ہم ان کے چنگل میں آئے ہوئے تھے' اس موقع پر وہ پہلے ڈراتے ہیں پھر "جاں بخشی" کے عوض لمبے چوڑے مطالبے سامنے لے آتے ہیں۔ ڈی ایس پی بھی کسی اونچی "ڈیمانڈ" کے چکر میں تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ وہ ہمیں کسی مصیبت میں پھنسانے کے بجائے "جھیلنے" کے موڈ میں تھا۔ اگر ہم اس کی بات مان لیتے تو وہ ہمیں خوشی خوشی جانے دیتا۔

اس نے کہا "مجھے گاڑی وغیرہ کے چکر میں نہ ڈالو۔ نقد کی بات کرو۔"

"وہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا "ہمارے پاس ان گیارہ ہزار کے سوا اور کوئی رقم نہیں۔"

"تمہارا کراچی میں سونے کا کاروبار ہے۔" ڈی ایس پی طنزیہ لہجے میں بولا "یہاں پر میرپور خاص میں بھی تمہارا چچا ایوب خان صرافے کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ تمہارے ایک فون پر رقم کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس نے مجھے بند گلی میں گھیر لیا تھا۔ مجھ سے ایک فاش غلطی ہوگئی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ خود کو زیادہ سے زیادہ متوسط طبقے کا ظاہر کرتا۔ میں نے اپنے فرضی چچا اور خود کو سونے کے کاروبار سے متعلق ظاہر کرکے بڑی سنگین غلطی کی تھی۔ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈی ایس پی پھیلنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں واقعی الجھن میں پڑگیا۔

اس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری سوچ کی پریشانی بھانپ لی ہو۔ پولیس والے جب کسی بے قصور کو گھیرتے ہیں تو اتنا خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چہرے کے تاثرات نے ڈی ایس پی کو خاصا سرور دیا ہوگا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں اس پوزیشن میں آگیا ہوں جہاں وہ مجھ سے اپنی مرضی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی میں پاکستانی پولیس بھی انڈین پولیس سے کچھ کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ڈی ایس پی میرے چہرے پر بدستور نظر جمائے ہوا تھا۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا "تم کوئی چھوٹی موٹی اسامی نہیں ہو مسٹر مقصود۔ سنار لوگ بھی اصلی میں نقلی اور سونے میں کھوٹ ملانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے' تم نے اور تمہارے چچا نے خوب مال کمار کھا ہوگا اس لیے تم خود کو زیادہ یتیم مسکین ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

میں اس کی نیت تو بھانپ چکا تھا' ٹٹولنے کی خاطر میں نے پوچھ لیا "ہماری آزادی کی آپ کی نظر میں کیا قیمت ہوگی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "تین افراد تین پیٹی۔"

میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا تاہم انجان بنتے ہوئے پوچھا "میں کچھ سمجھ نہیں پایا ڈی ایس پی صاحب! آپ ہماری رہائی کے بدلے کس قسم کی تین پیٹی کا مطالبہ کررہے ہیں؟"

"تم بھی بہت بے وقوف ہو۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا "تین پیٹی کا مطلب نہیں سمجھتے!"

"میں واقعی نہیں سمجھا جناب۔" میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی حیرت سجالی۔

وہ بولا "پیٹی' پولیس کی ایک پرائیویٹ اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے' ایک لاکھ روپے۔"

"اوہ!" میں نے پریشانی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا "تین لاکھ روپے تو بہت بڑی رقم ہے جناب! ہم تین افراد کا مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمارے پاس صرف گیارہ ہزار ہے۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "تم صرف ایک فون کرو گے اپنے وارثوں کو۔ میرپور خاص یا پھر کراچی۔ وہ خود رقم کا بندوبست کرکے دوڑے چلے آئیں گے۔"

ڈی ایس پی اب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ میرا تجربہ و مشاہدہ تو یہ تھا کہ پولیس افسر عموماً براہ راست رشوت کا معاملہ طے نہیں کرتے بلکہ نیچے کے کسی پولیس اہلکار کو

ہیں اور وہ شخص "مصیبت زدہ" افراد کو یہ راہ "ہے مگر یہ ڈی ایس پی تو مجھ سے کھلم کھلا اور "بلقام رشوت کا مطالبہ کررہا تھا۔

میں نے کچھ حیل وحجت کا مظاہرہ کیا تو وہ غصے میں آگیا "ہوں لیے میں فیصلہ سنا دیا "باقی کی تفتیش بنگلے پر ہوگی۔"

"باقی کی تفتیش!" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "تمام تفتیش تو ہوچکی جناب۔ اب اور کون سی تفتیش کرنا رہ گئی

وہ مکاری سے مسکرایا اور کہا "ابھی نہایت ہی اہم لات باقی ہیں جو یہاں تھانے میں طے نہیں ہوسکتے۔"

میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ اس نے لفظ "اہم لات" پر زور دیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ڈی ایس پی یا سے بڑے رینک کا کوئی بھی افسر مجرموں یا ملزموں کو ں کی غرض سے کہیں بھی لے جاسکتا تھا اور اس سلسلے اے وزیر صاحب کی اجازت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ہا پکڑے جانے والوں میں اگر کوئی خوب صورت لڑکی یا ت شامل ہو تو پھر زیادہ تر کسی بنگلے وغیرہ پر ہی تفتیش کی ں۔ الغرض' یہ سب کچھ مجاز افسر کی مرضی پر منحصر ہوتا ۔ اس کے مزاج' سرشت' فطرت اور نیت کا اس میں عمل دخل ہے۔

ڈی ایس پی نے بنگلے کا ذکر کیا تو میرے کان کھڑے ے ہمارے ساتھ ساحل جیسی ایک جوان اور خوب رت لڑکی تھی۔ اس کے حسن و جمال اور دلکشی میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا' کہیں رشوت خور ڈی ایس پی کا ساحل پر تو نہیں جمی ہوئی تھی؟ ایسا ہونا ناممکن نہیں

میں شعوری اور لاشعوری طور پر محتاط ہوگیا اور ڈی سے پوچھا "جناب! ایسے کون سے معاملات باقی ہیں تفتیش کے لیے کسی بنگلے پر جانا ضروری ہے؟"

"تم مجرم ہو' تمہیں سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں۔" سخت لہجے میں بولا۔

نے کہا "جناب! اصول تو یہ ہے کہ ملزم یا مجرم جس حراست میں گرفتار ہوں انہیں اسی متعلقہ تھانے میں تفتیش کے لیے لے جایا جاتا ہے جیسا کہ ہمارے ہوا ہے مگر اب آپ ہمیں اس سے آگے کسی بنگلے پر جانا چاہتے ہیں؟"

نے گھور کر کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا اب تم مجھے "پولیس' پولیس" پڑھاؤ گے۔ احمق انسان'

میں نے اپنی تمام عمر اسی محکمے میں گزاری ہے۔ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش نہ کرو کہ تفتیش کے لیے کس متعلقہ جگہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کون کون سے مقامات غیر متعلقہ ہیں۔"

وہ میرے سوالات سے خاصا برہم ہورہا تھا اور میری کوئی تاویل یا دلیل سننے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایس آئی کو اپنے پاس بلایا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مجرموں کو بنگلے پر پہنچانے کا بندوبست کرو۔ گھی سیدھی انگلی سے نکلتا نظر نہیں آتا!"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس موقع پر کسی قسم کے احتجاج یا مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ وہ فوری خیال یہ تھا کہ تھانے کی بہ نسبت کسی پرائیویٹ بنگلے پر مجھے ہاتھ پاؤں کو "کھولنے" کا زیادہ اچھا موقع مل جاتا۔ راستے میں بھی کوئی کارروائی ڈالی جاسکتی تھی۔ جب وہ پولیس افسر اپنی پیدا کے چکر میں ہمیں پریشان کرنے پر تلا ہوا تھا تو پھر مجھے یہ حق حاصل ہوجاتا تھا کہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی "گلو خلاصی" کے لیے کچھ بھی کرگزروں۔

ڈی ایس پی کی ہدایت پر ہمیں دوبارہ اسی موبائل میں ٹھایا گیا جس میں ہم ناکا کے مقام سے تھانے پہنچے تھے۔ ہماری گاڑی کو وہیں تھانے میں کھڑا رہنے دیا گیا۔ ہم تینوں کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور مسلح پولیس والوں نے ہمیں باقاعدہ نشانے پر بھی رکھا ہوا تھا۔

سب سے آگے ڈی ایس پی کی جیپ تھی۔ اس کے پیچھے وہ موبائل جس میں ہم تینوں' دو مسلح جوانوں کی نگرانی میں موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک پولیس والا ہی تھا۔ اس مرتبہ تھانے دار ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ اس کا مسلح باڈی گارڈ بھی جیپ میں موجود تھا۔ موبائل کی پسنجر سیٹ پر سب انسپکٹر موجود تھا۔

میں نے سوچا' اگر راستے میں کوئی سنہری موقع ہاتھ آیا تو کوئی ترکیب آزمانے کی کوشش کروں گا۔ اس خیال پر عمل درآمد کے لیے ضروری تھا کہ وہ "موقع" مجھے کسی ایسی جگہ میسر آئے جہاں ویرانی ہوتی کہ رات کی تاریکی کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔

پورے راستے میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا کیونکہ مشکل سے پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس بنگلے پر پہنچ گئے جہاں ڈی ایس پی تفتیش مزید کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک عام سا بنگلا تھا جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ گیٹ پر مسلح گارڈ موجود تھے جن کا تعلق ظاہر ہے' پولیس ہی

کے محکمے سے ہوگا۔ وہ بنگلا دو منزلہ تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہاں کوئی فیملی وغیرہ رہائش پذیر نہیں تھی۔ گیٹ پر متعین مسلح گارڈز کی تعداد دو تھی۔ بنگلے کے اندر بھی ملازم صورت دو افراد موجود تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس تھے مگر یہ بات طے تھی کہ وہ بھی محکمہ پولیس کے کانسٹیبل وغیرہ ہی ہوں گے۔

ہمیں بنگلے کی زیریں منزل پر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ کمرا اپنی سیٹنگ کے اعتبار سے ڈرائنگ روم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کمرے کی دیوار پر لگے وال کلاک میں وقت دیکھا' رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس وقت دو بجنے والے تھے۔ ڈی ایس پی نے ہمارے ساتھ آنے والے اے ایس آئی سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

یہ اے ایس آئی ان دو افراد میں سے ایک تھا جو موبائل میں ہماری نگرانی پر مامور کیے گئے تھے۔ اس اے ایس آئی کا نام عبدالرزاق تھا۔ موبائل کا ڈرائیور' دوسرا "نگران" اور سب انسپکٹر موبائل لے کر واپس تھانے چلے گئے۔

ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تم آؤ میرے ساتھ۔ ہم دوسرے کمرے میں مذاکرات کریں گے۔"

میں نے کہا "یہاں مذاکرات کرنے میں کیا قباحت ہے؟"

"یہاں ٹیلی فون نہیں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"تو پھر؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"پھر یہ کہ تم یہاں سے اپنے گھر والوں یا چچا سے رابطہ نہیں کر سکو گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "میں تمہیں جس کمرے میں لے کر جا رہا ہوں وہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔"

میں ڈی ایس پی کی نیت کو بہت وضاحت کے ساتھ جان گیا تھا۔ وہ ہمیں شرافت سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر کے وہ ہمارے لواحقین سے ایک بھاری رقم اینٹھنا چاہتا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ میں نے جو بیان دیا تھا وہ مبنی بر دروغ تھا۔ میرپور خاص یا کراچی میں میرا کوئی رشتے دار تو گیا' جان پہچان کا کوئی آدمی بھی نہیں تھا۔

اس مرحلے پر مجھے ڈی ایس پی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے میں ایک فائدہ نظر آیا۔ میں مذاکرات کے چکر میں کسی طرح ڈی ایس پی کو پھنسا لیتا تو مجھے سوچنے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ وقت مل سکتا تھا۔ اگر مجھے وہاں اپنی بچت اور چھٹکارے کے لیے مار ماری بھی کرنا پڑتی تو میں اس سے گریز نہ کرتا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ جانے سے مجھے اس بنگلے کے اندرون کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا "جناب! اب تو ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ آپ جہاں لے جائیں گے' چلے جائیں گے۔"

میں نے دانستہ عجز و انکسار کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اے ایس آئی عبدالرزاق وہیں ڈرائنگ روم میں میرے بخیل ساحل کے پاس رک گیا جبکہ ڈی ایس پی گارڈز ہمارے ساتھ ہولیا۔ وہ ایک صحت مند اور چوکس پولیس والا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ تیس سال ہوگی۔ اس نے ایک نئی نویلی کلاشنکوف بڑے ماہرانہ انداز میں تھام رکھی تھی۔

ڈی ایس پی مجھے بنگلے کی بالائی منزل پر لے آیا۔ بنگلے کے اندر سفر کرتے ہوئے میں نے ایک ایک شے کو اپنی نظروں میں رکھا تھا۔ تاکہ بوقتِ ضرورت کسی قسم کی کارروائی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس وقت میرے ظاہری اور باطنی حواس پوری طرح متحرک ہو چکے تھے۔

میں ڈی ایس پی کی معیت میں ایک کمرے میں داخل ہوا تو اس کا مسلح گارڈ باہر دروازے پر ہی رک گیا۔ ڈی ایس پی نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ بیٹھنے کے لیے صوفے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک سٹنگ کم بیڈ روم تھا۔ ٹیلی فون اسٹینڈ پر فون سیٹ بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک دیوار پر انٹر کام سیٹ بھی لگا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا انٹر کام سسٹم دونوں منزلوں پر رابطے کے لیے نصب کیا گیا تھا۔ اگر واقعی زیریں منزل پر فون کی لائن موجود نہیں تھی تو اس انٹر کام سے اچھا خاصا کام چلایا جا سکتا تھا۔

ڈی ایس پی نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کے اندر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد سوال کیا۔

"یہ عجیب سی بات نہیں کہ زیریں منزل پر تو فون کی سہولت موجود نہیں اور یہاں فون سیٹ رکھا ہوا ہے؟"

"تم بولتے بہت ہو۔" اس نے بیزاری سے کہا "خیر میں تمہارے اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔" پھر اس نے معنی خیز انداز میں بتایا "جس چیز کی جہاں ضرورت ہوتی ہے اسے وہیں پر ہونا چاہیے۔ یہ کمرا عموماً میرے استعمال میں رہتا ہے اس لیے ٹیلی فون کی سہولت بھی یہیں میسر آئے گی۔"

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا' وہ جھوٹ کا سہارا لے کر

مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زیریں منزل پر بھی اس فون کی کوئی لائن موجود ہوگی مگر وہ مجھ سے خلیحدگی میں بات کرنے کے لیے یہ ڈراما رچا رہا تھا۔ میں فون کے موضوع کو پس پشت ڈال کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

جلد ہی وہ اصل موضوع پر آگیا "مسٹر مقصود! پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں جناب۔" میں نے کہا۔

"سائیں' یہ بات تو تم ذہن سے نکال دو۔" وہ حتمی لہجے میں بولا "گیارہ ہزار روپے میں تو میں تم تینوں کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ تم یہاں سے فون کر کے اپنے لواحقین سے تین پیٹی رقم منگوانے کا بندوبست کرو گے۔ فی بندہ ایک پیٹی۔ کیا سمجھے؟"

میں اسے باتوں میں اُلجھا کر زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی غیر مسلح نہیں ہوگا مگر اس کی وردی کے اوپر کسی قسم کے اسلحے کی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا' لباس کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے متعدل لہجے میں کہا "ڈی ایس پی صاحب! اگر آپ نے یہی بات کہنا تھی تو یہاں بنگلے پر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تو تھانے میں بھی یہ مطالبہ کر چکے تھے۔"

"دراصل میں تھانے دار کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا۔" وہ ایک آنکھ دبا کر بولا "اگرچہ میں نے تھانے دار کو ناکے والے مقام کی نگرانی کے لیے بھیج دیا تھا لیکن اس کے تھانے کا عملہ اسے صورتِ حال سے آگاہ کر سکتا ہے۔ اس لیے احتیاط بہت ضروری ہے۔ یہ بنگلا میرے تصرف میں رہتا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ ہمارے درمیان کیا "ڈیل" ہوئی ہے۔"

وہ مسلسل دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ اس موقع پر میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں' تم اس تھانے کے عملے سے پردہ پوشی کے لیے ہمیں اس بنگلے پر لے آئے ہو مگر اے ایس آئی عبدالرزاق کی یہاں موجودگی کا کیا جواز ہے تمہارے پاس؟ عبدالرزاق بھی تو اسی تھانے کے عملے میں شامل ہے۔

اگر میں واقعی اس سے یہ سوال کرتا تو وہ میری تسلی کے لیے کوئی نہ کوئی جواب بھی دے دیتا چنانچہ میں نے دوسرے زاویے سے اسے کریدا۔

"ڈی ایس پی صاحب! آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں۔ تھانے دار کی نگرانی میں تو ہمیں گرفتار کیا گیا ہے اور وہ تھانے تک بھی ہمارے ساتھ آیا تھا' ازاں بعد آپ کے بیان کے مطابق آپ نے اسے واپس ناکے پر بھیج دیا ہے۔ تھانے دار اس واقعے سے لاعلم کیسے رہ سکتا ہے؟"

"وہ اس واقعے سے واقعی لاعلم نہیں رہ سکتا۔" وہ بولا "مگر میں اس سے صرف یہاں کی "ڈیل" چھپانا چاہتا ہوں ورنہ وہ بھی حصے دار بن جائے گا۔"

وہ مرتشی افسر بہت کائیاں تھا۔ مجھے بے وقوف بنانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا حالانکہ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایسے "معاملات" میں تمام "واقفانِ حال" حصے دار ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا' اس جھوٹے ڈی ایس پی کو میں اس کے گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔

"فرض کریں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "ہم آپ کی "خواہش" پوری کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ ہمیں چھوڑ دیں گے نا؟"

"بالکل چھوڑ دوں گا۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

"اس صورت میں آپ تھانے دار کو کیا جواب دیں گے؟"

"میں اس کا افسر ہوں۔" وہ غراہٹ سے مشابہ لہجے میں بولا "وہ مجھے جواب دینے کا پابند ہے' میں نہیں۔ میں ڈی ایس پی ہوں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ کیا سمجھے؟"

اس کی برہمی ظاہر کر رہی تھی جیسے میں نے اس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ میں نے معذرت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہمیں چھوڑنے کے لیے آپ کو اپنے سامنے کوئی نہ کوئی جواز تو رکھنا ہوگا!"

"اس کے سو راستے ہو سکتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "ون سکسٹی نائن زندہ باد۔"

"یہ ون سکسٹی نائن کیا شے ہے جناب!" میں نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا "یہ ایک قانونی دفعہ ہے۔" "ون سکسٹی نائن" یعنی دفعہ ایک سو انہتر (۱۶۹) بہت کام کی چیز ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں اس دفعہ کے تحت رپورٹ بنا کر اپنے سینئرز کو بھیج دوں گا کہ میں نے منگل سنگھ' گنڈا سنگھ اور ممتاز کے شبے میں' ناکے سے جن تین افراد کو گرفتار کیا تھا' گڑی تفتیش کے نتیجے میں یہ اصل مجرم ثابت نہیں ہو سکے۔ میں

نے تصدیق کرلی ہے کہ یہ منگل سنگھ گنڈا سنگھ اور مغویہ ممتاز نہیں ہیں بلکہ یہ علی الترتیب میر بخش، مقصود احمد اور لیلیٰ ہیں۔ ان تینوں کا تعلق معاشرے کے معزز طبقے سے ہے لہٰذا میں انہیں باعزت جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کرکے وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ کو شیطانی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے متاثر ہوتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا "واقعی جناب! ون مین آرمی ٹائن تو بڑی حیرت انگیز فرد ہے!"

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا اور بالکل کاروباری لہجے میں بولا "تم اپنے چچا کو فون کرو گے یا پھر کراچی میں رابطہ کرنا چاہو گے؟"

وہ گھوم پھر کر اسی طرف آگیا تھا جس رخ سے میں بچنا چاہتا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا "میں اس سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے دانستہ اپنا رویہ کچھ اس طرح کا رکھا کہ وہ مجھ سے خوش امیدی باندھنے پر مجبور ہوجائے وہ مجھے مائل بہ آمادگی دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے' میں تمہیں مشورے کا موقع دیتا ہوں۔"

"تھینک یو سر!" میں نے اسے مزید خوش کرنے کی خاطر کہا۔

وہ بولا "انہیں اوپر بلاؤں یا تم نیچے جاکر ان سے ملنا چاہتے ہو؟"

میں اپنے ساتھیوں کو گراؤنڈ سے اوپر لاکر اپنے لیے صورت حال کو قدرے مشکل اور پیچیدہ بنانے کے حق میں نہیں تھا چنانچہ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"میں وہیں جاکر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" ڈی ایس پی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اپنے کلاشنکوف بردار باڈی گارڈ کے ساتھ مجھے زیریں منزل پر بھیج دیا۔ باڈی گارڈ بہت محتاط اور تجربہ کار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک مناسب اور محفوظ فاصلے سے مجھے گن پوائنٹ پر رکھے ہوئے تھا۔ ویسے بھی میں گارڈ کے ساتھ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ ڈی ایس پی تھا۔ اگر وہ کسی طرح میرے شکنجے میں آجاتا تو میں بنگلے کی فضا کو اپنے حق میں ہموار کرسکتا تھا۔ میں جس قسم کی صورت حال سے گزر رہا تھا اس میں ذرا سی غلطی بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوسکتی تھی۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے زیریں منزل کے ڈرائنگ روم نما کمرے میں آگئے۔ وہاں اے ایس آئی عبدالرزاق میر بخش اور ساحل کو اپنی "نظر" میں رکھے ہوئے تھا۔ ڈی ایس پی کے گارڈ نے مجھے ڈرائنگ روم میں پہنچا کر عبدالرزاق سے مختصر بات کی جس کے نتیجے میں وہ گارڈ کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے پاس چلا گیا۔

گارڈ نے تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کہا "تمہیں جو بھی مشورہ کرنا ہے' جلد از جلد کرلو۔"

میں اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ دونوں متفکر نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میر بخش نے دھیمی آواز میں استفسار کیا "کیا ہوا سائیں؟"

ساحل بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "خیریت تو ہے وجدان!"

ساحل نے مصلحت کے تقاضے کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز اختیار کیا تھا۔ میں نے انہیں مزید آہستگی سے بولنے کی تاکید کرنے کے بعد کہا۔

"ابھی تک تو سب خیریت ہی ہے اور اس خیریت کو ہم سب نے مل کر مزید بخیریت بنانا ہے۔ میں ڈی ایس پی سے تھوڑی مہلت لے کر آپ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بہانے یہاں آیا ہوں۔"

"حکم سائیں۔" میر بخش دروازے میں کھڑے مسلح افراد کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس نے آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہ سن سکے۔ اگر واقعی دیواروں کے کان ہوتے ہیں تو مجھے امید تھی کہ وہ بھی ہماری گفتگو کو سن نہیں پا رہی ہوں گی۔

میں نے باری باری دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "ڈی ایس پی کسی بھی طرح جان چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس نے ہماری نجات کے لیے واشگاف الفاظ میں پورے تین لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔"

"اتنی رقم ہمارے پاس کہاں سے آئے گی؟" ساحل کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں نمودار ہوگئیں۔

میں نے کہا "ڈی ایس پی نے اس رقم کی "آمد" کا طریقہ بھی بتایا ہے۔"

"وہ کیا سائیں؟" میر بخش اضطراری لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ میں میرپور خاص میں اپنے چچا ایوب خان کو فون کروں۔" میں نے کہا "یا پھر کراچی اپنے گھر والوں کو فون کرکے اس رقم کا بندوبست کرنے کی تاکید کروں۔

جب تک کسی بھی وسیلے سے تین لاکھ کی رقم اس بنگلے پر نہیں پہنچ گی' ہم یہیں پر یہ آہنی زیور اپنی کلائیوں پر سجائے گن پوائنٹ پر سانس لیتے رہیں گے۔" اپنی بات ختم کرکے میں نے ہتھکڑی زدہ دونوں کلائیوں کو اشارہ کرنے والے انداز میں ہلکا سا جھٹکا دیا۔

ساحل نے مایوسی سے کہا "لگتا ہے' یہ کہانی بھی فیل ہوگئی!"

"ہاں سائیں۔" میر بخش تائیدی انداز میں بولا "میرپور خاص اور کراچی والی کہانی تو سراسر فرضی تھی۔ آپ ان دو جگہوں میں سے کہیں بھی فون کرکے ایک پیسا تک نہیں منگوا سکتے۔"

"اب کیا ہوگا وجدان؟" ساحل نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا "میں تم دونوں کی طرح ابھی اتنا مایوس نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے کسی بھی قسم کی صورت حال میں مایوس ہونا نہیں سیکھا۔"

"تو کیا تم یہاں اپنی "چی" کی قوت آزماؤ گے؟" ساحل نے پوچھا۔

میر بخش نے "چی" کے ذکر پر الجھن زدہ نظر سے پہلے مجھے اور پھر ساحل کو دیکھا۔ اس کی الجھن بجا تھی۔ ہم نے اس کے سامنے کبھی "چی" کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور از خود وہ اس پراسرار قوت کے بارے میں بھلا کیا واقفیت رکھ سکتا تھا۔ میں نے ساحل کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"جب تک کوئی بھی صورت حال میرے کنٹرول سے باہر نہیں ہوجاتی' میں کسی بھی پراسرار یا ماورائی قوت کا استعمال نہیں کروں گا۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

وہ مطمئن انداز میں بولی "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ موجودہ صورت حال تمہارے ہاتھ میں ہے؟"

"اگر ہاتھ میں نہیں تو ہاتھ سے زیادہ دور بھی نہیں۔" میں نے ذو معنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "اگرچہ میری کلائیوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی ہے لیکن ابھی میری "دراز دستی" مفلوج نہیں ہوئی۔ بس میں کسی مناسب موقع کی تاک میں ہوں۔"

ساحل نے پوچھا "اس موقع کے انتظار میں تم ڈی ایس پی سے تین لاکھ روپے کے مطالبے کو کب تک ٹہلاتے رہو گے؟"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔" میں نے کہا "اسی لیے میں مشورے کا بہانہ کرکے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔"

"وہ آئیڈیا کیا ہے؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا "میں ڈی ایس پی سے جاکر کہتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی کو بھیج کر رقم منگوا لیتا ہوں۔"

"ساتھی کو بھیج کر؟" ساحل نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "کون سے ساتھی کو بھیج کر تم اتنی بڑی رقم منگوانے کی بات کررہے ہو۔ اور کہاں سے؟"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "میں میر بخش کو میرپور خاص بھیجنے کی بات کروں گا اور ساتھ ہی ڈی ایس پی سے یہ فرمائش بھی کروں گا کہ وہ اس کی ہتھکڑی کھول دے۔"

"آپ بھی بہت کمال کی باتیں کررہے ہو سائیں۔" میر بخش نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا "میں میرپور خاص جاکر کس سے رقم لاؤں گا۔ اتنی بڑی رقم مجھے کون دے گا اور وہ بھی اس وقت' رات کے تین بجے۔ ناممکن سائیں' ناممکن۔"

میں نے کہا "میری ڈکشنری میں "ناممکن" کا لفظ نہیں ہے میر بخش!"

وہ میرے لہجے میں بھری ہوئی سنجیدگی سے چونک اٹھا۔ تاہم متذبذب لہجے میں پوچھنے لگا "سائیں! آپ خود ہی بتاؤ' میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لے کر آؤں؟"

میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلنے کے لیے وضاحت ضروری سمجھی اور کہا "دیکھو میر بخش! میں بتا چکا ہوں کہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے اور "آئیڈیاز" کی خاطر بہت سی بظاہر ناممکن باتوں کو بھی ممکن تصور کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کسی بھی صورت نہیں کرسکتے۔ اس لیے یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہیں رقم کے سلسلے میں پریشان نہیں ہونا۔ اور نہ ہی تمہیں واپس آنے کی ضرورت ہے۔"

وہ مزید الجھ گیا' لکنت زدہ آواز میں بولا "پھ۔۔۔ پھر۔۔۔ آپ مجھے کیوں بھیج رہے ہو سائیں۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔"

"تمہیں یہاں سے نکالنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔" میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوئے کہا "اس طرح کم از کم ہمارا ایک ساتھی تو پولیس والوں کی حراست سے نکل جائے گا۔ تم باہر آزاد دنیا میں رہ کر ہمارا انتظار کرنا۔ ہم بھی بہت جلد تم سے آملیں گے۔"

وہ قطعیت سے بولا "سائیں! میں آپ کو ان سنگین حالات میں چھوڑ کر ہرگز ہرگز کہیں نہیں جاؤں گا۔ میری جان آپ پر قربان۔ میں آپ کو رہائی دلانے کے لیے اپنی جان داؤ

پر تو لگا سکتا ہوں مگر پیٹھ دکھا کر اپنی جان نہیں بچا سکتا۔"

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تمہارے اس عمل سے کہیں بھی بزدلی ظاہر نہیں ہوگی۔ اگر تم کسی طرح آزاد ہو کر میرپور خاص پہنچ گئے تو ہمارے لیے زیادہ آسانی سے کچھ کر سکو گے۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "اگر میں تمہیں کسی بھی بہانے یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہوں تو اس میں کوئی بھلائی ہی پوشیدہ ہے۔"

وہ تذبذب میں نظر آنے لگا۔ ساحل نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "میر بخش! وجدان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہیں فوراً اس کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "تم میرپور خاص میں اپنے قیام کی کوئی جگہ مجھے بتا دو۔ ہم یہاں سے نکلتے ہی سیدھے وہاں آجائیں گے۔"

اسی وقت دروازے میں کھڑے ڈی ایس پی کے مسلح گارڈز نے وارننگ کے سے انداز میں بہ آوازِ بلند کہا "بہت ہو چکے راز و نیاز۔ اب بس بھی کرو۔"

میں نے تحکم آمیز سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا۔ وہ متامل لہجے میں بولا "میں نے آپ کے پوچھنے پر میرپور خاص کے ایک علاقے رتن آباد کا نام بتایا تھا۔ وہاں میرا ایک جاننے والا رہتا ہے۔ اس کا نام اللہ یار ہے۔ سبزی منڈی میں اس کی دکان ہے۔ آپ کسی سے بھی اس کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ اللہ یار خاصا مشہور بندہ ہے۔ میں اس کے پاس رک کر آپ کا انتظار کروں گا لیکن..."

"لیکن کیا؟" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا "ہم پولیس والوں کو بتا چکے ہیں کہ رتن آباد میں آپ کا چچا (فرضی) ایوب خان رہتا ہے۔ اس طرح میرے اور آپ کے لیے کوئی پریشانی پیدا نہ ہو جائے۔ یہ لوگ تو سیدھا میرپور خاص کا رخ کریں گے اور خاص طور پر رتن آباد میں ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"بعد میں جو پریشانی پیدا ہوگی، اس کے بارے میں بعد ہی میں سوچا جائے گا۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا "فی الحال تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"جو حکم سائیں!" وہ مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

میں ڈی ایس پی کے مسلح گارڈ کے ساتھ واپس بالائی منزل پر آگیا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہ گارڈ میری جانب سے بہت چوکس چوبند رہا اور مجھے ڈی ایس پی والے کمرے میں پہنچا کر بند دروازے کے باہر متعین ہو گیا۔ اس کی "تعیناتی" کے بارے میں مجھے یقین تھا ورنہ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اندر آگیا تو ڈی ایس پی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے ایک خاص فاصلہ رکھے ہوئے تھا۔ میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا تو اس نے سوال کیا۔

"ہو گیا مشورہ؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا "پھر کیا طے کیا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "میں آپ کی مطلوبہ رقم دینے کو تیار ہوں مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

وہ میرے اسٹائل سے ناچ اٹھا، برہمی سے بولا "تم اس وقت ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھے ہو اور میں ایک اعلیٰ پولیس افسر ہوں۔ تم میرے سامنے کوئی شرط رکھنے کی بات کر رہے ہو۔ جانتے ہو، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اسے میری بات بہت زور سے لگی تھی۔ میں اس موقع پر اسے خوامخواہ ناراض کر کے کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے فوراً خوشامدانہ رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ میری بات کو کسی اور انداز میں لے گئے ہیں۔ میری کیا مجال کہ میں آپ سے اپنی کوئی شرط منوا سکوں۔"

"پھر تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" وہ بدستور سخت لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "جناب! میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ رقم کا بندوبست کرنے کے لیے آپ مجھے ایک سہولت دے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی!"

"کس قسم کی سہولت؟" اس کے استفسار میں دلچسپی شامل تھی۔

میں نے نہایت ہی عاجزی سے کہا "جناب! اگر آپ میرے ساتھی میر بخش کی ہتھکڑی کھلوا دیں تو میں اسے میرپور خاص بھیج کر چچا سے تین لاکھ روپے کی رقم منگوا سکتا ہوں۔"

میری تجویز سن کر وہ سٹپٹا گیا اور غصیلے لہجے میں بولا "تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر تم کسی قسم کے چکر میں ہو تو یہ خام خیالی ہے تمہاری۔ رقم لانے کے لیے نہ تو میر بخش کی ہتھکڑی کھولنا ضروری ہے اور نہ ہی اس کا میرپور خاص جانا۔ تم ابھی یہاں سے ایک فون کھڑکاؤ اپنے چچا کو۔ وہ علی الصباح رقم لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔"

"سر! آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

نے مسکین صورت بنا کر ڈی ایس پی کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی "میں اپنے چچا ایوب خان کو فون نہیں کر سکتا۔" میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈی ایس پی سے ہمکلام تھا۔ وہ ناراضی زدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم اپنے چچا کو فون کیوں نہیں کر سکتے؟"

"اس لیے کہ وہ رات کے اس آخری پہر اپنے گھر پر ہوگا۔" میں نے بااعتماد لہجے میں کہا "اور چچا کے گھر پر فون کی سہولت موجود نہیں۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا پھر جلدی سے بولا "چلو ٹھیک ہے، تم پھر کراچی میں اپنے [illegible] سے با[illegible]۔ وہاں تو تمہارے گھر میں ضرور فون ہوگا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پلاننگ کے مطابق گفتگو کو آگے بڑھا دیا۔

"جناب! میں اس وقت اپنے گھر فون کر کے اس قسم کی خطرناک اطلاع نہیں دے سکتا۔"

"وہ کیوں۔" وہ تلملا کر بولا "اس اطلاع سے وہاں کون سی قیامت آجائے گی؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "قیامت ہی تو آجائے گی جناب۔" پھر میں نے اپنی آواز کو جذبات سے لبریز کرتے ہوئے ڈی ایس پی کو بتایا "سر! میری والدہ دل کی مریضہ ہیں۔ ان کا بائی پاس بھی ہو چکا ہے۔ وہ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی برداشت کی آخری حد سے گزر جائیں گی۔ آپ تو ماشاء اللہ خاصے سیانے ہیں۔ برداشت کی آخری حد سے گزرنے کا مطلب جانتے ہوں گے؟"

اس نے شک زدہ نظر سے مجھے گھورا اور ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "تم مجھے اپنے گھر کا نمبر بتاؤ۔ میں خود تمہارے باپ سے بات کرتا ہوں۔ میں ایسے طریقے سلیقے سے بات کروں گا کہ تمہاری ماں پر کسی قسم کے صدمے کا اثر نہیں ہوگا۔"

"کوئی فائدہ نہیں جناب۔" میں اپنے طریقہ واردات پر اڑا رہا "کئی سال پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں صرف میری والدہ اور چھوٹا بھائی ہے۔ فون ہر صورت میں والدہ ہی اٹینڈ کریں گی۔ اگر بالفرضِ محال، چھوٹے بھائی نے فون اٹھا بھی لیا تو وہ اپنے بچپنے میں والدہ صاحبہ کو اور بھی ڈرا دے گا۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کسی بھی طرح میری بات نہیں مانو گے!" وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کئی طرح باتیں بناتے رہو گے۔"

میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا "آپ میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں جناب! میر بخش کی ہتھکڑی کھول کر اسے میرپور خاص جانے دیں۔ انشاء اللہ، وہ کل رقم لے کر آجائے گا۔"

"نہیں سائیں، یہ تو نہیں ہو سکتا۔" وہ نفی میں گردن جھٹک کر ٹہلنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تم تینوں میں سے کوئی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔ اس جنگلے میں رہتے ہوئے تمہیں تین لاکھ روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔"

میں نے عاجزانہ انداز میں کہا "سر! میں اپنی مجبوری آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"ہوں!" ڈی ایس پی نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا "تم واقعی مجھے مجبور اور بے بس نظر آرہے ہو مگر فکر نہ کرو، میں تمہاری مجبوری رفع کرنے کا کوئی بندوبست کر سکتا ہوں۔ تم تینوں کو کہیں آنا جانا بھی نہیں پڑے گا اور بغیر کہیں فون کیے رقم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

اپنی بات ختم کر کے اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ میں اس کے بدلے ہوئے دوستانہ بلکہ ہمدردانہ رویے کو کوئی مفہوم یا معنی پہنانے سے قاصر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے لہجے سے مجھے کسی گہری سازش کی بُو آرہی تھی۔

میں نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا "جناب! میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا!"

"میں سمجھاتا ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اس کمرے کو دیکھ رہے ہو! میں اکثر و بیشتر یہاں راتیں گزارتا ہوں۔ تم اسے میرا بیڈ روم بھی کہہ سکتے ہو۔"

اس نے تھوڑا توقف کر کے میرے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر تم چاہو تو میں اس کمرے کے اس حصے کو تمہارے لیے جیل میں بدل سکتا ہوں۔" پھر اس نے ڈبل بیڈ کی جانب انگلی سے اشارہ کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم ابھی اور اسی وقت اس "بینک" میں تین لاکھ روپے مالیت کا ایک "چیک" جمع کروا دو۔ صبح تک تمہارا چیک کیش ہو جائے گا پھر تم تینوں ہنسی خوشی یہاں سے روانہ ہو جانا۔"

اس کی باتوں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں نے اس کی کمینگی اور ذلالت کو آخری سرے تک ناپنے کی خاطر چہرے پر ناسمجھی کے تاثرات سجاتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس تو نہ کوئی چیک ہے اور نہ ہی کوئی چیک بک۔ میں آپ کی پیشکش پر بہت حیران بلکہ پریشان ہوں۔"

"تم اب اتنے ننھے بچے بھی نہیں ہو۔" وہ اپنے چہرے پر خباثت کی تہ چڑھاتے ہوئے بولا "تم تو ایک بلینک چیک اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہو!"

پھر اس نے اپنی ناک پر ایک انگلی رکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا اور بے ہودگی سے مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

میرے بدن کا سارا خون دماغ کو چڑھ گیا۔ ساحل کے بارے میں ڈی ایس پی کے مکروہ عزائم نے میرے تن بدن میں شرارے بھر دیے۔ میں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ایک چیتے کے مانند جست بھری اور ڈی ایس پی کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے صوفے کی دوسری جانب پہنچ گیا۔

وہ اس اچانک حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اور میری وحشت اب اسے کسی تیاری کا موقع دینے والی نہیں تھی۔ مجھ پر ایک جنون سا سوار ہو چکا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ ساحل کی ذات سے متعلق ڈی ایس پی کی بدکلامی نے مجھے اچانک بے قابو کر دیا تھا۔ میں اپنی' اس وقت کی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

صوفے کی دوسری طرف زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کے دوران میں' میں ڈی ایس پی کی پشت پر پہنچ گیا اور اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو سامنے لاتے ہوئے میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی کوئی مزاحمتی کارروائی کرتا' میں نے اپنے دونوں بازو پیچھے کھینچتے ہوئے اس کی چربیلی گردن کو شکنجے میں کس لیا۔

ڈی ایس پی سناٹے میں آگیا۔ وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے دوگنا تھا۔ تاہم طاقت' توانائی' تکنیک اور چستی میں مجھ سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ ہتھکڑی کی زنجیر اس کے نرخرے پر فٹ بیٹھ گئی تھی۔ میں نے تھوڑا سا زور لگایا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بھنچے ہوئے حلق سے "خرخراہٹ" برآمد ہونے لگی۔

میں نے موت سے زیادہ سفاک لہجے میں اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی "ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پر اپنے بازوؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

اس کمرے کا فرش قالین پوش تھا اس لیے ہمارے "ٹکراؤ" کی آواز کمرے سے باہر نہیں جا سکی تھی ورنہ دروازے سے باہر کھڑا اس کا باڈی گارڈ ضرور مداخلت کر چکا ہوتا۔

ڈی ایس پی نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا کہ میری مطلوبہ چابی اس کی پتلون کی جیب میں تھی۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ سے مذکورہ جیب کو تھپتھپانے کی ناکام کوشش بھی کی۔

میں نے اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے اس کی جیب سے چابی نکالنے کی ماہرانہ کوشش کی تو ڈی ایس پی کا چربی دار پلپلا جسم میرا ساتھ نہ دے سکا۔ میں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس کی گردن کو پیٹ کی جانب جھکانا چاہا تاکہ میرے ہاتھ اس کی جیب تک رسائی حاصل کر لیں مگر اس کی گردن ایک "ناکافی حد" سے زیادہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔

میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں اسے حکم دیا "اپنی جیب سے چابی نکال کر یہ ہتھکڑی کھولو۔" ساتھ ہی میں نے ہتھکڑی کی زنجیر کو اس کے ٹیڈے پر دبایا۔

میں مسلسل اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھا کہ وہ حلق سے کوئی "واویلا" خارج کر کے اپنے باڈی گارڈ کو میری رہائی سے قبل اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس نے زندگی بھر حکم چلایا تھا' میری زبان سے اپنے لیے حکم سنتے ہوئے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ تاہم اس وقت اس کی گردن تیشے کی دھار پر تھی۔ اس کی ذرا سی غلط عدولی کسی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پھر کسمسانا چاہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے خطرناک نتائج کی سنگین دھمکیاں دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تاہم میں نے اس کی گردن پر آہنی زنجیر کا دباؤ بڑھاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"میرے چہرے پر برہنہ وحشت نے اس کی آنکھوں میں دہشت بھر دی اور اس کا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف رینگ گیا۔ میں نے اس دوران میں احتیاط کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ڈی ایس پی کی کوئی معمولی سی حرکت بھی بازی پلٹ سکتی تھی۔

ڈی ایس پی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہتھکڑی کھول دی۔ جس چابی سے میری ہتھکڑی کھولی گئی تھی وہ ایک چھلے میں پروئی ہوئی تھی۔ میں نے وہ گچھا بھی اپنے قبضے میں کر کے جیب میں ڈال لیا پھر اس کی گردن کو اپنے بازو کے حلقے میں کستے ہوئے میں اس کے لباس کو ٹٹول کر کسی ہتھیار وغیرہ کا سراغ لگانے لگا۔

جلد ہی میرا ہاتھ ایک ریوالور کے ابھار کو کھوجنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی لمحہ تھا جب ڈی ایس پی نے ایک ایسی

حرکت کی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔

اس نے ٹیلی فون اسٹینڈ کو ایک زوردار لات ماری۔ اسٹینڈ فون سمیت میز پر رکھے کانچ کے جگ سے ٹکرایا۔ وہ جگ پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی شیشے کا گلاس بھی موجود تھا۔ ٹیلی فون اسٹینڈ کی خطرناک ٹکر کانچ کا جگ' پانی سے بھرا ہوا جگ دیوار سے جا ٹکرایا۔

ایک زوردار چھناکا ہوا اور جگ کی کرچیاں کمرے میں بکھر گئیں۔ یہ آواز ایسی گئی گزری نہیں تھی کہ ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ اس کی جانب متوجہ نہ ہوتا۔ میں سیکنڈ کا لاکھواں حصہ بھی ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کے لباس سے ریوالور برآمد کر کے اس کی نال اس کی کنپٹی سے پیوست کر دی۔ اس کی گردن میرے بائیں بازو کی گرفت میں جکڑی ہوئی تھی۔ میرے شدید دباؤ نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ زبان سے کچھ بھی کر سکے۔

میں بجلی کی سی سرعت سے ڈی ایس پی کو لیتے ہوئے دروازے کے عین سامنے والی جگہ پہنچ گیا' دروازہ کھلنے کے بعد جو بہترین کمین گاہ بن سکتی تھی۔

باڈی گارڈ کا مطلب ہے "محافظ جاں" دروازے کے پار اندر مسلح شخص ڈی ایس پی کی جان کی حفاظت کا ذمے دار تھا۔ کمرے میں پیدا ہونے والی چھناکے کی تیز آواز نے اسے بڑی وضاحت سے بتا دیا کہ اس کے ڈی ایس پی کی جان کو نہایت ہی سنگین خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔

کمرے کا دروازہ "دھڑ" سے کھلا اور کلاشنکوف بردار باڈی گارڈ ایک جھٹکے سے اندر آگیا۔ ہم دونوں دروازے کی اوٹ میں تھے۔ وہ حیرت سے خالی کمرے کو تکنے لگا۔

میں نے اس کی حیرت رفع کرنے کے لیے نہایت سرعت کے ساتھ ریوالور کی نال اس کی گدی پر ٹکا دی اور نہایت مشابہ آواز میں کہا۔

"کلاشنکوف دور پھینک دو ورنہ تمہاری کھوپڑی کا بھیجا کمرے کی دیواروں پر مل دوں گا!"

اس کارروائی کے دوران میں' میں نے ڈی ایس پی کی گردن کو مسلسل اپنی بانہہ کی گرفت میں دبوچ رکھا تھا۔ کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر' وہ سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہا تھا۔

کلاشنکوف بردار باڈی گارڈ نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور کلاشنکوف کو کھڑکی والی دیوار کی طرف پھینکتے ہوئے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے۔ میرے لہجے کی سنگینی نے اسے ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا وہ لہجہ میرے فیصلہ کن خیالات کی عکاسی کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ باڈی گارڈ اگر اس وقت کسی مہم جوئی کے چکر میں پڑ جاتا تو اپنے ساتھ ساتھ ڈی ایس پی کو بھی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کر جاتا۔

کمرے کی بازی میرے حق میں پلٹ چکی تھی لیکن کمرے سے باہر حالات تبدیل ہو گئے۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ کچھ لوگ زیریں منزل سے بالائی منزل کی طرف آ رہے تھے۔ ظاہر ہے' وہ ساحل اور میر بخش نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے' ڈی ایس پی کے وفادار تھے۔

وہ بہت ہی نازک اور سنگین لمحات تھے۔ میں نے ڈی ایس پی کی گردن کو ایک مخصوص جھٹکا دیا' اس کے ساتھ ہی ایک زوردار فرنٹ پنچ کک اپنے سامنے ہینڈز اپ باڈی گارڈ کی تشریف پر رسید کی۔ میرے یہ دونوں عمل بیک وقت اور میکانکی تھے۔

ڈی ایس پی کی گردن میرے بازو کی گرفت میں جھول گئی۔ وہ دو تین گھٹنے کے لیے اتنا غفیل ہو چکا تھا۔

باڈی گارڈ اپنی باڈی کے نہایت ہی بارآور حصے پر میری طوفانی لات کھا کر لڑکھڑایا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑکی کی چوبی چوکھٹ سے ٹکرایا۔

میں ڈی ایس پی کے چربی زدہ جسم کو حوالہ فرش کرتے ہوئے باڈی گارڈ کی جانب بڑھا۔ وہ کھڑکی سے ٹکرا کر زمین پر گرنے کے بعد سنبھل چکا تھا۔ میں اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسی لمحے کھلی ہوئی کھڑکی سے میری نگاہ باہر چلی گئی۔

اس کھڑکی سے بنگلے کا مین گیٹ دکھائی دے رہا تھا اور میں نے وہاں جو منظر دیکھا اس نے مجھے بے حس و حرکت ہونے پر مجبور کر دیا۔

دو چھپیں آگے پیچھے وہاں آ کر رکیں اور ان میں سے کوئی نصف درجن افراد برآمد ہو کر بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ گیٹ پر اگرچہ روشنی بہت زیادہ نہیں تھی تاہم میں ان افراد میں ایک شخص کو بخوبی پہچان گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اس شخص کے سر پر ایک تازہ پٹی بندھی تھی۔ وہ ایک سوا ایک فیصد تارا تھا!

اسی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ میری لمحاتی غفلت یا عدم توجہی نے فائدہ اٹھا کر باڈی گارڈ نے اپنی کلاشنکوف پر قبضہ جمایا اور اس کی ہلاکت خیز نال کو میری گردن سے پیوست کرتے ہوئے وہ آتشیں لہجے میں غرایا "ہینڈز اپ!"

میں نے ہاتھ اٹھا دیے۔

فیصلے کی گھڑی بڑی کڑی ہوتی ہے اور یہ کڑی گھڑی میرے سر پر آن پہنچی تھی۔ اس کی "ٹک ٹک" میرے دماغ پر دستک دے رہی تھی۔ وجدان! کچھ کرو۔ کچھ کر گزرو۔ اگر وقت گزر گیا تو تمہیں اپنے ساتھیوں سمیت ایک اذیت ناک طوفان سے گزرنا ہوگا۔

میں نے ہمیشہ وقت کی پکار پر کان دھرے ہیں' اس کے تقاضوں کو سمجھا ہے اور ان کے مطابق ہی قدم اٹھایا ہے۔ مجھے بخوبی احساس تھا' میں ان لمحات میں بہت ہی سنگین صورتِ حالات سے دوچار تھا۔ وہ نہایت ہی نازک لمحات تھے جن میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

ڈی ایس پی کے گارڈ کی کلاشنکوف کی خوفناک نال میری گردن کے عقبی حصے سے پیوست تھی اور اس کے حکم پر میں نے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا رکھے تھے۔ میرے دائیں ہاتھ میں ڈی ایس پی سے چھینا ہوا ریوالور موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے گارڈ کی جان پر بن آئی تھی اور اس نے میرے تحکمانہ جملے کے نتیجے میں اپنی کلاشنکوف کھڑکی کے پاس پھینک دی تھی اور اب اس کا پلڑا بھاری تھا' وہ مجھے بھی کچھ اسی قسم کا حکم دے رہا تھا۔

"ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ لو!"

میں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

وہ کلاشنکوف کی قاتل نال سے میری گردن پر ٹھوکا دیتے ہوئے غرایا "گھوم جاؤ۔"

میں نہایت فرماں برداری سے گھوم گیا۔ اب میرا چہرہ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف تھا۔ اس دروازے کو تھوڑی دیر پہلے گارڈ "دھڑام" سے کھول کر کمرے میں آیا تھا۔ میں اس وقت ڈی ایس پی کو اپنے بازو کی لپیٹ میں دبوچے دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا اور گارڈ ہمیں کمرے میں نہ پا کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

گارڈ کو ایک مرتبہ پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ کمرے کے قالین پوش فرش پر فربہ اندام ڈی ایس پی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ گارڈ نے میری گردن پر نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پھر ٹھوکا دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں آگے بڑھوں۔

میں نے دو قدم آگے بڑھائے اور اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا۔ اس وقت میں کھلے ہوئے دروازے سے صرف ایک قدم کی دوری پر تھا۔ میری بائیں جانب چند انچ کے فاصلے پر کمرے کی دیوار تھی جس پر سوئچ بورڈ لگا تھا۔ اس وقت بورڈ پر صرف دو سوئچ آن پوزیشن میں تھے۔ ان دونوں میں ایک سیلنگ فین کا اور دوسرا ٹیوب لائٹ کا سوئچ تھا۔ فین کا سوئچ خصوصاً ریگولیٹر کے برابر میں لگایا جاتا ہے۔ مجھے اس سوئچ سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ ٹیوب لائٹ کا سوئچ تھا جو فین والے سوئچ سے دو انچ کی دوری پر تھا۔

میں نازک ترین لمحات کے جس مرحلے پر پہنچ چکا تھا وہاں سیکنڈ کا کروڑواں حصہ بھی ضائع کرنا انتہائی ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے بجلی سے بھی زیادہ سریع انداز میں اپنے فیصلے پر عمل کر ڈالا۔

میں نے سانس روکی' میرا بایاں ہاتھ ٹیوب لائٹ کے سوئچ پر پڑا اور میں نے بیٹھک لگانے والے انداز میں زمین پر بیٹھ کر بیک رول کیا۔ یہ تینوں عمل اتنے مربوط اور مرکانکی تھے کہ گارڈ کے حواس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو گیا۔

سوئچ بورڈ پر پڑنے والے میرے ہاتھ نے ٹیوب لائٹ کو آف کر دیا۔ کمرا اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس دوران میں بیک رول کرتے ہوئے میں گارڈ کی ایسی کم تیسی کر چکا تھا۔ میں نے فرش پر الٹی لوٹ لگاتے ہوئے دونوں پاؤں کو بیک کِکس کے اسٹائل میں گارڈ کی کلائیوں پر مارا' نتیجے میں کلاشنکوف کا ٹریگر دب گیا۔ ایک خوفناک برسٹ نے کمرے کی چھت کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اندھیرے میں گارڈ پر ایک کرتے ہوئے میں نے ٹانگ کا خاص خیال رکھا تھا۔

اگر اس موقع پر میں فرنٹ رول کرتا تو نتیجہ اس کے بالعکس برآمد ہوتا۔ فطری ردِعمل کے تحت گارڈ کلاشنکوف سے فائرنگ کرتا اور میں عین گولیوں کی رینج اور نشانے پر' فرش پر موجود ہوتا پھر میرا بھی وہی حشر ہوتا جو اس وقت کمرے کی چھت کا ہوا تھا۔

کمرے کی تاریکی میں گارڈ اپنی نئی نویلی کلاشنکوف سمیت پیچھے کی جانب الٹ گیا تھا۔ میں اپنی بروقت کارروائی کے بعد سائڈ رول کرتے ہوئے گارڈ سے محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ محفوظ ان معنوں میں' کہ مجھے بیڈ کی آڑ میسر آ گئی تھی۔ یہی وقت تھا جب نیچے سے آنے والے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔

کمرے سے باہر برآمدے میں وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں گارڈ اور ڈی ایس پی پر قابو پا چکا تھا تو میں نے ان تینوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ زیریں منزل سے

بالائی منزل کی جانب آ رہے تھے۔ ان میں ایک تو ڈی ایس پی کا ذاتی ڈرائیور تھا اور باقی دو افراد سادہ پوش گھریلو ملازم تھے۔

وہ کوئی نہایت ہی اہم اطلاع لے کر نیچے سے اوپر آئے تھے مگر فائرنگ اور کمرے کی تاریکی نے ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ ٹھٹک کر حیران اور پریشان نظروں سے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے اندر کی صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر ہیں' انہیں اندر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ کمرے سے باہر روشنی کا مناسب انتظام نہیں تھا تاہم میں انہیں واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ان کی آمد کا مقصد کھل گیا۔ ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے کمرے کے اندھیرے میں گھورتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں کہا "سر! آپ کہاں ہیں؟ نیچے بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ گیٹ کے باہر رکنے والی جیپوں سے متعلق کوئی اطلاع فراہم کر رہا ہے۔ میں نے بھی تھوڑی دیر قبل کمرے کی کھڑکی سے ان جیپوں کو گیٹ کے سامنے رکتے دیکھا تھا اور ان میں سے برآمد ہونے والے نصف درجن افراد میں تارا سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

ڈی ایس پی کو میں نے مخصوص داؤ کے استعمال کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے اتنا غفیل کر دیا تھا۔ ڈرائیور کی پکار اور استفسار کا کوئی جواب دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تاہم اس موقع پر ڈی ایس پی کے گارڈ کو کوئی ردِعمل ضرور ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ اس کی جانب مکمل خاموشی تھی۔

میں نے ٹیوب لائٹ کو آف کرنے کے بعد بڑے بچے تلے انداز میں پوری ایکوریسی کے ساتھ بیک رول کرتے ہوئے اس کی کلائیوں پر ڈبل کِک کی بھرپور ضرب لگائی تھی۔ نتیجے میں وہ کلاشنکوف سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا تھا۔ اسی دوران میں اس کی کلاشنکوف نے موت بھی اُگلی تھی۔ میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں گارڈ کے گرنے کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ اب اس کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر الجھن میں گرفتار ہو رہا تھا۔

ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے کمرے کی تاریکی میں سے کوئی جواب نہ پا کر اضطراری لہجے میں کہا "سر! آپ خاموش کیوں ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کمرے میں آپ نے اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟ آپ خیریت سے تو ہیں! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں فائرنگ کی آواز سنی تھی۔"

ڈرائیور کے متعدد سوالات کا اسے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ڈی ایس پی اس وقت جہاں تھا وہاں سے کوئی جواب ارسال نہیں کر سکتا تھا۔ میں دانستہ خاموش تھا البتہ گارڈ کی خاموشی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر یہی سمجھا کہ اس کی مسلسل خاموشی کسی چال کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' وہ مجھے شکار کرنا چاہتا ہو اور میری جانب سے کسی حرکت کا انتظار کر رہا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے اور آنے والے کسی بھی سنگین لمحے کے لیے تیار تھے۔

کمرے سے باہر موجود ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے دُزدیدہ نظر سے اپنے دونوں ساتھیوں کو دیکھا پھر کمرے کی جانب منہ کر کے فریادی انداز میں بتانے لگا "سر! نیچے والی منزل پر بازی پلٹ چکی ہے۔ اے ایس آئی عبدالرزاق اس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ گرفتار شدہ بندے نے اس کی کلاشنکوف چھین لی ہے اور اسے بری طرح پیٹ رہا ہے۔ ہتھکڑی کی وجہ سے وہ کلاشنکوف سے فائرنگ تو نہیں کر سکتا مگر وہ گن کو لاٹھی کی طرح استعمال کر رہا ہے۔"

ڈرائیور کی فراہم کردہ اطلاعات نے میرے دل و دماغ کو خوشی سے بھر دیا۔ میرے دل سے بے ساختہ نکلا۔ میر بخش! زندہ باد۔

جب میں ڈی ایس پی کے گارڈ سے اندھیرے میں نبرد آزمائی میں مصروف تھا' اسی دوران میں میر بخش نے نچلی منزل پر کام دکھا دیا تھا۔ یہ ایک خوش آیند بات تھی کہ کلاشنکوف اب نگران اے ایس آئی کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی لیکن میں گیٹ سے باہر کی صورتِ حال کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے باہر جو منظر دیکھا تھا' وہ میر بخش سمیت ہم تینوں کے لیے ہرصورت ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا اور یقیناً میر بخش ابھی تک گیٹ سے باہر کی تازہ ترین پوزیشن سے آگاہ نہیں تھا۔

جب ڈرائیور کے تشویش ناک انکشاف پر بھی گارڈ کی جانب سے کسی ردِعمل کا مظاہرہ سامنے نہیں آیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی مظاہرے و ظاہرے کے قابل نہیں رہا ہو گا۔ میں نے صورتِ حال کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور ڈی ایس پی جیسا لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں "اپنے" ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں سب خیریت ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر چھت پر چلے جاؤ اور گیٹ سے باہر نظر رکھو۔ میں نے کمرے میں دانستہ اندھیرا کر رکھا ہے۔"

وہ میرے داؤ میں آگیا اور دونوں سادہ پوش ملازموں کو ساتھ لے کر چھت کی جانب چلا گیا۔ وہ تینوں کمرے سے باہر ایسی جگہ رکے تھے جہاں سے کمرے کے اندر' قالین پر پڑے بے ہوش ڈی ایس پی کے جسم کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔ اگر وہ اپنے "صاحب" کو یوں کسمپرسی کی حالت میں زمین بوس دیکھ لیتے تو کسی بھی قیمت پر میرے حکم کی تعمیل نہ کرتے۔

میں ڈی ایس پی کے گارڈ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس کی سمت طاری مکمل خاموشی نے میرے اس خیال کی تصدیق کردی کہ وہ بھی اپنے "سر" سے ملتی جلتی کیفیت کا شکار تھا۔ تاہم میں نے عملی تصدیق ضروری سمجھی اور اندھیرے میں احتیاط سے رینگتے ہوئے اس طرف پہنچ گیا جہاں گارڈ میری ڈبل بیک کک کھانے کے بعد گرا تھا۔ جلد ہی میرے ہاتھوں نے اس کے بدن کو چھولیا' یہ سمجھنے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ گارڈ کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ ہوسکتا ہے' پیچھے اُلٹتے ہوئے اس کا سر کسی شے سے ٹکرا گیا ہو' نتیجے میں وہ فرش پر ڈھیر ہو کر بے ہوش ہوگیا ہو۔ گولیوں کی گونج کی وجہ سے میں اس کے ساتھ ہونے والی "کارروائی" سے بے خبر رہا تھا۔

لائٹ آف ہونا اور فائرنگ کی آواز یقیناً بنگلے سے باہر موجود تارا اور اس کے ساتھیوں سے پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ زیریں منزل پر ساحل اور میر بخش نے بھی یہ آوازیں سنی ہوں گی۔ مجھے فوری طور پر میر بخش او۔ ساحل کی مدد کے لیے پہنچنا چاہیے تھا۔ میری جیب میں چابیوں کا وہ گچھا موجود تھا جس سے ان دونوں کی ہتھکڑی کھولی جاسکتی تھی۔ یہ سوچتے ہی میں کمرے سے نکلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے نہ صرف اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا تھی بلکہ گیٹ سے باہر موجود افتاد سے بھی دو دو ہاتھ کرنا تھے۔

میں جیسے ہی کمرے کے دروازے پر پہنچا' انٹر کام کا مخصوص بزر بج اٹھا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ڈی ایس پی نے مجھے بتایا تھا' یہ انٹر کام بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا کام دیتا تھا۔ اس کا یہی مطلب ہوسکتا تھا' زیریں منزل سے کوئی ڈی ایس پی کی "خیریت" دریافت کررہا تھا۔ میری حاضر معلومات کے مطابق زیریں منزل پر اس وقت صرف تین افراد موجود تھے۔ ساحل' میر بخش اور نگران اے ایس آئی عبدالرزاق جو اب نگران نہیں رہا تھا۔ کلاشنکوف چھن جانے کے بعد وہ میر بخش کے رحم و کرم پر تھا۔ قوی امکان اسی بات کا تھا کہ ساحل انٹر کام کو استعمال میں لارہا تھا۔

اس دوران میں ایک مرتبہ پھر انٹر کام کا بزر بجا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر آگے بڑھ کر انٹر کام کا ریسیور اٹھالیا اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے ڈی ایس پی کے انداز میں پوچھا۔

"کیا ہے بھئی؟"

جواب میں جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی وہ ساحل کی تھی اور نہ ہی میر بخش کی۔ وہ یقینی طور پر گیٹ پر متعین گارڈز میں سے کسی کی آواز تھی۔ وہ فدویانہ انداز میں بتا رہا تھا "سر! وڈیرا اکبر سومرو آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"وڈیرا اکبر سومرو؟" میں نے ڈی ایس پی کے لہجے میں گارڈ کے الفاظ دہرائے۔

"جی سر!" اس نے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا "ابھی تھوڑی دیر پہلے اوپر فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی اور آپ کے کمرے کی لائٹ بھی بجھ گئی ہے۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔" میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

وہ بولا "وڈیرا اکبر سومرو بھی اس فائرنگ سے تشویش میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ فوری طور پر بنگلے کے اندر آنا... چاہتے ہیں۔ کیا میں انہیں ان کے ساتھیوں سمیت بنگلے میں آنے دوں؟"

میں نے کھڑکی سے تارا کی جھلک دیکھی تھی۔ گارڈ بتا رہا تھا' وڈیرا اکبر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے کبھی اکبر سومرو کو نہیں دیکھا تھا اس لیے صورت آشنائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وڈیرا اکبر سومرو اپنے بنگلے پر' عمرکوٹ کے ایک دور افتادہ مقام پر تھا۔ یہاں شادی بیاہ کے مضافات میں اس کی موجودگی حیرت انگیز تھی اور وہ بھی رات کے آخری پہر! بہرحال ایک بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس انٹر کام کا براہ راست تعلق بنگلے کے مین گیٹ پر متعین سیکیورٹی گارڈز سے تھا۔

میں وڈیرا اکبر سومرو کو بنگلے میں داخلے کی اجازت دے کر اپنے ساتھیوں کی خیریت کو کسی خطرے سے دوچار نہیں کرسکتا تھا اس لیے گارڈ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم انہیں بنگلے میں داخل نہ ہونے دو تاجب تک میرا حکم نہ ہو۔"

"سر! وہ اصرار بلکہ ضد کررہے ہیں۔" گارڈ نے بتایا "وہ

بضد ہیں کہ وہ اندر آنا چاہتے ہیں۔"

میں نے ڈی ایس پی کے مخصوص لب و لہجے کی نقالی کرتے ہوئے گارڈ سے پوچھا "کیا تم ذاتی طور پر وڈیرا اکبر سومرو کو جانتے ہو؟"

اس نے انٹر کام پر نفی میں جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے' وہ وڈیرا اکبر سومرو کے علاوہ کوئی بھی ہوسکتا ہے!" میں نے ایک خدشے کا اظہار کیا۔

گارڈ نے بتایا "جی سر! ایسا ہونا ممکن ہے۔"

"یہ ہمارے خلاف کسی قسم کی چال بھی ہوسکتی ہے؟"

"بالکل ہوسکتی ہے۔" گارڈ نے تصدیقی انداز میں کہا۔

اسی وقت گارڈ کے نزدیک ہی کوئی گرجدار آواز میں بولا "نہ بابا! تم اپنے ڈی ایس پی سے ہماری بات کرواؤ۔ کیا مہمانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے؟"

پھر تارا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اپنے زبان دوست اکبر سومرو سے کہہ رہا تھا "وڈیرا سائیں! اوپر والی منزل پر کوئی گڑبڑ ہے۔ لگتا ہے' وجدان نے یہاں بھی کوئی گڑبڑ کردیا ہے۔ ہمیں ڈی ایس پی کی اجازت کا انتظار کیے بغیر بنگلے میں گھس جانا چاہیے ورنہ وہ شیطان ایک مرتبہ پھر ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

تارا نے "شیطان" کا لفظ یقیناً میرے لیے استعمال کیا تھا۔ ان کی آوازوں کی صفائی سے لگتا تھا' وہ انٹر کام کے ریسیور کے بہت نزدیک کھڑے تھے۔ ان کے تیور اور عزائم کو بھانپتے ہوئے گارڈ نے مجھ سے پوچھا۔

"سر! یہ لوگ زبردستی بنگلے میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے حتمی لہجے میں کہا "میں خود نیچے گیٹ پر آرہا ہوں۔ ان سے کہو' میرا انتظار کریں۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے میزبان بہ نفس نفیس وہاں پہنچ رہا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں ریسیور کریڈل کرکے کمرے سے باہر آگیا۔ کمرا چھوڑنے سے پہلے میں نے ڈی ایس پی والا ریوالور تلاش کرکے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ کسی نازک موقع پر میرے ساتھیوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے دروازے کو اچھی طرح بند کردیا تھا۔ وہ پرانی طرز کا دروازہ تھا جس کے باہر ایک آہنی کنڈی بھی لگی تھی۔ میں نے اس کنڈی کو چڑھا دیا۔ اب دروازہ توڑے بغیر اندر سے کوئی باہر نہیں آسکتا تھا اور اندر جو دو افراد موجود تھے' وہ اس حالت اور کیفیت میں نہیں تھے کہ فی الفور دروازہ توڑنے کی جسارت کرسکتے۔ میرے مخاطب اندازے کے مطابق ڈی ایس پی دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا اور اس کے گارڈ کی بھی کم و بیش یہی پوزیشن تھی۔ جب "باڈی" بے ہوش تھی تو "باڈی گارڈ" کے ہوش مند رہنے کی کیا ضرورت تھی!

میں نے کمرے سے باہر آکر چھت کی جانب جانے والے زینے پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں سناٹے کا راج تھا۔ میرے حکم پر ڈی ایس پی کا ڈرائیور اور دونوں گھریلو سادہ پوش ملازم چھت پر چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ باہر کی صورت حال پر نظر رکھیں۔ جب تک میں انہیں واپسی کا حکم نہ دیتا' وہ چھت سے نیچے آنے والے نہیں تھے۔ میں نے بڑی مہارت اور خوب صورتی سے ڈی ایس پی کا لب و لہجہ اختیار کرکے صورتِ حال کی سنگینی کو نکیل کرلیا تھا۔

میں محتاط مگر تیز قدموں سے زینے اترنے لگا۔ وہاں کی ہر شے پر میری گہری نظر تھی۔ دس سیکنڈ میں' میں اس کمرے کے سامنے پہنچ چکا تھا جہاں کچھ دیر پہلے میں نے ساحل اور میر بخش کو چھوڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی میر بخش کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ یہ خوشی مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھنے کی تھی۔ بالائی منزل پر ہونے والی فائرنگ نے یقیناً انہیں میری طرف سے گہری تشویش میں مبتلا کردیا ہوگا۔ اس نے جوشِ جذبات میں کچھ بولنا چاہا تو میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کردیا۔ ساحل میرے' ہتھکڑی سے آزاد ہاتھوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن اے ایس آئی عبدالرزاق مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔

میر بخش میری متلاشی نظر کا مفہوم سمجھ گیا اور اس نے باتھ روم کی جانب اشارہ کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں دبی کلاشنکوف کو ہوا میں لہرایا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گن کا مالک باتھ روم میں بند ہے۔ میر بخش کے چہرے کا گہرا اطمینان اس بات کی اطلاع دے رہا تھا کہ باتھ روم میں بند اے ایس آئی کا "شافی بندوبست" اس نے کردیا تھا جیسا کہ میں ڈی ایس پی اور اس کے باڈی گارڈ کے ساتھ بالائی منزل پر کرآیا تھا۔

وہ کمرا بنگلے کے مین گیٹ سے کافی فاصلے پر واقع تھا چنانچہ وہاں ہلکی آواز میں گفتگو کی جاسکتی تھی۔ میر بخش کی حالت سے لگتا تھا کہ ابھی ابھی وہ اے ایس آئی سے "نمٹ" کر فارغ ہوا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا برآمد کیا اور جلدی جلدی ان دونوں کے ہاتھوں کو ہتھکڑی کی گرفت سے آزاد کردیا۔

ساحل بے تابی سے اپنی کلائیوں کو سہلاتے ہوئے بولی "وجدان! تم خیریت سے تو ہو؟ فائرنگ کی آواز سن کر تو میری جان ہی نکل گئی تھی۔"

اس کی آواز دھیمی اور لہجہ پر تشویش تھا۔ میر بخش نے کلاشنکوف کو ماہرانہ انداز میں دونوں ہاتھوں میں سونتتے ہوئے کہا۔

"مزہ تو اب آئے گا وجدان سائیں!"

اس کے لہجے سے بے نیازی جھلکتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے زخمی بازو اور اس میں ہونے والی تکلیف کو یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ان دونوں کو بنگلے کی چھت اور مین گیٹ سے باہر کی صورت حالات سے آگاہ کیا۔ میری پوری بات سننے کے بعد میر بخش حیرت سے بولا۔

"وڈیرا اکبر سومرو اور یہاں۔ مجھے یقین نہیں آرہا سائیں؟"

"یقین مجھے بھی نہیں آرہا۔" میں نے کہا "لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دو جیپوں میں سے چھ افراد کو نکل کر بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا تھا اور ان چھ افراد میں تارا کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ باقی باتیں مجھے گیٹ پر متعین سیکیورٹی گارڈ سے معلوم ہوئی ہیں۔"

ساحل نے کہا "تارا کو تو ہم بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ کب اور کیسے ہوش میں آیا اور اسے کیونکر پتا چلا کہ ہم یہاں شادی پلی کے ایک بنگلے میں موجود ہیں؟"

میں ساحل کے سوالات کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔ میں نے کہا "اس بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو موجودہ صورت حال سے نمٹنا ہے۔"

"سائیں! وڈیرا اکبر سومرو تو دوپہر تک اپنے بنگلے پر تھا۔" میر بخش نے الجھن زدہ انداز میں کہا "اس کی یہاں' شادی پلی میں موجودگی سمجھ میں نہیں آرہی۔"

میں نے کہا "جو بات ابھی سمجھ سے بالاتر ہے' وہ بعد میں زیریں ترین ہوجائے گی۔ ان الجھنوں میں وقت ضائع کرنا ہوش مندی کے اصولوں کے منافی ہے۔"

"سائیں! آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر میں جی اٹھا ہوں۔" میر بخش نے کلاشنکوف ہوا میں لہراتے ہوئے کہا "اب سو وڈیرا اکبر سومرو بھی میرے سامنے آجائیں تو پروا نہیں۔ میں آپ کی حفاظت کے لیے لاشوں کے انبار لگا سکتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بڑے سنگین لہجے میں اضافہ کیا "سائیں! اکبر سومرو کی طرف بھی میرا بہت حساب نکلتا ہے۔ آج یہ حساب بے باق ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "میر بخش! جب تک جان پر نہ بن آئے' تم گن کا استعمال نہیں کرو گے۔ ہمیں دوسروں کی جان سے کھیلے بغیر اپنی جان بچا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے۔ تم میری یہ بات ذہن میں رکھو گے۔"

"سائیں!" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا "وڈیرا اکبر سومرو انسان نہیں بلکہ ایک شیطان ہے۔" اس کا انداز بہت خوفناک تھا "وہ خود کو "بھوتار" کہلواتا ہے۔ اس کی اپنی پرائیویٹ جیل ہے۔ وہ لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے' ہزاروں بے گناہوں کا خون اس کے ہاتھوں پر ملا ہوا ہے۔ جرائم پیشہ افراد سے اس کے گہرے رابطے ہیں۔ وہ ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اپنی رعایا اور ہاریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ وہ کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں۔ میں تو کہتا ہوں۔"

"یہ تقریروں کا وقت نہیں ہے میر بخش!" میں نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "حالات کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا اور فرماں برداری سے بولا "جو حکم سائیں!"

"وجدان! یہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں؟" ساحل نے بیزاری سے کہا۔

میں نے کہا "مصیبت تو مصیبت ہی ہوتی ہے۔ کس اور حس کا کیا سوال ہے!"

وہ الجھن زدہ نظریں مجھ پر تکنے لگی۔

میں نے باتھ روم کے دروازے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے میر بخش سے پوچھا "قانون بہادر کا کیا حال ہے؟"

میرا اشارہ واضح طور پر اے ایس آئی عبدالرزاق کی طرف تھا۔ میر بخش میرے سوال کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا "اس کی پیشانی پر میں نے کلاشنکوف کا بٹ مارا تھا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر آگرا۔ میں نے گھسیٹ کر اسے باتھ روم میں پہنچا دیا۔ اب وہ دو تین گھنٹے تک وہاں آرام فرمائے گا۔"

میں نے پوچھا "اس کا سر تو نہیں پھٹا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا "پیشانی پر ایک کنگ سائز آلو نمودار ہوگیا ہے۔" اپنی بات ختم کرکے میر بخش نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا "اوپر والوں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ ڈی ایس پی اور اس کا باڈی گارڈ ایک کمرے میں "محو استراحت" ہیں۔"

اسی وقت بنگلے کے باہر ایک کلاشنکوف گرج اٹھی۔ برسٹ کی تیز تر تڑاہٹ فضا میں گونجی۔ آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ فائرنگ کا رخ نیچے سے اوپر کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بلکہ اسی وقت میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ فائرنگ کے جواب میں بنگلے کی چھت پر سے انسانی چیخوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ فائرنگ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب سے کی گئی ہوگی۔ بنگلے کی چھت پر ڈی ایس پی کا ڈرائیور اور دو سادہ پوش گھریلو ملازم اپنے "صاحب" کے حکم پر بنگلے کے گرد و نواح کی نگرانی پر "مامور" تھے۔ ممکن ہے' تارا یا اکبر سومرو نے ان کی جھلک دیکھ لی ہو اور عین ممکن ہے' وہ سمجھے ہوں کہ وہ تینوں افراد ہم ہیں۔ یعنی میں' ساحل اور میر بخش۔ اسی لیے انہوں نے ہم پر فائرنگ کی تھی۔

گولیوں کی تڑاہٹ اور جواباً انسانی چیخوں کی آواز نے ساحل کو سراسیمہ کردیا۔ وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"ساحل! تھوڑی دیر پہلے تم نے پوچھا تھا۔ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ بس تو جان لو' ہم "اس" مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ یہ مصیبت انسانوں کی نازل کردہ ہے جو دوسرے انسانوں کی جان لیتی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

آخری جملہ میں نے بیک وقت دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

میر بخش کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "میں پوری طرح تیار ہوں۔"

میں نے اپنی پتلون کی جیب سے ڈی ایس پی والا ریوالور نکال کر ساحل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ کیا تمہیں اسے چلانا آتا ہے؟"

اس نے میرے ہاتھ سے ریوالور لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا "جب تک تمہاری جان یا عزت پر نہ بن آئے' تم اسے استعمال نہیں کرو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ مجھے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دیے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا بات ہے ساحل' تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو۔ کیا ریوالور کے استعمال میں کوئی دقت محسوس کررہی ہو۔ تم نے بتایا ہے نا' تم اسے چلانا جانتی ہو!"

"میں وقت پڑنے پر اسے استعمال کرلوں گی۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا "لیکن..."

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا "لیکن کیا ہے ساحل؟"

"وجدان! تم نے مجھے اپنی جان کی حفاظت کی ہدایات اس طرح دے رہے ہو جیسے مجھ سے دور جانے والے ہو۔" وہ شکایتی انداز میں گویا ہوئی "کیا تم ان نازک لمحات میں میرے ساتھ نہیں ہوگے؟"

میں نے بے ساختہ کہا "میں تو ہر پل تمہارے ساتھ ہوں۔"

"پھر!" اس کی بولتی ہوئی آنکھوں میں بڑا معنی خیز سوال تھا۔

میں نے جلدی سے کہا "یہ تو میں تمہیں حفظ ماتقدم کے طور پر دے رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد جانے ہمیں کس قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑجائے۔ ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہنا چاہیے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "ابھی تو ہم یہاں سے نکلے بھی نہیں۔ کون جانتا ہے' یہاں کتنی خون ریزی ہونا ابھی باقی ہے!"

ساحل نے ایک جھرجھری لی۔ اسی وقت بنگلے کے باہر دوبارہ فائرنگ کی آواز بلند ہوئی' یہ اسٹریٹ فائرنگ تھی۔ یا تو گارڈز نے آنے والوں کو روکنے کے لیے ہتھیار استعمال کیے تھے یا پھر "تارا اینڈ کمپنی" نے گارڈز کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے فوراً بعد جوابی فائرنگ بھی سنائی دی۔ اس دو طرفہ فائرنگ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بنگلے کے گیٹ پر دونوں پارٹیوں میں ٹھن گئی تھی۔ وہ دونوں پارٹیوں والے فی الحال ہمارے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی باہمی مٹھ بھیڑ ہمارے لیے سود مند ثابت ہوسکتی تھی۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا ہم پر واجب ہوگیا تھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساحل اور میر بخش کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اس باتھ روم نما کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں سے بنگلے کا مین گیٹ پچاس قدم کی دوری پر تھا۔ گیٹ کے قریب ہی کار پورچ بنا ہوا تھا۔ پورچ میں ڈی ایس پی کی ذاتی گاڑی موجود تھی۔ وہاں سے فرار کے لیے یہ ہمارے کام آسکتی تھی۔

پورچ میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے فوری

طور پر ڈی ایس پی کی گاڑی کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر ہم اس گاڑی کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ جاتے تو باہر سے آنے والے ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ ہم بہ آسانی ان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس کی ایک واضح وجہ یہ بھی تھی کہ پورچ میں تاریکی تھی اور گیٹ کے نزدیک ہلکی روشنی موجود تھی۔

میں دبے قدموں چلتے ہوئے مذکورہ گاڑی کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ ساحل اور میر بخش نے بھی باآہستگی میری تقلید کی۔ ہم محفوظ پناہ گاہ میں پہنچے ہی تھے کہ بنگلے کے باہر ایک مرتبہ پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔ اس بار گولیوں کی گونج میں انسانی چیخوں کی آواز بھی شامل تھی۔ ان کرب ناک چیخوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کم از کم چار پانچ افراد اپنی جان ہار گئے تھے یا کم از کم شدید مضروب ہوئے ہوں گے۔

پھر بنگلے کے مین گیٹ پر باقاعدہ بھونچال آگیا۔ میں نے ڈی ایس پی کی گاڑی کی آڑ میں سے دیکھا' بنگلے کا گیٹ زور دار آواز سے کھلا اور تارا کی سرکردگی میں تین افراد بنگلے میں داخل ہوئے۔ تارا کے علاوہ باقی دو افراد میں سے ایک اپنے لباس اور حلیے سے وڈیرا دکھائی دیتا تھا۔ میر بخش نے میرے خیال کی تصدیق کی کہ وہ وڈیرا اکبر سومرو ہی تھا۔ وڈیرے کے ساتھ جو شخص تھا۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔ وہ یقیناً وڈیرے کا باڈی گارڈ قسم کا کوئی جاں نثار تھا۔ تارا کے ہاتھ میں بھی پسٹل دکھائی دے رہا تھا۔ ظاہر ہے' یہ وہ پسٹل نہیں ہوسکتا تھا جو میں نے ہوٹل کے کمرے میں اس سے چھین لیا تھا۔ مذکورہ پسٹل اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا تھا جو میر بخش ہوٹل سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ازاں بعد ہماری گاڑی (بلیک اینڈ وائٹ) کی تلاشی کے دوران میں وہ پسٹل پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ تارا کی چال میں نقاہت کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔

وڈیرا اکبر سومرو پر نظر پڑتے ہی میر بخش کچھ بے چین ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا' وہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بڑے بھرپور انداز میں' نفی میں گردن ہلا دی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔ اسے میرے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

تارا کے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جس میں' ہم اسے ہوٹل کے کمرے میں بے ہوش چھوڑ آئے تھے۔ وہ ایک ہٹا کٹا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ مارشل آرٹس سے بھی اسے گہری آگاہی حاصل تھی تاہم میں نے عمر کوٹ کے ہوٹل میں اس کی خوب گت بنائی تھی۔ میرے گھٹنے کی ضرب نے اس کی ٹھوڑی کی ایسی مزاج پرسی کی تھی کہ اس کی زبان دانتوں تلے آکر کٹ گئی تھی۔ وہ کسی مردار خور جانور کی طرح خون سے لتھڑا ہوا دہانہ کھول بند کرنے لگا تھا۔ ازاں بعد میرے پاؤں کا بلیڈ اس کی ناک پر اس زور سے لگا تھا کہ وہاں سے خون کا فوارہ چھوٹ نکلا تھا' پھر سب سے آخر میں اس کے سر کا عقبی حصہ چوبی میز سے تصادم کے بعد شدید زخمی ہوگیا تھا۔ اسی چوٹ نے تارا کو ہوش و حواس سے بھی بیگانہ کردیا تھا۔ ہم اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر آئے تھے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی ہم تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ بہرحال' وہ اس قسم کی حیرت میں پڑنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم انتہائی سنگین حالات سے دوچار تھے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی فکر کرنا تھی پھر کچھ اور سوچنا تھا۔

تارا اینڈ کمپنی کھلے ہوئے گیٹ سے اندر آئے تو ان کے پیچھے مجھے کسی گاڑی کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' گیٹ پر متعین وہ دونوں مسلح سیکیورٹی گارڈز اب کسی قسم کے تعاقب یا مزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ بھی عین ممکن تھا' وہ اب کسی اور جہاں میں پہنچ چکے ہوں!

ہم دم سادھے ڈی ایس پی کی گاڑی کے پیچھے دبکے رہے۔ اس وقت ہم ایسی پوزیشن میں تھے کہ اچانک فائرنگ کرکے ان تینوں کو فنا کے گھاٹ اتار سکتے تھے پھر ہمارے لیے وہاں سے فرار ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ میر بخش کچھ اسی قسم کے عزائم کا اظہار جسمانی حرکات و سکنات سے گاہے بگاہے کر بھی رہا تھا مگر میں خوامخواہ کے خون خرابے کے حق میں نہیں تھا۔ بے مقصد انسانی جان سے کھیلنا کسی طور مجھے گوارا نہ تھا۔

وہ تینوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔ سب سے آگے تارا تھا' اس کے پیچھے وڈیرا اکبر سومرو اور سب سے آخر میں وڈیرے کا مسلح محافظ۔ وہ شخص چوکنا نظر سے اپنے عقب میں بھی دیکھتا چلا جارہا تھا۔

میرے ذہن میں انٹرکام پر سیکیورٹی گارڈ سے ہونے والی گفتگو تازہ ہوگئی۔ جب میں اسے بہ حیثیت ڈی ایس پی احکام دے رہا تھا تو پس منظر میں تارا کے جملے بھی مجھے سنائی دیے تھے۔ اس نے اپنے میزبان وڈیرے سے کہا تھا' سائیں ہمیں ڈی ایس پی کی اجازت کے بغیر بنگلے میں گھس جانا چاہیے ورنہ وہ شیطان (یعنی میں) ایک مرتبہ پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔

تارا کے الفاظ سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ وہ باجماعت صرف میری ہی تلاش میں اس بنگلے تک پہنچے تھے اسی لیے اب وہ بنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہوگئے تھے۔

میری سماعت میں میر بخش نے سرگوشی کی "سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ جب تک تینوں مردود بنگلے کی تلاشی لیتے' ہم بہت دور نکل جائیں گے۔"

ساحل ہم دونوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے میر بخش کو جواباً کہا "تجویز تو تمہاری اچھی ہے لیکن میں یہاں سے پیدل جانے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"سائیں! ہم پیدل کیوں جائیں گے۔" میر بخش نے دھیمی آواز میں کہا "آخر یہ کس مرض کی دوا ہے!" بات ختم کرتے ہی اس نے ڈی ایس پی کی گاڑی کو تھپکا۔

جب ہم پورچ میں اس گاڑی کے پیچھے پناہ لے رہے تھے تو میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کا خیال آیا تھا لیکن بعد میں مجھے یہ خیال تکنیکی اعتبار سے کچھ زیادہ مناسب اور قابلِ عمل دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے اپنے خیالات میر بخش کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

"اس گاڑی کے استعمال میں دو قباحتیں ہیں۔"

"وہ کیا سائیں؟" اس نے پوچھا۔

"نمبر ایک..." میں نے بتایا "اس کی چابی ڈی ایس پی کے ڈرائیور کے پاس ہے جسے میں نے بنگلے پر نگاہ رکھنے کے لیے چھت پر بھیج دیا تھا اور..." ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے اپنا جملہ مکمل کردیا "اور تھوڑی دیر پہلے بنگلے کی چھت کی جانب سے ہم نے جو چیخیں سنی ہیں ان کے پیشِ نظر ڈرائیور کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

میر بخش اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا "سائیں! چابی وغیرہ کی تو آپ فکر نہ کریں۔ میں نے ایک طویل عرصہ ڈرائیونگ کی ہے اور بغیر چابی کے میں ہر قسم کی گاڑی اسٹارٹ کرنے کا ہنر جانتا ہوں۔ اس گاڑی کو یہاں سے نکالنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم اپنے فن میں یقیناً ماہر ہوگے۔ میں تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کررہا مگر میں اس گاڑی کو لے جانے کے حق میں نہیں ہوں اور یہی دوسری قباحت ہے۔"

میر بخش نے پوچھا "آپ اس گاڑی کے استعمال سے کیوں بچنا چاہتے ہیں؟"

"یہ ایک پولیس افسر کی گاڑی ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اس میں سفر کرنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ جلد یا بدیر ڈی ایس پی اور اس کے کارڈز کو پیش آنے والے واقعے سے پردہ اٹھ جائے گا۔ اس کے بعد بڑی شدومد سے ہمیں تلاشا جائے گا اور اس گاڑی کی وجہ سے ہم بہ آسانی گھیرے جاسکتے ہیں۔ یہ بات قطعاً چھپی نہیں رہ سکتی کہ ہم تینوں ڈی ایس پی کی گاڑی میں موقع سے فرار ہوئے ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میر بخش نے تشویش ناک لہجے میں کہا "ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے یہاں بیٹھے تو نہیں رہ سکتے!"

ساحل نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا "یہ بھی تو ہوسکتا ہے' ہم یہاں سے اس گاڑی میں نکل جائیں اور کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑا کر اپنے لیے کوئی اور بندوبست کرلیں۔"

"ہاں' یہ ہوسکتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "مگر میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! آپ کے ذہن میں جو بھی منصوبہ ہے' اس پر فوراً عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں زیادہ دیر تک رکنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"وجدان! تم کیا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟" ساحل نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے بتایا "میں نے بالائی منزل کی کھڑکی سے بنگلے کے باہر دو جیپوں کو آگے پیچھے رکتے دیکھا تھا جن میں سے چھ افراد برآمد ہوئے تھے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحت کی "میرا اشارہ وڈیرا اکبر سومرو اور تارا کی جانب ہے۔ میں ان کی جیپوں میں سے کسی ایک کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

ساحل نے کہا "وجدان! ابھی چند لمحے پہلے ہم نے صرف تین افراد کو بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب جاتے دیکھا ہے۔ تم بتا رہے ہو' دو جیپوں میں سے چھ افراد برآمد ہوئے تھے۔ باقی تین تو باہر ہی ہوں گے نا۔ میں تو..."

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ شاید اسے یاد آگیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے بنگلے کے باہر گیٹ پر سیکیورٹی گارڈز اور وڈیرا اینڈ کمپنی کے مابین فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا۔

میں نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا "بنگلے کے گیٹ پر اس وقت جو بھی صورتِ حال ہے اس کے بارے میں باہر نکل کر ہی صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے' وہاں کی صورتِ حال نہایت سنگین ہوگی۔"

"سائیں! اگر باہر والی کسی جیپ میں یہاں سے روانہ

ہونا ہے تو ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے۔" میر بخش نے کہا "یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔"

"مجھے یہاں رکنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔" میں نے کہا "تم ساحل کے پاس رکو۔ میں باہر کی پوزیشن دیکھ کر آتا ہوں۔"

میر بخش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سائیں وجدان! آپ ساحل کے پاس ہی رہو۔ میں باہر جاتا ہوں۔ آپ کا یہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔"

میر بخش اس وقت ایک جاں نثار کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے دلولے کو دیکھ کر میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا اور نپی تلی آواز میں اسے تاکید کردی "پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اندھیرے میں گیٹ کی جانب رینگ گیا۔ کلاشنکوف اس کے پاس تھی اس لیے میں اس کی طرف سے زیادہ فکرمند نہیں تھا۔

"وجدان!" ساحل نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے پہلو سے جڑتے ہوئے بولی "میں بہت وحشت محسوس کر رہی ہوں۔ یہ تمہارے ملک میں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "اس میں میرے ملک کا کیا قصور ہے؟ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں' ان میں ہمارے ساتھ یہی ہونا ہے چاہے ملک کوئی سا بھی ہو۔"

"مگر یہ تو تمہارا اپنا ملک ہے' تمہاری اپنی دھرتی ہے!" وہ مجھ سے مزید چپک گئی "میں تو سمجھ رہی تھی' یہاں تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پاکستان کوئی فرشتوں کا دیس نہیں ہے۔" میں نے کہا "دنیا کے ہر ملک میں اچھے برے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ کیا تمہارے ملک نیپال میں تمہارے ساتھ سب اچھا پیش آ رہا ہے؟ کھٹمنڈو کی بدھ نیل کھنڈ عبادت گاہ میں پیش آنے والے واقعات کو تو تم نہیں بھولی ہوگی۔ تمہارے گھر' تمہاری رہائش گاہ پر تمہارے ماں باپ کو کس بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان کی لاشوں کو تمہی نے تو کشتی میں ڈال کر کھٹمنڈو شہر کے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچایا تھا۔ اس بارے میں تم کیا کہو گی؟"

"سوری وجدان!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی "میں پریشانی میں ایک غلط بات کہہ بیٹھی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو' دنیا کا کوئی بھی ملک یوٹوپیا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "ساحل! ہم اس وقت اعصاب شکن حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں تمہاری پریشانی کو سمجھ سکتا ہوں اس لیے تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گا۔"

وہ بے ساختہ میرے ہاتھ کو تشکرانہ انداز میں دباتے ہوئے بولی "تھینک یو وجدان!"

"پہلے سوری وجدان اور اب تھینک یو وجدان۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

وہ میری بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولی "کیا کروں' بھول جاتی ہوں۔ آہستہ آہستہ پریکٹس ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے' تم نے کہا تھا کہ دوستی کے درمیان سوری' پلیز اور تھینک یو کو جگہ نہیں دینا چاہیے۔"

"تم بھولی ہو مگر بھولی نہیں ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" اس نے استفسار کیا۔

اب اس کے لہجے میں مایوسی اور بیزاری کی جگہ فطری شوخی نے لے لی تھی۔ یہ ایک مثبت اور خوش آیند بات تھی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا' وہ کہہ نہ سکا کیونکہ اسی وقت میر بخش واپس آ گیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔

"سائیں! باہر تو پوری پانچ لاشیں پڑی ہیں۔"

"یعنی دو سیکیورٹی گارڈز کی اور تین وڈیرے کے ساتھ آنے والوں کی لاشیں؟" میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "جی سائیں" پھر اس نے اضطراری انداز میں اضافہ کیا "اور دونوں جیپیں بھی وہاں موجود ہیں۔ ایک کے اگنیشن میں چابی بھی لگی ہوئی ہے۔"

"ویری گڈ۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا پھر پوچھا "چابی کون سی جیپ میں موجود ہے۔ آگے والی میں یا پیچھے والی میں؟"

"پیچھے والی میں۔" اس نے بتایا۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا "وہ جیپ نکالنے میں ہمیں آسانی رہے گی۔"

میر بخش نے مزید بتایا "سائیں! وہ نئی ٹکور پجارو ہے۔"

"آل رائٹ!" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم اسی پجارو میں یہاں سے روانہ ہوں گے' لیکن ہم ایک ایک کرکے

میں سوار ہوں گے۔" میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم پہلے تم پجارو میں پہنچو۔"

اس نے تذبذب کے انداز میں مجھے دیکھا اور کہا "سائیں! پہلے آپ دونوں چلے جاؤ۔ میرے پاس کلاشنکوف ہے' میں آپ کو کور دیتے ہوئے بعد میں آؤں گا۔"

اس کی تجویز معقول اور برمحل تھی اس لیے میں نے تمہیں میں وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساحل کو ساتھ لے کر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے ساتھ کھنچتی چلی آئی۔ ہم رکوع کی حالت میں چلتے ہوئے باآہستگی بنگلے سے باہر نکلے۔

باہر رات کی تاریکی میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم لاشوں کے درمیان سے بال بچا کر گزرتے ہوئے پجارو کے پاس پہنچے۔ میں نے بڑی احتیاط سے پجارو کا عقبی دروازہ کھول کر ساحل کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ ڈور کے پاس پہنچا۔ کچھ آواز پیدا کیے بغیر میں دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے دروازوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے احتیاط کا خیال رکھا تھا کہ ایک ذرا سی آواز بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمارے حق میں سب سے مفید یہ بات تھی کہ پجارو کے دروازے لاک نہیں تھے۔ آنے والوں نے دروازے لاک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تو غالباً دانست میں مجھے چشم زدن میں وہاں سے اپنے ساتھ لے جانے والے تھے۔ انہوں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا کہ بنگلے پر اس قسم کے حالات پیش آ سکتے ہیں۔ تارا اینڈ کمپنی مجھے "حاصل" کرنے کے لیے اس قدر "بے قرار" تھے کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں وہیں چھوڑ کر وہ دندناتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔

جب تک میں کار پورچ میں موجود تھا' میں نے بنگلے کے اندر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں سنی تھیں۔ آنے والے ہماری لاشیں دیوانے ہو رہے تھے۔ زیریں منزل پر جب انہیں اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تو وہ بالائی منزل کی جانب چلے گئے تھے۔ اس ساحل کے ساتھ جب بنگلے سے نکل رہا تھا تو انہیں سیڑھیوں کے بلند موں کی آوازیں نیچے سے اوپر جاتے ہوئے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میں پجارو کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بڑی بے چینی سے میر بخش کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے پسنجر سیٹ کا دروازہ نیم وا کر رکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ تارا اینڈ کمپنی کے اوپر پہنچنے سے پہلے پجارو میں پہنچ جائے۔ وہ لوگ اوپر پہنچ جاتے تو پھر ہم بہ آسانی ان کی نظروں میں آ سکتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کو کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا' وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میر بخش چاروں جانب چوکنا نظر سے دیکھتے ہوئے پجارو کے نزدیک آ گیا۔ کلاشنکوف کو اس نے بالکل "ریڈی" انداز میں تھام رکھا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ پلک جھپکتے میں ایک خوفناک برسٹ فائر کر سکتا تھا۔

میر بخش نے پجارو میں داخل ہونے کے لیے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بنگلے کے اندر فائرنگ ہونے لگی۔ گولیوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ کسی کلاشنکوف سے فائر کی گئی ہیں۔ میر بخش نے تشویش ناک نظر سے بنگلے کی طرف دیکھا اور اچک کر پجارو میں سوار ہو گیا۔ اسی وقت بنگلے کے اندر کلاشنکوف کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ ہونے لگی۔ اس دو طرفہ فائرنگ سے لگتا تھا' تارا اینڈ کمپنی کے خلاف مزاحمت پیش کی جا رہی ہے۔

میں نے فائرنگ کی آواز سے فائدہ اٹھایا اور نئی نویلی پجارو کو اسٹارٹ کردیا۔ گاڑی بالکل نیو برانڈ تھی اس لیے اس کا انجن بڑی سبک خرامی سے بیدار ہو گیا۔ میں نے جیپ کو بیک کرنے کے لیے ریورس گیئر میں ڈالا اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ریوالور کہاں ہے جو میں نے تمہیں دیا تھا؟"

"میرے ہاتھ میں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا "ذرا دینا ادھر۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو وجدان؟" اس نے پوچھا۔

"میں جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں' تمہاری نظر کے سامنے ہی کروں گا۔" میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور لیتے ہوئے کہا "تم توجہ سے دیکھتی جاؤ۔"

وہ ریوالور میری جانب منتقل کرنے کے بعد الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس وقت میں نے میر بخش کے چہرے پر بھی تذبذب کے آثار دیکھے۔ میں نے ڈی ایس پی والا ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی نال کا رخ اپنے سامنے کھڑی دوسری جیپ کی طرف کردیا پھر نہایت مہارت کے ساتھ اعشاریہ تین دو کیلی بر کی دو گولیاں جیپ کے پچھلے ٹائروں میں پیوست کردیں۔

ہوا خارج ہونے کی مخصوص آواز کے ساتھ دونوں

جانب کے ٹائر فلیٹ ہوگئے۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اب وہ لوگ فوری طور پر اس جیپ کی مدد سے ہمارا تعاقب نہیں کرسکتے تھے۔ جب تک وہ ٹائر تبدیل کرکے ایسے کسی ارادے پر عمل کرنے کی پوزیشن میں آتے' ہم وہاں سے میلوں دور نکل چکے ہوتے۔

اب وہاں ایک سیکنڈ بھی رکنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے ریوالور واپس ساحل کو دے دیا اور پجارو کو ریورس گیئر میں چلاتے ہوئے باقاعدہ راستے پر لے آیا۔ اسی وقت میں نے بنگلے کی چھت پر کسی انسانی ہیولے کو چکراتے دیکھا۔

تاریکی کے باعث اسے پہچاننا مشکل تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آواز نے مجھے بتادیا کہ وہ شیطان کا برادر خورد تارا تھا۔ وہ چیخ کر اپنے ساتھی کو پکار رہا تھا۔ "کلاشنکوف لے کر فوراً ادھر آؤ۔ وہ فرار ہورہے ہیں۔"

اگلے ہی لمحے چھت پر کلاشنکوف بردار انسانی ہیولا نمودار ہوا پھر تارا کی ہدایت پر اس نے کلاشنکوف سے ہم پر فائرنگ شروع کردی۔

تارا کی آواز اور احکام سنتے ہی میر بخش بھی اپنی کلاشنکوف ٹارچ' پجارو کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے بنگلے کی چھت کی جانب کرچکا تھا۔ جواباً اس نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ اس دوران میں' میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ پجارو کو محفوظ فاصلے پر پہنچانے کے بعد گیئر تبدیل کیا اور ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھاتے ہوئے ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھادیا۔

بنگلے کی چھت سے برسائی جانے والی گولیوں میں سے ایک بھی ہمیں یا پجارو کی باڈی میں نہیں لگی تھی۔ البتہ ہمیں عارضی آڑ فراہم کرنے والی دوسری جیپ اس فائرنگ کی زد میں آگئی تھی۔ اس کی باڈی میں متعدد سوراخ بن گئے۔ میں اس کے ٹائروں کو برسٹ کرکے پہلے ہی بیکار کرچکا تھا۔ اب وہ بیکار تر ہوگئی تھی۔

جب ہم کافی دور نکل آئے تو میر بخش نے کہا "سائیں! آپ نے دوسری گاڑی کو بیکار کرکے بہت اچھا کیا ہے' اب تارا وغیرہ ہمارا پیچھا نہیں کرسکیں گے۔"

"شکر ہے' ان جنگلی لوگوں سے پیچھا تو چھوٹا۔" ساحل نے سکھ کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے میر بخش سے کہا "میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ازحد ضروری تھا۔ ہم اسی صورت میں خود کو زیادہ محفوظ رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارا تعاقب نہ کرنے پائیں۔"

میر بخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ تو ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں! لیکن بنگلے کے پورچ میں ڈی ایس پی کی گاڑی بھی موجود ہے۔ وہ ہم تک پہنچنے کے لیے اس گاڑی کو استعمال کرسکتے ہیں۔"

"ہاں' کرسکتے ہیں۔" میں نے پجارو کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "وہ اس گاڑی کے علاوہ ایک اور بھی نہایت اہم شے بھی استعمال کرسکتے ہیں۔"

"کیا شے سائیں؟" میر بخش نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

ساحل بھی پوری توجہ سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے تجسس سے لبریز لہجے میں کہا "وجدان بات کو توڑ توڑ کر سنسنی خیز انداز میں کیوں بتا رہے ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ' تم کس چیز کے استعمال کا ذکر کررہے ہو؟"

میں نے کہا "تم لوگوں کو بالائی منزل پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا نا' اس لیے تم نہیں جانتے کہ وہاں کی سب سے اہم چیز کیا ہے حالانکہ اس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں لیکن اس وقت تمہارے ذہن اس طرف نہیں جاسکتے۔"

"پلیز وجدان! اور سسپنس پیدا نہ کرو۔ تم مجھے جاسوسی پر اُکسا رہے ہو!" ساحل نے شوخی سے کہا "اس سرگزشت کو اُلجھن سے پاکیزہ ہی رہنے دو۔"

میر بخش سنجیدگی سے بولا "سائیں! آپ کسی اہم چیز کے بارے میں بتا رہے تھے!"

میں نے ایکسی لریٹر پاؤں کا دباؤ مزید بڑھاتے ہوئے کہا "بالائی منزل پر ڈی ایس پی والے کمرے میں ٹیلی فون موجود ہے۔ تارا یا وڈیرا اکبر سومرو ٹیلی فون کو استعمال کرکے ہمارے لیے مشکلات پیدا کرسکتے ہیں۔"

میر بخش نے ونڈ اسکرین کے پار گہرے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں ابھر آئیں۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے میر بخش! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"سائیں! اس وقت ہماری گاڑی کا رخ شادی پلی کے اکڑی کی جانب ہے۔" میر بخش نے تشویش ناک لہجے میں کہا "یہ وہی سڑک ہے جس پر سفر کرکے ہم شادی پلی پہنچے تھے۔"

"تو پھر؟" میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"سائیں! ہمیں اکڑی پہنچ کر اپنا رخ تبدیل کرنا ہوگا۔ ہم دوبارہ عمر کوٹ پہنچ جائیں گے۔" میر بخش نے کہا

فون والی بات کے پیش نظر ہمارا عمر کوٹ کی طرف جانا بھی طور مناسب نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہاری تشویش بجا ہے لیکن ہم اس سڑک خلاف سمت میں بھی تو سفر جاری نہیں رکھ سکتے نا۔ ادھر ی اور میرپور خاص کی درمیانی سرحد ہے جہاں پولیس نے خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے ناکا لگایا ہے۔ ڈی ایس پی نے مجھے بتایا تھا کہ تھانا انچارج شادی اس نے بنگلے کی جانب روانہ ہونے سے پہلے ناکے کی بھیج دیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے تو ان لوگوں کے چنگل نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر دوبارہ اس موٹی توند تھانے دار کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ اگلی پچھلی ساری کسر دے گا۔ جب اسے پتا چلے گا کہ ہم نے اس کے اعلیٰ محترم ڈی ایس پی کے ساتھ کیا "سلوک" کیا ہے تو وہ ہمارا حشر کرے گا۔"

"وجدان! تم خوامخواہ بہت دور تک سوچ رہے ہو۔" ساحل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

وہ بولی "وجدان! تم نے بتایا تھا' ڈی ایس پی اور اس گارڈ کو اناٹمی فعل کرنے کے بعد تم نے اس کمرے کو بند کنڈی لگا دی تھی۔ وڈیرا اکبر سومرو یا تارا کو کیسے پتا کہ اس کمرے میں کوئی ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا ہے کمرے میں تو اندھیرا بھی ہے۔"

"کمرے کے اندھیرے کو ٹیوب لائٹ کا بٹن آن کرکے جا سکتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میر بخش نے میرے کلام کے دوسرے جملے پر غور کیے بغیر "سائیں! اگر وہ لوگ ڈی ایس پی والے کمرے میں ہوگئے تو گڑبڑ نہیں ہوجائے گی؟ وہاں تو ڈی ایس پی اور گارڈ زخمی ہوش پڑے ہیں۔"

"میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے خیال انداز میں کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ نہ صرف کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں بلکہ وہاں انہیں مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں سائیں!" میر بخش کے انداز میں الجھن تھی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "جب ہم پجارو میں بیٹھ کر وہاں سے نکل رہے تھے تو تم نے بنگلے کے اندر فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں؟" ان دونوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اور یہ بات تم لوگوں نے بھی محسوس کی ہوگی کہ وہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے' تارا اینڈ کمپنی کے جواب میں کوئی فائرنگ کررہا تھا یا پھر تارا اینڈ کمپنی نے کسی کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ کی تھی۔" میں نے ذرا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا "بنگلے میں' تارا وغیرہ کی مزاحمت کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہوسکتا ہے۔"

میرے اس ڈرامائی جملے کے اختتام پر ساحل نے فوراً پوچھا "کون شخص ہے وہ؟"

"ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ۔" میں نے بتایا۔

"مم... مگر تم نے تو بتایا تھا' وہ وہاں بے ہوش پڑا تھا؟" ساحل نے کہا۔

میر بخش بولا "ہاں سائیں! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟"

"میں نے امکانات کی بات کی ہے۔" میں نے کہا "اس وقت باہر سے آنے والوں کی مزاحمت کرنے کے لیے بنگلے میں صرف ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ہتھیار موجود ہے یعنی ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ۔ اس کی نئی نویلی کلاشنکوف وہیں کمرے میں پڑی تھی۔ ہوسکتا ہے' جب باہر سے آنے والے اس کمرے میں پہنچے ہوں تو گارڈ کو ہوش آچکا ہو اور اس نے اپنی گن سے ان پر فائرنگ کردی ہو۔" میں نے ایک لمحے کو رک کر مزید کہا "ڈی ایس پی کا ریوالور اس وقت ساحل کے ہاتھ میں ہے۔ اے ایس آئی عبدالرزاق سے چھینی ہوئی کلاشنکوف تمہارے پاس موجود ہے۔" میں نے میر بخش کی طرف اشارہ کیا اور کہا "بنگلے کے دونوں مسلح سیکورٹی گارڈز کی لاشیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ میں نے جن تین افراد کو بہ حیثیت ڈی ایس پی بنگلے کی چھت پر نگرانی کا فرض سونپا تھا وہ تینوں غیر مسلح تھے اور پھر ان کی چیخوں کی آوازیں ہم نے سنی تھیں جب بنگلے کے باہر سے ان پر کلاشنکوف کا برسٹ مارا گیا تھا۔ ان میں سے اگر کوئی زندہ بچ بھی گیا ہوگا تو وہ مسلح مزاحمت کے قابل کہاں ہوگا۔"

میر بخش نے پوری بات سننے کے بعد کہا "سائیں! اگر ڈی ایس پی کے گارڈ نے واقعی تارا وغیرہ پر فائرنگ کی ہے تو انہیں بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہوگا۔"

"یقیناً پہنچا ہوگا۔" میں نے کہا "اور یقیناً نہیں، پہنچا ہوگا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" ساحل نے کہا۔

میں نے ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "اس دو طرفہ فائرنگ کے بعد تارا اور وڈیرے کا محافظ تو زندہ پائے گئے ہیں۔ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو تارا کے حکم پر اس محافظ نے ہم پر گولیاں برسائیں تھیں جو زیادہ تر دوسری جیپ کی باڈی میں لگی تھیں اور ہم بہ حفاظت نکل آئے تھے۔"

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی نقصان ہوا ہے تو وڈیرے کا ہوا ہے!" میر بخش نے مسرور لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "فی الحال کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے' وہ تینوں محفوظ رہے ہوں اور ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ زندگی ہار گیا ہو!"

ساحل ایک جھرجھری لے کر رہ گئی۔ میر بخش معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔

ساحل نے کہا "لگتا ہے' پولیس والوں کا برا وقت چل رہا ہے۔ پے در پے انہیں نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔"

"ان کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ اس وقت میرے ذہن میں ڈی ایس پی کی ہوس ناک گفتگو تازہ ہوگئی تھی۔ وہ "دن سکسٹی نائن" کی آڑ میں ہمیں چھوڑنے پر تیار ہوگیا تھا اور ساتھ ہی اس نے ایک کڑی شرط بھی لگا دی تھی۔ ساحل کے بارے میں اس کے مذموم عزائم جان کر میرا دماغ گھوم گیا تھا اور اس کے بعد ہی یہ مار ماری کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میں نے ساحل یا میر بخش کو ابھی تک اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا "ان کرتوتوں پر ان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا ہونا چاہیے۔ اس میں وقت کا کوئی قصور نہیں۔ وقت نہیں' انسان اچھا یا برا ہوتا ہے۔"

میر بخش نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا "سائیں! ہم اکڑی کے بہت نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ آگے کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا پھر میں نے پجارو کو ہوا کا گھوڑا بنایا ہوا تھا اسی لیے بھی ہم بہت جلد اکڑی پہنچنے والے تھے۔ میں نے میر بخش کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"عمر کوٹ جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔"

"پھر کس طرف جائیں گے؟"

اس نے پوچھا "اکڑی سے اور کس طرف کی سڑکیں نکلتی ہیں؟"

وہ بتانے لگا "اکڑی سے بائیں جانب یعنی شمال میں ایک سڑک نکلتی ہے جو پتھورو سے ہوتے ہوئے ضلع سانگھڑ میں داخل ہوجاتی ہے۔"

"مجھے نہیں جانا سانگھڑ وانگھڑ۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

وہ بولا "اور آپ عمر کوٹ بھی نہیں جانا چاہتے اس لیے ہم اکڑی سے گزرنے کے بعد اس سڑک کو چھوڑ دیں گے۔ یہ سڑک سیدھی عمر کوٹ کی طرف جاتی ہے۔"

"میں بنیادی طور پر کراچی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بدستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا "اس مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے راہنمائی کرو۔"

میر بخش نے حتمی لہجے میں کہا "پھر تو آپ گاڑی کو اکڑی سے دائیں جانب موڑ لیں۔ کراچی جانے کے لیے عمر کوٹ سے میرپور خاص میں سے گزرنا ضروری ہے۔ ایک راستہ وہی شادی پلی والا تھا جس پر ناکا لگا ہوا ہے۔ اب ہم دوسرے اور تیسرے راستے کو آزمائیں گے۔"

میں نے پوچھا "اکڑی سے دائیں طرف گاڑی موڑنے کے بعد کیا صورتِ حال ہوگی۔ میرا مطلب ہے' ہمارا روٹ کیا بنے گا۔"

"وجدان سائیں!" میر بخش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "چند گز آگے یہ سڑک آپ کو چھوڑنا ہوگی۔" اس کی بات ختم ہونے تک وہ چند گز گزر گئے۔ ہم اکڑی سے گزر کر اس چوراہے پر آگئے جہاں دو سڑکیں ایک دوسرے کو کراس کرتی تھیں۔ میر بخش نے کہا "سائیں! گاڑی کو سیدھے ہاتھ موڑ لیں۔" میں نے اس کے کہنے کے مطابق پجارو کو کڑی سے جنوب کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ میر بخش نے بتانا شروع کیا "وجدان سائیں! اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم صالح بھمبرو سے گزریں گے پھر رحیم ڈکری سے ہوتے ہوئے "سامارو" پہنچ جائیں گے۔ سامارو' میرپور خاص کے بہت نزدیک ہے۔ وہاں سے سیدھی سڑک جیمس آباد (میرپور خاص) کی طرف جاتی ہے۔"

اس کا تفصیلی بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا "اور نیشنل ہائی وے کا راستہ کون سا ہے؟"

"ہم سامارو میں رکے یا وہاں سے میرپور خاص میں داخل ہونے کے بجائے سیدھے آگے بڑھ جائیں۔" اس نے بتایا "کنری اور "نبی سر" سے ہوتے ہوئے "نوکوٹ" کے مقام پر میرپور خاص پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے استفسار کیا "کیا یہ وہی "نبی سر" ہے جہاں کے

صاحب حیثیت شخص قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو منگل خان ہائی ڈاکو نے اغوا کر رکھا ہے اور پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کر رہا ہے؟"

"جی سائیں' یہ وہی "نبی سر" ہے۔" میر بخش نے تصدیق کردی۔

ساحل نے کہا "یہ منگل سنگھ تو بہت ہی منحوس آدمی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم بخیریت سفر جاری رکھتے تو پتا نہیں' اس وقت کہاں ہوتے۔ جہاں بھی ہوتے' خیریت سے ہوتے۔"

میر بخش ہوٹل سے نکلنے کے بعد مجھے بتا چکا تھا کہ ہم حیدر آباد سے "شالیمار ایکسپریس" کے ذریعے کراچی جائیں گے۔ مذکورہ ٹرین نصف شب کے قریب کراچی پہنچتی تھی اور رات تقریباً ختم ہونے والی تھی۔ جس وقت میں نے بنگلے کی بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے تارا اینڈ کمپنی کو جاتے دیکھا اس وقت ڈی ایس پی کے وال کلاک میں صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اس حساب سے اب لگ بھگ پانچ' ساڑھے پانچ کا وقت ہوگا۔ اس کا مطلب تھا' صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد سورج طلوع ہونے والا تھا۔

میں نے ساحل کی جھنجلاہٹ کے جواب میں کہا "اگر ہم اپنے پروگرام کے مطابق سفر کرتے رہتے تو یقیناً اس وقت کراچی میں ہوتے۔"

میر بخش نے الجھن زدہ انداز میں کہا "سائیں! ایک بات ابھی تک میرے حلق سے نہیں اتری۔ میں جتنا سوچتا ہوں' الجھتا چلا جاتا ہوں۔"

"کون سی بات میر بخش؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "چلو یہ بات تو ذہن تسلیم کرسکتا ہے کہ ہوش کے کمرے میں تارا کو کسی بھی طرح ہوش آگیا ہوگا اور اس نے باہوش ہونے کے بعد وہاں کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھا ہوگا۔ جب اسے پتا چلا ہوگا کہ ہم اس کی گاڑی میں عمر کوٹ سے "صوفی فقیر" کی طرف جانے والی سڑک پر گئے ہیں تو وہ ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا ہوگا۔ جب وہ اکڑی سے اسے معلوم ہوا ہو کہ ہماری ایمبولینس گاڑی شادی پلی کی جانب گئی ہے چنانچہ وہ سیدھا شادی پلی جا پہنچا پھر وہاں لگے ہوئے ناکے سے اسے ہمارے بارے میں مفصل تفصیل سے بتا دیا گیا ہوگا اور تھانے وغیرہ سے ہوتے ہوئے وہ ڈی ایس پی کے بنگلے تک پہنچ گیا تھا لیکن....."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھا اور کہا "میں وڈیرا اکبر سومرو تو دوپہر تک اپنی جاگیر پر تھا۔ میں اسے ڈی ایس پی کے بنگلے پر چھوڑ کر آپ کی طرف آیا تھا پھر وہ تارا کی معیت میں ڈی ایس پی کے بنگلے پر رات کے آخری پہر کس طرح پہنچ گیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

میں نے کہا "جس طرح تم نے بہت سی امکانی باتوں کا ذکر کیا ہے' بالکل اسی طرح یہ بھی ممکن ہے' تارا' وڈیرا اکبر سومرو کے ساتھ ہی عمر کوٹ شہر تک پہنچا ہو لیکن اس نے وہاں وڈیرے کی موجودگی کو راز میں رکھا ہو اور جب تارا ہمیں گھیر گھار کر وڈیرے تک پہنچانے میں ناکامیاب رہا تو وڈیرا اس کی خیر خیریت دریافت کرنے ہوٹل پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے بعد ان دونوں کا ایک ساتھ ڈی ایس پی کے بنگلے پر وارد ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہتی۔" میں ایک لمحہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ویسے حقیقت کیا ہے' اس کے بارے میں تو وڈیرا اکبر سومرو اور تارا ہی بتا سکتے ہیں اور ان تک جانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے چوکنا نظر سے عقب کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ اب تک ہمیں اپنے تعاقب میں کسی قسم کی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ میر بخش نے کلاشنکوف کا اسٹریپ کندھے پر چڑھا رکھا تھا اور اس کی نال کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر "فوکس" تھی۔ اس نے اس سفر کے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس نے "جی سائیں" کہہ کر میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "تم اب گن کو کندھے سے اتار کر اپنی گود میں رکھ لو یا پھر گاڑی کے کسی حصے میں ڈال دو۔ تعاقب میں اگر کسی کو آنا ہوتا تو ہمیں متعاقب کی اب تک جھلک نظر آجاتی۔ خوامخواہ اپنے اعصاب کو دباؤ کا شکار نہ بناؤ۔"

اس نے اپنے بائیں بازو کے کندھے سے کلاشنکوف کا پٹا اتار کر اسے گود میں رکھ لیا پھر بولا "یہ تو ٹھیک ہے' ہمارا تعاقب نہیں کیا جارہا لیکن کسی وقت اچانک اس ہتھیار کی ضرورت پیش آسکتی ہے اس لیے میں کلاشنکوف کو اپنی دسترس ہی میں رکھوں گا۔"

میں نے کہا "میر بخش! ہم ابھی تک ایک نہایت ہی اہم نکتہ کو بھولے ہوئے ہیں!"

"وہ کیا سائیں؟" اس نے پوچھا۔
میں نے کہا "ہمیں پہلی فرصت میں پجارو کی تلاشی لینا چاہیے۔"
"کیا آپ گاڑی روک کر یہ کام کرنا چاہتے ہیں؟"
"اس کام کے لیے گاڑی روکنا ضروری نہیں۔" میں نے کہا "میں گاڑی ڈرائیو کررہا ہوں۔ تم گاڑی کا یہ حصہ اچھی طرح چیک کرلو اور تم۔" میں نے عقب نما آئینے میں ساحل کو دیکھتے ہوئے کہا "تم گاڑی کے پچھلے حصے کی تلاشی لو۔ اچھی طرح ایک ایک کونے کھانچے کو دیکھو۔ کوئی چیز تمہاری نظر سے بچنا نہیں چاہیے۔"
وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مصروف ہوگئے۔ دس پندرہ منٹ کی تلاشی کے بعد کافی خوش آیند خبریں مجھ تک پہنچیں۔ میربخش نے پجارو کے اس حصے سے ایک بھاری رقم کا سراغ لگالیا تھا۔ وہ رقم ایک خفیہ خانے میں چھپائی گئی تھی۔ میربخش نے رقم والی گڈی میری نظر کے سامنے لہرائی اور بتایا "سائیں! یہ پورے پچاس ہزار روپے ہیں۔"
وہ پانچ سو روپے والی نوٹوں کی ایک مکمل گڈی تھی جس پر بینک کی تصدیقی مہر بھی لگی تھی۔ گڈی پر لگی پن اور چٹ سے ظاہر ہوتا تھا' اس میں سے ایک نوٹ بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ گویا وہ میربخش کی اطلاع کے مطابق واقعی پچاس ہزار روپے تھے۔ ان حالات میں ہمیں رقم کی سخت ضرورت تھی۔ یہ رقم نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔
میربخش نے جوشیلے انداز میں کہا "سائیں! میں نے سن رکھا ہے' اس دنیا میں ہمارا جو نقصان ہوتا ہے' وہ آخرت میں ستر گنا ہمیں واپس مل جاتا ہے۔ پولیس والوں نے ہم سے لگ بھگ گیارہ ہزار روپے چھینے تھے۔ پانچ گنا تو ہمیں اسی جہان میں مل گئے' باقی پینسٹھ گنا دیکھیں کہاں ملتے ہیں!"
"میربخش!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "میں تمہارے اس سود و زیاں کے فارمولے پر یقین نہیں رکھتا۔ اللہ کے ہاں نوازنے اور چھیننے کا دستور اور کلیہ بہت عجیب و غریب ہے۔ اسے اسٹیمیٹ کرنا ہماشما کے بس کی بات نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ رقم ہمیں ان گیارہ ہزار کے بدلے میں ملی ہوگی۔ ہماری رقم کا زیاں ایک سانحہ تھا' اس رقم کا حصول ایک اتفاق ہے۔ بہرحال' یہ رقم بڑے موقع پر ہمارے ہاتھ لگی ہے اس لیے اسے حسین اتفاق بھی کہا جاسکتا ہے۔"
میربخش نے میرے خیالات پر کسی قسم کا اعتراض یا تنقید نہیں کی۔ پجارو کے عقبی حصے کی تلاشی میں ساحل کو ٹیوں کے دو کین ملے تھے۔ وہ دونوں کین پیٹرول سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے ڈھکنوں کو بہت محفوظ انداز میں بند کیا گیا تھا۔ وہ پانچ پانچ لیٹر والے کین تھے گویا ہمارے پاس اس وقت دس لیٹر فیول اضافی حیثیت میں موجود تھا۔ یہ بھی صحرائی علاقے میں بہت بڑی نعمت تھی۔
پجارو میں کہیں بھی کوئی ہتھیار یا اس کا ایمونیشن نہیں پایا گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں ہمارے لیے سب سے اہم وہ رقم تھی جس کی مدد سے ہم دیگر اشیائے ضرورت خرید سکتے تھے۔ پولیس والوں نے تلاشی کے نام پر ہمیں بالکل ہی خالی کردیا تھا۔ گیارہ ہزار روپے' تارا کا پسٹل مع کلپ' ایمبولینس نما بلیک اینڈ ریڈ گاڑی' ہمارا سفری بیگ وغیرہ سب کچھ ہم سے چھین لیا گیا تھا۔ میں نے عمر کوٹ سے میرپور خاص کی جانب سفر کے دوران میں یامی شاہ کی جیپ والی چابیاں کھڑکی سے باہر پھینک دی تھیں۔ اگر جامہ تلاشی کے مراحل میں وہ چابیاں میرے پاس سے برآمد ہوجاتیں تو ہمارے لیے مصائب میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا۔
ہمارے درمیان کافی دیر تک تارا' ڈیرا اکبر سومرو اور ڈی ایس پی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیں پیش آمدہ حالات بھی زیرِ بحث آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شروع میں تو ساحل بھی اس بات چیت میں شامل رہی لیکن پھر اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ جب میں نے اسے کافی دیر تک کچھ بولتے ہوئے نہ سنا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
"ساحل! کیا بات ہے' تم چپ کیوں ہو؟"
اس نے فطری ردِعمل کے طور پر مجھے دیکھا۔ وہ درحقیقت میری پشت کو دیکھ رہی تھی لیکن میں بیک ویو مرر میں اس کا چہرہ بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس کی صورت پر تکلیف کے آثار نظر آئے۔ پجارو کے اندر اگرچہ بہت مدھم روشنی تھی تاہم میں نے ساحل کے چہرے کی کیفیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا۔
وہ جواب دیتے ہوئے بولی "کچھ نہیں ہے وجدان!"
"کچھ تو ہے۔" میں نے پجارو کی رفتار قدرے کم کردی "یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"
وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی "بس ذرا میرے پاؤں میں تکلیف ہورہی ہے۔"
"ذرا سی تکلیف پر چہرہ اس قدر تو نہیں بگڑتا!"
"کیا ہوا ہے' میرے چہرے کو؟" وہ بے ساختہ اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "میں محسوس کررہا ہوں' تم اس وقت شدید تکلیف میں ہو۔"
"ٹخنے میں پھر سے درد جاگ اٹھا ہے۔" اس نے بتایا۔
بہرحال فکر کی کوئی بات نہیں' میں برداشت کررہی ہوں۔"
انڈیا سے پاکستان آتے ہوئے سرحدی صحرا میں ساحل (اس وقت تک دھنو تھی) کے پاؤں میں شدید موچ آگئی تھی۔ ہم بھارتی سرحدی گاؤں "سوئی گام" سے جب پاکستان کے سرحدی گاؤں میں پہنچے تو پنڈت کشوری لال کے یہاں قیام کیا۔ پنڈت نے وید (حکیم) کو بلا کر "دھنو" کے پاؤں کا معائنہ کروایا تو پتا چلا اس کے دائیں ٹخنے میں موچ آگئی تھی۔ وید نے مالش کے لیے اسے ایک مرہم دے دیا تھا۔ ازاں بعد میں نے اپنی "چی" کی قوت سے اس کے ٹخنے کا درد رفع کردیا تھا۔ ساحل خود بھی اس عمل کو کافی حد تک سمجھ گئی تھی تاہم چونکہ اس کی "چی" کی قوت بیدار نہیں تھی اس لیے خاطر خواہ نتائج برآمد کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔
یہ پوری رات ہم نے افراتفری اور بھاگ دوڑ میں گزاری تھی۔ اس بے آرامی نے ساحل کے ٹخنے کے درد کو بھی جگا دیا تھا۔ ویسے بھی وہ مسلسل ہیل والی سینڈل پہنے ہوئے تھی۔ تھکن اور رت جگا اچھے اچھوں کو پچھاڑ دیتا ہے' ساحل تو ایک نرم و نازک حسینہ تھی۔
میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم تکلیف کو برداشت کرنے کے بجائے دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہو؟"
"کیا کروں میں؟"
"سب سے پہلے تو ہیل دار سینڈل کو پاؤں سے جدا کرو۔" میں نے مشورہ دیا "پھر وہی عمل دہراؤ جو تم نگر پارکر کے تھانے کی حوالات میں پہلے بھی کرچکی ہو۔"
وہ بولی "تم کہہ رہے ہو تو میں ایسا ہی کروں گی۔" پھر اس نے سینڈل کو پاؤں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا "میرے عمل کا مادہ تاثیر تو نہیں ہوسکتی جو تمہارے عمل میں ہے۔ تم تو ہیں ہی عظیم الشان قوت کے مالک ہو۔"
میربخش نے مجھ سے کہا "سائیں! ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اگر آپ برا نہ منائیں تو!"
"ہاں کہو' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"میں نے پہلے بھی آپ دونوں کی زبان سے یہ لفظ دو تین بار سنا ہے۔" میربخش نے کہا "چی کی قوت کیا چیز ہے' اگر ممکن ہو تو اس بارے میں کچھ بتائیں؟"
میربخش کے سوال کا جواب دینا بہت ضروری تھا۔ وہ میرا ساتھی اور جاں نثار دوست بن چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی آسان الفاظ میں اسے اس قوت کے بارے میں بتادیا۔ میری وضاحت سنتے ہوئے اس کے چہرے پر ہیجان خیز تاثرات ٹمیلا سالگا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔
"سائیں! آپ تو بہت کمال کے آدمی ہو۔ آپ کے پاس تو بہت حیرت انگیز اور زبردست قوت ہے۔ اس کے بل بوتے پر تو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں۔"
میں نے کہا "ہاں' ہے تو لیکن میں اسے انتہائی جائز اور مثبت کاموں میں استعمال کرتا ہوں۔ شعبدہ بازی مجھے پسند ہے اور نہ ہی میں نے اس کا کبھی مظاہرہ کیا ہے۔"
"آپ بہت عظیم ہیں سائیں!" وہ فرطِ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔
میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "عظیم صرف اللہ کی ذات ہے۔ باقی سب انسان برابر ہیں۔ بس بعض اوقات کسی شخص کی محنت اسے دوسروں سے ممتاز کردیتی ہے لیکن اس برتری کے سبب اسے دوسروں سے خود کو بڑا یا اعلیٰ و ارفع نہیں سمجھ لینا چاہیے' اللہ انسان کو دو طریقوں سے آزماتا ہے۔ کسی ایسی چیز سے نواز کر جس کا انسان اہل نہیں ہوتا یا پھر کسی ایسی شے سے محروم رکھ کر جس کا وہ استحقاق رکھتا ہو۔ یہ صلاحیتیں' شکتیاں' ہنر اور تجربے کاریاں سب آنی جانی ہیں۔ ہم سب معمولی اور غیر معمولی اداکار ہیں۔ ہمارا بدایت کار تو وہ ہے جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔"
وہ بھیگی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لرزاں لہجے میں گویا ہوا "سائیں! آپ تو صرف عامل ہی نہیں ملکہ عالم بھی ہیں۔"
"میں کچھ بھی نہیں ہوں۔" میں نے قطعیت سے کہا "بس ایک سیدھا سادہ معمولی سا انسان ہوں۔ میں مثبت سوچ اور مثبت عمل کا قائل ہوں اور منفی سوچ رکھنے والے لوگوں سے نبرد آزما ہوں۔ میں ایک طرح سے حق و باطل کی جنگ میں مصروف ہوں اور مجھے یقین ہے' بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی۔"
وہ سحرزدہ نظر سے مجھے تکے چلا جارہا تھا۔ یہ میرے لیے اس کی والہانہ عقیدت تھی جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔
میں نے کہا "میربخش! میری ایک بات ذہن نشین کرلو۔ یہ دنیا مفید لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے ہمیں ہر لمحے خود کو مفید بنانے کی کوشش میں مصروف رہنا چاہیے۔ ہماری

ذات سے کسی دوسری ذات کو فائدہ ضرور پہنچنا چاہیے۔ یہی ایک صحت مند معاشرے کا اصول ہے۔ بے فیض اور غیر مفید شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں۔"

ساحل نے مجھ سے سوال کیا "وجدان! تمہارے نزدیک ایک مفید انسان میں کیا کیا اوصاف ہونا چاہئیں؟"

میر بخش کی طرح وہ بھی پوری توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میرے نزدیک مفید انسان وہ ہے جس میں تین بنیادی اوصاف میں سے کم از کم ایک وصف ضرور موجود ہو۔ وہ تین اوصاف یہ ہیں۔ نمبر ایک' مثبت علم۔ نمبر دو' صحت مند فکر۔ نمبر تین توانائی سے بھرپور دانش۔"

"اور اگر کسی شخص میں یہ تینوں خاصیتیں موجود ہوں تو؟" ساحل نے پوچھا۔

"تو وہ شخص میرے نزدیک الیگزا لٹیڈ مین (شرف یافتہ انسان) کہلانے کا حق رکھتا ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا

"آپ ایسے شخص کو زندہ ولی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

میر بخش نے شوق سے لبریز لہجے میں پوچھا "سائیں! کیا میں بھی اپنی "چی" کی قوت بیدار کر سکتا ہوں؟"

اسی وقت مجھے پجارو سے باہر آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں نے میر بخش کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا "یہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں؟"

اس نے بغور پجارو کی ونڈ اسکرین کے پار دیکھا اور مجھے بتایا "ہم اس وقت "صالح بھمبرو" سے گزر رہے ہیں۔ اس سے آگے "محمد رحیم کلری" آئے گا اور پھر اس کے فوراً بعد "سامارو" کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔"

میں نے تسلی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے میر بخش سے پوچھا "ہاں' تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا' سائیں کہ کیا میں بھی "چی" کی قوت کو بیدار کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں!" میں نے کہا۔

"اس کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا "میرا مطلب ہے' اس قوت کی بیداری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"صرف ایک چیز کی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا سائیں؟"

میں نے بتایا "عزم!"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا!" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "عزم کا آسان مطلب ہے "ارادہ" جس شخص نے کوئی کام کرنے کا پکا ارادہ کر لیا' سمجھ لو اس نے وہ کام سرانجام دے لیا۔"

"پھر بھی' چی جیسی عظیم قوت کی بیداری کے لیے کچھ نہ کچھ پاپڑ تو بیلنا ہی پڑتے ہوں گے!" میر بخش کے اس اصراری انداز میں بے پناہ دلچسپی شامل تھی۔

میں نے واضح الفاظ میں کہا "کوئی پاپڑ نہیں بیلنا پڑتے۔ بس ایک سیدھی سادی آسان سی مشق ہے۔ اسے باقاعدگی سے کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ کی نیت صاف ہے' ارادہ پختہ ہے اور مقصد نیک ہے تو پھر کامیابی آپ کا مقدر ہے۔ آپ کا ہر بھی عمل لگن سے بھرپور ہوگا' وہ مثبت نتائج ضرور لائے گا۔"

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں پوچھنے لگا "سائیں! کیا آپ مجھے "چی" کی بیداری کے لیے مخصوص وہ سادہ سی مشق بتا سکتے ہیں؟"

"بالکل بتا سکتا ہوں۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

اس موقع پر ساحل نے شکایتی لہجے میں کہا "وجدان' تم نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ وہ مخصوص ایکسرسائز مجھے بھی کراؤ گے لیکن ابھی تک تم نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مشق کرانے کے لیے مکمل ذہنی سکون اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے کہا "ایسا کہا تھا یا نہیں؟"

"ہاں' تم نے یہی کہا تھا۔" اس نے تصدیق کی۔

میں نے پوچھا "کیا اس کے بعد سے ہمیں ذہنی سکون اور فرصت میسر آئی ہے؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے کہا "پھر تمہاری شکایت بے جا ہے۔"

وہ بولی "جب ہمیں فرصت ملے گی اس وقت ہم اس مشق کا عملی مظاہرہ کر لیں گے۔ فی الحال تم ہمیں اس کی تھیوری تو بتا سکتے ہو نا!"

"ہاں' فی الحال یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا پھر انہیں "چی" کی حقیقت بتانے لگا۔

میں نے انہیں بتایا کہ "چی" ایک پوشیدہ اور خوابیدہ قوت ہے جو ہر انسان کے پیٹ کے پچھلے حصے میں' ناف سے تھوڑا نیچے موجود ہے۔ آپ اس مقام کو ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کا زیریں حصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چینی فلاسفی میں اسے "چی" کا نام دیا گیا ہے۔ ہندو مائتھالوجی میں یہ قوت "کنڈلینی شکتی" کہلاتی ہے۔ اسلامی روحانیت میں اسے

"کیا ہم فوٹان کو دیکھ سکتے ہیں؟"

"کسی ایک فوٹان کو دیکھنا انسانی آنکھ کے بس کی بات نہیں۔" میں نے کہا "فوٹان کا مجموعہ روشنی ہے جسے ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ذرہ الیکٹرون' پروٹان اور نیوٹرون سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔"

میر بخش نے پوچھا "سائیں! خیال کی قوت سے کارنامہ کیسے انجام دیا جا سکتا ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "خیال کی قوت بڑی غضب کی چیز ہے۔ اگر انسان پوری لگن سے کسی ایک خیال پر توجہ مرکوز کر دے تو وہ خیال مجسم شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہماری سوچ جتنی مضبوط ہوتی ہے' ہم اتنے ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ خیال کی قوت واقعات کو جنم دیتی ہے۔ ہم گہری توجہ سے جس بات کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں' وہ ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ ایک راگی ملہار گا کر برسات کا سماں پیدا کر سکتا ہے۔ وہ جب دیپک راگ چھیڑتا ہے تو آگ جل اٹھتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ لوگ اسے گانے والے کا فن کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ اس کا ارتکازِ توجہ ہے۔ وہ اپنے فن میں ڈوب کر خیال کی قوت سے ایک واقعے کو جنم دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خیالات کا کنسٹرکٹیو ناقابلِ یقین اور حیرت آفریں مناظر تخلیق کر سکتا ہے۔"

راگ راگنیوں اور گویوں کے بارے میں مجھے بے پور میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ رانی روپ متی گائیکی کے فن میں خاصی دسترس رکھتی تھی۔ اس سے میں گھنٹوں موسیقی پر گفتگو کرتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی تھیں۔

ساحل اور میر بخش پوری دل جمعی سے میری جانب متوجہ تھے اور "چی" سے متعلق باتیں سن رہے تھے۔ اچانک میں نے ساحل سے پوچھا "تمہارے ٹخنے کا درد اب کیسا ہے؟"

"آں... ہاں۔" وہ چونکتے ہوئے بولی "میں نے تو کافی دیر سے یہ درد محسوس نہیں کیا۔" پھر وہ تیرانی سے مجھے تکنے لگی۔

"یہ ہوتی ہے خیال کی قوت!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تم کافی دیر سے مجھے سن رہی ہو۔ تمہاری توجہ میری باتوں پر لگی ہے' گویا اس وقت تم ارتکازِ توجہ کی کیفیت سے گزر رہی ہو۔ میری باتوں کے سوا تمہارا دھیان کسی اور سمت میں نہیں ہے اس لیے تم باقی تمام کیفیات سے بے خبر ہو۔ تمہارے ٹخنے میں درد تو ہو رہا ہوگا لیکن عدم توجہی کی وجہ سے تم اسے محسوس نہیں کر رہی ہو۔ جس طرح

طرف" کہتے ہیں۔ تینوں تہذیبوں کے عالموں نے اس کی بیداری کے لیے مختلف طریقے' مشقیں' ریاضتیں و مراقبے وغیرہ وضع کیے ہیں۔ راستے الگ الگ ہیں مگر کم و بیش منزل ایک ہی ہے۔ جو بھی انسان اس کے حصول کے لیے وضع کردہ راستے پر بالکل درست قدم رکھتا ہے' وہ بالآخر اپنی منزل کو پا لیتا ہے۔"

میں ان کی طرف دیکھے بغیر بولے چلا جا رہا تھا۔ میری ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ میں نے "چی" کے بارے میں مزید بتاتے ہوئے کہا "جب مخصوص مشق کے ذریعے اس خوابیدہ قوت کو بیدار کیا جاتا ہے تو یہ ریڑھ کی ہڈی کے راستے سیدھی دماغ کی جانب سفر کرتی ہے۔ اس موقع پر بہت سمجھ بوجھ اور احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مشق کرنے والا کوئی سنگین غلطی کر بیٹھے یعنی اس کے ارتکاز اور فہم میں کوئی رخنہ پڑ جائے یا اس کی نیت میں کوئی کھوٹ آ جائے یا وہ کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھے تو پھر یہ قوت کسی بھی نوعیت کی سرکشی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ یہ ایک داستانی شیر کو جگانے کے مترادف ہے لیکن اس مرحلے پر اگر مشق کرنے والے کو کسی ماہر استاد کی راہنمائی حاصل ہو تو پھر خطرے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ ویسے بھی یہ قوت اچانک بیدار ہو کر دماغ کی جانب سفر نہیں کرتی۔ جب آپ اسے جگانے کے لیے اپنی مشق کے ذریعے اس کو ہولے ہولے جھنجھوڑتے ہیں تو یہ کسمسا کر کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ ان مراحل میں مشق کرنے والے شخص پر مخصوص قسم کی کیفیات بھی طاری ہوتی رہتی ہیں جن کی بنا پر نگران استاد اسے مفید مشوروں سے نوازتا رہتا ہے۔ ان مشوروں اور ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس سرکش قوت کو زنجیریں ڈال کر دماغ کی طرف لایا جاتا ہے۔

"دماغ میں پہنچ کر یہ قوت فوٹان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دماغ کے ایک مخصوص حصے کو روشن کر دیتی ہے۔ یہ وہی حصہ ہے جہاں خیالات نمو پاتے ہیں۔ یہ خیالات کی نشوونما کو تقویت دیتی ہے گویا یہ خیالات کی قوت کو بڑھاتی ہے' انہیں توانائی بخشتی ہے۔ یہ ایک طرح سے آٹو جنریٹر کے طور پر کام کرتی ہے جس سے انسان خیال کی قوت سے بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔"

ساحل نے پوچھا "فوٹان کیا چیز ہوتی ہے؟"

"یہ لائٹ انرجی کا سب سے چھوٹا اور ناقابلِ تقسیم ذرہ ہے۔" میں نے بتایا "روشنی کا سارا کھیل اسی ننھے منے ذرے کا مرہونِ منت ہے۔"

ارتکازِ توجہ سے کوئی واقعہ تخلیق کیا جاسکتا ہے' بالکل اسی طرح عدم توجہی اور بے نیازی سے کسی حقیقت کی نفی بھی کی جاسکتی ہے اور یہ سارے کا سارا کھیل خیال کی قوت کا ہے۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوگئی کہ تمہارے اندر ارتکازِ توجہ یعنی کنسنٹریشن کی صلاحیت موجود ہے۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! میں بھی کافی دیر سے اپنے بازو کا درد بھولا ہوا ہوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے گھائل بازو میں کوئی ٹیس کیوں نہیں اٹھی۔"

"اب تو تمہاری حیرت دور ہوگئی ہوگی۔" میں نے کہا "تم بھی اپنے اندر توجہ کی قوت رکھتے ہو۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے' میں اپنی "چی" کی قوت کو بیدار کرسکتا ہوں؟"

"یہ ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا "اگر تمہارا عزم پختہ اور کوشش مثبت ہوئی تو تم یہ قوت ضرور حاصل کرلو گے۔"

ساحل نے کہا "بس بھئی بہت ہوگئی۔ وجدان! اب جہاں بھی ہمیں کچھ دیر ٹھہرنے کا موقع ملے گا' تم ہمیں "چی" کی مشق کرنا عملاً سکھاؤ گے۔ تھیوری بہت پڑھ لی۔"

"ٹھیک ہے' میں نے کب انکار کیا ہے۔"

"میں تم سے مارشل آرٹس بھی سیکھوں گی۔" وہ مچل کر بولی۔

"وہ بھی ضرور سکھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

میر بخش نے کہا "ان فنون کے لیے آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں سائیں۔"

"لے لیا۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا "اور کچھ؟"

"بہت بہت شکریہ سائیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ساحل سے کہا "تم ذرا میر بخش کو "شکریہ" والا فلسفہ سمجھا دو۔"

وہ میری بات کا مقصد سمجھ گئی اور آئندہ پانچ منٹ میں وہ میر بخش کو بتاتی رہی کہ میرے نظریے کے مطابق تھینک یو' سوری اور پلیز جیسے تکلفات کو دوستوں کے درمیان جگہ نہیں پانا چاہیے۔

میر بخش گہری عقیدت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! میں آپ کا دوست بننے کے قابل کہاں ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے' یہی بڑی بات ہے۔ آپ تو میرے آقا ہیں۔" پھر اس نے دونوں ہاتھ مخصوص انداز میں جوڑ دیے۔

میں نے کہا "میرے سامنے اس طرح ہاتھ نہ جوڑو۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہم دوست ہیں۔ مجھ سے سیدھی بات کیا کرو۔"

"سائیں! مجھ سے یہ نہیں ہوسکے گا۔" وہ عاجزی سے بولا۔ تاہم اس مرتبہ اس نے ہاتھ نہیں جوڑے تھے "سائیں! میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ آپ نے مجھے سام بنالیا' آپ کی بہت مہربانی ہے۔ اب میری یہ زندگی آپ کی امانت ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ پر قربان ہوجائے۔"

بات ختم کرتے ہوئے وہ خاصا جذباتی ہوگیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اسے مزید روکنا ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ میرے ساتھ رہتے رہتے خود ہی سب کچھ سیکھ جاتا۔ اس کی ساری عمر وڈیرا اکبر سومرو کی چاکری میں گزری تھی۔ اس قسم کے بھوتار وڈیرے صرف حکم چلاتے ہیں اور میر بخش جیسے ادنیٰ چاکر "جو حکم سائیں" کہنے کے لیے پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی چاکر اپنے وڈیرے کے سامنے دم مارنے کی جسارت نہیں کرسکتا' دوستی کرنا اور دوستانہ انداز میں باتیں کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ مجھے امید تھی کہ میر بخش تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے رویّوں کو بخوبی سمجھنے لگے گا پھر اسے ہمارے ساتھ گھلنے ملنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس میل ملاپ کے لیے کچھ وقت کی ضرورت تھی۔

وہ دونوں اچانک خاموش ہوگئے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے درد کو محسوس کررہے تھے۔ میں نے دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

"کیسی خوش خبری؟" ساحل نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میر بخش بھی سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں کی تربیت و تعلیم ابھی سے شروع کردوں۔"

"وہ تو تم کافی دیر سے کررہے ہو۔" ساحل نے کہا "تمہارا علمی اور فنی لیکچر ہم پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔"

"میں عملی تربیت کی بات کررہا ہوں۔"

"اس کے لیے تو سکون اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہوگی۔" ساحل نے کہا۔

میر بخش بولا "سائیں! کیا گاڑی میں وہ مشق کرنا مناسب ہوگا۔ آپ تو کہہ رہے تھے..."

میں نے میر بخش کی بات کاٹتے ہوئے کہا "باقاعدہ عملی

مشق تو گاڑی میں نہیں کی جاسکتی البتہ اس کی ابتدائی تیاری کے لیے ہلکا پھلکا کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" ساحل کی آواز میں دلچسپی شامل تھی۔

میں نے کہا "تم دونوں میں ارتکازِ توجہ کی صلاحیت موجود ہے اور اس صلاحیت کو آزمانے کا موقع بھی ہے۔ ساحل، تم اپنے ٹخنے میں درد محسوس کررہی ہو اور میر بخش، تم اپنے زخمی بازو میں تیسیں محسوس کررہے ہو۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "میں نے یہ بات تم دونوں کی اچانک خاموشی سے بھانپ لی ہے۔ ممکن ہے، میرا اندازہ غلط ہو اور تم دونوں کی خاموشی کی کوئی اور وجہ ہو! کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

وہ بیک زبان بولے "آپ نے ہمارے بارے میں بالکل درست محسوس کیا ہے۔"

"پھر تم دونوں اپنی توجہ اپنے اوپر جسم کے زخمی حصے پر مرکوز کردو۔" میں نے کہا "اور اس خیال کو ذہن میں جمانے کی کوشش کرو کہ تمہارے زخم تکلیف دہ نہیں رہے۔ تم لوگ ایسا سوچتے ہوئے جسم کے متاثرہ حصوں کو دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سے سہلاتے بھی جاؤ۔ اس طریقے سے تمہیں یقینی طور پر بہت آرام و سکون ملے گا۔"

اگلے ہی لمحے وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کررہے تھے۔

جب ہم "محمد رحیم کلری" کے نزدیک پہنچے تو رات کی تاریکی چھٹنے لگی۔ آہستہ آہستہ اب سپیدۂ سحر نمودار ہورہا تھا۔ تاریکی کا جتنا حصہ ختم ہوتا، وہ جگہ اجالا لے لیتا۔ وہ ایک بیک وقت عمل تھا۔ غیر محسوس طور پر تاریکی اجالے میں بدل رہی تھی جس طرح انسانی جسم میں خون کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایک طرف تازہ خون بنتا رہتا ہے، دوسری جانب ناقابلِ استعمال ڈیڈ بلڈ سیلز ایک قدرتی عمل کے تحت دوران خون میں سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ قدرت کا ہر نظام حیرت آفرین ہے اور "آٹو سسٹم" کے تحت کام کرتا ہے۔ جس طرح تاریکی، اجالے کی خوراک بن جاتی ہے بالکل اسی طرح اندھیرا، روشنی کو نگل جاتا ہے۔ شام و سحر کا یہ چکر صدیوں سے چلا آرہا ہے اور صدیوں تک چلتا رہے گا۔ گویا یہ سلسلہ ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے۔

ریگستان میں ایک ہی دن میں موسم کی کئی صورتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ دن کے ابتدائی اور آخری حصے یعنی شام و سحر کے وقت موسم بہت خوشگوار ہوجاتا ہے۔ نہ سردی اور نہ گرمی۔ دوپہر میں آسمان آگ برسانے لگتا ہے گویا جسم کا سا سماں ہوتا ہے۔ بھیگی ہوئی رات اپنے اندر شدید ٹھنڈک رکھتی ہے۔ اگر سردی بہت زیادہ نہ بھی ہو تو پھر بھی موسم سرد ہی ہوتا ہے۔

میں ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہ جمائے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کا منظر ایک مخصوص حد تک روشن تھا۔ اب تو ویسے بھی اجالا کھلنے لگا تھا۔ غور سے دیکھنے پر گردونواح کا منظر نگاہ کے سامنے واضح ہوجاتا تھا۔ اس وقت فضا بہت دلکش اور موسم خاصا سہانا ہورہا تھا۔

محمد رحیم کلری سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پجارو کو روکنا پڑا۔ دراصل اس مقام پر ریلوے کراسنگ تھی۔ ریل کی پٹڑی سڑک کے اوپر سے گزرتی تھی اور اس وقت ریلوے کراسنگ والا پھاٹک بند تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا، وہاں سے کوئی ٹرین گزرنے والی تھی۔

وہ ریلوے کوئی مین لائن نہیں تھی اس لیے زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہاں سے گزرنے والی کوئی پسنجر/لوکل ٹرین ہوگی یا پھر وہ مال گاڑی بھی ہوسکتی تھی۔

ریلوے پھاٹک پر، پھاٹک والا ریلوے ملازم ہاتھ میں سگنل لیمپ لیے کھڑا تھا۔ مزکورہ لیمپ سے پھوٹنے والی سبز روشنی اس بات کی نشان دہی کرتی تھی کہ آنے والی گاڑی کو وہاں سے گزرنے کی اجازت دی جارہی ہے۔ دن کے وقت یہی کام سبز جھنڈی دکھا کر کیا جاتا ہے۔

پھاٹک کے نزدیک ہی کھپریل کی چھت والا ایک کمرا بنا ہوا تھا جو یقیناً پھاٹک والے شخص کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ میں نے نگاہ دوڑا کر دور تک دیکھا۔ ہمارے سامنے اور پیچھے کسی بھی قسم کی کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ علی الصباح کا وقت تھا اور اس غیر مصروف سڑک پر ہمارے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

ہمیں وہاں رکے ہوئے چند لمحات ہی گزرے تھے کہ پھاٹک والا ہماری جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس نے چیک دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سگنل لیمپ جھول رہا تھا۔ یہ لیمپ بھی عجیب چیز ایجاد کی ہے ریلوے والوں نے جو کبھی سبز اور کبھی سرخ روشنی خارج کرتا ہے درحقیقت ایک ڈبا نما شے ہے جس کی ایک "دیوار" میں سرخ شیشہ اور دوسری دیوار میں سبز شیشہ جڑا ہوا ہے۔ دونوں دیواریں آمنے سامنے والی ہوتی ہیں اور لیمپ کے ڈبے کے اندر عام روشنی والا ایک چراغ جل رہا ہوتا ہے مگر رنگ دار شیشوں کے سبب اس میں سے پھوٹنے والی روشنی اپنی

[illegible] سے سبز اور سرخ دکھائی جاسکتی ہے۔

[illegible] پردار پھاٹک والے کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ [illegible] عجیب سا احساس ہوا۔ وہ پھاٹک کو بند کرکے گاڑی کو [illegible] دینے کے لیے پٹڑی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا، گاڑی [illegible] تک اسے وہیں موجود رہنا چاہیے تھا۔ میں نے [illegible] پھاٹک سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا کیا تھا۔ پھاٹک والے [illegible] طرف قدم اٹھاتے دیکھ کر میں نے سرگوشیانہ انداز [illegible]

"کلا شنکوف کو گود میں سے اٹھا کر کسی جگہ چھپا دو۔ اس [illegible] نمائش کرنا کوئی نئی مصیبت کھڑی کرسکتا ہے۔" اس [illegible] ہی میں نے میر بخش کو اشارہ بھی کردیا۔

اس وقت اگرچہ اجالا پھوٹنا شروع ہوگیا تھا۔ تاہم [illegible] کے اندر کی جانے والی حرکت کو پھاٹک والا دیکھ نہیں [illegible] تھا۔ میر بخش نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے [illegible] کلاشنکوف کو گود میں سے اٹھا کر، دامن کے نیچے دونوں [illegible] میں پھنسا کر کھڑا کردیا۔ میر بخش نے گہرے نیلے رنگ [illegible] قمیص زیب تن کر رکھا تھا جو اس ملگجے اجالے میں [illegible] فاصلے سے سیاہ نظر آتا تھا۔ اس نے کلاشنکوف کو اس [illegible] میں اپنی دسترس میں استادہ کیا تھا کہ بوقتِ ضرورت [illegible] آسانی سے نکال کر استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔

وہ پجارو سے باہر لیمپ بردار شخص کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] "یہ مردود ہماری جانب کیوں آرہا ہے۔ اسے تو بند پھاٹک [illegible] پاس موجود رہنا چاہیے۔ گاڑی کسی بھی لمحے آسکتی [illegible]"

"یہ بات مجھے بھی حیران کررہی ہے۔" میں نے کہا "میں [illegible] والے کی اس حرکت سے الجھ گیا ہوں۔"

[illegible] درمیان سرگوشیوں میں بات چیت ہورہی تھی۔ [illegible] نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "وجدان! [illegible] پاس ایک بھاری رقم بھی موجود ہے۔ اسے بھی کہیں [illegible] چاہیے۔ پچاس ہزار روپے کوئی معمولی تو نہیں [illegible]"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا [illegible] نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا، بولا "سائیں! میں نے [illegible] والی گڈی کو ڈیش بورڈ میں رکھ دیا ہے۔ اگر کہیں اور [illegible] تو حکم کریں۔"

"نہیں، وہیں ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی کے [illegible] دیکھنے لگا۔

پھاٹک والا ریلوے ملازم اب ہماری پجارو سے صرف دس گز کے فاصلے پر تھا اور اس کا رخ سیدھا ہماری ہی جانب تھا۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک قد آور صحت مند انسان تھا۔ چادر کی بکل نے اس کے چہرے کا زیادہ تر حصہ چھپا رکھا تھا جس کی وجہ سے میں اس کا حلیہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سگنل لیمپ اس نے بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دایاں ہاتھ چادر کے اندر تھا۔ میں محتاط نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کے پاس آیا اور ایک طائرانہ سی نگاہ پجارو کے اندر ڈالنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا "سائیں! ماچس ہوگی آپ کے پاس؟"

چادر کی بکل کی وجہ سے اس کی اصل آواز اپنی اصل حالت میں مجھ تک نہیں پہنچی۔ نہ سلام، نہ دعا۔ اس نے آتے ہی ماچس کی فرمائش کردی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کردیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس ریلوے ملازم کی نیت میں مجھے فتور نظر آرہا تھا۔

میں نے گھور کر اس کے چہرے کو دیکھا اور سخت لہجے میں کہا "یہاں کوئی سگریٹ نہیں پیتا اس لیے تمہیں ماچس نہیں مل سکتی۔"

میری بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ بکل پوش شخص نے لیمپ کو ایک طرف پھینکتے ہوئے دایاں ہاتھ چادر سے برآمد کیا اور اس میں موجود ریوالور کی نال کو میری کنپٹی سے لگاتے ہوئے بولا۔

"گاڑی سے باہر آجاؤ۔"

اس کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا اور وہ بائیں مرنے مارنے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پہلو میں بیٹھے میر بخش کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

ریوالور بردار بکل پوش نے غراتے ہوئے کہا "کسی قسم کی چالاکی کے بارے میں نہیں سوچنا ورنہ تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے اسے باتوں میں لگانے کی خاطر کہا "تم تو گاڑی کو سگنل دینے کے لیے لیمپ تھامے پھاٹک پر کھڑے تھے، تمہیں ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"بکواس مت کرو اور گاڑی سے باہر نکل آؤ۔" اس نے قطعی انداز میں کہا۔

میں نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے ہوئے کہا "اس دوران میں اگر ٹرین وغیرہ آگئی تو تمہاری نوکری بھی جاسکتی ہے۔"

پھاٹک والے کو اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتنا چاہیے۔"

اس نے نہایت ہی بے ہودہ انداز میں ریلوے اور پھاٹک والے کو مغلظات میں تولا پھر دھمکی آمیز انداز میں بولا "اگر تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی چاہتے ہو تو گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہمیں صرف تمہاری گاڑی کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "تم بار بار "ہمیں" کا لفظ استعمال کر رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے' تمہارے کچھ اور ساتھی بھی یہاں موجود ہیں؟"

"تم سوالات نہیں کرو اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر فوراً عمل کرو۔" وہ تحکمیانہ انداز میں پھنکارا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ اگر تم نے کسی قسم کی مزاحمت کی تو پھر مجھے مجبوراً یہ ریوالور استعمال کرنا پڑے گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے ریوالور کی نال کا دباؤ میری کنپٹی پر بڑھا دیا۔

ایک بات تو واضح ہو گئی تھی کہ اس شخص کا تعلق محکمہ ریلوے سے ہرگز نہیں تھا۔ اس نے کسی ٹرین کی گزر کے لیے پھاٹک بند نہیں کیا تھا بلکہ محمد رحیم کلری کی جانب سے آنے والی کسی گاڑی کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے تھا جنہیں فوری طور پر ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے۔

یہ تمام خیالات چشم زدن میں میرے دماغ سے گزرے تھے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اصل پھاٹک والا اس وقت یقیناً ریوالور بردار کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر ہوگا۔ وہ اسے قابو میں کیے بغیر وہاں کا نظام اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے تھے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ پھاٹک والے شخص کو اس کے کمرے میں محبوس کیا گیا ہوگا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس اکلوتے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی عقبی جانب دیوار کے ساتھ مجھے ایک چھوٹی جیپ کھڑی نظر آئی۔ وہ ایک "ٹویوٹا فورو وہیل ڈرائیو" تھی۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" ریوالور بردار شخص نے میری کنپٹی پر ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

میں نے پوچھا "آخر تمہاری ہم سے دشمنی کیا ہے؟"

جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسے ہماری جانوں کی نہیں بلکہ اس بچارو کی ضرورت تھی' میں بہت ایزی ہو گیا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے اس شخص سے چھیڑ خانی میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔

"ابھی تک تو کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن اگر تمہارا یہ رویہ رہا تو دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی۔"

میں نے پوچھا "تم اس نئی نویلی دشمنی کا اظہار کس طرح کرو گے؟"

"اس طرح!" اس نے ریوالور کی نال کو میری کنپٹی میں گھسیڑنے کی کوشش کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا "اگر دس سیکنڈ کے اندر تم لوگوں نے میری بات پر عمل نہیں کیا تو پھر اس گاڑی کے اندر تمہاری تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آئیں گی۔"

میں نے ایک مصنوعی جھرجھری لی اور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے "ہینڈز اپ" ہاتھوں کو کانوں سے لگاتے ہوئے میر بخش کی طرف دیکھ کر کہا "نہ بابا نہ۔ ہمیں مرنے کا کوئی شوق نہیں۔ تم یہ گاڑی لے جا سکتے ہو۔ میں تو نیچے اتر رہا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے میر بخش کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"تم دونوں بھی گاڑی سے باہر نکل آؤ۔" ریوالور بردار نے میر بخش اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

میں نے بدستور ہینڈز اپ رہتے ہوئے اس بکل پوش شخص سے درخواست کی "میرا ساتھی دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ اس کو گاڑی سے باہر لانے کے لیے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ اگر تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بلا لاؤ۔ البتہ لڑکی کو میں نیچے اترنے کا کہہ دیتا ہوں۔"

اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔ اپنے کسی ساتھی کو بلا لانے والی تجویز نے اسے متاثر نہ کیا۔ غالباً وہ ہمیں چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا پھر ساتھی کے حوالے سے اس کے ساتھ کوئی اور "ٹیکنیکل پرابلم" تھی۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے کہا۔

"میں اپنے ساتھی کو یہاں نہیں بلانا چاہتا۔ تم میری مدد کے بغیر اپنے معذور ساتھی کو گاڑی سے باہر لاؤ۔ میں ریوالور سے تمہاری نگرانی کروں گا۔"

اس نے روانی میں "اپنے ساتھی" کے الفاظ استعمال کر کے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ کل دو افراد تھے جنہیں ہماری گاڑی کی اشد ضرورت تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے بچارو کی پسنجر سیٹ کی جانب

[illegible] کی طرف
وہ مفاری سے بولا "لیکن اس سے پہلے تمہاری ساتھی [illegible] کو نیچے اترنا ہوگا!"
میں نے ساحل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "گاڑی سے [illegible] جاؤ لیلیٰ!"
میں نے دانستہ ساحل کو لیلیٰ کے نام سے پکارا تھا۔ اس [illegible] یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اب میرا نام مقصود احمد ہے [illegible] میر بخش حسب معمول میر بخش ہی ہے۔ میرے اور بکل [illegible] شخص کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں' وہ میر بخش اور [illegible] نے بھی تفصیلاً سنی تھیں مجھے قوی امید تھی کہ میر بخش [illegible] پلاننگ کو سمجھ گیا ہوگا۔ جب میں اسے بچارو سے باہر [illegible] رہا ہوتا تو اس موقع پر اسے کوئی کارروائی کرنا تھی۔
ساحل میرے اشارے پر بچارو سے باہر آ گئی تو میں [illegible] بخش کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس دوران میں ریوالور بردار [illegible] ہماری نگرانی کرتا رہا۔ میں نے بچارو کا دروازہ کھولتے [illegible] بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہا۔
"یہ تو بے رحمی کی انتہا ہے۔ اب میں منہ اندھیرے [illegible] اپاہج ساتھی کو کس طرح سامارو تک پہنچاؤں گا!"
وہ ڈانٹ آمیز لہجے میں بولا "یہ منہ اندھیرا سدا نہیں [illegible] گا۔ تھوڑی دیر بعد اس سڑک پر بسوں وغیرہ کی [illegible] شروع ہو جائے گی۔ تم لوگ بہ آسانی کسی بس وغیرہ [illegible] سوار ہو کر سامارو تک جا سکتے ہو۔"
"اچھا بھائی' جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے جھنجلائے [illegible] انداز میں کہا۔
میں اس قسم کی اداکاری کر رہا تھا کہ ریوالور بردار کو [illegible] عزائم کی بھنک نہ ملے۔ وہ یہی سمجھے کہ ہم اپنی گاڑی [illegible] جانے پر بہت پریشان ہیں۔ خاص طور پر اپنے معذور [illegible] کی وجہ سے میں جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہا ہوں۔
میں نے اپنے اور اپنے عقب میں کھڑے ریوالور بردار [illegible] کے درمیانی فاصلے کو ذہن میں نقش کیا پھر دونوں [illegible] کے کلاوے میں میر بخش کو سمیٹتے ہوئے اس کے کان [illegible] سرگوشی کی "اسے صرف زخمی کرنا ہے اس لیے فائرنگ [illegible] ہونا چاہیے۔"
میری آغوش میں محصور میر بخش کی گردن نے اثباتی [illegible] اور میں نے اس کے جسم کو اٹھا کر بچارو سے باہر [illegible] ریوالور بردار شخص میری پشت پر صرف تین فٹ کے [illegible] کھڑا تھا۔ میں نے میر بخش کو بچارو سے برآمد کرتے [illegible] میں اٹھائے اٹھائے ایک زوردار گول چکر میں [illegible] یا کر زمین پر رکھ دیا۔
میری اس "حرکت" کا بڑا حیرت انگیز نتیجہ برآمد ہوا۔ میر بخش کی دونوں ٹانگیں ریوالور بردار کے اس ہاتھ پر پڑیں جس میں اس نے ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا اور وہ شخص ہلکی چیخ سے مشابہ آواز نکال کر زمیں بوس ہو گیا۔
یہ سب کچھ برق رفتاری سے پیش آیا تھا۔ میر بخش کسی اسپرنگ کی طرح زمین سے اچھلا اور عقاب کے مانند پرواز کرتے ہوئے زمیں بوس بکل پوش شخص کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں اس شخص کے منہ سے چیک دار چادر ہٹ گئی تھی' گویا اب وہ بکل میں نہیں تھا۔ اب میں اس کے حلیے کا مشاہدہ بہ آسانی کر سکتا تھا۔
اس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ اس نے بیچ کی مانگ نکال رکھی تھی اور بال بھی خاصے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بڑی بھرپور داڑھی بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی صورت کی سب سے واضح نشانی یہ تھی کہ وہاں بھلبھری کے بڑے بڑے سفید دھبے موجود تھے۔ میری نظر اس کے ہاتھوں پر گئی تو وہاں بھی مجھے اسی قسم کے نشانات دکھائی دیے' گویا وہ مکمل طور پر اس خوفناک مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔
زمین پر چت پڑا ہوا وہ شخص پھٹی پھٹی آنکھوں سے میر بخش کو تک رہا تھا۔ آنکھیں موٹی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کی حیرت کا سب سے بڑا سبب میر بخش تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی اپاہج شخص کو اس طرح اچھلتے اور فضا میں پرواز کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس "معذور شخص" کے ہاتھ میں کلاشنکوف بھی موجود تھی جس کی موت اگلنے والی خوفناک نال کو اس نے خاک نشین کے کھلے ہوئے منہ میں گھسیڑ رکھا تھا۔
میں نے اس دوران میں اس کا ریوالور اٹھا کر ساحل کے حوالے کر دیا اور میر بخش کے قریب آ گیا۔ ساحل میرا اشارہ پا کر دوبارہ بچارو میں جا بیٹھی تھی۔
"کیا حکم ہے سائیں؟" میر بخش نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا "مانو تو ٹھکانے لگا دوں؟"
"اگر ضرورت پڑی تو اسے ٹھکانے بھی لگا دیں گے۔" میں نے اس وحشت زدہ شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "پہلے اس کا انٹرویو تو کر لوں۔ کیا پتا' یہ اس امتحان میں پاس ہی ہو جائے اور ہمیں اس کے خون میں ہاتھ نہ رنگنا پڑیں۔"

وہ شخص کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا "گن کی نال میرے منہ سے نکال دیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔"

"وہ تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔" میر بخش نے خوں خوار انداز میں اسے گھورتے ہوئے کہا "اور اسی حالت میں تمہاری زبان چلے گی۔ ہم سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔"

اس شخص کی وحشت میں اضافہ ہوگیا۔ میر بخش کے اٹل لہجے میں بڑی تاثیر تھی۔ تاہم میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور ہماری پجارو عین سڑک پر کھڑی تھی۔ پھاٹک چونکہ بند تھا اس لیے ہمارے پیچھے یا پھاٹک کی دوسری جانب گاڑیوں کی "آمدورفت" سے وہاں رش لگ سکتا تھا اس طرح ہماری "کارروائی" پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی تک دور دور تک کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم یہ صورتِ حال مستقل نہیں رہ سکتی تھی۔

میں نے میر بخش سے کہا "تم اس شخص کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے سڑک سے نیچے اتار لو۔ میں گاڑی کو مناسب جگہ پر لگاتا ہوں تاکہ کسی قسم کی "بدمزگی" کا امکان باقی نہ رہے۔"

"ٹھیک ہے سائیں' آپ گاڑی میں جائیں۔" میر بخش پراعتماد لہجے میں بولا "میں اس چت کبرے کو سنبھالتا ہوں۔"

میں پجارو کی جانب جانے سے پہلے ریلوے کراسنگ پر موجود پھاٹک کھول دیا۔ اب وہاں کسی آنے جانے والی گاڑی کے رکنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اس طرح میں تسلی کے ساتھ اس دھبے دار شخص سے پوچھ گچھ کرسکتا تھا۔

پھاٹک کو کھولنے سے خطرے کا ایک امکان پیدا تو ہوگیا تھا مگر مجھے امید تھی کہ وہ خطرہ لاحق ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اگر کوئی گاڑی یا ٹرین کو اس دوران میں ریلوے لائن سے گزرنا ہوا بھی تو وہ گزر ہی جائے گی۔ اسی طرح اگر سڑک پر سے گزرنے والی کسی کار' بس یا ٹرک نے ٹرین وغیرہ کی جھک دیکھ لی تو وہ پھاٹک کھلا ہونے کے باوجود بھی کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوگا۔ ویسے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس شخص کو بہت جلد "نمٹا" دوں گا۔

میں پجارو میں آیا اور اسے باآہستگی ڈرائیو کرتے ہوئے سڑک سے اتار کر کچے میں کھڑا کردیا۔ میں گاڑی سے نیچے اترنے لگا تو ساحل نے سوال کیا۔

"وجدان اس شخص کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"تھوڑی سی پوچھ تاچھ اور بس۔" میں نے کہا۔

"اور میں یہاں گاڑی میں اکیلی رہوں گی؟"

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"بات ڈر کی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی "میرے پاس تو دو ریوالور ہیں۔ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔"

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا "پھر کیا بات ہے' تم اس قدر الجھی ہوئی کیوں ہو؟"

"میں تو بس صرف یہ کہہ رہی ہوں' اس پوچھ تاچھ کی ضرورت کیا ہے!"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا!" میرے لہجے میں الجھن تھی۔

وہ بولی "ہم نے اس شخص سے ہتھیار چھین لیا ہے۔ اب وہ ہمارے سامنے کسی حقیر کیچوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار رکھے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

"ابھی میں اتنا بے حس نہیں ہوا ہوں۔" میں اچانک سنجیدہ ہوگیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "اس میں بے حسی والی کون سی بات ہے؟"

"شاید تم نے اس شخص کی باتیں غور سے نہیں سنیں۔" میں نے کہا "وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کا ایک اور ساتھی بھی یہیں آس پاس کہیں موجود ہے۔ انہیں ہماری گاڑی کی ضرورت ہے تاکہ فرار ہوسکیں' اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ کسی سنگین جرم میں ملوث ہیں۔"

"ہمیں ان کے جرم سے کیا لینا دینا۔" ساحل نے بیزاری سے کہا "وہ جائیں جہنم میں۔"

"وہ جہنم میں جائیں گے تو اپنے ساتھ اور بھی کئی جانوں کو مصیبت میں ڈال جائیں گے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں نے اس کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک فورویل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کھڑی دیکھی ہے اور پھاٹک والا اصل شخص کہیں نظر نہیں آرہا۔ سگنل لیمپ کی اس جرائم پیشہ شخص کے پاس موجودگی تو یہی بتاتی ہے کہ پھاٹک والا شخص اس وقت کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ ممکن ہے' اس شخص کے ساتھی نے پھاٹک والے کو اس کے کمرے میں یرغمال بنا رکھا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے!"

"ہاں واقعی' کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی "یہ بھی عین ممکن ہے' تارا اور اس کے خیرخواہ ہماری تلاش میں یہاں پہنچ جائیں۔ اس امکان کو نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا نا؟"

میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" پھر پوچھا "تو کیا ہم پھاٹک والے کو اس حال میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں؟"

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "میں بہت جلد' اس شخص سے "ملاقات" کرکے واپس آتا ہوں پھر ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس شخص کو تم اسی گاڑی میں لے آؤ۔" ساحل نے تجویز دی "ہماری گاڑی سڑک سے ہٹ کر کھڑی ہے۔ گاڑی کے اندر گن پوائنٹ پر اس سے ہر بات پوچھی جاسکتی ہے اور اگر کسی ہنگامی حالت میں ہمیں آگے بھی بڑھنا پڑ گیا تو ہمارے لیے بہت آسانی رہے گی۔"

ساحل کی تجویز میرے دل کو لگی۔ اس نے بڑی ذہانت کی بات کی تھی اور یہ ذہانت برمحل تھی۔ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا "تم ایک عقل مند لڑکی ہو!"

"صرف عقل مند؟" وہ شرارت سے مجھے گھورنے لگی۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلا کر کہا "تم عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ عقل بند بھی ہو۔"

وہ چونک کر بولی "یہ عقل بند کیا ہوتا ہے؟"

"دوسروں کی عقل بند کرنے والے کو "عقل بند" کہتے ہیں۔"

"میں نے تو کسی کی عقل' بند نہیں کی۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

میں نے پوری دیانت داری سے کہا "میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا ساحل! تم اتنی حسین' اتنی متین اور اتنی ذہین ہو کہ کسی بھی عقل مند کے ہوش اڑا سکتی ہو' اس کی عقل کو بند کرسکتی ہو۔ تمہارے پاس حسن کا حادو ہے اور تم اس جادو کا استعمال بھی جانتی ہو۔"

میں روانی میں بتا گیا' کیا کیا بول گیا تھا۔ ساحل نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور شرارت آمیز انداز میں بولی "میں تو اس وقت مانوں گی جب یہ جادو تم پر اثر دکھائے گا!"

"میں اس بندے کو لے کر آرہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں پجارو سے نکل آیا۔

اپنے عقب میں مجھے ساحل کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ہنسی میں بڑی نغمگی تھی' اس کی آواز میں بڑا ترنم تھا۔ وہ بولتی تھی تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ قدرت نے اسے حسن' نزاکت اور ذہانت سے خوب نواز رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چت کبرے چہرے والا دراز قامت شخص ہماری پجارو میں موجود تھا۔ اس مرتبہ ساحل پسنجرز سیٹ پر آگئی تھی اور میر بخش اس شخص کے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں چلا گیا تھا۔ میر بخش نے اس دھبے دار شخص کو پجارو کے فرش پر سیٹوں کے درمیان لٹالیا اور کلاشنکوف کے بجائے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں نے گردن موڑ کر اس شخص سے پوچھا "کون ہو تم؟"

جواب دینے کے بجائے وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مختلف قسم کے تاثرات آپس میں گڈمڈ ہورہے تھے۔ مجھے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ بہت خوف زدہ ہے اور مجھ سے رحم کی اپیل کررہا ہے۔ کبھی ایسا لگتا' وہ عیاری سے بچ نکلنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ کسی موقع کی تاک میں ہے تاکہ بازی پلٹ سکے۔

میر بخش نے اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم سائیں کے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو ورنہ پھر مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"بھگوان کے لیے مجھے زندہ چھوڑ دو۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولا "میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔"

اس شخص کے پہلے جملے نے ہم تینوں کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اپنی جاں بخشی کے لیے "بھگوان" کا واسطہ دیا تھا۔ یہ اس کا ایک بے اختیاری عمل تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندو تھا۔

میرا ذہن اس وقت برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میر بخش نے اس کی گردن پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا "ہم یہاں سے بہت دور تو تمہیں پہنچا ہی دیں گے کیونکہ تم سیدھی طرح زبان کھولتے نظر نہیں آرہے۔"

میں نے اپنے خدشات کی تصدیق کے لیے سرسراتی ہوئی آواز میں اس شخص سے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

میرے لہجے میں اتنی سنگینی اور سفاکی تھی کہ وہ خاموش نہ رہ سکا۔

"میں... بوٹا سنگھ ہوں۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا

"تم بوٹا سنگھ نہیں بلکہ منگل سنگھ ہو۔' میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

میر بخش نے میری بات پر ردا چڑھایا "تم ایک خطرناک ڈاکو ہو۔ تم نے اپنے ساتھی کی مدد سے ایک لڑکی کو اغوا کر رکھا ہے۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا میرا تیر تو نشانے پر بیٹھا ہی تھا'

میر بخش کے انکشافات نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں منمنایا۔

"آ... آ... آپ کو ہمارے بارے میں... کیسے پتا چلا؟"

ساحل نے نفرت سے اسے گھورتے ہوئے اس "کارِ خیر" میں اپنا حصہ ملایا "تم لوگوں نے جس لڑکی کو اغوا کیا ہے اس کا نام ممتاز ہے۔ وہ "نئی سر" کے ایک صاحب حیثیت شخص قاضی سلطان کی بیٹی ہے۔ تم نے ممتاز کی رہائی کے بدلے قاضی سلطان سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ ہمارے ان پے در پے حملوں سے بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود وحشت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے اور کچھ کہے بھی یا نہ کہے۔ بالآخر اس نے خوف زدہ نظر سے ہم تینوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کا تعلق پولیس سے ہے؟"

"ہاں۔" میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا "ہم پولیس والوں سے گہرے مراسم رکھتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم ڈی ایس پی کے پرائیویٹ بنگلے پر موجود تھے۔ یہ وہی ڈی ایس پی ہے جس کی نگرانی میں تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے "شادی پلی" کی سرحد پر ناکا لگایا گیا ہے۔"

اس کی بلیک اینڈ وہائٹ صورت پر سرسوں پھول گئی۔ میں نے اس کے چہرے کو بلیک اینڈ وہائٹ اس لیے کہا ہے کہ رنگ تو اس کا گندمی تھا تاہم بھلبھری کے سفید رھبوں کی وجہ سے وہ سیاہ نظر آتا تھا۔ یہ بھی ایک بہت عجیب و غریب اور گنا مرض ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ سب سے خطرناک اور کریہہ الذکر وہ قسم ہے جو بالآخر کوڑھ (جزام) میں بدل جاتی ہے۔ انسانی جلد پر نمودار ہونے والے یہ سفید دھبے دبے پاؤں اپنا کام دکھاتے ہیں اور مریض بے خبری میں مارا جاتا ہے۔ ان دھبوں کا پھیلاؤ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے لیکن چونکہ ان میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس لیے مریض زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ یہی سوچتا ہے' زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ یہی ہوگا نا کہ میرا پورا وجود سفید ہوجائے گا۔ ہوجائے! وہ ہم کراس مرض کا علاج نہیں کرواتا اور ڈاکٹر تبدیل کرتا رہتا ہے۔ بالآخر ایک روز اسے بڑے بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

گزرے زمانوں میں کوڑھ کے مریضوں کو شہر سے باہر ویران کھنڈروں اور غاروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ صحت مند لوگ کسی قسم کے وبائی حملے سے محفوظ رہیں۔ اس مرض میں مبتلا شخص کی ہڈیاں اندر ہی اندر گھل جاتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

اب اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ خطرناک ڈاکو منگل سنگھ اس وقت ہمارے رحم و کرم پر تھا اور ممتاز نامی وہ اغوا شدہ لڑکی منگل سنگھ کے ساتھی گنڈا سنگھ کی کسٹڈی میں تھی۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر منگل سنگھ سے پوچھا۔

"ممتاز کہاں ہے؟"

اس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا تو میر بخش نے اپنے پاؤں کو اس کی گردن پر اس طرح مسلا جیسے کوئی سگریٹ نوش ختم شدہ سگریٹ کے ٹوٹے کو مسلتا ہے۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ تاہم منگل سنگھ کی کراہ پیچارو سے باہر نہ جا سکی۔

میں نے میر بخش کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ ماری اور گمبھیر لہجے میں کہا "اگر اب منگل سنگھ نے میرے کسی بھی سوال کا جواب دینے میں پس و پیش سے کام لیا تو تم بلا دریغ فائر کر دینا۔"

اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ منگل سنگھ خوف کی شدت سے تھرتھرانے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "مہاراج! مجھے چھما کردیں۔ میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں' آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔"

"ہمیں سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "بس تم سے جتنا پوچھا جائے' اس کا جواب دو۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "اور یہ تم بار بار بھگوان کو بیچ میں نہ لاؤ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا شخص مستند جھوٹا ہوتا ہے۔"

"پھر آپ کو میری بات کا یقین کیسے آئے گا؟"

میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا "میں نے بتایا ہے نا' قسم یا سوگند کسی شخص کے سچا ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ عام طور پر وہی افراد زیادہ قسمیں اٹھاتے ہیں جنہوں نے کسی جھوٹ کو چھپانا ہوتا ہے۔ جھوٹے اور مکار افراد اپنے مفاد کی خاطر کھوکھلی قسموں کا سہارا لے کر خدا' بھگوان' ایشور اور لارڈ آف لارڈز کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔"

الحمدللہ میں ایک مسلمان ہوں اور ایک خدا پر یقین کامل رکھتا ہوں۔ وہ خدا جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ منگل سنگھ سے بات کرتے ہوئے میں نے آخری جملہ محض خانہ پری کے لیے ادا کیا تھا۔ اس دنیا میں بسنے والے

انسانوں کے مجموعی اور انفرادی تاثر' نظریات اور خیالات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا!

منگل سنگھ میری ڈانٹ پھٹکار اور میر بخش کی دھونس سے راہ راست پر آگیا۔ میں نے اسے آمادہ تعاون دیکھا تو اپنا سوال دہرا دیا "ممتاز کہاں ہے؟"

"وہ گنڈا سنگھ کے پاس ہے۔" اس نے بتایا۔

"اور وہ پاز سنگھ کہاں ہے؟"

"ادھر ریلوے کوارٹر میں۔" اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے بتایا۔

میں نے پوچھا "اس کوارٹر میں اور کون کون موجود ہے؟"

"گنڈا سنگھ اور ممتاز کے علاوہ پھانک والا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

وہ بڑی شرافت سے میرے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ جب کسی کی جان پر بن آئے تو بڑے سے بڑا "غیر شریف" انسان بھی شرافت کے مظاہرے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

میں نے کہا "پھانک والے ریلوے ملازم کو تم لوگوں نے یرغمال بنا رکھا ہے!"

"ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔" اس نے بتایا۔ میر بخش نے اس کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ قدرے کم کردیا تھا چنانچہ وہ بے آسانی بول رہا تھا۔ اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "اچانک ہماری جیپ میں کوئی پیچیدہ قسم کی خرابی پیدا ہوگئی جو باوجود کوشش کے بھی ہم سے دور نہ ہوسکی۔ ہمیں پولیس والوں کی دسترس سے نکلنے کے لیے فوری طور پر کسی گاڑی کی ضرورت تھی۔ ہم نے پھانک والے کو زیر کیا پھر پھانک بند کرکے کسی شکار کا انتظار کرنے لگے۔ اس کارروائی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے ہاتھ میں سگنل لیمپ بھی اٹھالیا تھا۔"

"اور پھر تمہیں شکار نظر آگیا؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور پوچھا "تم کتنی دیر سے سگنل لیمپ تھامے پھانک کے پاس کھڑے تھے؟"

"میں آپ کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھنے کے بعد ہی وہاں کھڑا ہوا تھا۔" اس نے بتایا "ویسے ہمیں یہاں پہنچے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"

میں نے پوچھا "اس کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ جو فورویہیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کھڑی ہے' تم لوگ اسی میں یہاں تک پہنچے ہو؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

"کوارٹر میں موجود تمہارے ساتھی گنڈا سنگھ کے پاس کس قسم کا اسلحہ موجود ہے؟"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے بتایا "گنڈا سنگھ کے پاس صرف ایک رائفل ہے۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟" میر بخش نے اس کی گردن کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"بھگوان کی سو..." وہ کہتے کہتے رک گئی پھر سنبھل کر بولا "میں سچ کہتا ہوں' ہمارے پاس اسلحے کے نام پر بس یہی دو ہتھیار تھے۔ میرا ریوالور تو آپ چھین ہی چکے ہیں۔ رائفل وہاں کوارٹر میں گنڈا سنگھ کے پاس ہے۔"

میں نے ریلوے کوارٹر کی جانب نگاہ دوڑائی اور ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "تم کافی دیر سے ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ گنڈا سنگھ کو تمہاری جانب سے تشویش تو ہوگی؟"

"ہاں جی' وہ پریشان ہو رہا ہوگا۔" منگل سنگھ نے تائید کی۔

میں نے کہا "وہ تمہاری خیر خبر لینے کیوں نہیں نکلا؟"

"ہمارے درمیان یہ طے ہے کہ جب تک میں کوارٹر کے سامنے جاکر مخصوص انداز میں سیٹی نہیں بجاؤں گا' وہ کوارٹر سے باہر نہیں نکلے گا۔" منگل سنگھ نے بتایا "چاہے مجھے کتنی بھی دیر ہوجائے۔ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔ میں اپنے گروہ کا سردار ہوں۔ سب کو میری بات ماننا پڑتی ہے۔"

"تم ایک ایسے گروہ کے سرغنہ ہو جو صرف ایک فرد پر مشتمل ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یعنی بائیس سالہ گنڈا سنگھ۔ تمہارے گروہ کے تین افراد تو پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے' جب کنڑی میں پولیس نے تمہارے ڈیرے پر چھاپا مارا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

وہ حیرت سے بھرپور نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا "آپ کو تو ایک ایک بات معلوم ہے۔"

"ہمیں ایک ایک نہیں بلکہ آدھی آدھی اور چوتھائی چوتھائی بات بھی معلوم ہے۔" میں نے رعب دار لہجے میں کہا "تم کسی غلط فہمی میں رہتے ہوئے غلط بیانی سے کام لینے کی کوشش نہ کرنا منگل سنگھ۔"

اس نے پوچھا "آپ ہیں کون لوگ۔ آپ پولیس والے تو نہیں لگتے!"

میں نے کہا "ہم پولیس والے نہیں لگتے بلکہ ہم پولیس والوں کے بہت کچھ لگتے ہیں۔"

"میں سمجھ نہیں سکا۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"میں سمجھاتا ہوں منگل سنگھ۔" میں نے اس کے غبارے کی ساری ہوا خارج کرتے ہوئے کہا "تم نے قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو اغوا کرکے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ سلطان نے تمہارے مطالبے اور دھمکی میں آئے بغیر پولیس والوں سے رابطہ کیا۔ ایس پی عمرکوٹ سے اس کی گہری شناسائی بلکہ رشتے داری ہے۔ اسی لیے ایس پی کے حکم پر ایک ڈی ایس پی نے ناکا لگا کر تمہاری گرفتاری کا اہتمام کیا تھا۔ بس تم یوں سمجھو کہ ہم ایس پی عمرکوٹ کے خاص بندے ہیں۔"

اس کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ میں نے اے ایس آئی جمشید احمد' تھانا انچارج شادی پلی اور ہوس پرست مرشی ڈی ایس پی سے حاصل ہونے والی مفید معلومات سے منگل سنگھ کو مشکل میں ڈال دیا۔ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے بتا چکا تھا کہ جب تک وہ بھانک والے کے کوارٹر کے سامنے جاکر مخصوص انداز میں سیٹی نہیں بجائے گا' اس کا ساتھی گنڈا سنگھ اپنے طور پر کوئی کارروائی کرے گا اور نہ ہی وہ کوارٹر سے باہر آئے گا اس لیے میں مغویہ ممتاز اور یرغمالی پھانک والے کی طرف سے بے فکر ہوگیا۔ ہم پجارو میں بیٹھے جس انداز میں گفت و شنید کر رہے تھے وہ خاصا محفوظ طریقہ تھا۔ پاس سے گزرنے والی کوئی گاڑی ہماری وجہ سے تشویش میں مبتلا نہیں ہوسکتی تھی۔ ممتاز اور پھانک والے کی جان کی سلامتی کا یقین مجھے منگل سنگھ سے بات چیت پر اکسا رہا تھا۔

میں نے سخت لہجے میں اس سے سوال کیا "جو ٹویوٹا جیپ کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ خراب حالت میں کھڑی ہے۔ وہ بھی تم لوگوں نے کسی سے چھینی ہی ہوگی؟"

"آپ نے بالکل درست کہا ہے۔" اس نے تصدیق کی "ایک سال پہلے میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک برات کو لوٹا تھا۔ لوٹ کے مال میں یہ جیپ بھی شامل تھی۔ اس وقت سے یہ میرے پاس ہے مگر اس وقت مجھے اس کی اشد ضرورت نکلی تو اس نے جواب دے دیا۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا "بس جی' سارا مقدر کا کھیل ہے۔"

"کبھی تھانا' کبھی جیل ہے۔" مبر بخش نے طنزیہ لہجے میں نکڑا چسپاں کیا۔

میں نے کہا "منگل سنگھ! میری معلومات کے مطابق تم ممتاز کو اغوا کرکے "نبی سر" سے اپنے ڈیرے واقع کنری لے گئے تھے۔ پولیس والوں نے وہاں ریڈ کیا تو تم ایک خون ریز مقابلے کے بعد کنری سے عمرکوٹ کی طرف نکل گئے پھر پولیس کی ہائی کمان کو خفیہ اطلاع ملی کہ گزشتہ رات (اب چونکہ ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا اس لیے پچھلی شب کو گزشتہ رات کہا جاسکتا تھا) تم مغویہ اور اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک جیپ میں عمرکوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانے والے ہو۔ تمہیں ضلعی سرحد کو شادی پلی کے مقام سے عبور کرنا تھا اسی لیے تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے وہاں ناکا لگایا گیا مگر تم تو یہاں نظر آرہے ہو۔ یہ کیا ماجرا ہے؟"

منگل سنگھ ایک خطرناک مجرم اور سفاک ڈاکو تھا لیکن اس وقت اس کی گردن تیز دھار تلوار پر دھری تھی اس لیے اپنی جان کی سلامتی کے لیے وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سے تعاون کر رہا تھا پھر ہمارے "تعارف" اور "کارکردگی" نے بھی اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اس وقت وہ ایک درندہ صفت مجرم نہیں بلکہ رحم کا اپیل کنندہ نظر آرہا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ انسان کو ہیرو سے زیرو ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

منگل سنگھ نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا "ہمارا پروگرام تو یہی تھا کہ عمرکوٹ سے سیدھے میرپور خاص کی طرف نکل جائیں گے لیکن جن دشمن سبھی کے ہوتے ہیں۔ اگر پولیس والوں کو ان کے کسی مخبر نے ہمارے منصوبے کی اطلاع پہنچادی تھی تو میرے بھی ایک "پولیس والے خیرخواہ" نے شادی پلی والے ناکے کے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے ہم عمرکوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانے والے راستے پر نہیں گئے بلکہ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم عمرکوٹ سے پہلے "ساماروں" جائیں گے پھر محمد رحیم کلری سے گزرنے کے بعد ایک نیم ہمارکچے راستے پر سفر کرتے ہوئے ضلع میرپور خاص میں داخل ہوجائیں گے لیکن اس ریلوے کراسنگ پر ہماری جیپ میں کوئی خرابی ہوگئی اور ہم نے مجبوراً پھانک والے کو زیر کرکے آپ کی گاڑی حاصل کرنے کے بارے میں سوچا اور....."

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مبر بخش بول اٹھا "اور اس سوچ پر عمل کرکے تمہیں منہ کی کھانا پڑی۔ ہے نا؟"

منگل سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! میں اس وقت آپ کے قبضے میں ہوں۔ آپ چاہیں تو میری جان بھی لے سکتے ہیں لیکن میں بنتی کروں گا کہ اگر مصالحت کی کوئی راہ نکل آئے تو....."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تعاون طلب نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوچھا "تم کس قسم کی مصالحت چاہتے ہو؟"

"آپ پولیس والے نہ سہی مگر پولیس والوں کے قریبی ہیں۔" وہ کاروباری انداز میں بولا "یہ سارا کھٹ راگ ممتاز کی تلاش اور رہائی کے لیے پھیلایا گیا ہے۔ آپ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور ہم دونوں کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دو۔"

میں نے کہا "اس ڈیل میں تو تمہارا بہت نقصان ہوجائے گا۔"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا "آپ کس نقصان کی بات کر رہے ہو؟"

"تم نے مغویہ ممتاز کی رہائی کے لیے اس کے باپ قاضی سلطان سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اگر ہم ممتاز کو یونہی سوکھے لے گئے تو یہ تمہارا نقصان ہی ہوا نا؟"

وہ بے بسی سے بولا "سائیں! جان بچی سو لاکھوں پائے۔ زندگی رہی تو میں اور کمالوں گا۔ آپ بتائیں' یہ سودا منظور ہے؟"

"تم خاصی بچکانا باتیں کر رہے ہو۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

وہ متعجب انداز میں بولا "میں نے بچوں والی کیسی کون سی بات کہہ دی؟"

"اوئے گھامڑ!" میں نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا "اس وقت تم جس طرح ہمارے چنگل میں پھنسے ہوئے ہو اس پر تمہیں شکر کرنا چاہیے کہ ابھی تک زندہ سلامت ہو۔ ہم تم دونوں کی ٹانگیں توڑ کر ممتاز سمیت اس گاڑی میں ڈال کر پولیس ہیڈ کوارٹر لے جاسکتے ہیں۔ تم یار گیسٹنگ کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہو۔ کیا سمجھے؟"

وہ حالات کی نزاکت کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا اسی لیے زیادہ چون وچرا نہیں کی اور دوستانہ انداز میں بولا "میرے پاس ایک اور پیش کش بھی ہے!"

اب میں نے اسے گھسنے کا ارادہ کرلیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اس کی باتیں مجھے متاثر کر رہی ہوں۔ اس طرح میں اس کی رہی سہی خطرناکی سے بھی آگاہ ہوسکتا تھا۔ ممتاز اور پھانک والے کی محفوظ سلامتی کے لیے منگل سنگھ کو ہر زاویے سے ٹھونک بجا کر دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"منگل سنگھ! تم کیا پیش کش کرنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "میں اپنی اور اپنے ساتھی کی جان بخشی کے لیے مغویہ کے علاوہ آپ کو ایک بھاری رقم بھی دینے کو تیار ہوں۔"

"مثلاً کتنی بھاری رقم؟"

"پورے ایک لاکھ روپے نقد۔" اس نے چارا پھینکنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات سجالیے جیسے اس کی آفر میں مجھے بہت کشش دکھائی دی ہو۔ یہ وہی ڈاکو تھا جو ایک لڑکی کی زندہ واپسی کے لیے اس کے لواحقین سے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کر رہا تھا۔ اب اس کی اپنی جان شکنجے میں آگئی تھی تو وہ ان پچاس لاکھ روپوں کے مطالبے سے تو دست بردار ہو ہی رہا تھا' اس کے ساتھ ساتھ مزید ایک لاکھ روپے دینے کو بھی تیار تھا گویا اس طرح وہ بیٹھے بٹھائے اپنا اکیاون لاکھ روپے کا نقصان کر رہا تھا.... اور یہ خسارہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے برداشت کرنے کو تیار ہوا تھا۔

حضرت انسان بھی عجیب شے ہے۔ یہ مطلب براری کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ جانور کو شعور نہیں دیا گیا۔ وہ صرف اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے جائز وناجائز تگ ودو کرتا ہے مگر انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود بھی بعض اوقات بہت پستی میں چلا جاتا ہے اور کچھ ایسا کر گزرتا ہے کہ انسانیت کو اس کے کرتوت پر نادم ہونا پڑتا ہے۔

میں نے منگل سنگھ کو بدستور خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا رکھتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری یہ پیش کش منظور ہے مگر میں پہلے اپنی تسلی کروں گا۔"

"کس بات کی تسلی؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "صرف دو باتوں کی تسلی۔ نمبر ایک مغویہ صحیح سلامت ہے یا تم لوگوں نے اس کے ساتھ....."

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا "سائیں! فکر نہ کرو۔ لڑکی بالکل صحیح سلامت ہے۔ آپ اس سے بات چیت کرکے یقین کرسکتے ہیں۔ بس اتنے دنوں کی افراتفری میں اس کا لباس خاصا میلا ہوگیا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے فخریہ انداز میں اضافہ کیا "ہم جس لڑکی کو تاوان کی خاطر اغوا کرتے ہیں' اس کی عزت کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ اگر تاوان وصول ہونے کی صورت نظر آئے اور ہماری جان

جانے کا اندیشہ پیدا ہوجائے تو ہم مغوی یا مغویہ کو قتل کردیتے ہیں مگر اس کی عزت سے کھیلنا گوارا نہیں کرتے' یہ ہمارا اٹل اصول ہے۔ عیاشی کے لیے ہم دوسرے راستے اختیار کرلیتے ہیں مگر اپنے اصولوں کو نہیں توڑتے۔"

اس ڈاکو نے جو اصول بیان کیا تھا' میں نے اس کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث میں پڑے بغیر اس سے استفسار کیا "کنڑی میں پولیس مقابلے کے دوران میں تم پر ایسا وقت آیا تھا جب تمہاری جان خطرے میں پڑ گئی تھی مگر تم نے مغویہ کو قتل کرنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"ہاں' ایک بہت ہی خاص وجہ ہے۔" چت کبرے ڈاکو منگل سنگھ نے سنجیدہ لہجے میں کہا "جو لوگ اپنے تعلقات کے زعم میں ہمارا مطالبہ پورا کرنے کے بجائے پولیس کی مدد حاصل کرتے ہیں' وہ بہت جلد پولیس والوں کی جانب سے مایوس ہوکر ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں کیونکہ پولیس والے ان سے رقم تو اینٹھتے رہتے ہیں مگر کارروائی بالکل کھوکھلی کرتے ہیں۔ ان کے وعدوں سے دل برداشتہ ہوکر مغوی یا مغویہ کے لواحقین ہمارا ہر مطالبہ پورا کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں اور اس موقع پر ہم ان سے دوگنا رقم حاصل کرتے ہیں۔"

"اور اگر لواحقین کے پاس اتنی رقم نہ ہو تو؟"

"اس بات کا خیال ہم اغوا کی واردات کرنے سے پہلے خاص طور پر رکھتے ہیں۔" منگل سنگھ نے بتایا "ہم صرف مال دار اور صاحب حیثیت لوگوں پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں۔ میں جانتا ہوں' ممتاز کا باپ بہ آسانی ایک کروڑ روپے ادا کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر تو میں یہ کہوں گا کہ تمہارا ایک کروڑ ایک لاکھ روپے کا نقصان ہوگیا!"

میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے پوچھا "آپ دوسری تسلی کس بات کی کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے اسے بتایا "میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم جو ایک لاکھ روپے مجھے دو گے وہ کہیں نقلی تو نہیں؟"

"ہم کبھی اصلی اور نقلی کے چکر میں نہیں پڑتے سائیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "ہمارے پاس جو بھی رقم ہے وہ دوسروں ہی سے لوٹی ہوئی ہے۔ اب جو بھی ہو اصلی یا نقلی!"

میں نے پوچھا "کیا وہ ایک لاکھ روپے کی رقم اس وقت تمہارے لباس میں موجود ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "نہیں' رقم ہماری جیپ میں رکھی ہے۔"

"اس کی گردن پر سے پاؤں اٹھالو میر بخش!" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میر بخش نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی "تاہم اس ڈاکو کو ریوالور کے نشانے پر رکھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ منگل سنگھ نے جب مجھے آمادہ دیکھا تو دوستانہ انداز میں بولا۔

"آپ مجھے اس کوارٹر تک جانے کی اجازت دے دیں۔ میں مغویہ اور رقم کو آپ کے پاس لے آتا ہوں۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی "کیا میں شکل سے اتنا ہی احمق نظر آتا ہوں تمہیں؟"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔" دھیمے دار منگل سنگھ نے کہا۔

"تم نے واقعتاً ایسی ہی بات کی ہے منگل سنگھ!" میں نے کٹیلے لہجے میں کہا "کیا میں اتنا ہی بے وقوف ہوں کہ تمہیں بہ آسانی اس کوارٹر تک جانے کی اجازت دے دوں تاکہ تم وہاں موجود رائفل کے بل بوتے پر مجھے کم زور بنا سکو۔ تم ممتاز اور پھانک والے کی جان بھی لے سکتے ہو یا انہیں گن پوائنٹ پر رکھ کر وہاں سے فرار بھی ہوسکتے ہو!"

"میں نے جو کہا ہے اس پر عمل بھی کروں گا۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا "یہ میرا آپ سے وعدہ ہے.... ایک ڈاکو کا وعدہ۔ ہم لوگ اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے گردن تک کٹوا سکتے ہیں۔"

"لیکن میں ہرگز کوئی تجربہ نہیں کرسکتا!" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

وہ بولا "پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ آپ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر اس کوارٹر تک لے جائیں۔ میں محض مخصوص انداز میں سیٹی بجاکر اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کو کوارٹر سے باہر بلاؤں گا پھر آپ کی مرضی' جو بھی کرتے پھریں۔"

"ہاں' یہ معقول تجویز ہے۔" میں نے کہا۔

میر بخش نے پوچھا "سائیں! آپ نے کیا سوچا ہے؟"

میں نے کہا "ساحل یہیں پجارو میں موجود رہے گی۔ تم منگل سنگھ کو کلاشنکوف کے نشانے پر رکھ کر کوارٹر تک لے جاؤ گے۔ یہ وہاں پہنچ کر مخصوص انداز میں سیٹی بجائے گا پھر اس سیٹی کی آواز سن کر گنڈا سنگھ جیسے ہی کوارٹر سے برآمد ہو تم اسے بھی فائرنگ رینج میں لاسکتے ہو۔ دوران میں اگر

منگل سنگھ نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تم اسے بے دریغ گولیوں سے بھون ڈالنا۔"

یہ بات میں نے منگل سنگھ کو خوف زدہ کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ وہ کسی قسم کی مہم جوئی کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ میر بخش اس عرصے میں میرے مزاج اور طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں خوامخواہ کی خون ریزی کا قائل نہیں۔ منگل سنگھ کو گولیوں سے بھوننے والی بات کو اس نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

اس نے پوچھا "منگل سنگھ کا سدباب تو آپ نے بتادیا سائیں! لیکن اگر دروازے سے برآمد ہونے والے گنڈا سنگھ نے کسی قسم کی کوئی پھرتی دکھائی تو اس کو کس طرح کنٹرول کرنا ہوگا؟ اس کے پاس بھری ہوئی ایک رائفل بھی ہے!"

میں نے منگل سنگھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "ویسے تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ گنڈا سنگھ کوئی چالاکی دکھا سکے کیونکہ منگل سنگھ کی سیٹی سن کر وہ یہی سمجھے گا کہ سب خیریت ہے۔ بہ فرض محال' اگر اس نے اسمارٹ بننے کی کوشش کی تو میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں تم سے پہلے ہی کوارٹر کے دروازے پر پہنچ جاؤں گا۔"

ہم اس پلاننگ کے عین مطابق پجارو سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈی ایس پی والا ریوالور ساحل کے پاس ہی رہنے دیا تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں وہ اسے استعمال کرسکے۔ منگل سنگھ سے چھینا ہوا ریوالور میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ اس کے استعمال کی نوبت آئے گی۔ ابھی تک ایک بات سراسر ہمارے حق میں جارہی تھی کہ اس سڑک پر اب تک کسی بھی جانب سے کوئی گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سڑک خاصی غیر مصروف تھی۔ اب صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ کسی ٹرین کی آمد و رفت کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

ریلوے ملازم کا وہ کوارٹر پھاٹک کے نزدیک ہی ریلوے کی پٹڑی سے نشیب میں بنا ہوا تھا۔ کمرے کے سامنے ایک چھوٹا سا لان نما احاطہ بھی نظر آرہا تھا۔ کھپریل کی چھت والا وہ اکلوتا کمرا اس وقت ہم سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے دوسری جانب گھوم کر جانے کی ضرورت تھی۔ ہماری پجارو جس طرف کھڑی تھی وہاں سے کمرے کی عقبی دیوار نظر آتی تھی اسی لیے میں نے بہ آسانی منگل سنگھ کو ٹویوٹا فورو ویل ڈرائیو جیپ کو دیکھ لیا تھا۔ کمرے کی عقبی دیوار میں کوئی کھڑکی یا روشن دان موجود نہیں تھا اس لیے امید کی جاسکتی تھی کہ گنڈا سنگھ نے اپنے "مربی" کے ساتھ ہونے والی کارروائی نہیں دیکھی ہوگی۔

میں جلد از جلد اس مخمصے کو نمٹانا چاہتا تھا۔ اس بات کا خارج از امکان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ تارا اینڈ کمپنی یا کوئی پولیس والا بیدار مغز افسر ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آنکلتا۔ اس صورت میں ہماری مشکلات میں اضافہ ہوسکتا تھا۔

مجھے اس لیے بھی کوارٹر والے معاملے سے جلدی فارغ ہونا تھا کہ ساحل کو میں پجارو میں بالکل تنہا چھوڑ آیا تھا۔ اس کے پاس لاکھ ریوالور سہی مگر تھی تو وہ ایک لڑکی ہی۔ ابھی لڑائی بھڑائی کے تھلم کھلا معاملات سے اس کا ڈائریکٹ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے مارشل آرٹس اور جمناسٹک وغیرہ سیکھنے کی فرمائش کی تھی اور میں خلوص نیت سے اسے یہ فنون سکھانا بھی چاہتا تھا۔ وہ ایک قد آور اور چست و چوبند لڑکی تھی۔ بہت جلد ان فنون میں مہارت حاصل کرسکتی تھی۔ خاص طور پر مارشل آرٹس میں وہ بہت کامیاب رہتی۔ دراز قامتی اس کے لیے بہت سود مند ثابت ہوتی۔

ہم طے شدہ پروگرام کے تحت اپنی اپنی پوزیشن پر جاکر کھڑے ہوئے۔ میں نے منگل سنگھ کو سیٹی بجانے کا اشارہ کیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی پہلی دو دو انگلیوں کو منہ میں ڈالا اور زبان پر ان انگلیوں کا مخصوص دباؤ ڈالتے ہوئے سیٹی بجادی۔

وہ بہت ہی آزمائشی لمحے تھے۔ منگل سنگھ کا ساتھی گنڈا سنگھ کمرے سے نکلنے کے بعد کس ردعمل کا مظاہرہ کرتا' اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منگل سنگھ نے ہمیں اس سیٹی کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کی ہوں اور اس کی آواز کے کچھ اور ہی معنی ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہوسکتا تھا اور جو کچھ بھی وہاں پیش آتا' میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے منگل سنگھ کی زبان پر اعتبار کیا تھا' اس کی نیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نیت کو جاننے کا ابھی تک کوئی طریقہ' کوئی فارمولا ایجاد نہیں ہوا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو دنیا میں کوئی کسی سے دھوکا نہ کھاتا۔ بے شک' اللہ ہی نیتوں کے حال جاننے والا ہے!

منگل سنگھ کی مخصوص سیٹی کے جواب میں پھاٹک والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے ایک نوجوان کی صورت دکھائی دی۔ وہ یقیناً گنڈا سنگھ تھا۔ گنڈا سنگھ نے اپنے دائیں ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی۔ میں پوری

طرح کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے چوکس ہوگیا۔

گنڈا سنگھ نے اپنے سردار منگل سنگھ کو کلاشنکوف کے نشانہ پر بے بس دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ مجھے محسوس ہوا' وہ کوئی سنگین قدم اٹھانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کے رائفل والے ہاتھ میں' میں نے واضح جنبش محسوس کی تاہم میر بخش اس دوران میں نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گنڈا سنگھ کو بھی کلاشنکوف کی ہلاکت خیز فائرنگ کی رینج میں لا چکا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کرلیا کہ اگر گنڈا سنگھ کا رائفل والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا تو میں اس کا سوا ستیاناس مار کر رکھ دوں گا۔ میں ایسی آڑ میں کھڑا تھا کہ گنڈا سنگھ میری وہاں موجودگی سے بے خبر تھا۔

تاہم شانتی خیریت گزری۔ گنڈا سنگھ نے اپنے گرو کو گن پوائنٹ پر فکس دیکھ کر کسی قسم کی حماقت کا ثبوت نہیں دیا' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گنڈا سنگھ پر نظر پڑتے ہی منگل سنگھ نے اس کے لیے احکام جاری کردیا تھا۔

"گنڈا سنگھ! رائفل پھینک کر باہر آجاؤ۔"

گنڈا سنگھ کی عمر لگ بھگ بائیس سال تھی۔ وہ حسامت میں میرے اریب قریب تھا شاید اس لیے مجھ پر گنڈا سنگھ ہونے کا شبہ کیا گیا تھا۔ منگل سنگھ عمر اور قد کاٹھ میں میر بخش کے برابر تھا اور ساحل کو ممتاز سمجھا گیا تھا۔ یہ دونوں ڈاکو اور مغویہ ممتاز ہمیں ناکے پر پیش آنے والے حالات سے قطعی لاعمل تھے۔

گنڈا سنگھ نے اپنے پیر استاد کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہاتھ والی رائفل کو ایک طرف پھینک کر کمرے سے باہر آگیا۔ میر بخش نے کلاشنکوف کے اشارے سے گنڈا سنگھ کو منگل سنگھ کے قریب آنے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں سنگھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔

اس دوران میں' میں بھی دیوار کی آڑ سے نکل کر سامنے پہنچ گیا۔ منگل سنگھ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "سائیں! آپ کوارٹر کے اندر جا کر دیکھ لو۔ لڑکی وہاں موجود ہے اور صحیح سلامت بھی ہے۔ رقم نیز آپ لوگوں کو ابھی دیتا ہوں۔"

گنڈا سنگھ اس صورتِ حال سے حیرت میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بازی کس طرح پلٹ گئی تھی۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم کوارٹر کے اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لو اور فوراً آکر مجھے رپورٹ پیش کرو۔"

"جو حکم سائیں۔" وہ فرماں برداری سے بولا "ان کا کیا کرنا ہے؟" اس نے "سنگھ اینڈ کمپنی" کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے کہا "انہیں میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے منگل سنگھ والا ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ میں ان دونوں کو بغیر کسی ہتھیار' اوزار کے چٹکیوں میں مسل کر رکھ سکتا تھا لیکن خوامخواہ کی نمائشی ہنگامہ آرائی کے حق میں' میں کبھی بھی نہیں رہا۔ ریوالور کو بھی میں نے ڈاکوؤں پر رعب طاری کرنے کے لیے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

منگل سنگھ کلاشنکوف بہ دست کوارٹر کے اندر داخل ہونے لگا تو میں نے کہا "تم نے صرف مغویہ ممتاز ہی کی خیریت معلوم نہیں کرنا بلکہ پھاٹک والے ریلوے کے ملازم کی بھی خبر گیری کرنا ہے' ان دونوں کی سلامتی کے بعد ہی ہم ان سنگھوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔"

میر بخش اثبات میں گردن ہلا کر کوارٹر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ ایک بات کا میں نے اندازہ لگایا کہ کوارٹر کے اندر مغویہ اور یرغمالی آزاد حالت میں موجود نہیں تھے ورنہ گنڈا سنگھ کے کوارٹر سے باہر آتے ہی کوارٹر کے اندرونی حصے میں کسی قسم کی ہلچل کے آثار نظر آجاتے۔ اندر مکمل سناٹا اور سکون طاری تھا۔

پانچ منٹ بعد میر بخش کمرے سے باہر نکلا اور میرے پاس آکر بولا "سائیں! اندر وہ دونوں خیریت سے ہیں تاہم ان مردودوں نے انہیں اچھی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔"

میر بخش میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم نے جکڑے ہوئے مغویہ اور یرغمالی کو بتا دیا ہے کہ ان کی مصیبت ختم ہوگئی ہے اور وہ اب رہا کیے جانے والے ہیں؟"

"میں نے انہیں اچھی خاصی تسلی دے دی ہے۔" میر بخش نے بتایا۔

میں منگل سنگھ کی جانب متوجہ ہوگیا "تم نے اپنی پیش کش کی پہلی قسط تو ادا کردی یعنی ایک کروڑ روپے کا نقصان اٹھایا۔ اب دوسری قسط کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جاؤ۔ ایک لاکھ روپے کا بوجھ کب تک ساتھ ساتھ اٹھائے پھرو گے!"

وہ خاموشی کے ساتھ ٹویوٹا جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ گنڈا سنگھ دو قدم کے فاصلے سے اس کی تقلید کر رہا تھا۔ میر بخش نے مسلسل ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے معمولی سی کوئی غلط حرکت بھی انہیں ناقابلِ تلافی

نقصان سے دوچار کرجاتی۔

فورو وہیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کے نزدیک پہنچ کر منگل سنگھ نے اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میر بخش نے گرج دار آواز میں کہا "خبردار!"

منگل سنگھ کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ میکانکی انداز میں رک گیا۔ میر بخش نے خوفناک لہجے میں دریافت کیا "کیا کسی چالاکی کا ارادہ ہے۔ یاد رکھو' میں کبھی بھی نہیں رہا۔ ریوالور کو بھی میں نے ڈاکوؤں پر رعب طاری کرنے کے لیے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

منگل سنگھ کلاشنکوف بہ دست کوارٹر کے اندر داخل ہونے لگا تو میں نے کہا "تم نے صرف مغویہ ممتاز ہی کی خیریت معلوم نہیں کرنا بلکہ پھاٹک والے ریلوے کے ملازم کی بھی خبر گیری کرنا ہے' ان دونوں کی سلامتی کے بعد ہی ہم ان سنگھوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔"

میر بخش اثبات میں گردن ہلا کر کوارٹر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ ایک بات کا میں نے اندازہ لگایا کہ کوارٹر کے اندر مغویہ اور یرغمالی آزاد حالت میں موجود نہیں تھے ورنہ گنڈا سنگھ کے کوارٹر سے باہر آتے ہی کوارٹر کے اندرونی حصے میں کسی قسم کی ہلچل کے آثار نظر آجاتے۔ اندر مکمل سناٹا اور سکون طاری تھا۔

پانچ منٹ بعد میر بخش کمرے سے باہر نکلا اور میرے پاس آکر بولا "سائیں! اندر وہ دونوں خیریت سے ہیں تاہم ان مردودوں نے انہیں اچھی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔"

میر بخش میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم نے جکڑے ہوئے مغویہ اور یرغمالی کو بتا دیا ہے کہ ان کی مصیبت ختم ہوگئی ہے اور وہ اب رہا کیے جانے والے ہیں؟"

"میں نے انہیں اچھی خاصی تسلی دے دی ہے۔" میر بخش نے بتایا۔

میں منگل سنگھ کی جانب متوجہ ہوگیا "تم نے اپنی پیش کش کی پہلی قسط تو ادا کردی یعنی ایک کروڑ روپے کا نقصان اٹھایا۔ اب دوسری قسط کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جاؤ۔ ایک لاکھ روپے کا بوجھ کب تک ساتھ ساتھ اٹھائے پھرو گے!"

وہ خاموشی کے ساتھ ٹویوٹا جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ گنڈا سنگھ دو قدم کے فاصلے سے اس کی تقلید کر رہا تھا۔ میر بخش نے مسلسل ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے معمولی سی کوئی غلط حرکت بھی انہیں ناقابلِ تلافی

فورو وہیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کے نزدیک پہنچ کر منگل سنگھ نے اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میر بخش نے گرج دار آواز میں کہا "خبردار!"

منگل سنگھ کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ میکانکی انداز میں رک گیا۔ میر بخش نے خوفناک لہجے میں دریافت کیا "کیا کسی چالاکی کا ارادہ ہے۔ یاد رکھو' میں کبھی بھی نہیں رہا۔ ہوشیاری کے آثار دیکھتے ہی بے دریغ دونوں کو گولیوں میں پرو دوں گا۔ تمہارے جسموں میں اتنے سوراخ نمودار ہو جائیں گے کہ آرپار دیکھنا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔"

میں نے منگل سنگھ سے پوچھا "تم اپنی جیب سے کیا نکالنے والے تھے؟"

"چابی۔" اس نے شکست خوردہ انداز میں جواب دیا۔

"چابی!" میں نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا "کیسی چابی۔"

اس نے بتایا "ہماری گاڑی میں ایک خفیہ خانہ ہے۔ ایک لاکھ کی وہ رقم میں نے اسی خانے میں محفوظ کر رکھی ہے۔ وہ خانہ لاک ہے اور چابی سے کھلتا ہے۔"

منگل سنگھ کی اس وضاحت پر اس کا نوجوان ساتھی گنڈا سنگھ حیرت آمیز نظر سے اسے تکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ خفیہ خانے کے راز سے گنڈا سنگھ واقف نہیں تھا۔ اس خانے کا ذکر اس کے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں تھا۔

میں نے منگل سنگھ کی بات پر آنکھ بند کرکے بھروسا نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت کسی لٹے پٹے شخص کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ایسے ہارے ہوئے جواری سے بھی تشبیہ دی جاسکتی تھی اور زخمی سانپ کہنا بھی مناسب تھا۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ "ہم تو ڈوبے ہیں صنم....." کے مصداق کسی بھی قسم کی کوئی حرکت فرما سکتے ہیں۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ اس خفیہ خانے میں سے ایک لاکھ کی رقم کے بجائے کوئی ہتھیار برآمد کرلیتا اور اچانک ہم پر فائرنگ شروع کردیتا۔ ایسی صورت میں ہماری جانوں کو بے حد خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ویسے یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ چابی کا بہانہ کرکے اپنی جیب میں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے اس کا بدن ٹٹول کر اس کے پاس کسی آتشی اسلحے کی عدم موجودگی کا یقین کرلیا تھا۔ یہی کارروائی میں نے تھوڑی دیر پہلے گنڈا سنگھ کے ساتھ بھی کرڈالی تھی۔

میں نے منگل سنگھ سے کہا "تم چابی میرے ساتھی کو دے دو اور اس خفیہ خانے کی نشان دہی بھی کردو۔ رقم یہ خود ہی نکال لے گا۔"

کسی قسم کا پس و پیش کیے بغیر منگل سنگھ نے مذکورہ چابی اپنی جیب سے نکال کر میر بخش کے حوالے کردی پھر اسے بتانے لگا کہ وہ خفیہ خانہ گاڑی کے کس حصے میں واقع ہے۔ میں نے منگل اینڈ گنڈا سنگھ کو کور کرلیا اور میر بخش جیپ کی تلاشی میں مصروف ہوگیا۔

اس تلاشی کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ میر بخش نہ صرف بہ آسانی خفیہ خانے تک پہنچ گیا بلکہ اس نے منگل سنگھ کی بتائی ہوئی رقم بھی دریافت کرلی۔

منگل سنگھ نے کہا "گن کر دیکھ لو سائیں۔ پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔"

وہ استعمال شدہ نوٹ تھے۔ ان میں ایک ہزار' پانچ سو اور سو سو والے تینوں قسم کے نوٹ شامل تھے۔ میں نے انڈیا میں پانچ ہزار روپے کا نوٹ بھی دیکھا تھا مگر پاکستان میں ابھی تک مجھے ایک ہزار روپے سے بڑا نوٹ نظر نہیں آیا تھا۔ ازاں بعد میر بخش نے مجھے بتایا کہ پاکستانی کرنسی کا سب سے بڑا نوٹ ایک ہزار روپے والا ہی ہے۔

منگل سنگھ نے ہمیں جو رقم فراہم کی تھی یا یوں سمجھ لیں کہ اپنی جان بخشی کے لیے جو نذرانہ پیش کیا تھا' وہ کوئی قرض کی وصولی تو تھی نہیں جو میں ایک ایک نوٹ گن کر شمار کرتا۔ مالِ مفت' دلِ بے رحم کے مطابق اس رقم کو گنے بغیر میں نے منگل سنگھ سے کہا۔

"تم کہہ رہے ہو' ایک لاکھ ہیں تو پھر ایک لاکھ ہی ہوں گے۔"

"تم مسلمان لوگ ہم ہندوؤں پر بھروسا نہیں کرتے نا۔" وہ نیم طنزیہ انداز میں بولا "ہمیں چالاک بنیا کہتے ہو اس لیے رقم گن کر اپنی تسلی کرلیتے تو زیادہ اچھا تھا۔"

میں نے کہا "ہر قوم میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی فردِ واحد کے ذاتی کردار یا اعمال پر اس قوم کے لیے کوئی فارمولا تیار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا ہے۔ یہاں مجھے درجنوں بدکردار' کرپٹ اور جرائم پیشہ ہندو پنڈت نظر آئے ہیں۔ چند مخلص' باکردار اور مثالی ہندوؤں سے میری دوستی بھی رہی ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے میری دوستی اور تعلق کی خاطر اپنا لاکھوں کا نقصان کیا۔ اپنے ہی ہندو بھائیوں کی دشمنیاں مول لیں اور وہاں کی جنونی قسم کی مسلم کش طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ میرے نظریات اور خیالات بلکہ تجربات عام قسم کے لوگوں سے خاصے مختلف ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں'

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے یا برے اور یہ اچھے برے انسان دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انسان اچھے یا برے ہوتے ہیں اس لیے کسی قوم یا مذہب کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ کوئی بھی مذہب برائی کی تعلیم نہیں دیتا۔ دنیا میں پائے جانے والے تمام مذاہب کی تعلیمات چوری، ڈاکا، قتل و غارت گری، جھوٹ، مکاری، دل آزاری اور تخریبی کارروائیوں سے روکتی ہے۔ امن و سکون، صلہ رحمی، تعاون، مدد، مظلوم کی داد رسی، ظالم کی سرکوبی اور تمام تعمیری کاموں کی تلقین کرتی ہے۔ مذہب کسی بھی صورت انسان کو برا نہیں بناتا۔ اس کے اپنے اعمال و کردار ہی اس کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔"

منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک مسلمان اس قسم کے آزاد خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ بات آزاد خیالی کی نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی انسان کے دل و دماغ میں کتنی گنجائش ہے۔ تنگ نظر لوگ کسی بھی قوم کی بدنامی کا سبب ہوتے ہیں جب کہ وسیع النظر افراد اپنی قوم اور مذہب کا سربلند کرتے ہیں..... جن قوموں نے دنیا میں فلاح و ترقی پائی ہے ان قوموں میں وسیع دل و دماغ رکھنے والے افراد کی کمی نہیں رہی۔ فتنہ و فساد پھیلانا بہت آسان کام ہے کیوں کہ ہر تخریبی کام سہل ہی ہوا کرتا ہے۔ امن و آشتی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا سخت طلب کام ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہی ہے اور حقیقت آنکھیں بند کر لینے سے بدل نہیں جاتی۔

اس وقت دنیا میں جتنے مسلمان موجود ہیں، وہ اگر ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ایک دائرے میں کھڑے ہو جائیں تو ان کے حصار میں دنیا کی باقی تمام اقوام نظر آئیں گی۔ کسی بھی محیط، دائرے، حصار یا حدود میں موجود اشیا اس محیط، دائرے حصار یا حدود سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتیں مگر وہ ہاتھ کہاں سے آئیں جو مضبوط کڑیوں کا کردار ادا کر کے ایک ایسی پلائی ہوئی زنجیر کو تخلیق دے سکیں۔ کسی بھی زنجیر کی نام کڑیاں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ہم تو پاکستانی ہیں، افغانی ہیں، ایرانی، عراقی ہیں، شامی ہیں، مصری ہیں، عرب ہیں، عجم ہیں، کالے ہیں، گورے ہیں، مفلوک الحال ہیں، مال دار ہیں، ہم سب کچھ ہیں مگر ایک نہیں ہیں۔ ایک نہیں ہیں تو نیک نہیں ہیں۔

کاش! اے کاش! ہم کچھ بھی نہ ہوتے، صرف مسلمان ہی ہوتے!

منگل سنگھ کی حیرت رفع نہ ہو سکی تو اس نے پوچھا "سائیں! آپ اپنے حلیے سے مولوی تو دکھائی نہیں دیتے مگر باتیں بڑی عالمانہ کر رہے ہیں۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ اپنی وضع قطع سے نظر آنے والے ملا اور ایک حقیقی عالم دین میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس معاملے میں لب کشائی کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میں نے منگل سنگھ کو کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب جانا۔

وہ بولا "سائیں! میں نے تو اپنا وچن (وعدہ) پورا کر دیا۔ مغویہ ممتاز، یرغمالی پھاٹک والا اور ایک لاکھ کی رقم میں آپ کے حوالے کر چکا ہوں۔ اب آپ کی باری ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ مسلمان اپنے وچن کے پالن کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے؟"

اس نے مجھے ایک بند گلی میں گھیر لیا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ اس وقت میں فیصلے کے پھندے میں "ہاں اور نہ" کے درمیان سوالیہ نشان کی صورت جھول رہا تھا۔ میں نے اس کشمکش میں جو فیصلہ کیا وہ میرے ضمیر کی آواز تھی۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، اس چکر میں الجھے بغیر میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"منگل سنگھ! تم نے بالکل درست سنا ہے۔ ایک سچا مسلمان اپنے وعدے کو نبھانے کے لیے گردن کٹوا سکتا ہے۔"

"پھر ہمارے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟"

میرے کہا "تم دونوں یہاں سے جا سکتے ہو لیکن جانے سے پہلے تمہیں ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا سائیں؟" منگل سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے ٹویوٹا جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم لوگ گاڑی کو دھکیل کر جس طرح یہاں لائے ہو اسی طرح دھکیل کر واپس سڑک پر پہنچاؤ گے۔ میں تمہیں اس کا مناسب معاوضہ بھی دوں گا۔"

میں نے یہ بات ایک خاص مقصد کے تحت کہی تھی۔ میں کسی بھی صورت میں پھاٹک والے غریب انسان کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ گاڑی اس کے کوارٹر کی پشت سے لگی کھڑی رہتی تو اس کی پوزیشن کمزور ہو سکتی تھی۔ گاڑی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص منصوبہ ترتیب پا چکا تھا۔

منگل سنگھ نے میری بات سن کر الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا "اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"تم فائدے اور نقصان کے چکر میں نہ پڑو۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "جو میں تم سے کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔"

گنڈا سنگھ نے معلوم کرنا چاہا "آپ ہمیں اس کام کا کیا معاوضہ دیں گے؟"

"یہ کام مکمل ہونے کے بعد پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں ٹویوٹا جیپ کو دھکا لگانے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ کچھ دیر کی مشقت کے بعد وہ گاڑی کو سڑک پر، میرے مطلوبہ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دراصل سڑک سے نیچے کچا تھا اور جیپ کو میں نے ایسی پوزیشن میں کھڑا کیا تھا کہ دیکھنے میں یوں محسوس ہو، انتہائی مجبوری کی حالت میں اسے سڑک سے نیچے اتارا گیا ہو گا۔

میں جیپ سے نیچے اترا اور منگل سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اپنی ڈیوٹی انجام دے لی۔ اب تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملنا چاہیے۔"

وہ پتا نہیں، میری اس معاوضے والی بات کا کیا مطلب نکال بیٹھا، اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ اس دوران میں کلاشنکوف بردار میر بخش بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ جرائم پیشہ افراد عموماً ایسے موقع پر اپنا اس قسم کا کوئی وعدہ "ایفا" کرنے کے لیے سامنے والے کی جان لے لیتے ہیں اور اس پر احسان بھی جتاتے ہیں کہ انہوں نے اس شخص کو ایک کٹھن زندگی سے نجات دلا دی۔

میر بخش کو سامنے دیکھ کر منگل سنگھ بھی یہی سمجھا تھا کہ شاید اب دونوں کو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ ان دونوں کی ساری زندگی جرائم کی دلدل میں گزری تھی۔ وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی تھے مگر میں جرائم پیشہ تھا اور نہ ہی میرا ساتھی میر بخش اس قبیل سے تعلق رکھتا تھا۔

میں نے منگل سنگھ سے لیے ہوئے ایک لاکھ روپے کے نوٹ واپس اسے دیتے ہوئے کہا "یہ تم لوگوں کا معاوضہ ہے۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے نوٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ رقم اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "رکھ لو۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔ واقعی یہ روپے تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ نوٹ پکڑ لیے پھر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں حیرت، بے یقینی اور تشکر کے جذبات موج زن تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔

جب انسان کی سمجھ میں نہ آئے کہ اسے اپنی زبان سے کون سے الفاظ ادا کرنا چاہئیں تو پھر زبان پر تالا پڑ جاتا ہے، سمجھ سوچ ایک جگہ رک جاتی ہے اور ہونٹ تھرتھرا کر رہ جاتے ہیں۔ منگل سنگھ کے ہونٹوں میں بھی کپکپاہٹ نما جنبش ہو رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "یہ رقم میں تمہیں نئی زندگی شروع کرنے کے لیے دے رہا ہوں اور تمہاری جان اس لیے بخش رہا ہوں کہ تم نئی زندگی شروع کر سکو۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مزید کہا۔

"منگل سنگھ! جس خطرناک مرض میں تم مبتلا ہو اس کا انجام بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ اس کے علاج میں توبہ کا بڑا عمل دخل ہے..... برے کاموں سے توبہ! مجھے امید ہے، تم یہ چوری چکاری، ڈاکا زنی اور قتل و غارت گری کو چھوڑ کر ایک سیدھے سادے انسان کی طرح زندگی گزارو گے۔ یاد رکھو! وقت ہر انسان کو اچھا بننے کا کم از کم ایک موقع ضرور فراہم کرتا ہے۔ تم سمجھ لو، وقت میرے توسط سے تمہیں یہ موقع فراہم کر رہا ہے۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھانا یا اسے ضائع کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

وہ فرط جذبات سے میرے قدموں میں جھک گیا پھر گلوگیر آواز میں بولا "مہاراج آپ تو بھگوان کا اوتار ہو۔ مجھے اپنے چرنوں (قدموں) میں جگہ دے دو۔ میں ہر پاپ (گناہ) سے سچی توبہ کر لوں گا۔"

"مجھے گناہ گار نہ کرو۔" میں نے شانوں سے تھام کر اسے کھڑا کر دیا "میں ایک انسان ہوں، مجھے انسان ہی رہنے دو اور جہاں تک چرنوں میں جگہ دینے کا تعلق ہے تو فی الوقت ممکن نہیں۔ تمہارے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ جلد از جلد یہاں سے دور چلے جاؤ اور شریفانہ زندگی اختیار کرنے کی کوشش کرو۔"

وہ آب دیدہ ہو گیا۔ اس کے چت کبرے ہونٹ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔ وہ اس وقت جذبات کی شدت سے گزر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔

اس وقت ہم دونوں انسان تھے جو انسانیت کے ناتے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے صدق دل سے دعا کی۔

"اے میرے پروردگار! اس ڈاکو کو نیک دل انسان

بنادے۔ اس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لیے ہمدردی اور محبت کو جگہ دے۔ بے شک تو بہت قدرت والا ہے۔"

پھر ہم جدا ہوگئے۔ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی گنڈا سنگھ ایک کچی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے وجدان؟"

اپنے عقب میں ساحل کی چمک دار آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ ڈاکوؤں کو رخصت کرتے ہوئے ہمیں دیکھ چکی تھی۔ ہماری بے خبری میں وہ بچارو سے نکل کر وہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہو رہا ساحل۔"

"کچھ تو ہو رہا تھا۔" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی "میں نے تمہیں منگل سنگھ ڈاکو سے بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "یہ جو بھی چکر ہے اس کی پہلی قسط ختم ہوگئی اور دوسری قسط اس کوارٹر میں ہماری منتظر ہے۔" میں نے کوارٹر کی جانب اشارہ کیا "آؤ وہاں چلتے ہیں۔"

"مگر تم نے ڈاکوؤں کو جانے کیوں دیا؟"

"کیا سارے سوال یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لوگی؟" میں نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

اس نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "ممتاز تو خیریت سے ہے نا؟"

"ہم اسی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا اور کوارٹر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

وہ دونوں بھی میرے پیچھے آنے لگے۔ میر بخش کی زبانی میں مغویہ اور یرغمالی کی خیریت جان کر مطمئن ہوگیا تھا۔ جب ہم کمرے کے اندر پہنچے تو ایک تکلیف دہ منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔

وہ عام سائز کا ایک درمیانہ سا کمرا تھا جس کے ایک کونے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ چھتی نما شیلف بنے ہوئے تھے جن پر چند برتن رکھے نظر آئے۔ دوسری دیوار پر کپڑے ٹانگنے والی تین کھونٹیاں نصب تھیں۔ کمرے کے احاطے میں موجود ایک چوٹھا میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ان شواہد سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ بھانک والا وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔

کمرے میں بچھی اکلوتی چارپائی کے سرہانے کی جانب دیوار کے ساتھ تھوڑی سی جگہ خالی بچی ہوئی تھی۔ یہ دیوار اور چارپائی کے درمیان لگ بھگ تین فٹ چوڑا ایک خلا تھا اور اس خلا میں مغویہ اور یرغمالی نظر آرہے تھے۔ ممتاز کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں پاؤں میں بھی بندشیں پڑی تھیں اور منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا۔ یرغمالی کے ہاتھ پاؤں بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

بھانک والے شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ عام سی صحت کا مالک ایک دیہاتی شخص تھا جب کہ مغویہ ممتاز پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ جب میں نے بغور اس کی صورت کا جائزہ لیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں پھر جلد ہی مجھے اپنی سوچ تبدیل کرنا پڑی۔ میں نے ممتاز کو پہلے نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ معروف انڈین اداکارہ مادھوری ڈکشٹ سے گہری مشابہت رکھتی تھی۔ پہلی نظر میں یونہی لگتا تھا' وہ مادھوری ڈکشٹ ہو۔ میں نے انڈیا میں قیام کے دوران میں مادھوری ڈکشٹ کی چند فلمیں دیکھی تھیں بلاشبہ وہ ایک ذہین اور بھرپور اداکارہ تھی جسے اپنے چہرے کے تاثرات پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ ٹھاکر بھانو سنگھ اور رانی روپ متی کی حویلی میں' فارغ اوقات میں' میں مختلف فلمیں وی سی آر پر دیکھا کرتا تھا۔

میں نے میر بخش کی مدد سے مغویہ اور یرغمالی کی بندشیں کھولیں اور انہیں آزاد کردیا۔ بھانک والا شخص آزاد ہوتے ہی رونے لگا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے جو بے اختیار اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ وہ زندہ بچ سکے گا۔

ممتاز کی عمر کا اندازہ میں نے اٹھارہ اور بیس کے درمیان لگایا۔ اس کا قد پانچ فٹ دو انچ ہوگا۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ اسے نہ تو فربہ اور نہ ہی دبلا کہا جاسکتا تھا۔ اس کے بدن میں ایک خاص قسم کا تناسب تھا جو اپنے اندر بھرپور کشش رکھتا تھا۔ وہ گوری چٹی رنگت والی ایک طرح دار حسینہ تھی۔ اس وقت وہ سندھ کے روایتی لباس میں تھی جو خاصا میلا ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کھلنے کے بعد اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اب وہ خود کو خاصا ایزی فیل کر رہی تھی۔

اب میں وہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا تھا۔ ممتاز کو فی الحال میں اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں یا تو اسے اس کے والدین تک پہنچا دیتا یا پھر اس کی محفوظ واپسی کا کوئی معقول بندوبست کرتا۔ ممتاز کو چونکہ میں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اس لیے بھانک والے سے میں نے ضروری گفتگو کرلینا مناسب جانا۔

"چاچو! کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے اپنا نام انور علی بتایا۔ میں نے مزید پوچھا "چاچو انور! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" سندھی زبان میں چچا کو چاچو اور ماموں کو مامو کہا جاتا ہے۔

"سائیں! میں میرپور خاص کے علاقے "ڈگری" کا رہنے والا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

اس نے بلا کم و کاست مجھے منگل سنگھ' گنڈا سنگھ کی کارروائی کے بارے میں بتادیا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "چاچو! جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ وہ دونوں آدمی ڈاکو تھے اور اس لڑکی کو اغوا کرکے لے جا رہے تھے۔ ان کی گاڑی اچانک خراب ہوگئی تو انہوں نے تمہیں یرغمال بنالیا۔"

ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا "اگر تم کسی بھی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتے تو وہی یاد رکھو جو میں اب تمہیں بتانے والا ہوں۔ اگر تم نے اپنی عقل' استعمال کرنے کی کوشش کی تو سمجھ لینا' پولیس والے تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر اور لٹھ لے کر پڑ جائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ بندہ خاصا سمجھ دار لگتا تھا۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "اچھی طرح سمجھ گیا ہوں سائیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں وہی بیان دوں گا جو آپ پڑھائیں گے۔ میں سیدھا سادہ مانو پولیس کے چکر میں نہیں پڑسکتا۔" پھر اس نے مخصوص سندھی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے کہا "میرے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو ذہن میں بٹھالو۔" پھر میں نے تاکید کے انداز میں اسے ایک جھوٹی سچی کہانی سنائی "دو ڈاکو اپنی جیپ میں کسی لڑکی کو اغوا کرکے لے جا رہے تھے۔ ان کی گاڑی کے تعاقب میں ایک اور گاڑی بھی پیچھے چلی آرہی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ پچھلی گاڑی میں کون تھا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں بھی تم نے اپنے طور پر اندازہ لگایا ہے۔ تم کوئی بھی حتمی بات نہیں جانتے۔ تم نے جو کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آتے دیکھا' اس کے بارے میں قیاس کرلینا یعنی از خود کوئی نتیجہ اخذ کرلینا۔"

میں نے چند لمحات تک اس کے چہرے پر نظر جما کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا' وہ پوری توجہ سے میری باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "پیچھے آنے والی گاڑی والوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح آگے والی گاڑی کو روک لیں مگر

"خواب" کے موضوع پر
اردو زبان میں اپنی نوعیت
کی
منفرد کتاب
خوابوں کے اسرار
قیمت 25 روپے ❖ ڈاک خرچ 23 روپے
خوابوں کی تعبیر، ان کی حقیقت اور ان
کی افادیت کے بارے میں ایک نادر
کتاب!
کتاب کی قیمت منی آرڈر/ڈاک خرچ بذریعہ
پوسٹ آفس منی آرڈر ارسال کریں
مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 7190 ناظم آباد نمبر 4 کراچی 74600
فون: 6602661 فیکس: 6625261, 6615612
kitablat@hotmail.com
kitablat1970@yahoo.com

آگے والے کسی قیمت پر رکنے کو تیار نہیں تھے چنانچہ مجبوراً پچھلی گاڑی والوں نے اگلی گاڑی کی باڈی اور ٹائروں پر گولیاں برسانا شروع کردیں۔ نتیجے کے طور پر آگے والی گاڑی لڑکھڑائی' اس کے ٹائر پھٹ گئے اور ڈرائیور کو گاڑی سڑک سے نیچے اتارنا پڑی۔"

"مگر وہ گاڑی تو میرے کوارٹر کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی ہے؟" پھاٹک والے انور علی نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باہر کے حالات سے یکسر بے خبر تھا۔

میں نے کہا "وہ گاڑی اب تمہارے کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ نہیں بلکہ ادھر سڑک کے کنارے کچے میں آڑی ٹیڑھی کھڑی ہے۔"

اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "یہ کب اور کیسے ہوا؟"

"یہ جب اور جیسے بھی ہوا تم اس کے لیے اپنا دماغ نہ تھکاؤ۔" میں نے کہا "بہرحال' یہ حقیقت ہے کہ وہ گاڑی اب سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر تحیر آمیز لہجے میں بولا "وہ دونوں آدمی کہاں ہیں جنہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھ سے سگنل لیمپ چھین لیا تھا اور مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اپنے منہ سے کوئی آواز نکالی تو وہ مجھے قتل کردیں گے۔ ان میں سے ایک رائفل تانے ہمارے سروں پر سوار رہا اور دوسرا سگنل لیمپ لے کر باہر چلا گیا تھا؟"

"وہ دونوں آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔" میں نے انور علی کو حقیقت حال سے بے خبر رکھتے ہوئے کہا۔

ساحل اور میر بخش سمجھ گئے کہ میں کسی مصلحت کے تحت سچ میں جھوٹ کی آمیزش کررہا ہوں۔ انور علی نے جب سگنل لیمپ کا ذکر کیا تو مجھے کچھ یاد آگیا تھا۔ میں نے پھاٹک والے سے پوچھا۔

"گاڑی کافی دیر سے نہیں گزری۔ کیا اس ریلوے لائن پر بہت کم آمدورفت رہتی ہے؟"

اس نے بتایا "رات میں آخری گاڑی گیارہ بجے گزرتی ہے۔ اس کے بعد اب نو بجے آئے گی۔ ویسے اس لائن پر زیادہ رش نہیں ہوتا۔" پھر اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے انور علی؟"

اس نے سوال کیا "سائیں! آپ نے بتایا ہے کہ پچھلی گاڑی نے ڈاکوؤں والی گاڑی پر گولیاں برسائی تھیں جس کے نتیجے میں اس کے ٹائر پھٹ گئے اور سڑک سے اتر گئی۔ مگر میں نے تو فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔"

"ہم یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں فائرنگ کی آواز بھی سنائیں گے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال۔" میں واپس اپنی کہانی کی طرف آگیا "جب ڈاکوؤں والی گاڑی رک گئی تو انہوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر فرار ہی میں عافیت جانی اور مغویہ کو چھوڑ کر نو دو گیارہ ہوگئے۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی میں موجود افراد نے مغویہ کو اپنی گاڑی میں سوار کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمہاری نظر سے اوجھل ہوگئے۔"

"میں سمجھ گیا سائیں' بالکل سمجھ گیا۔" انور علی نے پر اعتماد لہجے میں کہا "میں پولیس والوں کو یہی بیان دوں گا۔"

مادھوی ڈکشٹ کی کمالی ممتاز نے سوال کیا "کیا وہ دونوں ڈاکو واقعی فرار ہوئے ہیں؟ ان کے ارادے فرار ہونے والے تو نہیں لگتے تھے۔ وہ دونوں بہت خطرناک لوگ تھے؟"

ممتاز سندھی لب ولہجے میں بہت صاف اردو بول رہی تھی۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ تعلیم یافتہ تھی۔ میں نے اس خوب صورت لڑکی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ہاں ممتاز' وہ دونوں درحقیقت فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔" میں نے ممتاز سے دانستہ جھوٹ بولا۔ وہ بھی انور علی کی طرح کوارٹر سے باہر پیش آنے والے حالات سے بے خبر تھی اور میں اسے بے خبر ہی رکھنا چاہتا تھا۔ فی الحال ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا یہی تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "جب انہوں نے دیکھا کہ وہ بری طرح ہمارے چنگل میں پھنس چکے ہیں تو انہوں نے فرار ہی میں عافیت جانی۔"

ممتاز نے استفسار کیا "آپ ڈاکوؤں کی گاڑی پر فائرنگ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"تاکہ یہ بے چارہ انور علی کسی بڑے وبال میں نہ آجائے۔" میں نے کہا "اس کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔"

"آپ کون لوگ ہو اور مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" ممتاز نے نہایت ہی اہم سوال پوچھے۔

میں نے کہا "ہم خدائی فوج دار ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔" میں نے ذرا توقف کرکے اضافہ کیا "ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کریں گے۔ تم از خود بھی اپنے گھر جاسکتی ہو۔ ویسے تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ ہماری حفاظت میں تم اپنے والدین کے پاس

پہنچو۔ تم نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھا لیے ہیں۔"

وہ احسان مندی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشکرانہ جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ ہم نے اسے ڈاکوؤں کے چنگل سے نجات دلا کر واقعی اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں آزاد ہوگئی ہوں۔"

وہ بار بار اپنی کلائیوں کو سہلا رہی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے مضبوط رسی کی بندشیں موجود تھیں۔

میں نے کہا "تم واقعی آزاد ہوگئی ہو اور اس بات کا یقین تمہیں اس وقت آئے گا جب اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔"

"مجھے تو یہ سب کچھ کسی بھیانک خواب کی طرح محسوس ہورہا ہے۔"

"بھیانک خوابوں کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ممنونیت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "آپ بتا رہے ہو' وہ دونوں شیطان کہیں بھاگ گئے ہیں مگر مجھے اب بھی ان سے خوف آرہا ہے کہ کہیں واپس نہ آجائیں۔"

"تم نے گزشتہ چند روز بس مصیبت میں گزارے ہیں یہ انہی حالات کا اثر ہے۔" میں نے کہا "ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ دونوں ڈاکو اب کبھی پلٹ کر تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا "آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں چند روز سے اس مصیبت میں گرفتار تھی۔ ہماری تو یہ پہلی ملاقات ہے۔ آپ میرے گزرے ہوئے حالات سے کس طرح واقف ہیں؟"

اس کہانی میں ایک غلطی کر بیٹھا تھا۔ بہرحال' اب اس غلطی کو نبھانا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا "واقعی میں نے آج تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتا' تم کون ہو' کہاں سے آئی ہو اور ڈاکوؤں نے تمہیں کیوں اغوا کیا تھا۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

اس کے اس جملے میں بڑی فورس تھی۔ ممتاز بولتی ہوئی آنکھوں والی ایک ذہین لڑکی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک صاحب حیثیت شخص کی اکلوتی اولاد تھی۔ حسین و جمیل تھی' تعلیم یافتہ تھی۔ یہ تمام عوامل مل کر انسان کو پُراعتماد بنا دیتے ہیں اور "اعتماد" ذہین لوگوں کا خاصہ ہے۔ میں نے ممتاز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے جواب میں کہا۔

"میں کیا نظر آنے کی کوشش کررہا ہوں!"

"جو آپ نہیں ہیں۔" وہ ٹٹولتی ہوئی نگاہ مجھ پر مرکوز کرکے بولی۔

"میں کیا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ بہت گہرے انسان ہیں۔"

"کسی کی گہرائی ناپنے کے لیے بھی کسی نہ کسی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تم ایک ہنرمند لڑکی ہو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

میں مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرے آخری جملے پر جھینپ کر اس نے نگاہ جھکالی۔ میں پھاٹک والے انور علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

"چاچو! تو بجنے میں کتنا وقت باقی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا "تم نے بتایا ہے کہ نو بجے کوئی گاڑی وہاں سے گزرے گی۔"

ہماری جامہ تلاشی کے نام پر ہمیں ہر شے سے محروم کردیا گیا تھا۔ اس وقت ہمارے جسموں پر لباس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گھڑی کی عدم موجودگی کے سبب وقت کا درست اندازہ نہیں ہوپا رہا تھا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ ابھی نو نہیں بجے ہوں گے۔

انور علی نے اپنی میلی کچیلی گھڑی کے ڈائل کو دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ گاڑی کی آمد میں پورا ایک گھنٹا باقی ہے۔"

بات ختم کرکے وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے چاچو' تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"سائیں! آپ تو اب یہاں سے چلے جاؤ گے۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولا "اگر وہ دونوں ڈاکو پھر اس طرف آنکلے تو میں۔۔۔؟"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ اب کبھی اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔ تم۔ بے فکر ہوکر اپنے معاملات کو جاری رکھو۔"

وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ ویسے یہ حقیقت بھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی گنڈا سنگھ انور علی کو پریشان کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں نے منگل سنگھ کی آنکھوں میں جو تاثر دیکھا تھا، اس کے آئندہ عزائم کی عکاسی کرتا تھا۔ مجھے امید نہیں، بلکہ پورا یقین تھا کہ اب وہ

دونوں سیدھی راہ اختیار کرلیں گے۔ انہیں آسانی سے چھوڑنے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نظر آئے تھے ورنہ میں گن پوائنٹ پر انہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ ممتاز کا باپ قاضی سلطان انہیں "پاکر" بہت خوش ہوتا۔ پولیس کے اعلیٰ افسر سے اس کی رشتے داری تھی۔ وہ رشتے داری کی قوت استعمال کرکے منگل سنگھ اینڈ کمپنی کو عبرت ناک سزائیں دلوا سکتا تھا مگر میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اگر کوئی برا شخص برائی کی راہ چھوڑ کر اچھائی کا راستہ اپنانا چاہتا ہو تو اس کی سابق برائیوں کو نظرانداز کرکے اس کو اس کار خیر کا موقع ضرور فراہم کرنا چاہیے۔ وہ دونوں بھی مجرمانہ زندگی سے تائب ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں ایک موقع دے دیا تھا۔ ویسے نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ مجھے دھوکا دے کر نکل گئے تھے اور آیندہ بھی انہوں نے اپنی روش کو جاری رکھنا تھا تو پھر یہ بھی ضروری تھا کہ وہ عن قریب کسی پولیس مقابلے میں عبرت ناک موت سے دوچار ہوجاتے کیونکہ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ یہ اپنے ساتھ مذاق برداشت نہیں کرتا۔

ساحل اور میر بخش بخوبی سمجھ رہے تھے کہ میں نے ان لوگوں (انور + ممتاز) سے کچھ باتیں دانستہ چھپائی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ ایک مناسب وقت تک وہ بھی اس سلسلے میں زبان نہیں کھولیں گے۔ ہم تینوں میں بڑی اچھی انڈراسٹینڈنگ پیدا ہوچکی تھی۔

میر بخش نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "سائیں! یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ ہمیں فوراً روانہ ہوجانا چاہیے۔"

"میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ساحل نے تائیدی انداز میں کہا "ہمیں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے اور اب ہم۔ میرپور خاص کے بجائے "نبی سر" کی طرف جائیں گے۔ پہلے اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچائیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناوجدان!؟"

ساحل سے بھی وہی غلطی ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ ممتاز نے نبی سر کے الفاظ پر چونک کر ساحل کو دیکھا پھر پوچھا "تمہیں کیسے معلوم کہ میں نبی سر میں رہتی ہوں؟"

میں نے تو بہت خوب صورتی سے اپنی غلطی کو نبھالیا تھا لیکن ساحل بوکھلا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ممتاز کا سوال تھا ہی اتنا بروقت اور چبھتا ہوا۔

میں نے فوراً ساحل کی مدد کرتے ہوئے کہا "ہم کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے' یہ تمام باتیں گاڑی میں بیٹھ کر بھی ہوسکتی ہیں۔ باہر ہماری پجارو کھڑی ہے۔"

پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کوارٹر کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ممتاز ہمارے ساتھ چلتے ہوئے بولی "میں آپ دونوں کے ناموں سے تو واقف ہوچکی ہوں۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ وجدان ہو۔ آپ کا ساتھی میر بخش ہے اور اس لڑکی کا نام...؟"

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "ہماری ساتھی کا نام ساحل ہے۔"

"میرا نام ممتاز ہے۔" جب ہم کوارٹر سے نکل کر سڑک پر پہنچے تو سابق مغویہ نے اپنا تعارف پیش کیا "میں "نبی سر" کی ایک معروف شخصیت قاضی سلطان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا ماموں ایک بہت بڑا پولیس افسر ہے۔"

میری معلومات کے مطابق قاضی سلطان کی کسی بڑے پولیس افسر سے رشتے داری تھی۔ اب ممتاز بتا رہی تھی کہ وہ اعلیٰ پولیس افسر اس کا ماموں تھا۔ میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

"کیا تم واقعی کسی بڑے پولیس افسر کی بھانجی ہو؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں' ایس پی صاحب میرے سگے ماموں (ماموں) ہیں۔"

یہ ایک اور انکشاف انگیز بات تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میر بخش سے کہا "میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر پجارو کی طرف جارہا ہوں۔ تم اپنی کلاشنکوف سے اس نویوٹا کو ویسا بنا دو جیسا ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے منگل سنگھ والی جیپ کی طرف اشارہ کردیا۔

میر بخش نے سرکو اثباتی جنبش دی اور فوروھیل ڈرائیو نویوٹا جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ میں دونوں لڑکیوں کے ساتھ پجارو کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ چند لمحات بعد ہمیں اپنے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ میر بخش نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جیپ کے ٹائروں کو پھاڑ دیا تھا اور ایک طرف سے اس کی باڈی کو بھی چھلنی کردیا تھا۔ منگل سنگھ کا ریوالور اور گنڈا سنگھ والی رائفل کو ہم نے ان کی جیپ ہی میں ڈال دیا تھا تاکہ کہانی میں حقیقت کے کسی رنگ کی کمی باقی نہ رہے۔ جس وقت انسان جان بچا کر بھاگ رہا ہوتا ہے تو اپنی جان کے سوا وہ ہر شے کو بھول جاتا ہے۔

ہم پجارو کے نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے ساحل اور ممتاز کو گاڑی کے عقبی حصے میں سوار کرایا اور خود ڈرائیونگ

سنبھال لی۔ میر بخش کے لیے میں نے پسنجرز سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔

ساحل نے میر بخش کی فائرنگ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تاہم موقع پر ممتاز خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وجدان! کیا یہ سب ضروری تھا؟"

"اشد ضروری!" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا "بے چارہ انور علی ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہوا۔"

اس کے بعد ممتاز نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میر بخش اپنا نمٹا کر پجارو کی طرف واپس آنے لگا۔ میں نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کردیا... اور میر بخش کے گاڑی میں بیٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔

جب وہ پجارو سے دس قدم کی دوری پر تھا تو میں نے اس کے چہرے پر کسی طوفان کے آثار دیکھے۔ وہ یک لخت مڑ کر پجارو کے عقب میں دور کہیں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ رکتا یا ایسا ممکن ہے' میں اس کے تاثرات کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیتا۔

میں بغور میر بخش کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے کی الجھن میں بہت تیزی سے ایک وحشت سی شامل ہوتی جارہی تھی۔ بے اختیار میری نگاہ ریئرویو مرر کی جانب اٹھ گئی۔ پجارو کے پہلو میں نصب وہ آئینہ بڑی وضاحت کے ساتھ عقبی منظر کی عکاسی کررہا تھا۔ پلک جھپکتے میں' میں نے میر بخش کی الجھن کا سبب جان لیا۔

ہمارے پیچھے اسی سڑک پر ریگ و غبار کا ایک طوفان اٹھتا دیکھا جارہا تھا پھر کسی گاڑی کے انجن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی' اس کے ساتھ ہی آواز پیدا کرنے والی وہ گاڑی بھی میری نظر میں آگئی۔

وہ ایک ٹویوٹا ہائی لکس تھی جو بڑی تیز رفتاری سے ہمارے عقب میں بڑھتی چلی آرہی تھی۔ گاڑی کے پچھلے کھلے حصے میں کوئی شخص کھڑا تھا۔ اس شخص نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر نصب ایک خوفناک شے پر ہمارے تھے اور وہ دھاتی شے یقینی طور پر ایک مشین گن تھی۔ موت تقسیم کرنے والی خطرناک مشین!

ٹویوٹا ہائی لکس جس ہلاکت خیز رفتار سے ہمارے نزدیک آرہی تھی' اسے نظرانداز کرنا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ اس گاڑی میں جو کوئی بھی تھا' ہمارا دوست یا خیرخواہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آرہا تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اگر اس نے ایک لمحے کی تاخیر بھی کردی تو بازی ہار جائے گا۔ یہ موت اور زندگی کی بازی تھی' بقا اور فنا کی جنگ تھی جس میں کئی انسانی جانیں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔

میں نے ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی سے گردن باہر نکالی اور میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے حلق کی پوری قوت سے چلایا "بھاگو میر بخش... جلدی' ہری اپ!"

مقناطیسیت

اس کتاب کے مطالعے سے اپنی شخصیت کی مقناطیسی قوت کو اجاگر کریں اور کامیاب زندگی گزاریں

قیمت 40 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ

کتابیات پبلشرز

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

میری پکار پر میر بخش خیالات کے بھنور سے نکل آیا۔ اس دوران میں ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے لیے پسنجرز سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ وہ کسی گولی کی رفتار سے پجارو تک پہنچا اور بجلی کی سی سرعت سے گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے ایک جھٹکے سے پجارو کو آگے بڑھادیا۔ چند لمحات میں پجارو ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

پجارو چونکہ ساکن حالت سے حرکت میں آئی تھی اس لیے اونچی رفتار پکڑنے میں اسے جو لمحے لگے اسی وقت میں ٹویوٹا ہائی لکس ہمارے بہت قریب پہنچ گئی۔ وہ اب بھی ہمارے عقب میں تھی تاہم ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا۔ یقینی طور پر متعاقب گاڑی کی رفتار ہم سے کچھ زیادہ رہی ہوگی۔ میں بیک وقت دو مقامات پر متوجہ تھا۔ بھرپور توجہ کے ساتھ ڈرائیونگ بھی کررہا تھا اور ریئرویو مرر میں اپنے پیچھے آنے والی گاڑی کو بھی نظر میں رکھے ہوئے تھا۔

ابتدا میں وہ صرف ایک گاڑی تھی' ٹویوٹا ہائی لکس۔ جس کے عقبی کھلے ہوئے حصے میں کوئی شخص گن تھامے کھڑا تھا۔ فاصلے میں تیزی سے واقع ہونے والی کمی کے باعث گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد کے ہیولے دکھائی دینے لگے۔ رفتہ رفتہ ان ہیولوں کے جلئے واضح ہوئے تو مجھے چونکنا پڑا۔ وہ چہرے میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں استادہ گن بردار شخص کو بھی میں بخوبی پہچان گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ بے اختیار ایکسی لریٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا' ایک خون ریز معرکے کا وقت آن پہنچا ہے۔

ٹویوٹا ہائی لکس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شیطان کا برادرِ خورد تارا موجود تھا۔ اس کے برابر میں پسنجرز سیٹ پر وڈیرا اکبر سومرو نظر آرہا تھا جبکہ عقبی حصے میں گن بردار وہ شخص وڈیرے کا گارڈ تھا۔ وڈیرے کے ساتھ آنے والے چار حواریوں میں سے صرف یہی شخص زندہ بچا تھا' باقی تین ڈی ایس پی کے سیکیورٹی گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ تارا وڈیرے کا مہمان تھا اس لیے میں اسے اس کے حواریوں میں شمار نہیں کررہا۔ اس کے زخمی سر پر پٹی بدستور موجود تھی۔

میری طرح میر بخش نے بھی حالات کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کرلیا۔ یقیناً خون اس کی رگوں میں اُچھل کر رہ گیا ہوگا۔ اکبر سومرو ایک طویل عرصے تک اس کا ان داتا رہا تھا تاہم حالات کی بے رحمی نے میر بخش کو وڈیرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس وقت انتہائی مستعد نظر آرہا تھا۔ کلاشنکوف کو اس نے بڑے چوکس اور ماہرانہ انداز میں ریڈی کرلیا۔

میری پوری کوشش تھی کہ دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلے میں اضافہ جاری رہے۔ ابھی تک ہم شاید فائرنگ رینج میں نہیں آئے تھے یا ممکن ہے' متعاقب دشمنوں کی کوئی مصلحت ہو۔ بہرحال' اس طرف سے فائرنگ نہیں کی گئی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فائرنگ نہیں کریں گے۔

میں نے میر بخش کے تیور دیکھ لیے تھے اس لیے گاڑی کی رفتار کو مزید بڑھاتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا "ہمارے پاس فاضل ایمونیشن نہیں ہے۔ تم ٹویوٹا فورٹی وہیل پر فائرنگ کرکے اس گن کے میگزین کو خاصی حد تک خالی کرچکے ہو لہٰذا ایک بھی گولی ضائع نہیں ہونا چاہیے!"

"سمجھ گیا سائیں!" وہ کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "ہر گولی رنگ لائے گی۔"

پجارو کے عقبی حصے میں موجود ساحل اور ممتاز اس اچانک افتاد پر سراسیمہ نظر آنے لگیں۔ دونوں لگ بھگ ہم عمر تھیں۔ حسین اور جوان بھی تھیں تاہم دونوں کے حسن اور جوانی میں علاقائی فرق تھا۔ ساحل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"یہ شیطان یہاں بھی پہنچ گئے!"

اس کی بڑبڑاہٹ میں خوف سے زیادہ جھنجلاہٹ شامل تھی۔ ممتاز نے ساحل سے پوچھا۔

"کیا تم ان لوگوں کو جانتی ہو؟"

ساحل نے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔

ممتاز نے گردن موڑ کر ٹویوٹا ہائی لکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر میری آنکھیں کوئی دھوکا نہیں کھا رہیں تو اس گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ وڈیرا اکبر سومرو بیٹھا ہے۔"

ممتاز کے جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا "تم وڈیرے کو کیسے جانتی ہو؟"

"اکبر سومرو عمرکوٹ کے ایک دور افتادہ علاقے میں رہتا ہے۔" ممتاز نے بتایا "وہ خاصا معروف اور طاقت ور وڈیرا ہے۔ بابا کی طویل عرصے سے' اس سے دشمنی چل رہی ہے۔ میں اپنے دشمن کو نہیں پہچانوں گی تو پھر کسے پہچانوں گی؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا "لیکن اس گاڑی کا ڈرائیور مجھے اس علاقے کا نہیں لگتا۔ پتا نہیں یہ شخص کون ہے اور وڈیرے کے ساتھ کیوں نظر آرہا ہے؟"

ساحل نے جلدی سے کہا "وہ تارا ہے۔ وہ شخص آج وڈیرے کا مہمان بنا ہوا ہے۔"

ممتاز نے اکبر سومرو سے شناسائی ظاہر کرکے میرے ذہن میں ہلچل مچادی پھر یہ خیال اور بھی سنسنی خیز تھا کہ اکبر سومرو ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا دیرینہ دشمن بھی تھا۔ "وڈیرا اکبر سومرو اپنے دشمن کی بیٹی کو ہمارے ساتھ دیکھ

میرے خیالات کو ممتاز کی آواز نے تہ و بالا کردیا۔ وہ چیخ رہی تھی "وجدان! تم وڈیرے کی گاڑی کو اپنے عقب میں دیکھ کر بڑی تیزی سے وہاں سے فرار ہوئے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تم لوگوں کا بھی دشمن ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"اکبر سومرو سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔" میں نے کہا "ہمارا جھگڑا اس کے مہمان تارا نامی اس شخص سے ہے جو ٹویوٹا ہائی لکس کی ڈرائیونگ سیٹ پر تمہیں نظر آرہا ہے۔"

"تم لوگوں کے درمیان کس قسم کا جھگڑا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

میں ممتاز کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیونکہ اسی لمحے متعاقب گاڑی سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ دونوں لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں اور فطری ردِعمل کے طور پر وہ نیچے جھک گئیں۔

میں نے پجارو کو فائرنگ سے بچانے کے لیے تھوڑی جھنجلاہٹ بازی دکھائی۔ نتیجے میں وہ ذرا سا لہرائی۔ لڑکیاں ایک بار پھر چیخ اٹھیں۔ میں نے اسٹیئرنگ وہیل پر گرفت قائم رکھتے ہوئے لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم دونوں سیٹوں کے درمیان گاڑی کے فرش پر لیٹ جاؤ۔ دبک کر بیٹھ جاؤ۔ گاڑی کو خطرناک جھٹکے بھی لگ سکتے ہیں۔"

ان دونوں نے خاموشی سے میرے احکام کی تعمیل کی۔

میر بخش نے کہا "سائیں! "سامارو" یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے' اس سے پہلے ہی کرنا ہے۔"

"تم ٹویوٹا ہائی لکس کو تعاقب سے روکو۔" میں نے کہا "میں گاڑی کی رفتار بڑھا کر ان سے دور نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"متعاقب خطرناک حد تک رفتار کو بڑھا رہے ہیں۔" میر بخش نے کہا "ہم زیادہ دیر تک ان کی فائرنگ رینج سے باہر نہیں رہ سکتے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' انہیں جلد از جلد تعاقب سے روکنا ہے۔"

"سائیں!" میر بخش سنجیدگی سے بولا "انہیں روکنے کے لیے فائرنگ بہت ضروری ہے۔"

"پر وانہیں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ناگزیر کام ہر صورت میں ہونا چاہیے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ دنیا کی کوئی دلیل انہیں قائل نہیں کرسکتی۔ وہ صرف جوتے کی زبان سمجھتے ہیں۔"

میر بخش مسرور لہجے میں بولا "یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں۔ وڈیرا اکبر سومرو واقعی ایک بھوت ہے۔ بہت بڑا بھوت اسی لیے وہ خود کو بھوتار کہلاتا ہے۔ اس کو اتنی لاتیں اور جوتے پڑنے چاہئیں کہ وہ باتوں کے قابل نہ رہے۔"

میرا اشارہ درحقیقت تارا کی جانب تھا مگر میر بخش اسے اپنے دل کی بات سمجھتے ہوئے وڈیرے کی طرف لے گیا۔ میں نے کہا "کس کے قابل نہ رہے؟ باتیں کرنے کے یا باتیں سننے کے؟"

"دونوں کے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "میں نے خون خرابے سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کرلی مگر یہ حرامی خون تارا اپنی تمام تر خرابیوں کے ساتھ ہمارے تعاقب میں لگا ہوا ہے اس لیے اب خون خرابا تو ہوگا اور بہت ٹھیک ٹھاک ہوگا۔"

میرا اشارہ پاکر میر بخش نے اپنے جسم کو مخصوص زاویے پر موڑا اور کلاشنکوف کو اپنی سائیڈ والی کھڑکی سے تھوڑا باہر نکال لیا مگر ٹریگر دبانے کی نوبت نہ آئی۔ اسی وقت پجارو کا عقبی شیشہ ایک چھناکے کے بلکہ دھماکے سے چکنا چور ہوگیا۔ جدید محفوظ شیشے بڑے منفرد انداز میں ٹوٹتے ہیں۔

میر بخش کی "حرکت" کو یقینی طور پر متعاقب گاڑی کے گن بردار شخص نے نوٹ کرلیا تھا۔ اس کی کلاشنکوف سے نکلنے والی بیشتر گولیاں ضائع ہوگئیں۔ تاہم ایک آدھ پجارو کی باڈی کے عقبی حصے پر ضرور لگی تھی جس کی وجہ سے وہ شیشہ اب اپنا وجود کھو چکا تھا۔

اس فائرنگ پر دونوں لڑکیاں پھر چیخ اٹھیں۔ تاہم انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور سیٹوں کے درمیان دبکی بیٹھی رہیں۔ ان کا چیخنا ایک بے ساختہ عمل تھا اور اپنی جگہ پر جمے رہنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے حالات کی سنگینی کو خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حالات کا مقابلہ اور سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھیں۔

میربخش نے اس موقع پر ذرا بھی سستی نہیں دکھائی۔ کھڑکی سے باہر نکلی ہوئی کلاشنکوف سے اس نے متعاقب ٹویوٹا ہائی لکس پر فائرنگ کردی۔ اس نے نپا تلا نشانہ تو وڈیرے کو بنایا تھا لیکن وہ ایک متحرک ٹارگٹ تھا۔ تارا گاڑی کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے ڈرائیو کررہا تھا اس لیے وہ فائرنگ سے محفوظ رہے تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ان کی گاڑی کی رفتار قدرے کم ہوگئی جس کی وجہ سے ہمارا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے لہراتے ہوئے اس مختصر سی سڑک پر رواں دواں تھیں۔ ریلوے کراسنگ پر پہنچنے سے قبل ریلوے ٹریک' سڑک کی دائیں جانب ساتھ ساتھ متوازی چل رہا تھا۔ کراسنگ کے بعد یہی پٹری سڑک کی بائیں جانب آگئی تھی۔ تاہم اب وہ متوازی نہیں رہی تھی بلکہ بتدریج سڑک اور ریلوے ٹریک میں فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ میربخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ "سامارو" کے بعد وہ پھر متوازی ہوجائیں گی اور "کزی" کے مقام پر انہیں آپس میں مل جانا تھا۔

پجارو کا عقبی شیشہ ٹوٹنے کے باعث وہاں ایک وسیع خلا نمودار ہوچکا تھا جس کی وجہ سے ہم زیادہ غیر محفوظ ہوگئے۔ میربخش نے اس خلا کے پار ٹویوٹا ہائی لکس کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"سائیں! یہ تعاقب اگر اسی طرح جاری رہا تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔" اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

میں نے کہا "میں بھی اس "کارچیزنگ" کے حق میں نہیں ہوں۔ پجارو کے پچھلے حصے میں پٹرول سے بھرے دو چھوٹے کین موجود ہیں۔ دس لیٹر پٹرول کا یہ ننھا سا ذخیرہ ہمارے لیے موت کا پیغامبر ثابت ہوسکتا ہے۔ اس ہائی اوکٹین گیسولین کو کوئی گولی چھو کر بھی گزر گئی تو یہ گاڑی آگ کا گولا بن جائے گی پھر ہم میں سے کسی کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہو سائیں۔" میربخش نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

"میں نے ایسی کون سی ناسمجھی کی بات کردی ہے میربخش؟"

"میں آپ کی بات نہیں کررہا۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ڈرائیونگ پر ماہرانہ توجہ مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا "پھر تم کس کی بات کررہے ہو۔ کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"سائیں! میں پجارو میں موجود پیٹرول والے چھوٹے کینز کی بات کررہا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "پجارو ایک ڈیزل گاڑی ہے۔ اس کے عقب میں ڈیزل والا کین اپنے مخصوص اسٹینڈ میں موجود ہے۔ دوسری جانب فاضل اسٹپنی بھی اپنی جگہ پیوست ہے۔ یہ دونوں چھوٹے کین پجارو کا فیول نہیں ہوسکتے پھر انہیں گاڑی میں کیوں رکھا گیا؟"

میربخش کی الجھن بجا تھی۔ پجارو واقعی ڈیزل سے چلتی تھی۔ میرا دھیان پہلے اس طرف نہیں گیا تھا اور گاڑی میں موجود وہ دونوں کین دیکھ کر مجھے اطمینان سا محسوس ہوا تھا کہ چلو ہمارے پاس فاضل ایندھن تو ہے۔ بہرحال' یہ فیول پجارو میں استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے میربخش سے کہا "تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ پٹرول والے چھوٹے کین پجارو میں کیوں رکھے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ فی الوقت ہمیں جلد از جلد ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔"

"اوکے سائیں!" میربخش گہری سنجیدگی سے بولا "آپ پجارو کی رفتار کو تھوڑا کم کرکے ان کی گاڑی کو فائرنگ رینج میں لاؤ۔ میں ٹویوٹا ہائی لکس کے ٹائروں کو نشانہ بناتا ہوں۔"

میں نے کہا "ٹویوٹا ہائی لکس کو فائرنگ رینج میں لانے کا مطلب یہ ہوگا کہ پجارو بھی فائرنگ رینج میں آجائے گی۔ تمہارے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے تو دوسری طرف بھی کلاشنکوف بردار موجود ہے۔ جب دونوں گاڑیوں سے فائرنگ کی جائے گی تو نقصان بھی یقیناً دو طرفہ ہوگا۔"

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا سائیں۔"

میں نے کہا "پجارو کی پشت پر ڈیزل والا کین بھی بندھا ہوا ہے۔ ابھی تک وہ فائرنگ سے محفوظ رہا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ آئندہ بھی محفوظ رہے گا۔"

"گولی لگنے سے ڈیزل آگ نہیں پکڑے گا۔" میربخش نے گمبھیر لہجے میں کہا "اگر پجارو والا کین پھٹ گیا تو ٹویوٹا کے لیے مصیبت بن جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں' کین کو فائرنگ کی زد میں ضرور آنا چاہیے۔"

میں میربخش کی بات کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ پجارو کی پشت پر بندھے ہوئے ڈیزل کین میں اگر فائرنگ سے سوراخ ہوجاتے تو سارا ڈیزل سڑک پر بہہ جاتا جس کے سبب ٹویوٹا ہائی لکس کے ڈرائیور تارا کو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دن میں تارے نظر آجاتے۔ وہ جس رفتار سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا' چکنی سڑک کے باعث اس کا الٹنا یا کم از کم بری طرح پھسلنا لازمی تھا۔

میں نے پجارو کے عقبی حصے میں "روپوش" دونوں لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم کسی بھی صورت وہاں سے باہر نکلنے یا سر اٹھانے کی کوشش نہیں کروگی ورنہ پچھلی کھڑکی سے آنے والی گولیوں کی بوچھار تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گی۔"

"ہم تمہارے حکم کا انتظار کریں گے۔" ساحل نے مضبوط لہجے میں کہا "تم لوگ جو کچھ کرنا چاہتے ہو' کر گزرو۔"

ساحل کی آواز میں بلا کا عزم موجود تھا۔ اس بات نے مجھے بہت سکون بخشا۔ میں اس سے ایسی ہی بہادری اور جرات کی توقع کررہا تھا۔ وہ میری توقع پر پوری اتر رہی تھی۔

ممتاز نے کہا "وجدان! تارا اگر تمہارا دشمن ہے تو وڈیرا اکبر ہمارا دشمن ہے گویا وہ دونوں اجتماعی طور پر ہمارے دشمن ہیں۔ اس معرکے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم نے ڈاکوؤں کے چنگل میں اتنے دن گزار کر بہت بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔" میں نے کہا "فی الحال تم آرام کرو۔ ویسے بھی وڈیرے کو ابھی یہ بات معلوم نہیں کہ تم ہماری ہم سفر بنی ہوئی ہو۔"

پھر میں میربخش کی جانب متوجہ ہوگیا "میں ایک دو تین گنتے ہوئے اچانک پجارو کی رفتار کم کردوں گا۔ اسی مرحلے پر تم ٹویوٹا ہائی لکس کے سامنے والے ٹائروں پر فائرنگ کرنا۔"

اس نے اثبات میں گردن کو جھٹکا دیا۔ وہ اس وقت بے انتہا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

جب میں نے پہلے پہل ٹویوٹا ہائی لکس کو اپنے تعاقب میں بڑھتے دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر کوئی گن نصب ہے لیکن ازاں بعد نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ وہ گن ایک کلاشنکوف تھی جو نصب نہیں تھی بلکہ وڈیرے کے محافظ نے اسے ہاتھوں میں تھام کر کھڑکی کی پشت پر ٹکا رکھا تھا۔ میربخش نے مجھے بتایا تھا کہ "ٹویوٹا ہائی لکس" عام طور پر یہاں "پولیس موبائل" کی صورت میں استعمال ہوتی ہے یا پھر باربرداری کے لیے۔ عموماً بڑے حلے دودھ کے ڈرم ڈھونے کے لیے اس گاڑی کو استعمال کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ باربرداری کے لیے اس کے پچھلے حصے کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے جبکہ "موبائل" کی صورت میں اس حصے پر ہڈ لگا کر اندر دو طرفہ نشستیں بٹھنے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور اس کی پیشانی پر سرچ اور نیکی کھونے والی [illegible] نصب کردی جاتی ہیں۔ ہمارا تعاقب کرنے والی ٹویوٹا ہائی لکس کا تعلق کسی بھی طور پر پولیس سے نہیں تھا۔

میں نے تین تک گنتی گننے کے بعد اچانک پجارو کی اسپیڈ کم کردی۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے گاڑی کو سڑک پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا ئیڈ میں نکال لیا تھا۔ میربخش نے اس موقع پر نہایت ہی پھرتی سے متعاقب گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے فائرنگ کی۔ دوسری جانب سے جوابی فائرنگ کی گئی۔ یہ فائرنگ ہمارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ گاڑی خوفناک انداز میں لہرائی۔

یقینی طور پر پجارو کا پچھلا ٹائر برسٹ ہوگیا تھا۔ اچھلتی کودتی سرکش گاڑی کو میں نے بڑی مہارت سے کنٹرول کیا۔ ٹائر پھٹنے سے ایک زوردار دھماکا ہوا تھا جس نے گاڑی میں موجود دونوں لڑکیوں کو ایک مرتبہ پھر چیخنے پر مجبور کردیا۔ گاڑی کو مزید آگے بڑھانا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے بدقت تمام اسے کچے میں ایک طرف روک لیا۔

اسی وقت میربخش کی خوشی سے معمور آواز میری سماعت سے ٹکرائی "سائیں! وہی ہوا جس کا امکان تھا۔"

"اس میں ایسی خوشی والی کون سی بات ہے؟" میں نے گردن گھما کر عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میربخش کے جواب دینے سے پہلے ہی میں اس کی خوشی کی وجہ جان گیا۔ اسی وقت ٹویوٹا ہائی لکس کے بریک چرچرائے۔ میں نے دیکھا' وہ سڑک پر دور تک پھسلتی چلی جارہی تھی اور اس خطرناک پھسلن کا سبب وہ آئل تھا جو سڑک پر جا بجا پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے دشمنوں کی فائرنگ سے پجارو کے پیچھے فٹ ڈیزل والا کین پھٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان جو گفتگو ہورہی تھی حالات بالکل اس کے مطابق پیش آئے تھے۔

میں حیرت اور استعجاب سے پھسلتی ہوئی ٹویوٹا ہائی لکس کو دیکھنے لگا۔ وہ سڑک پر رہتے ہوئے ہم سے تھوڑی آگے نکل گئی مگر اس کی اسپیڈ اتنی زیادہ تھی کہ سنبھلنے کے بجائے وہ الٹ گئی۔ اب وہ بھی پجارو کی طرح کچے میں اتر آئی تھی لیکن پجارو کے بالعکس الٹی پڑی تھی۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ اس وقت سوچ بچار نہیں بلکہ عمل کی ضرورت تھی۔ دشمنوں کے سنبھلنے سے پہلے ہمیں ان کے سر پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے ساحل اور ممتاز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہم باہر جارہے ہیں۔ تم دونوں گاڑی میں رہو گی اور اس طرح رہو گی کہ باہر سے نظر نہیں آؤ گی۔ سمجھ گئیں؟"

ممتاز خاموش رہی۔ تاہم ساحل نے کہا "وجدان! میں بھی تمہارے ساتھ آتی ہوں۔"

"نہیں' تم وہیں زیادہ محفوظ ہو۔"

"میرے پاس بھی ریوالور ہے۔" وہ اصرار کرنے لگی "ضرورت پڑنے پر میں اسے استعمال کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ ضرورت یہاں پجارو کے اندر بھی سامنے آسکتی ہے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن میں نے حتمی انداز میں اسے خاموش کرا دیا "میں جو کہہ رہا ہوں' بس اس پر عمل کرو۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گی تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہوجائے گا۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔ میر بخش کے ساتھ پجارو سے باہر نکل آیا۔ کلاشنکوف بدستور اس کے ہاتھ میں تھی مگر میں جانتا تھا' اس ہتھیار میں بہت کم گولیاں باقی ہوں گی۔ جو ریوالور ساحل کے قبضے میں تھا وہ مرتشی ڈی ایس پی کا تھا۔ یہ اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ایک شان دار امپورٹڈ ریوالور تھا جس کی دو گولیاں میں بنگلے سے نکلتے ہوئے' جیپ کو بیکار کرنے میں استعمال کرچکا تھا۔ باقی چار گولیاں اس وقت بھی ریوالور کے چیمبر میں موجود تھیں۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے الٹی ہوئی ٹویوٹا ہائی لکس کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں کی صورتِ حالات خاصی دگرگوں تھی۔ گن بردار محافظ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ اپنی گن سمیت اس وقت گاڑی کے نیچے دبا ہوگا۔ میں نے جھک کر ڈرائیونگ کیبن کا جائزہ لیا۔ وڈیرا اکبر سومرو اور تارا اپنی نشستوں پر موجود تھے۔ تاہم وہ گاڑی میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ وہ کسی مدد کے بغیر وہاں سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ وہ زندہ تھے مگر بہت مصیبت میں دکھائی دیتے تھے۔

میر بخش نے کہا "سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں فوراً آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

"ہم آگے بڑھیں گے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

"کون سا ضروری کام سائیں؟"

"ٹویوٹا ہائی لکس کو سیدھا کرنا ہے۔"

"مم... مگر یہ تو ہمارے دشمنوں کی گاڑی ہے!" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا "میں جانتا ہوں۔ یہ دشمنوں کی گاڑی ہے اسی لیے اسے سیدھا کرنا چاہتا ہوں۔ میں دوستی اور دشمنی میں ایک سلیقے کا قائل ہوں۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں سائیں؟"

"آجائیں گی' گاڑی سیدھی ہونے کے بعد۔" میں نے ذو معنی انداز میں کہا "جب تک ٹویوٹا ہائی لکس الٹی رہے گی' تمہاری کھوپڑی بھی اوندھی ہی رہے گی۔"

میر بخش کی آنکھوں میں الجھن ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا "سائیں! لگ... کیا... کیا آپ واقعی...؟"

"ہاں' میں واقعی..." میں نے سرکواثباتی جنبش دی "اور اس کام میں ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ فکرمند ہوگیا "مگر سائیں! ہم دو افراد اتنی بھاری گاڑی کو کس طرح سیدھا کریں گے!"

میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "دو نہیں' صرف ایک فرد۔"

وہ مزید حیران ہوگیا اور وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "میر بخش! تم جاکر پجارو کا پچھلا پہیا تبدیل کرو۔ گاڑی کے عقب میں فاضل اسٹپنی موجود ہے۔ میں ٹویوٹا ہائی لکس کو دیکھتا ہوں۔"

میر بخش کی حالت اس وقت دیوانوں ایسی ہورہی تھی۔ وہ میرے حکم کی تعمیل میں وہاں سے جانا بھی چاہتا تھا اور میری کارروائی دیکھنے کے لیے وہاں رکنا بھی چاہتا تھا۔ اس کا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کررہا تھا کہ میں تن تنہا اس گاڑی کو سیدھا کروں گا۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھے بغیر تحکمانہ انداز میں کہا "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم جلدی سے پجارو کو سفر کے قابل بنا دو اور اس سے پہلے نسرک پر موجود آئل کو ریت سے ڈھک دو تاکہ کوئی اور گاڑی اس طرح پھسل کر تباہی کے دہانے پر نہ پہنچ جائے۔"

یہ ایک اتفاق تھا اور خاصا سود مند اتفاق تھا کہ ابھی تک ہمارے سوا وہاں سے کوئی اور گاڑی نہیں گزری تھی۔ ایک تو وہ صبح کا وقت تھا' دوسرے... وہ سڑک بھی کچھ زیادہ مصروف نہیں لگتی تھی۔ اس وقت ہم ریلوے کراسنگ اور سامارو کے درمیان تھے۔

میر بخش کو احکام دینے کے بعد میں "جت" ہائی لکس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ اتنی بھاری گاڑی تھی کہ میں اپنی جسمانی قوت صرف کرکے اسے سیدھا نہیں کرسکتا تھا چنانچہ اس نازک موقع پر میں نے "چی" کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میر بخش کی طرح ممکن ہے' اور بھی بہت سے افراد یہ سوچ رہے ہوں کہ میں دشمنوں کی مصیبت کو رفع کرنے میں

[illegible] لے رہا تھا۔ مجھے بچ نکلنے کا ایک اچھا موقع میسر [illegible] مجھے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ کسی [illegible] پر پہرا یا پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ تارا میرا اور اکبر [illegible] میر بخش کا دشمن تھا۔ وڈیرے کا گارڈ چونکہ اپنے مالک [illegible] حکم کا پابند تھا اس لیے وہ بھی ہمارے دشمنوں ہی میں شمار [illegible] تھا۔ اگر میں انہیں موجودہ مصیبت سے نجات دلانا چاہتا [illegible] یہ بھی ان پر میرا ایک کاری وار ہی تھا۔ مصیبت زدہ [illegible] پر احسان کرنا اسے بھری محفل میں سوجوتے مارنے سے [illegible] زیادہ موثر ہوتا ہے۔

دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ [illegible] الٹی ہوئی ہائی لکس کے پہلو میں آگیا۔ میں نے دونوں بازو [illegible] حد تک پھیلا کر اپنے ہاتھ گاڑی کی باڈی پر ٹکا دیے اور [illegible] توجہ کو گاڑی کے مرکز پر مرکوز کردیا۔ کئی سال پہلے کسی [illegible] داں نے بھاری سے بھاری چیز کو اٹھانے کے لیے [illegible] فارمولا بنایا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر اسے دنیا سے [illegible] کھڑے ہونے کی کوئی جگہ دے دی جائے اور ایسی ایک [illegible] سلاخ مہیا کی جائے جو اس کرۂ ارض کا بوجھ سہار سکتی [illegible] وہ دنیا کو اس سلاخ پر اٹھا سکتا ہے' ایک مضبوط فلکرم کی [illegible]

اس سائنس داں کے پیش کردہ "قوت' وزن اور [illegible] کے فارمولے کو آج تک غلط ثابت نہیں کیا جاسکا۔ [illegible] ٹویوٹا ہائی لکس کو "چی" کی قوت کی مدد سے سیدھا کرنا [illegible] تھا۔ "چی" کے استعمال کے لیے کسی سلاخ یا فلکرم کی [illegible] پیش نہیں آتی بلکہ اس کے لیے بنیادی طور پر صرف [illegible] اہم ہیں۔ آپ کا ارتکازِ توجہ اور مرکزِ توجہ!

میں نے ٹویوٹا ہائی لکس کے مرکز پر اپنی توجہ مرکوز کرتے [illegible] دونوں ہاتھوں کے پلش سے سیدھا کرنا شروع کردیا۔ [illegible] ذہن کا روشن حصہ کسی جنریٹر کے مانند توانائی فراہم [illegible] لگا۔ یہ میری پختہ سوچ کی توانائی تھی جو میرے بازوؤں [illegible] ہوتے ہوئے ہاتھوں کے راستے گاڑی میں منتقل ہورہی [illegible] "چی" کی قوت عملی طور پر اسی طرح کام کرتی ہے۔ اس [illegible] میرے دونوں بازو کسی کار لفٹر کے انداز میں مصروف [illegible] چند لمحات بعد گاڑی زمین سے اٹھنے لگی۔ میری جانب [illegible] دونوں پہیے رفتہ رفتہ فضا میں بلند ہونے لگے۔ میں نے [illegible] توجہ کا عمل جاری رکھا اور گاڑی کو پہلو کے بل تقریباً [illegible] حالت میں کھڑا کردیا۔ اس کے بعد میں نے سانس [illegible] کرتے ہوئے ہلکے سے پلش کے ساتھ گاڑی کو دوسری [illegible] دھکیل دیا۔

ٹویوٹا ہائی لکس نے ایک دو ہلکے پھلکے ہچکولے کھائے اور اپنے "قدموں" پر کھڑی ہوگئی۔ گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں موجود تارا اور اکبر سومرو "اپ سائیڈ ڈاؤن" کی حالت سے واپس "اپ سائیڈ اپ" کی حالت میں آگئے۔

میں ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وڈیرے کے محافظ کی جانب بڑھا۔ گاڑی الٹنے کے باعث وہ بری طرح نیچے دب گیا تھا۔ میں نے اس کے قریب جاکر بغور جائزہ لیا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھوں میں موجود تھی تاہم وہ چاروں خانے چت بے حس و حرکت پڑا تھا۔ سانس کی آمدورفت جاننے کے لیے میں اس پر جھک گیا اور بلیک جھپکتے میں مجھے معلوم ہوگیا' اس کی سانسیں پوری ہوچکی تھیں۔

اسی وقت میں اپنے عقب میں کسی کو موجود پاکر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ میں نے بڑی سرعت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ میر بخش تھا۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی اس نے کہا۔

"لگتا ہے' یہ مانو تو گیا کام سے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے تصدیق کردی "یہ اپنی آخری سانس گاڑی کے نیچے دبے دبے لے چکا۔ یوں سمجھو' دنیا کے غم و فکر سے آزاد ہوگیا۔"

"سائیں! آپ نے اس گاڑی کو...؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے میر بخش کو مزید بولنے سے روک دیا۔ وہ یقیناً یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ٹویوٹا کو کس طرح سیدھا کرلیا تھا۔ اس قسم کی حیرانی آمیز اور تعجب خیز باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا "میں نے تمہیں پجارو کا ٹائر تبدیل کرنے کو کہا تھا اور تم ابھی تک یہیں نظر آرہے ہو؟"

وہ پجارو کی جانب بڑھنے لگا تو میں نے گارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ گن تم اپنے قبضے میں کرلو۔"

میر بخش گارڈ کے ہاتھ سے گن نکالنے کے لیے آگے بڑھا پھر چونک کر میرے عقب میں دیکھنے لگا اس سے پہلے کہ میں اس کی چونکی ہوئی نگاہ کا مطلب سمجھ پاتا' اس نے ایک زوردار دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔

میں ریتیلی زمین سے ٹکرایا ہی تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میر بخش نے اس نازک موقع پر نہایت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے دھکا دیتے ہوئے وہ خود بھی زمین پر لیٹ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اس گولی کی زد میں آنے سے محفوظ رہے۔

وہ گولی یقینی طور پر ہمارے دشمنوں کی جانب سے چلائی گئی تھی۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے ٹویوٹا کی

نے خود کو پوشیدہ کر رکھا ہے۔ پتا نہیں، تم کون سی دوسری لڑکی کا ذکر کر رہے ہو!"

وڈیرا اکبر سومرو بے یقینی سے پجارو کی جانب دیکھنے لگا۔ جب اسے وہاں کچھ دکھائی نہ دیا تو الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تم ہمیں چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے پجارو کے پچھلے حصے میں دو لڑکیوں کو دیکھا ہے۔ تم مجھے جھٹلا نہیں سکتے۔ میرے سر میں کوئی چوٹ بھی نہیں لگی اور میری نظر بھی سلامت ہے۔"

میر بخش وڈیرے کی جانب سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا' اس نے اکبر سومرو کی جانب دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں کہا "سائیں! تمہاری نظر تو ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ ایسا کون ہے جس کی بہن بیٹی یا بہو تمہاری اس نظر سے محفوظ رہی ہو؟"

اپنے سابق اردلی سے چاکر کا یہ انداز گفتگو وڈیرے کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ میر بخش کو نفرت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "کتے! تم ذرا بنگلے پر تو پہنچو۔ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔"

بات ختم کرتے ہی وڈیرے نے کلاشنکوف کا رخ میر بخش کی طرف کر دیا۔ تارا مجھے پسٹل کے نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اعصاب شکن لمحات تھے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دونوں مسلح افراد میرے حملے کی رینج سے باہر تھے۔ اگر میں انہیں باتوں میں لگا لیتا تو "کارروائی" کے لیے کوئی مناسب موقع نکل سکتا تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ تارا مجھے جان سے مارنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا البتہ وڈیرے سے کچھ بعید نہیں تھا۔ میر بخش نے اس سے غداری کر کے اس کے غیظ و غضب کو بری طرح للکار دیا تھا۔

وڈیرے کے محافظ کی لاش ہم سے تھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔ میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اکبر سومرو! تمہارا یہ جاں نثار حرام موت مرا ہے جس طرح ڈی ایس پی کے بنگلے پر تمہارے تین ساتھی سیکیورٹی گارڈز کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ تم یہ پے در پے نقصانات کب تک اٹھاتے رہو گے؟"

"یہ تمام نقصانات میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائے ہیں۔" وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "تم نے ڈی ایس پی کے بنگلے پر میری ایک جیپ کو بھی بیکار کر دیا تھا لیکن فکر نہ کرو' میں نے تمہارا بہت خوب صورت بندوبست کر دیا ہے۔"

لفظ "بندوبست" پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔ میں نے اسے آمادۂ گفتگو دیکھا تو آہستہ آہستہ گھسنا شروع کر دیا۔ میں درحقیقت کسی سنہری موقع کی تاک میں تھا جب میں وہاں کی بازی کو پلٹ سکتا۔

میں نے وڈیرے کی جانب دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا "تم نے میرے لیے کون سا خوب صورت بندوبست کیا ہے؟"

وہ فخریہ انداز میں بولا "میں نے بنگلے والی کہانی کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ تم جب بنگلے سے نکل رہے تھے تو ڈی ایس پی کے باڈی گارڈ کو ہوش آ گیا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ ہم پر کلاشنکوف تان کر انکوائری شروع کرتا' ہم نے اسے گیٹ پر متعین گارڈز کے پاس دوسرے جہان میں پہنچا دیا۔"

"اور اس سے پہلے تم لوگوں نے دو سادہ پوش گھریلو ملازموں کو ڈی ایس پی کے ڈرائیور سمیت فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈز بھی تمہاری فائرنگ کا نشانہ بنے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم غلط نہیں کہہ رہے۔" اس نے تائید کی "مگر تمہاری اس درست بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہی تو مزے کی بات ہے بچے۔" وہ معنی خیز انداز میں زیر لب مسکرایا "میں نے تمہیں بتایا ہے نا' میں نے تمہارے وہاں سے نکلتے ہی بنگلے والی کہانی کو الٹا کر رکھ دیا ہے۔"

میں نے اسے باتوں میں لگانے کی خاطر پوچھا "میں سمجھ نہیں سکا ہوں' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا "اور اس لیے بھی بتاؤں گا کہ اب بہت جلد تم پولیس کی تحویل میں جانے والے ہو پھر تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی باقی زندگی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے گی۔ کیا سمجھے؟"

"وہ کس خوشی میں بھئی؟"

"خوشی میں نہیں بلکہ جرم میں۔ جرم بھی نہیں بلکہ جرائم میں!" وہ ایک مرتبہ پھر معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا "میں نے اور میرے ساتھیوں نے ایسے کون سے جرائم کیے ہیں جو ہمیں جیل کی ہوا کھانا پڑے گی؟"

وڈیرا اکبر سومرو ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا "تم نہایت ہی مشکوک اور خطرناک بندے ہو۔ تم اپنی ساتھی دھنو کے ہمراہ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے پڑوسی ملک بھارت سے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ تم پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا

شبہ ہے۔ تم نے ڈی ایس پی کے بنگلے پر حملہ کر کے اس کے باڈی گارڈ کو ہلاک کیا ہے۔ تم نے ڈی ایس پی کے ڈرائیور اور ملازموں کو بھی قتل کیا ہے۔ تم نے گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈز کو بھی مارا ہے۔ تم نے ڈی ایس پی کی بیوی اور بیٹی کو اغوا کیا ہے۔ تم نے ڈی ایس پی کی جیپ اور اسلحہ لوٹا ہے۔ تم نے ڈی ایس پی کے بنگلے پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ تم نے ڈی ایس پی کے بنگلے پر موجود میرے ساتھیوں کو بھی یرغمال بنا

ٹھپا لگانا بہت آسان ہے۔ اس کے بعد تم نے میرے ایک آدمی نواز علی کو صحرا میں قتل کر ڈالا' دوسرے آدمی میر بخش کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔" اس نے نفرت آمیز نظر سے میر بخش کو دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کمتر کمینے کا تو میں جو حشر کروں گا وہ دنیا دیکھے گی۔ نہ صرف دیکھے گی بلکہ کانوں کو ہاتھ بھی لگائے گی۔ کسی کو آیندہ غداری کا حوصلہ نہیں ہو سکے گا۔"

وڈیرے کے چہرے کے عضلات سے اندازہ ہوتا تھا وہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔ یہ میرے لیے خاصا سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ میں غصے کی حالت میں اس سے کوئی ایسی غلطی کروانے میں کامیاب ہو سکتا تھا جس سے مجھے ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع مل جاتا۔

میں نے براہِ راست وڈیرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم میرے بلکہ ہمارے جرائم گنوانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ کیا تم نے وہ ارادہ ترک کر دیا ہے؟"

وہ میرے طرزِ تخاطب پر تلملا کر رہ گیا۔ تاہم وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تمہارے جرائم کی کہانی بہت طویل ہے۔ بہرحال۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بتانے لگا "میرے آدمی میر بخش کے ساتھ مل کر تم نے عمر کوٹ میں بدمعاشی اور غنڈا گردی کی کئی وارداتیں کیں جن میں کئی افراد زخمی ہوئے۔ اس کے بعد تم میری ہی چوری شدہ بلکہ چھینی ہوئی گاڑی میں عمر کوٹ سے میرپور خاص کی طرف فرار ہو رہے تھے تو ناکے پر تم لوگ دھر لیے گئے۔ تم پر ڈاکوؤں وغیرہ کا شک کیا گیا۔ اگرچہ تم لوگ ڈاکو نہیں تھے' نہ ہی مغویہ ممتاز سے تمہارا کوئی تعلق تھا مگر تم لوگوں نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے نام اور مقامات کے بارے میں متعدد جھوٹ بولے۔ اتنی بھاری تعداد میں جھوٹ وہی لوگ بولتے ہیں جو کسی نہ کسی جرم یا جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا تو میں نے پوچھا "پھر۔ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم؟"

"جو بھی ثابت کرنا ہے وہ تو پولیس ہی کرے گی۔" وڈیرے نے حقارت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "ہم تو صرف تم لوگوں کو ان کے حوالے کریں گے اور۔ تم لوگوں میں یہ غلط اور بدبخت شخص میر بخش شامل نہیں۔" اس نے باقاعدہ انگلی سے میر بخش کی طرف اشارہ بھی کر دیا "اس حرام کے تخم کو تو میں اپنے ساتھ بنگلے پر لے جاؤں گا۔"

میں نے کہا "میں ڈی ایس پی کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کر چکا ہوں۔ وہ تو رشوت کے چکر میں ہمیں اپنے بنگلے پر لے گیا تھا ورنہ ہم قابلِ گرفت نہیں تھے۔"

"یہ تمام باتیں اب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔" وڈیرے نے تیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری کہانی تمہاری سوچ اور خیال سے بالکل مختلف ہے۔"

اس کے پُراسرار انداز نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پیشانی پر پریشانی کے تاثرات سجاتے ہوئے سوال کیا "اور وہ نئی کہانی کیا ہے؟"

"نئی کہانی یہ ہے وجدان!" تارا نے براہِ راست مجھے مخاطب کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "ڈی ایس پی کے بنگلے پر تم نے بہت اودھم مچایا ہے۔ تم نے سب سے پہلے محترم ڈی ایس پی کو بے ہوش کر کے اس کا ریوالور چھینا پھر کسی طرح اس کے باڈی گارڈ پر قابو پا لیا۔ تم جیسے بدنام زمانہ مجرم سے کچھ بھی بعید نہیں۔ تم نے گارڈ کو بے بس کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ اس دوران میں تمہارے ساتھی زیریں منزل پر اے ایس آئی عبدالرزاق سے کلاشنکوف چھین کر اسے باتھ روم میں بند کر چکے تھے۔ تم بالائی منزل پر موجود ڈی ایس پی کے ڈرائیور اور دو گھریلو ملازموں کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اس لیے فوراً ان کا کام بھی تمام کر دیا۔ بنگلے سے فرار ہوتے وقت جب گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈز نے تمہیں روکنے کی کوشش کی تو تم نے انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس فائرنگ کی زد میں ہمارے تین افراد بھی آ گئے۔ وہ وڈیرا سائیں کے بہترین ساتھی تھے۔ تم نے ان کی لاشیں گراویں اور ہماری جیپ میں وہاں سے فرار ہو گئے۔"

بات ختم کرنے کے بعد تارا نے بڑے فخر سے مجھے دیکھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ وڈیرے نے میری کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "تم ہماری ایک جیپ لے کر فرار ہو گئے اور دوسری جیپ کے پچھلے ٹائروں کو بیکار کر دیا۔ اس کے علاوہ تم نے جیپ کی باڈی پر متعدد گولیاں بھی برسائیں تاکہ ہم تمہارا تعاقب نہ کر سکیں۔"

"مگر یہ تو سب جھوٹ ہے۔" میں نے احتجاجی انداز میں کہا "ہم نے کسی ایک فرد کو بھی قتل نہیں کیا۔ بنگلے پر جو ہلاکتیں ہوئیں ان میں سراسر تم لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

تارا نے طنزیہ لہجے میں کہا "یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ تمہاری بات کا یقین کون کرے گا؟"

"میں جو بھی کہہ رہا ہوں' وہ سچ ہے' صداقت ہے۔"

"تمہارے اس سچ اور صداقت کا کوئی ثبوت نہیں۔" وڈیرا مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا "بنگلے پر صرف دو

پولیس والے زندہ بچے ہیں یعنی ڈی ایس پی اور اے ایس آئی عبدالرزاق۔ ڈی ایس پی کو ہم ہی ہوش میں لے کر آئے تھے اور اے ایس آئی کو بھی ہم نے ہی زیریں منزل کے باتھ روم سے برآمد کیا ہے۔ ہم نے انہیں جو کہانی سنائی انہوں نے اس پر یقین کرلیا۔ ڈی ایس پی بڑی سرگرمی سے تمہاری تلاش میں ہے۔ پولیس پر ہتھیار اٹھانا اور انہیں قتل کرنا انتہائی سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ اب تم اپنی پوزیشن کا خود ہی اندازہ لگالو۔"

حالات نے ہمارے خلاف سازش کا ایک ایسا نادیدہ جال بن دیا تھا جس میں ہم بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔ اگر ہمیں دوبارہ ڈی ایس پی کے حوالے کردیا جاتا تو پھر ہماری جان چھوٹنی مشکل ہوجاتی۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے' کوئی ہماری سچائی کا یقین نہ کرتا۔ ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ان خبیثوں کے چنگل سے نکل کر آگے بڑھ جاتے مگر کیسے؟ میرا ذہن بڑی تیزی سے اس سوال کا جواب تلاشنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے وڈیرا اکبر سومرو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا آپ لوگ واقعی ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بات سولہ آنے درست ہے۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

"پھر اس کے مشن کا کیا ہوگا؟" میں نے تارا کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے سوال کیا "یہ تو مجھے اپنے چوہدری کے قدموں میں ڈالنا چاہتا تھا؟"

تارا نے کہا "میرا مشن ضرور کامیاب ہوگا۔ ڈی ایس پی کے بنگلے سے میں نے فون پر چوہدری صاحب سے بات کرلی ہے۔ ہم ایک خاص مقصد کے تحت تمہیں پولیس کے حوالے کریں گے۔ تم پر اتنے سنگین مقدمات ڈال دیے جائیں گے کہ جیل سے باہر کبھی نہیں آسکو گے۔ ویسے بھی چوہدری صاحب نے تمہارا اچار یا مربّہ تو ڈالنا نہیں۔ وہ صرف تم سے سونے کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ تمہارے باپ نے چوہدری صاحب سے بھاری مالیت کا سونا چھین کر کہیں چھپا دیا تھا اور تم اس خفیہ مقام سے واقف ہو۔ چوہدری صاحب کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ ڈی ایس پی سے بھی ان کی بات ہوگئی ہے۔ تم ڈی ایس پی کے چنگل میں پھنسو گے تو ہرراز تمہاری زبان سے اگلوالیا جائے گا۔ ہمارا مقصد پورا ہوجائے گا۔ تم جاؤ جہنم میں۔ پولیس تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں!"

تارا کے انکشافات بڑے تشویش ناک تھے۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب اگر ہم پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ہمارا یادگار حشر کرسکتی تھی۔ ڈی ایس پی کے بنگلے پر ہونے والی قتل و غارت گری کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ حالات یکسر ہماری مخالفت میں جارہے تھے۔ میں نے الجھن زدہ نظر سے پجارو کی جانب دیکھا تو وڈیرے نے پوچھا۔

"دو لڑکیاں تو کجا' وہاں ایک بھی نظر نہیں آرہی۔ تمہاری زخمی ساتھی کہیں تکلیف کی شدت سے جان تو نہیں ہارگئی؟"

ممتاز اور ساحل میری ہدایت پر بڑی سختی سے عمل پیرا تھیں۔ ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے بھی اٹھ کر باہر کے حالات جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی یہ فرماں برداری ہمارے لیے کافی سود مند ثابت ہورہی تھی۔ فرماں برداری عموماً نفع بخش ہی ثابت ہوتی ہے!

تارا نے وڈیرے کی تشویش کے جواب میں کہا "سائیں! پجارو کون سی دور ہے۔ وہاں جاکر دیکھ لو' وہ لڑکیاں کہاں اور کس حالت میں چھپی بیٹھی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو تارا۔" وڈیرے نے تائید کی "اس طرح یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ دوسری لڑکی کون ہے۔"

تارا نے کہا "میں ان دونوں کو نشانے پر رکھتا ہوں۔" اس کا اشارہ واضح طور پر ہماری جانب تھا "آپ پجارو کے اندر کے حالات کی خبر لے لو پھر ہم ان سب کو لے کر یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

وڈیرے نے پجارو کی جانب قدم اٹھادیے۔

میرا ذہن برق رفتاری سے کام کرنے لگا۔ ہم نازک ترین حالات سے گزر رہے تھے۔ تارا اور وڈیرا مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ میں ان پر حملہ آور ہوکر انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میری ایسی کوئی بھی حرکت انہیں فائرنگ پر مجبور کردیتی جس میں یقیناً نقصان ہمارا ہی ہوتا۔

وڈیرے نے پجارو کی سمت دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ میر بخش اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔ وہ کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند اپنے سابق آقا کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ وڈیرا اپنے غلام کی اس حرکت پر چراغ پا ہوگیا۔ اس نے دہاڑ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"حرام زادے! ہٹ جا میرے راستے سے۔"

"تمہارا حکم سننے والے کان اب میرے پاس نہیں رہے سائیں۔" میر بخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جرات مندی سے کہا "تمہیں پجارو تک جانے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔"

وڈیرا دانت پیستے ہوئے بولا "تمہاری لاش گرانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں ابھی فائرنگ کرکے تمہارا جسم چھلنی کرسکتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔" میر بخش عجیب سے لہجے میں بولا "چلاؤ گولی۔"

مجھے میر بخش کی حماقت پر غصہ تو آرہا تھا تاہم میں اسے اس حرکت سے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جو عزم دیکھا تھا اور اس کی آواز میں جو اعتماد شامل تھا وہ کسی طوفان بلا خیز سے کم نہیں تھا۔ وہ یقینی طور پر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

وڈیرے نے تلملائے ہوئے انداز میں میر بخش کے سوال کا جواب دیا "ذلیل انسان! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی گھٹیا باتیں کرکے تم مجھے طیش دلانے میں کامیاب ہوجاؤ گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تمہیں یک مشت مارنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔ میں تو تمہیں اپنے ساتھ جاگیر پر لے جاؤں گا اور تمہارے بدن کا عضو عضو چھید چھید کر اس میں مرچیں بھروں گا۔ غداروں کو میں اتنی آسان موت دینے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میں غدار نہیں بلکہ ہیرو ہوں۔" میر بخش نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"تیرے تو ہیرو کی میں... اوں..."

وڈیرا کلاشنکوف سے میر بخش پر حملہ آور ہوا مگر اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی "ٹھک" کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور وہ "اوں" کرتے ہوئے زمین بوس ہونے لگا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگری تھی۔

تارا نے چونک کر اپنے میزبان کو دیکھا گویا ایک لمحے کے لیے وہ میری جانب سے غافل ہوگیا تھا۔ اس کی اس غفلت سے فائدہ نہ اٹھانا سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ میرے لیے وہ لمحاتی مہلت کافی تھی۔ میں نے فضا میں پرواز کی اور سیدھا تارا کے اوپر پہنچ گیا۔

تارا نے مجھے اپنے انتہائی قریب دیکھا تو ہاتھ میں پکڑا ہوا پسٹل میری جانب سیدھا کرنا چاہا مگر اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل کر میری دسترس میں آچکا تھا۔ میں نے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ایک زوردار جھپٹا مارا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے ریت پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

اس دوران میں میر بخش نے وڈیرے والی کلاشنکوف پر قبضہ جما کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔ وڈیرا اپنی بائیں کہنی تھامے زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اسی وقت ساحل پجارو سے باہر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ڈی ایس پی والا ریوالور نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ساحل ہی نے فائر کرکے وڈیرے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا تھا۔ ساحل کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ساری صورتِ حالات واضح ہوگئی۔ ساحل کی یہ کارروائی بروقت تھی۔ اس نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وڈیرے پر گولی چلائی تھی۔ اس بہادر لڑکی پر میں فخر محسوس کرنے لگا۔

اگرچہ ساحل کی چلائی ہوئی گولی نے بازی پلٹ دی تھی۔ تاہم تارا اب بھی مجھ سے زور آزمائی میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کے پسٹل والے ہاتھ کی کلائی دبوچ رکھی تھی اور وہ اپنا بازو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ وہ اس وقت میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے اس کی بغل میں ایک زوردار گھٹنا رسید کردیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔ اس کی جگہ اگر کوئی عام سا غنڈا ہوتا تو میرے گھٹنے کی طوفانی ضرب اسے تڑپنے پر مجبور کردیتی۔ تارا میں کسی سانڈ کی سی قوت بھری تھی اور وہ بے پناہ قوتِ برداشت کا بھی مالک نظر آتا تھا۔ عمر کوٹ کے ہوٹل میں' میں نے اسے جو زخم دیے تھے انہیں چاٹنے کے لیے کئی دن درکار تھے مگر وہ آندھی طوفان کی طرح اس صحرا میں میرے پیچھے چکراتا پھر رہا تھا۔

تارا نے میرے گھٹنے کی ٹھوکر کھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جواباً مجھ پر حملہ بھی کیا۔ اس نے گھٹنے فولڈ کرتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں میرے پیٹ پر جمائے اور پوری قوت سے مجھے اپنے اوپر سے دور اچھال دیا۔

میں کسی بدنصیب مظلوم کی طرح زمین پر لوٹ پوٹ نہیں ہوا بلکہ میں نے فضا میں رہتے ہوئے اپنے وجود پر توازن حاصل کرلیا اور ہوا میں رول کرتے ہوئے سیدھا اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔

تارا مجھ سے صرف تین قدم کی دوری پر زمین سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس کی یہ کوشش ناکامیاب بنادی۔ میں لیفٹ راؤنڈ ہاؤس کرتے ہوئے دو قدم اندر آیا پھر بجلی کی سرعت سے رائٹ وھیل کک اس کی کھوپڑی پر رسید کردی۔

وہ ابھی پوری طرح سنبھل کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ میری وھیل کک نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کردیا۔ اس کے ہاتھ کا پسٹل ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا اور وہ اپنے قدموں پر ڈگمگاتے ہوئے دونوں ہاتھ ہوا میں چلانے لگا۔

تارا کے سر کا عقبی حصہ پہلے ہی بری طرح زخمی تھا۔ میری دھانسو کک نے اس کے زخم کی ٹھیک ٹھاک مزاج پرسی کر ڈالی۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی سفید پٹی عقبی جانب سے سرخ ہونے لگی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کے سر کے زخمی حصے سے خون جاری ہوگیا تھا۔

تارا کے ہاتھ سے نکلے ہوئے پسٹل کو ساحل نے اٹھالیا۔ میر بخش نے کلاشنکوف ساحل کے حوالے کی اور وڈیرے پر پل پڑا۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے اپنے سابق آقا کی "خدمت" میں مصروف ہوگیا۔ میر بخش کو اس کے حال پر چھوڑ کر تارا کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میر بخش کے سینے میں وڈیرے کے لیے غم و غصے کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا' اچھا تھا وہ غبار نکال کر دل ہلکا کرلیتا۔

تارا بڑا ہمت والا ثابت ہورہا تھا۔ بری طرح پٹنے کے بعد بھی وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے حملے میں وہ پہلے جیسی تیزی و پھرتی نہیں تھی۔ اس کی کمپرسی دیکھ کر مجھے ترس بھی آیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مجھے فرنٹ کک مارنا چاہی۔

میں اچک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا کک والا پاؤں ہوا میں جھولا اور "دھپ" سے ریتیلی زمین پر آٹکا۔ وہ اس وقت واضح طور پر ہانپ رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "تارا! تم تو مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے والے تھے۔ اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

وہ میرے اس ترش انداز پر تلملا کر رہ گیا اور غصے سے بولا "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم خوش قسمت ہو۔ بار بار ہمارے گھیرے سے نکل جاتے ہو لیکن یاد رکھو' قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ دیکھنے والے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔"

"اور تم یہ ساری کارروائی اسی حالت میں کرو گے۔ ہیں؟" میں نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا "تم تو اس وقت اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو!"

وہ پھنکار کر آگے بڑھتے ہوئے بولا "میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں کہ کس قابل ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے گھٹنے پر اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارنا چاہی۔ تارا جو گرز پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے پاؤں کے حرکت میں آنے سے قبل اس کا ارادہ بھانپ لیا اور اپنا اسٹانس توڑتے ہوئے اسی پاؤں سے فرنٹ کک ایک جرک کے ساتھ اس کے منہ پر جڑ دی۔ اسٹانس توڑنے کا سارا فائدہ مجھے پہنچا اور تارا کا ٹھوکر کے لیے آگے بڑھا ہوا پاؤں نہ صرف یہ کہ میرے گھٹنے تک نہ پہنچ سکا بلکہ میری کک نے اس کی ٹھوڑی کا سوا ستیاناس بھی کردیا۔ سوا ستیاناس ان معنوں میں کہ عمر کوٹ والے ہوٹل کے کمرے میں گھٹنے کی بھرپور ضرب سے اس کی ٹھوڑی کا ستیاناس تو پہلے ہی مار چکا تھا جس کے نتیجے میں دانتوں تلے دب کر اس کی ناپاک زبان لہولہان ہوگئی تھی۔

ٹھوڑی پر لگنے والی میرے پاؤں کی ضرب نے تارا کو پیچھے الٹنے پر مجبور کردیا۔ وہ کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا۔ تاہم وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا۔ میں بہ آسانی اس پر حاوی ہوچکا تھا۔ سر کی عام سی چوٹ بھی انسان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیتی ہے۔ یہ تارا ہی کی ہمت تھی کہ وہ چاہے لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں ہی سے سہی' بہرحال میرے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی حالت خاصی قابلِ رحم تھی۔ میں نے اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

"تارا! تم تو مجھے بتانے والے تھے' کس قابل ہو! پھر کیا ہوا؟"

وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے اسے مزید تپانے کے لیے کہا "بھئی' سچی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے کسی قابل بھی نظر نہیں آرہے۔ بہتر یہی ہے کہ چوڑیاں پہن کر "شو" وغیرہ کرنا شروع کردو۔"

اس کے ہونٹ کچھ اس انداز میں ہلے جیسے مجھے گالی دے رہا ہو۔ میں نے جلتی پر تیل کا پورا گیلن انڈیلتے ہوئے کہا "شرم و حیا نے تو تمہاری زبان کو گنگ کردیا ہے۔ ہونٹ ہل رہے ہیں مگر مجال ہے جو آواز نکلے۔ تم تو اچھے خاصے "مشرقی مرد" ثابت ہورہے ہو!"

وہ غصے کی شدت سے کپکپا اٹھا پھر غلیظ گالی میری جانب اچھالتے ہوئے اس نے وحشت ناک انداز میں کہا "آؤ۔ مجھ پر حملہ کرو۔" اس نے ہاتھوں سے باقاعدہ مجھے بلانے کا اشارہ بھی کیا "تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے دو چار چوٹیں پہنچانے کے بعد تسخیر کرچکے ہو۔ تارا اب بھی تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔ مرد کے بچے ہو تو آگے بڑھو۔"

میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "یہی جانور کی تو قربانی بھی قبول نہیں ہوتی۔"

"یہ کیا بکواس کررہے ہو تم۔" وہ طیش کے عالم میں بولا "تم نے مجھے جانور کہا ہے؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "میں نے تو ایک مثال دی ہے۔ اس وقت بری طرح زخمی ہو۔ تم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھے شرم آرہی ہے۔"

وہ جھنجھلا کر بولا "بہانے بازی مت کرو۔" اس نے مجھے گھُرکا "سیدھی طرح اعتراف کرلو کہ تم میرے نزدیک آتے ہوئے ڈر رہے ہو۔ تم جانتے ہو' میں تمہیں چٹکیوں میں مسل دوں گا۔"

وہ انتہائی بے وقوفانہ بات کررہا تھا۔ اس وقت میں ہر حوالے سے اس پر اپنی برتری ثابت کرچکا تھا لیکن اس کی اکڑ فوں کی توں باقی تھی' گویا رسی جل چکی تھی' بل باقی تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے تارا۔ تم منفی ذہنیت کے مالک ہو جبکہ میں مثبت طرزِ فکر کا حامل ہوں۔"

وہ اکتاہٹ آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "تمہاری ہائی لکس الٹ گئی تھی۔ تم دونوں کسی چوہے کی طرح گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں پھنس گئے تھے۔ تم دونوں کا گن بردار محافظ بھاری گاڑی کے نیچے دبا تھا۔ میں اگر چاہتا تو تم سب پر لعنت بھیج کر یہاں سے چلا جاتا۔ تم مرتے یا بچتے' مجھے اس کی پروا نہیں ہونا چاہیے تھی مگر میں نے ہائی لکس کو سیدھا کرکے تم لوگوں کو جان بچانے کا موقع دیا۔ دوستی اور دشمنی کا بھی کوئی قاعدہ' کوئی دستور ہوتا ہے لیکن تم؟" میں نے جملہ ادھورا چھوڑنے کے بعد اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "لیکن تم تو دوستی کیا' دشمنی کے بھی اہل نہیں ہو۔ تم نے احسان فراموشی کی وہ مثال قائم کی ہے جو دوستوں یاد رکھی جائے گی۔"

"مجھے تمہارے اس لیکچر سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ ناپسندیدہ نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے بولا "میدانِ جنگ میں ہر چیز جائز اور ہر تدبیر واجب ہوتی ہے۔ تم میرے دشمن ہو۔ دشمن۔ میں تمہیں اور تمہاری دشمنی کو بھول نہیں سکتا۔ تم میرے اکلوتے بھائی دارا کے قاتل ہو' یہ بات میں آخری وقت تک یاد رکھوں گا جب تک تمہیں نیست و نابود نہ کردیتا۔" اس نے بڑے زور سے دانت کچکچائے اور غرائے ہوئے لہجے میں بولا "تم نے گاڑی کو سیدھا کرکے اپنی جان بچائی' یہ تمہاری بے وقوفی تھی۔ اپنی حماقت کو احسان کا نام نہ دو وجدان!"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی مجھے تمہارے ساتھ بھلائی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ تم کسی سانپ سے کم نہیں۔ تمہارا کام ڈسنا ہے۔ تم لاٹھی والے ہاتھ اور دودھ پلانے والے ہاتھ میں تمیز نہیں کرسکتے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہو۔ تم ہر احسان' ہر بھلائی کو فراموش کرکے اپنی فطرت کے عین مطابق ڈنک مارو گے۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ وہ اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ ایک مارشل آرٹسٹ تھا تاہم جوشِ جذبات میں اس وقت وہ بالکل دیسی انداز میں مجھ پر جھپٹا تھا۔ اس نے دونوں بازو آگے پھیلا کر میری گردن کو گرفت میں لینا چاہا۔ میں بیٹھک لگانے والے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں پیٹ کے بل میرے سر پر گرا' اسی لمحے میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

تارا فضا میں بلند ہوا' میں نے دونوں ہاتھوں کے پُش سے اسے دور پھینک دیا۔ زمین ریتیلی تھی اس لیے وہ کسی خطرناک چوٹ سے محفوظ رہا۔ بصورتِ دیگر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

جس وقت تارا بدقت تمام زمین سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا' میں نے میر بخش کی جانب دیکھا۔ وہ پوری طرح وڈیرے پر قابو پائے ہوئے تھا۔ میر بخش نے اپنے سابق آقا کے ساتھ اتنی بے دردی سے لات مکا کیا تھا کہ وہ چاروں خانے چت ریت پر پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"ہاتھ ہلکا رکھو میر بخش' کہیں اپنے سائیں کو جان ہی سے نہ مار دینا۔" میں نے تارا کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"سائیں وجدان! اس جیسے کمینے اور ڈھیٹ انسان اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔" میر بخش نے ایک جان دار ٹھڈا اکبر سومرو کی پشت پر رسید کرتے ہوئے کہا "ابھی تک تو یہ زندہ ہے۔ اگر آپ حکم کرو تو میں اس کی جان بھی نکال سکتا ہوں۔"

"نہیں!" میں نے قطعیت سے کہا "یہ تمہارے قابو میں ہے' یہی بہت ہے۔ ابھی تو ہم نے اس سے بہت سی کہانیاں سننا ہیں۔ اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔"

"پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟" میر بخش نے پوچھا۔

"تم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مکمل قابو میں کرلو تاکہ یہ کسی قسم کی "حرکت" کے قابل نہ رہے۔" میں نے کہا "میں اس لعین سے نمٹ کر تمہاری طرف آتا ہوں۔"

لعین سے میری مراد تارا تھی کیونکہ وہ اب میرے سامنے اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ اس وقت جس اسٹانس میں کھڑا تھا اس

میں مجھے کافی کمزوریاں نظر آئیں۔ میں نے اس کے پاؤں پر نظر جماتے ہوئے برق رفتاری سے اس کے ہاتھوں پر ایک راؤنڈ ہاؤس کک ماری۔

ردِعمل کے طور پر اس نے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ اس نے اپنے چہرے کو کور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کا سینہ کھل گیا۔ میں نے اس گیپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور سائڈ کک اس کے سینے پر رسید کردی۔

ٹھوکر کھانے کے بعد وہ لڑکھڑایا تاہم زمین بوس ہونے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔ اس کے بعد تو اس کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ پے در پے ناکامیابی نے اس کا دماغ خراب کردیا تھا۔ وہ کسی جنونی کی طرح مجھ پر پل پڑا۔

اس نے رائٹ پنچ میرے منہ پر رسید کرنا چاہا۔ میں نے گردن کو ایک جانب جھٹکتے ہوئے چہرے کو اس کے وار سے بچایا۔ اس نے لیفٹ گھٹنا میرے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔ تاہم مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ میں نہایت پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تارا نے بڑے دھواں دھار انداز میں مجھے "نی شاٹ" لگانے کی کوشش کی۔ یہ مارشل آرٹس کی ایک ایسی ضرب ہے جو تہِ مقابل کے گھٹنے کے جوڑ پر لگائی جاتی ہے تاکہ اس کا توازن بگاڑا جاسکے۔

میں نے بیک اسٹیپ لیتے ہوئے اپنے گھٹنے کو تارا کے وار سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دائیں راؤنڈ ہاؤس کک اس کے چہرے پر رسید کردی۔ اس نے گردن کو پیچھے جھکاتے ہوئے چہرے کو میری کک سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی بے اختیار اس کا دایاں ہاتھ بچاؤ کے سے انداز میں سامنے نکل آیا۔

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور راؤنڈ ہاؤس کک کو ریورس کرتے ہوئے' اس کی کہنی پر لاک لگاتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ ایک "کڑاکے" کی آواز پیدا ہوئی اور تارا کی فلک شگاف چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ یہ تکلیف اس کی برداشت سے باہر تھی۔

یقینی طور پر تارا کا بازو کہنی کے جوڑ سے ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ایک سائڈ کک رسید کرتے ہوئے اسے دور پھینک دیا۔

وہ کچھ دیر تک اوندھا زمین پر پڑا رہا پھر اپنے مجروح بازو کو تھام کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا دایاں بازو اس طرح جھول رہا تھا جیسے کندھے سے اس کا رابطہ نہ رہا ہو۔ وہ کسی مولی کی طرح تارا کے بائیں ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔ تارا کا شمار ایسے افراد میں ہوتا تھا جو کسی رحم کے قابل نہیں ہوتے۔ میں نے اس کے "شایانِ شان" سلوک کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے ٹھوکروں میں اڑانے لگا۔ اس کی کمزور مدافعت نے میرا "کام" آسان بنادیا۔

دس منٹ بعد وہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی ساری تن فن غائب ہوگئی۔ وہ اس وقت کسی کیچوے کی طرح بے بس پڑا تھا۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اب اس کی جانب سے کسی نقصان دہ کارروائی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

دوسری جانب میر بخش اپنے سابق وڈیرے سائیں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا چکا تھا۔ وہ دونوں شیطان ہمارے رحم و کرم پر تھے۔ میں زیادہ دیر وہاں رکنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے میر بخش سے کہا "تم جلدی سے پجارو کا ٹائر تبدیل کرو۔ میں ان سوراؤں پر نظر رکھتا ہوں۔"

"ان کا کیا کرنا ہے سائیں؟" میر بخش نے سوال کیا۔

"یہ ہمارے ساتھ جائیں گے۔" میں نے کہا "ان کی کھالوں سے بہت مضبوط اور ڈھیٹ قسم کے جوتے تیار ہوسکتے ہیں۔ یہ دونوں خاصی موٹی کھال کے واقع ہوئے ہیں۔"

میر بخش مزید کوئی سوال کیے بجارو کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے ساحل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ریوالور مجھے دو اور ممتاز سے کہو' آرام سے سیٹ پر بیٹھ جائے۔ حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔"

میں جب تارا سے نبرد آزمائی میں مصروف تھا' اس دوران میں میر بخش نے ہائی کس میں سے ایک رسی تلاش کرکے وڈیرے کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے تھے۔ ساحل نے اپنے ہاتھ کا ریوالور مجھے دیتے ہوئے کہا "وجدان! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے کہا "میں ان دو باگڑ بلّوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ انہیں پجارو میں ڈال کر ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

یہی سوال تھوڑی دیر پہلے میر بخش نے بھی مجھ سے کیا تھا اور میں نے اسے خاصا تسلی بخش جواب دے دیا تھا اس لیے ساحل نے مزید جرح نہیں کی اور ممتاز کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے جب ساحل سے ممتاز کو سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تو وڈیرے اکبر سومرو نے چونک کر پجارو کی طرف دیکھا تھا۔ اسے دو لڑکیوں کے بارے میں خاصی تشویش تھی،

خاص طور پر دوسری لڑکی یعنی ممتاز کے بارے میں۔ وہ اور تارا ریلوے کراسنگ سے ہمارے تعاقب میں تھے۔ انہوں نے ممتاز اور ساحل کو پجارو میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔

میں نے میر بخش سے پوچھا "تمہارے پاس اور رسی تو ہوگی؟"

وہ پجارو کے عقب سے فاضل اسٹپنی اتار کر ٹائر تبدیل کرنے میں مصروف ہوچکا تھا۔ اس نے جواب دیا "سائیں! مزید رسی تو نہیں ہے۔ جو ملی' میں نے اس سے اس مردود کے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ دیے ہیں۔"

"دوسرا مردود بھی اسی قسم کی "تواضع" کا حق دار ہے۔" میں نے کہا "میں کسی کے ساتھ "ناانصافی" نہیں کرسکتا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میر بخش اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "تم جو کر رہے ہو' اسے جلد از جلد نمٹالو۔ میں ہی ان کی "خاطر داری" کی کوئی راہ نکالتا ہوں۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت وڈیرے کے پاؤں کی رسی کھول دی۔ مجھے ماننا پڑا کہ میر بخش نے بڑی مضبوط بندشیں لگائی تھیں۔ میر بخش کے اس کارنامے میں سالہا سال کا جمع شدہ غصہ بھی شامل رہا ہوگا جو وہ وڈیرے کے لیے اپنے دل و دماغ میں رکھتا تھا۔

میں نے وڈیرے کے پاؤں سے فارغ ہونے والی رسی سے تارا کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ ان ہاتھوں میں وہ مجروح ہاتھ بھی شامل تھا جو کسی عضوِ معطل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میر بخش نے وڈیرے کے ہاتھ بھی پشت پر جکڑے تھے۔ میں ان دونوں کو ایک خاص مقصد کے تحت اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ان کے پاؤں آزاد اور ہاتھ جکڑبند ہونا ضروری تھے ورنہ ہم ان گناہ کی پوٹوں کو کہاں کہاں اٹھائے پھرتے۔ انہیں تو اپنے پاؤں پر ہی چلنا تھا۔

میں نے ریوالور کے اشارے پر تارا اور اکبر سومرو کو اٹھ کر کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ انہوں نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے کہا "شرافت سے پجارو کی طرف چلو۔"

وہ نقاہت آمیز قدم اٹھاتے ہوئے پجارو کی جانب بڑھنے لگے۔ اس دوران میں ساحل نے ممتاز کو سیٹ پر بٹھادیا تھا۔ وڈیرے کی اس پر نظر پڑی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ۔ یہ تو۔ ممتاز ہے۔ قاضی سلطان کی بیٹی!"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" میں نے اسے گھور کر سادگی سے پوچھا۔

"ہاں' میں اسے اور اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" وڈیرے نے جواب دیا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "چلو اچھی بات ہے۔ تمہاری جان پہچان نکل آئی۔ سفر اچھا گزرے گا۔"

"مم۔ مگر یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟" وڈیرے کی حیرت رفع ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی "اسے تو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا تھا۔"

"یہ اس طرح میرے ہاتھ لگی ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ وڈیرے کے گال پر رسید کردیا "کچھ آیا سمجھ شریف میں یا تفصیل بھی بیان کروں؟"

وڈیرا اکبر سومرو میرا تھپڑ کھا کر تلملا اٹھا تاہم وہ تلملاہٹ نکالنے کا موقع نہیں تھا۔ اس لیے بے بسی سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ وہ کسی عام آدمی کا تھپڑ نہیں تھا جو صرف آواز پیدا کرکے رہ جاتا۔ وہ میرا تھپڑ تھا۔ وجدان علی کا تھپڑ! جس نے شاؤلن ٹیمپل جیسے عظیم الشان ادارے سے مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی جہاں اس کے ہاتھ پاؤں کو فولادی بنادیا گیا تھا۔

وڈیرے کے گال پر جہاں میں نے طمانچہ رسید کیا تھا وہاں میری انگلیوں کے نشانات ثبت ہوگئے تھے بلکہ چھپ گئے تھے۔ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی قوت صرف کردی تھی اسے وہ تھپڑ مارتے ہوئے۔

تارا نہ تو ممتاز کو جانتا تھا اور نہ ہی اس کے اغوا کی کہانی سے وہ واقف تھا اس لیے اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی خاموشی اور لاتعلقی تو اس کی ناواقفیت ہی کو ظاہر کررہی تھی۔

میں نے وڈیرا اکبر سومرو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا "تمہارے پاس موبائل فون تو ہوگا؟"

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے اس کے دوسرے گال کو سرخ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا "جھوٹ مت بولو خبیث انسان۔ میں دروغ گوئی کی بہت عبرت ناک سزا دیتا ہوں۔ جب تمہارے عام سے ملازم مجھے اغوا کرتے ہوئے اپنے پاس موبائل فون رکھ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں رکھ سکتے؟"

میرا اشارہ اس موبائل فون کی طرف تھا جو میں نے تھپاڑ کر کے صحرا میں سفر کے دوران میں وڈیرے کی ایمبولینس

نما گاڑی سے برآمد کیا تھا۔ ازاں بعد اس کنگ سائز موبائل فون کو تباہ کردیا گیا تھا۔ میر بخش نے میری اس کارروائی پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

وڈیرا "نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن" والی کیفیت کا شکار تھا اس لیے اسے زبان کھولتے ہی بنی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بنگلے سے نکلتے وقت موبائل فون اپنے ساتھ لایا تھا۔ تاہم اس کی بیٹری ختم ہوچکی تھی۔ وہ فون اس وقت ٹویوٹا ہائی لکس میں موجود تھا۔

میں نے ان دونوں بدبختوں کو ساحل کی نگرانی میں چھوڑا اور خود ہائی لکس کی جانب بڑھ گیا۔ جاتے ہوئے میں ریوالور بھی ساحل کے حوالے کرگیا تھا۔ وہ پجارو کے اندر تھی جبکہ وہ دونوں زیرِ حراست افراد پجارو کے باہر کھڑے تھے۔ میر بخش اپنے کام کے اختتامی مراحل میں داخل ہوچکا تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی مہم جوئی کی کوشش کرتا تو میر بخش اسے "سنبھال" لیتا۔

میں نے صرف پانچ منٹ کے اندر ہائی لکس کے ڈرائیونگ کیبن کو چھان مارا۔ وڈیرے کا نااہل موبائل فون بہ آسانی دستیاب ہوگیا۔ اس تلاشی کے دوران میں کوئی اور قابلِ ذکر چیز برآمد نہ ہوسکی۔ مجھے سب سے زیادہ کھوج اسلحے وغیرہ کا تھا مگر ہائی لکس میں کسی قسم کا کوئی آتشیں ہتھیار موجود نہیں تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان کے پاس اسلحے کے نام پر صرف وہی کلاشنکوف اور پسٹل تھا جن پر ہم قبضہ جما چکے تھے۔

میں نے وڈیرے کے موبائل فون کو پجارو میں منتقل کیا۔ اس کی بیٹری واقعی ڈاؤن ہوچکی تھی یا اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال' وہ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وہ فی الوقت کسی بیکار شے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

اس وقت تک نہ تو ننھے منے موبائل فون مارکیٹ میں آئے تھے اور نہ ہی ان کے نہایت ہی مختصر سے چارجر۔ کنگ سائز موبائل فون کے ساتھ ساتھ اسی قبیل کی ایک بیٹری کو اٹھائے اٹھائے پھرنا پڑتا تھا۔

میر بخش نے ٹائر کی تبدیلی کا کام تسلی بخش طریقے سے کردیا تو میں نے اس سے کہا "اب ڈرائیونگ تم کرو گے اور دونوں لڑکیاں تمہارے ساتھ آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھیں گی۔"

"دونوں لڑکیاں ایک سیٹ پر؟" میر بخش نے متعجب انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ہاں' دونوں ایک ساتھ۔ سیٹ خاصی کشادہ ہے۔ یہ چھوئی موئی وہاں آسانی سے سما جائیں گی۔"

چھوئی موئی سے میری مراد خدانخواستہ یہ نہیں تھی کہ وہ دونوں ننھی بچیاں تھیں۔ لڑکی یا عورت کو چھوئی موئی اس کی نزاکت اور سکڑنے سمٹنے کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ یہ بہت جلد کہیں بھی سما جاتی ہیں۔ خاص طور پر مرد کا دل ان کے چھپنے کی پسندیدہ جگہ ہے!

میر بخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوالیہ نظر سے اکبر سومرو اور تارا کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا "یہ میرے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں رہیں گے۔ انہوں نے ہم سے منسوب کردہ قتل و غارت گری کی فرضی جھوٹی کہانی تو سنادی۔ اب کچھ نئی نئی اور دلچسپ کہانیاں میں بھی انہیں سنانا چاہتا ہوں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین!"

دونوں لڑکیاں پجارو کے عقبی حصے سے نکل کر پسنجرز سیٹ پر آگئیں۔ وہ سیٹ ان کے بیٹھنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ میں دراصل دونوں خبیثوں کے ساتھ پچھلے حصے میں اکیلا رہنا چاہتا تھا تاکہ اگر کسی شدید قسم کی کارروائی کی ضرورت پیش آجائے تو وہ لڑکیوں کی نظر سے پوشیدہ رہے۔ میر بخش نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میرے اشارے پر اکبر سومرو اور تارا پجارو کے عقبی حصے میں سوار ہوئے۔ انہوں نے جیسے ہی سیٹوں پر بیٹھنے کی کوشش کی' میں نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

"لاٹ صاحب کے بچو! اپنی اوقات کو نہ بھولو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم کسی دعوت میں شریک ہونے نہیں جارہے۔ تم اس وقت قیدی ہو اس لیے آرام سے پھیل کر سیٹوں پر بیٹھنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ تمہارا ٹھکانا وہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے پجارو کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔

وہ سکڑ سمٹ کر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگے تو مجھے شرارت سوجھی۔ وہ اچھوتا خیال یکدم ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں نے ان دونوں کی بندشیں کھولیں اور انہیں اس طرح ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھنے کو کہا کہ ان کے رخ ایک ہی سمت میں ہوگئے۔ وہ اپنے دائیں اور بائیں پہلو سے جڑے بیٹھے تھے۔ گویا وڈیرے کا بایاں زخمی بازو' تارا کے دائیں مجروح بازو سے دو جسم کی دوری پر تھا اور ان کے صحیح سلامت بازو ایک دوسرے سے لگ گئے تھے۔

میں نے ان دونوں کے ناکارہ بازوؤں کو نظرانداز کردیا اور کارآمد بازوؤں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر اس طرح

باندھ دیا جیسے کسی بانس کی لمبائی بڑھانے کے لیے کوئی دوسرا بانس اس کے اوپر رکھ کر مضبوط رسی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں' جڑواں حالت میں بیٹھے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

میں نے ان کی نظروں کی پروا کیے بغیر میر بخش کو حکم دیا "گاڑی کو سڑک پر لے آؤ اور جس حد تک ممکن ہو' تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے منزل پر پہنچادو۔"

میر بخش نے کوئی سوال کرنے کے لیے لب کھولنا چاہے تو میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "گائیڈ تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے' جو بھی پوچھنا ہے' اسی سے پوچھو۔ ممتاز "مس گائیڈ" ہے مگر تمہیں مس گائیڈ نہیں کرے گی۔ یہ بھی اپنے والدین سے ملنے کے لیے ایک ایک سانس بے چینی سے لے رہی ہے۔ یہ پہلی فرصت میں اپنے گھر پہنچنا چاہتی ہے۔"

میں نے میر بخش کو بڑے واضح انداز میں بتا دیا تھا کہ ہمیں سیدھا "نبی سر" جانا تھا۔ جہاں ممتاز کے والدین بڑی بے قراری سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ میر بخش نے ایک جھٹکے سے پجارو اسٹارٹ کی پھر اسے سڑک پر لانے کے بعد بتدریج اس کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

ہم کچھ دیر بعد "ساماروٗ" کو اپنے پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ یہ سڑک سیدھی کنری کی طرف جارہی تھی۔ جہاں سے ہمیں آگے "نبی سر" کی سمت سفر طے کرنا تھا۔ جس سڑک پر اس وقت ہم محوِ سفر تھے وہ کنری سے مشرق کی جانب مڑ کر سیدھی دھرمسال (تھارپارکر) کو جاتی تھی۔

میرے ذہن میں ایک سوال کافی دیر سے چکرا رہا تھا۔ مجھے یہ جاننا تھا کہ وڈیرا اکبر سومرو ہمارے تعاقب میں عمر کوٹ سے سیدھا ڈی ایس پی کے بنگلے واقع شادی پلی کس طرح پہنچ گیا تھا۔ میر بخش جب گزشتہ روز بنگلے سے روانہ ہوا تھا تو وڈیرا وہاں موجود تھا۔ اپنے ذہن کی خلش دور کرنے کے لیے میں نے وڈیرے سے پوچھا۔

"اکبر سومرو! تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ ہم عمر کوٹ سے فرار ہونے کے بعد شادی پلی کی طرف گئے ہیں اور رات کے آخری پہر ہم تمہیں ڈی ایس پی کے بنگلے پر ملیں گے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے نہیں ہوگی میرے لیے ہے۔" میں نے کہا "میر بخش تمہیں کل دوپہر کو بنگلے پر چھوڑ کر ہماری طرف آیا تھا۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا "کل رات ساڑھے نو بجے مجھے میرے ایک آدمی نے اطلاع دی تھی کہ تم تینوں شادی پلی والے ناکے سے گرفتار کرلیے گئے ہو۔ میں اپنی جاگیر سے فوراً عمر کوٹ پہنچا۔ اس وقت تک تارا کو ہوش آچکا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور تھانہ شادی پلی آگیا۔ جب ہم مذکورہ تھانے پہنچے تو صبح کے لگ بھگ تین بج چکے تھے۔ راستے میں تارا نے مجھے عمر کوٹ کے ہوٹل میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کردیا تھا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں جاگیر سے روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ دو جیپیں اور چار محافظ بھی لے آیا تھا۔ اب وہ چاروں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں اور تارا زندہ ہیں۔"

یہاں تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "رکو نہیں' بولتے چلے جاؤ۔ اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو تم دونوں بھی اپنے چار ساتھیوں کے پاس پہنچادیے جاؤ گے۔"

میرے لہجے میں چھپی ہوئی سنگینی کو اس نے صاف محسوس کرلیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ تاہم اپنی آواز میں تھوڑی ہمت بھرتے ہوئے اس نے مجھے تنبیہہ کی "وجدان! یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو۔ یاد رکھو' میں تمہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کروں گا۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

"میں تمہاری طاقت اور ہمت کا بڑی وضاحت کے ساتھ مشاہدہ کرچکا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تم انتہائی بزدل' گھٹیا اور کمینے انسان ہو۔ تمہاری بہادری کا اندازہ مجھے اس وقت ہوگیا تھا جب تم اپنے سابق نوکر اور میرے موجودہ دوست سے لات ٹھڈے کھا رہے تھے۔"

اس نے سلگتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور دوبارہ تنبیہہ کی "میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا وجدان' تم یہ سب اچھا نہیں کررہے۔ اگر اپنے لیے مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں فوراً آزاد کرکے جانے دو۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ اچھا نہیں کررہا تو کیا تم لوگوں نے ہمارے ساتھ اچھا کیا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو' تم نے ڈی ایس پی سے ساز باز کرکے ہمیں نو دس افراد کے قتل میں ملوث کرنے کی جو سازش کی ہے' اس میں تمہاری شرافت کی کیا شرح نکلتی ہے؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے

مزید کہا "تم مجھے عبرت ناک انجام کی دھمکی دینے سے پہلے اپنی حالت پر غور کرلو۔ اس وقت تو تم اپنے چہرے پر بیٹھنے والی مکھی کو بھی اڑانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس سے زیادہ افسوس ناک اور قابلِ رحم صورتِ حالات اور کیا ہوگی!"

وہ کینہ توز نگاہ سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے ایک بیان سے یہ بات تو واضح ہوگئی تھی کہ وہ گزشتہ روز تارا کے ساتھ اپنے بنگلے سے روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ کسی مخبر کی اطلاع پر اسے رات میں گھر سے نکلنا پڑا تھا۔

میں نے اس کی مجروح کہنی پر اپنے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ وڈیرے کی بائیں کہنی پر گولی لگی تھی اور یقینی طور پر ہڈی کا حشر خراب کرگئی تھی۔ ساحل نے بروقت فائر کرکے وڈیرے کو حاکم سے محکوم بنادیا تھا۔ اس نے دانتوں پر دانت جمائے اور تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"تم بہت بہادر بنتے ہو مگر تمہارا یہ سلوک بہادری کے منافی ہے۔"

"میں صرف بہادر بنتا ہی نہیں بلکہ میں نے اپنی بہادری ثابت بھی کی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم جیسے ضمیر فروش، ظالم اور احسان ناشناس افراد تو اس سے بھی زیادہ بدترین سلوک کے مستحق ہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ بہت رعایت برت رہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے دکھتے ہوئے بازو پر ایک اور ہلکا سا وار کیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا "تم نے ابھی تک ڈی ایس پی کے بنگلے پر پہنچنے کی کہانی مکمل نہیں کی۔ اگر اب تمہاری زبان کو بریک لگے تو میں تمہاری کہنی کو ٹھوکروں میں اڑادوں گا۔ شاباش، شروع ہوجاؤ۔"

وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے تکنے لگا مگر جب میں نے اس کی کہنی کو نشانہ بنانے کے لیے اپنے پاؤں کو حرکت دی تو وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔

"ہم تقریباً تین بجے صبح شادی پلی کے متعلقہ تھانے پہنچے۔ اس تھانے کے انچارج سے میری اچھی دعا سلام ہے۔ تھانا انچارج اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ شادی پلی والے ناکے کی نگرانی کرنے گیا ہے۔ میں نے اے ایس آئی جمشید احمد سے تم لوگوں کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ ڈی ایس پی تمہیں اپنے بنگلے پر لے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم سیدھے اس بنگلے پر پہنچے تھے۔ آگے کے حالات و واقعات تمہارے علم میں ہیں۔"

میں نے وڈیرے کی دو جیپوں کو کم و بیش صبح ساڑھے تین بجے ڈی ایس پی کے بنگلے کے گیٹ پر رکتے دیکھا تھا۔ اس حساب سے وڈیرے کا بیان درست نظر آتا تھا مگر کچھ معاملات ابھی حل طلب تھے۔

میں نے اس سے پوچھا "تم نے بتایا ہے، تمہارے کسی آدمی نے تمہیں ہماری گرفتاری کی اطلاع دی تھی۔ ہمیں شادی پلی والے ناکے سے پکڑا گیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، تمہارے مخبر کا تعلق اسی علاقے سے ہے؟"

وڈیرے نے خاموشی سے اثبات میں گردن ہلادی۔

میں نے تیز لہجے میں سوال کیا "کون ہے وہ شخص؟"

"اے ایس آئی جمشید احمد۔" اس نے بتایا۔

میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔ اے ایس آئی جمشید سے ہم نے بلکہ میں نے ناکے کے مقام پر خاصی باتیں کی تھیں۔ وہ ایک باتونی شخص تھا۔ اس کی زبانی مجھے اس ناکے کی حقیقت کے بارے میں پتا چلا تھا۔ منگل سنگھ، گنڈا سنگھ اور ممتاز والی کہانی بھی جمشید ہی نے مجھے سنائی تھی۔ ازاں بعد اس "لوز ٹاک" پر اسے ڈی ایس پی سے ڈانٹ بھی سننا پڑی تھی اور اب وڈیرا بتا رہا تھا کہ اے ایس آئی اس کا خاص آدمی تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ بھی سوچا، ممکن ہے وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کررہا ہو۔

اسی امکان کے پیشِ نظر میں نے اس سے پوچھا "اکبر سومرو! اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو خود سوچ لو، تمہارا کیا حشر ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمہاری مخبر والی کہانی کو ہضم نہیں کرپایا ہوں۔" میں نے آخری جملہ دانستہ اسے گھنے کے لیے کہا تھا۔

وہ بولا "جو حقیقت تھی وہ میں نے تمہیں بتادی ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ تم اس پر یقین کرتے ہو یا نہیں۔"

"اے ایس آئی تمہارا آدمی کس طرح ہوسکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے بتایا "جمشید ایک طویل عرصے سے میرے لیے مخبری کا کام کررہا ہے۔ اے ایس آئی کے عہدے پر اس کی ترقی بھی میری کوششوں ہی سے ہوئی ہے۔" ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے کہا "تم تو ابھی کل کے بچے ہو وجدان! تمہیں کیا معلوم کہ حکمرانی کے لیے کس طرح ہر محکمے میں اپنے بندے پہنچائے جاتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو اکبر سومرو۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا "کل کے بچے کو واقعی یہ بات معلوم نہیں لیکن یہ بچہ برسوں کے بوڑھے کو زیرِ دام لانے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ بچہ کل کا بچہ بخوبی جانتا ہے کہ تم جیسے بڑھے ظالموں کو عبرت ناک سزا کس طرح دی جاتی ہے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے گھائل بازو سے ایک چھوٹی سی "انکھیلی" کی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمودار ہوئے اور بے ساختہ اس کے لبوں سے میرے لیے ایک بے ہودہ گالی پھسل گئی۔

میں نے اس کی کسمپرسی کی پروا کیے بغیر اس کے فرعون صفت چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ جڑدیا۔ نتیجے کے طور پر اس کی باچھوں سے لہو رسنے لگا۔ وہ اس طوفانی طمانچے سے تھرا کر رہ گیا۔ میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔

"تم نے پچاس پچپن سال کن جانوروں میں رہ کر گزارے ہیں۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ دو لڑکیوں کی موجودگی میں تم کس قسم کی بے ہودہ گوئی کررہے ہو۔ کیا تم اپنے زنان خانے میں بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتے ہو؟"

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا "اکبر سومرو! میں تمہاری نظر میں کل کا بچہ ہوں مگر اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں عقل کا کچا بھی ثابت ہوں گا۔ جو بھی جھوٹ بولو، ذرا سوچ سمجھ کر بولنا۔"

میر بخش گاہے بہ گاہے عقب نما آئینے میں اپنے سابق وڈیرے سائیں کی درگت بنتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں کہا تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ مسرت کی انتہا سے گزر رہا تھا۔

میں نے دوبارہ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اے ایس آئی جمشید کو صرف یہ معلوم تھا کہ ہمیں گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارے اصلی ناموں سے واقف نہیں تھا پھر تم نے یہ کیسے جان لیا کہ گرفتار ہونے والے ہم ہی ہوں گے؟"

"یہ تم نے اچھا سوال کیا ہے۔" اس نے کہا "اے ایس آئی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ گرفتار شدگان میں وجدان اور دھنو شامل ہیں کیونکہ تم لوگوں نے پہلے اپنے نام مراد اور کلثوم بتائے تھے۔ بعد میں تھانے جاکر تم مقصود احمد اور لیلیٰ بن گئے۔ البتہ میر بخش کا نام ہر جگہ میر بخش ہی رہا۔ مجھے اے ایس آئی کی جس بات نے تمہاری طرف متوجہ کیا وہ "ریڈ اینڈ بلیک" گاڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تم لوگوں نے مجھ سے دور پار کی رشتے داری بھی ظاہر کی تھی اور پولیس کو بتایا تھا کہ

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں) تیار ہے

بجھ گئی

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز

5802551 5802552-5895313

kitabiat1970@yahoo.com

تم عمرکوٹ کا تاریخی قلعہ دیکھنے میرے پاس آئے تھے۔ چونکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اس لیے میرا شک تمہاری طرف گیا اور بالآخر یہ شک سچ بھی ثابت ہوا۔"

وڈیرے کی اس وضاحت میں خاصی جان تھی۔ میرے ذہن نے اس کی بات کو تسلیم کرلیا۔ یقینی طور پر وہ اسی طرح تعاقب کرکے ڈی ایس پی کے بنگلے پر پہنچے ہوں گے۔ اے ایس آئی جمشید نے میری وجہ سے اپنے افسرِ بالا سے خاصی جھاڑ کھائی تھی اس لیے بھی اس نے خصوصی الرٹ سیسی دکھائی ہوگی۔

"تمہارا کیا حال ہے چوہدری کے پالتو بندر؟" میں نے تارا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک یک ٹک مجھے گھورتا رہا پھر دارننگ۔ دینے والے انداز میں بولا "تم ہمارے ساتھ بہت زیادتی کررہے ہو وجدان۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"میں تو تمہارے خاندان کا قرض لوٹا رہا ہوں۔" میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں نے کہا "تمہارے ملعون بھائی دارا نے جو کچھ میرے اور میرے والدین کے ساتھ کیا تھا' میں کئی سال سے اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اب میں جو کچھ تمہارے ساتھ کروں گا' وہ قرض کی ادائیگی ہوگی اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے؟"

وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں تمہیں میری یہ بات تو بری نہیں لگ گئی کہ میں نے تمہیں چوہدری کا بندر کہہ دیا ہے؟"

وہ اب بھی خاموش رہا۔ اس کی خاموشی میں میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

میں نے کہا "جو کسی کے اشاروں پر ناچتا ہے اسے بندر ہی کہا جاتا ہے۔ کیا تم اپنے چوہدری کے اشاروں پر نہیں ناچتے؟ میں نے تو تمہارے ساتھ بہت رعایت کی ہے۔ میں تمہیں چوہدری کا پالتو کتا کہتا تو یہ ٹائٹل تمہارے لیے زیادہ مناسب ہوتا۔ اسی کے خرچے پر پل بڑھ کر تو تم اس ڈیل ڈول کو پہنچے ہو۔ تمہارا یہ ہٹا کٹا پن چوہدری کے ٹکڑوں کا رہینِ منت ہے۔"

میں مسلسل ایسے جملے ادا کررہا تھا جو اس کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کررہے تھے۔ تاہم وہ کسی قسم کی اشتعال انگیز حرکت سے گریزاں نظر آتا تھا۔ ابھی تک مجھے تارا کا جو تجربہ ہوا تھا اس کے مطابق اس میں تحمل کی کمی تھی اور وہ بہت جلد طیش میں آکر مغلظات پر اتر آتا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے مزاج کے خلاف ایکٹ کررہا تھا۔ یہ اس کی مصلحت بھی ہوسکتی تھی' مجبوری بھی کہ وہ اس وقت پوری طرح میرے رحم و کرم پر تھا اور یہ خاموشی اور برداشت اس کی چالاکی بھی ہوسکتی تھی۔ وہ اپنے میزبان کا حشر دیکھ چکا تھا۔ تارا کے دائیں بازو کی ہڈی کہنی کے مقام سے "جواب" دے گئی تھی۔ اس جواب کی آواز میں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ ہڈی ٹوٹنے کی کڑاکے دار آواز اپنے اندر ایک عجیب سا تاثر رکھتی ہے۔ اذیت رساں افراد اس آواز سے کیف و سرور حاصل کرتے ہیں جبکہ مصیبت زدہ شخص اس آواز کو سنتے ہی دہشت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ تارا نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ اگر اس نے کوئی چون وچرا کی تو میں اس کے گھائل بازو کے ساتھ عملی "گفتگو" شروع کردوں گا اور یہ اسے کسی بھی طور گوارا نہیں تھا۔

وڈیرے نے۔۔۔ جو اب خاصا چھوٹیرا ہوچکا تھا' مجھ سے پوچھا "تم ہمیں یوں باندھ کر کہاں لے جارہے ہو؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "نئی سر۔"

"وہاں تو قاضی سلطان کی حویلی بھی ہے۔" اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

میں نے کہا "ہاں' وہ تو ہے۔۔۔ اور اس حویلی میں قاضی سلطان بھی ہے۔"

اس کی تشویش گہری ہوگئی اور وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بے پروائی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "روس میں رہنے والے کسی شخص نے کسی دنیا گھومے ہوئے شخص سے کہا' میں جاپان جانا چاہتا ہوں۔ جہاں دیدہ شخص نے کہا' چلے جاؤ۔ اس میں پریشانی کیا ہے؟ وہ بولا' میں نے سنا ہے راستے میں چین بھی پڑتا ہے! جہاں نودرد شخص نے اطمینان سے کہا' ہاں وہ تو پڑے گا!"

وڈیرا الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا' میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوئے کہا "بھئی' اگر ہم نئی سرجائیں گے تو قاضی سلطان سے بھی ملاقات ہوگی' اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

وہ سراسیمہ انداز میں اپنے مہمان تارا کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جانب اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے' قاضی سلطان سے تمہاری دیرینہ دشمنی چلی آرہی ہے؟"

"تمہیں یہ بات میرے دشمن کی بیٹی نے بتائی ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"سوال نہیں کرو' صرف میری بات کا جواب دو۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ راہِ راست پر آتے ہوئے بولا "ہاں' ہم ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔"

میں نے کہا "اپنے دشمن کے سامنے جاتے ہوئے ڈر رہے ہو؟"

"ڈرتی ہے میری جوتی۔" وہ جوش میں آگیا۔

میں نے تیکھے انداز میں کہا "پھر تمہاری حالت مردوں سے بدتر کیوں ہورہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے' تمہارا پیشاب خطا ہوجائے گا۔ اگرچہ یہ پجارو تمہاری ہی ہے لیکن میں یہاں کسی قسم کی گندگی برداشت نہیں کروں گا' یہ بات ذہن میں رکھنا چھوٹیرا سائیں!"

وہ بے بسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے لرزنے لگا پھر اپنے خون آلود دہانے کو وا کرتے ہوئے گویا ہوا "میں کسی قاضی واضی سے نہیں ڈرتا۔ اس کا تو میں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اس کی اتنی ہمت نہیں کہ میرے سامنے آکر وار کرسکے۔ میں تو۔۔۔ میں تو۔۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ممکن ہے' وہ ممتاز کے باپ قاضی سلطان کو کوئی گالی دینے کا ارادہ رکھتا ہو اور میرے لائق "سلوک" نے اس کی زبان پر تالا ڈال دیا ہو۔ میرے ذہانت خیز طمانچے نے اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کو زخم کردیا تھا۔ وہ اس تلخ تجربے کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا "جب تم اتنے ہی بہادر ہو' قاضی سلطان کو خاطر میں نہیں لاتے تو پھر تمہاری جان کیوں نکلی جارہی ہے اس کا سامنا کرتے ہوئے؟"

"میں اپنی اس حالت پر پریشان ہوں۔" اس نے اپنے وجود پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "جب قاضی سلطان مجھے اس حال میں دیکھے گا تو میں شرمندگی سے گردن بھی نہیں اٹھا سکوں گا۔"

اس کا کہنا بجا تھا۔ اپنے دشمن کے سامنے کمزور اور شرمناک حالت میں جانے سے واقعی ناک کٹ جاتی ہے۔ ہر غیرت مند تو اس قسم کی شرم ناک صورتِ حالات پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے اکبر سومرو کو مخاطب کرتے ہوئے کٹیلے انداز میں کہا "تو اس کے لیے اتنا فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہ ندامت اور شرمندگی تمہیں گردن نہیں اٹھانے دے گی تو تم کسی بیمار بکرے کی طرح گردن ڈالے رہنا۔ آخر ہم بھی تو تمہارے دشمن ہیں۔ تم ہمارے سامنے تو گردن اٹھائے بیٹھے ہو؟"

"تمہاری بات دوسری ہے۔"

"دوسری کیوں ہے بھئی؟ دشمن تو آخر دشمن ہی ہوتا ہے۔"

وہ موضوعِ گفتگو کو تبدیل کرتے ہوئے بولا "قاضی سلطان کی بیٹی تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟ تم ڈی ایس پی کے بنگلے سے تو میر بخش اور دھنو (ساحل) کے ساتھ نکلے تھے؟"

"یہ ہمیں راستے میں ملی ہے۔" میں نے بتایا۔

اس دوران میں میر بخش' ساحل یا ممتاز نے ہماری بات چیت میں مداخلت نہیں کی۔ میر بخش اور ساحل تو میرے مزاج کو بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ ممتاز عقل مندی کا تقاضا نبھاتے ہوئے خاموش تھی۔

وڈیرے نے پوچھا "اس لڑکی کو تو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا تھا پھر یہ تمہیں راستے میں کیسے مل گئی؟ میں نے تو سنا ہے' ڈاکوؤں نے اس کی واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا تھا؟"

"تم خوامخواہ بے خبری کا ڈرامائی رچاؤ اکبر سومرو۔" میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا "میں کون سی بے خبری کا ڈراما رچا رہا ہوں؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا "تم یہ کیا "تم نے سنا ہے" اور "تمہیں پتا چلا ہے" جیسے جملے بول کر حقائق کو چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔ جو سچی بات ہے' اسے زبان پر کیوں نہیں لاتے!"

میں نے اسے گھیرنے کے لیے ایسا مضبوط جال پھینکا تھا کہ وہ گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا "پتا نہیں' تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو۔ مجھے ڈی ایس پی کی زبانی معلوم ہوا ہے' قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو منگل سنگھ نامی کسی ڈاکو نے اغوا کرلیا تھا۔ ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے ہی تو شادی پلی اور میرپور خاص کی ضلعی سرحد پر ناکا لگایا گیا تھا جہاں سے تم گرفتار ہوئے تھے۔"

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا!" میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔

"یہی حقیقت ہے بھئی۔"

"تم اداکاری اچھی کرلیتے ہو۔" میں نے اپنے "مشن"

پر کام جاری رکھا "لیکن تمہاری یہ اداکاری حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرسکتی اکبر سومرو!"

وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا "پھر تم ہی بتادو' حقیقت کیا ہے؟"

میری مبہم اور پراسرار گفتگو نے ان دونوں کو اضطراب میں مبتلا کردیا۔ وہ پہلو تو بدل نہیں سکتے تھے' بس کسمسانے پر اکتفا کرنے لگے۔ پجارو بھی بڑی عجیب گاڑی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹسوبشی والوں نے اس میں بہت سی تجرباتی تبدیلیاں کی ہیں۔ خاص طور پر سیٹنگ اور انٹرنس کے حوالے سے۔ ابتدائی زمانے میں اس کے عقبی حصے کی دو طرفہ سیٹوں کے درمیان اچھی خاصی گنجائش ہوتی تھی۔ ازاں بعد اس حصے میں آگے پیچھے نشستوں کی تعداد بڑھانے کے نتیجے میں یہ گنجائش کم سے کم تر ہوتی گئی۔ ہم جس پجارو میں محوِ سفر تھے وہ دو طرفہ نشستوں والی تھی جس کے درمیانی حصے میں اتنی گنجائش بہرحال موجود تھی کہ میں نے ان دو سرکاری سانڈوں کو وہاں ٹھونس رکھا تھا۔ ایک تو گنجائش کی کمی' دوسرے ان کے بازوؤں کی بندش نے انہیں "پرپرزے" نکالنے سے روک رکھا تھا۔ وہ بے بسی کی عملی تصویر تھے۔

میں نے اپنی پلاننگ کے مطابق وڈیرے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تم ایک بھوتار وڈیرا ہو۔ اپنی رعایا پر ظلم کرکے تمہیں ازحد خوشی ہوتی ہے۔ کوئی ایسا جرم نہیں جس میں تم ملوث نہ ہو۔ تم چوری ڈکیتی کرواتے ہو' خطرناک مجرموں کو پناہ دیتے ہو۔ نامی گرامی ڈاکو تمہاری پشت پناہی کے طفیل اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب ہیں۔"

میں سانس لینے کے لیے رکا تو اس کے چہرے کا جائزہ بھی بغور لیا۔ وہ میری باتیں سن کر سلگ اٹھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ تاہم مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا' چنانچہ وہ خاموش رہا۔

میں نے اس کے جذبات کے سوڈے میں نمک چھڑکتے ہوئے کہا "قاضی سلطان سے تمہاری دیرینہ دشمنی چلی آرہی ہے۔ تم نے قاضی سلطان کو "چرکا" لگانے کے لیے اپنے پالتو ڈاکو منگل سنگھ سے دشمن کی بیٹی ممتاز کو اغوا کرالیا اور اس کی واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کردیا۔"

"یہ سب جھوٹ ہے' بکواس ہے۔" وہ پھٹ پڑا "میں کسی منگل سنگھ نامی ڈاکو کو نہیں جانتا' نہ ہی میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو اغوا کروایا ہے۔"

میں نے اس کا احتجاجی جملہ مکمل ہوتے ہی زخمی کنپٹی پر پاؤں کی ایک درمیان ٹھوکر رسید کردی۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کے مانند ڈکرا اٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلی لہراتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔

"اگر مزید تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو زبان کو بند رکھو۔ صرف وہ سنو جو میں بیان کررہا ہوں اور سمجھ لو کہ یہی حقیقت ہے۔"

"ہم تمہاری جھوٹی باتوں کو کس طرح حقیقت سمجھ لیں؟" تارا نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے معترض لہجے میں کہا۔

"اس طرح سمجھ لو بدذات۔" میں نے جملہ پورا کرتے ہی اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کردیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ اس کی ناک کو میں عمرکوٹ والے ہوٹل میں بھی خاصی اذیت سے دوچار کرچکا تھا۔ وہ جبڑے بھینچتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"وجدان! ایک مرتبہ میں اس مصیبت سے نکل آؤں پھر تمہیں بتاؤں گا کہ تکلیف اور اذیت کیا ہوتی ہے۔ تم نے تارا کے اسٹائل کا ابھی مزہ نہیں چکھا۔"

"اوئے کسی رستم خان کی اولاد۔" میں نے اسے گھورا "کل سہ پہر سے تو میں تمہارے مختلف اسٹائلز دیکھتا آرہا ہوں۔ تم ہر اسٹائل میں پیٹنے کی دھمکی دیتے ہو پھر خود پٹنا شروع ہوجاتے ہو۔ تم نے تو مارشل آرٹس کی ناک کٹوادی ہے۔" میں نے تھوڑا توقف کرتے ہوئے اس کو تاکید کی "میں تمہارے میزبان چھوٹیرا سائیں سے بڑی اہم باتیں کررہا ہوں۔ اگر اب تم نے ہماری گفتگو میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو مارشل آرٹس کی ساری بے توقیری کا بدلہ لے لوں گا۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا!" میں نے اس کی مضروب ناک پر ایک چٹکی بھری اور مضحکہ خیز انداز میں کہا "تم نے اپنی پنچ حرکتوں سے ان فنون کی ناک کٹوائی ہے' میں عملی طور پر تمہاری یہ پکوڑا ناک کاٹ کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ جانتے ہو' کون سے ہاتھ پر؟" وہ غصے کو اپنے معدے میں اتارتے ہوئے کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "اسی ہاتھ پر جس کی کہنی کی ہڈی سے کڑاکے کی صدا بلند ہوئی تھی!"

پھر میں دوبارہ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب متوجہ ہوگیا "ہاں' تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ تم نے منگل سنگھ کی مدد سے ممتاز کو اغوا کروالیا۔ مغویہ کے ماموں کی کارروائی پر پولیس نے ڈاکوؤں کے ڈیرے پر چھاپا مارا تو منگل سنگھ اپنے ساتھی گنڈا

سنگھ کے ہمراہ مغویہ سمیت تمہارے پاس عمرکوٹ پہنچ گیا۔"

اس موقع پر وڈیرے نے کچھ کہنا چاہا تو میرا ہاتھ میکانکی انداز میں اس کے زخمی بازو کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ہونٹ کھلنے سے پہلے ہی بند ہوگئے۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"پولیس کی سرگرمیاں جب عمرکوٹ تک پہنچیں تو تم نے اپنی بچت کے لیے مغویہ کو عمرکوٹ سے میرپورخاص منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن عین موقع پر تمہیں اطلاع ملی کہ شادی پلی سے آگے پولیس نے ناکا لگالیا ہے۔ اس لیے تم نے اپنے ڈاکوؤں کو ٹویوٹا فورو وہیل ڈرائیو جیپ میں عمرکوٹ سے ساماروں کی طرف روانہ کردیا تاکہ وہ ساماروسے آگے کچا راستہ استعمال کرکے میرپورخاص میں داخل ہوجائیں۔"

"تم نے تو بڑی خوفناک کہانی گھڑلی ہے۔" وڈیرا سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "کہانیاں اسی طرح جنم لیتی ہیں۔ تم نے بھی توہم سے منسوب کرکے قتل وغارت گری کی ایک جھوٹی کہانی تیار کی تھی جس کے نتیجے میں تم ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے تاکہ ہماری باقی کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے۔ کیا وہ کم خطرناک کہانی تھی۔ میں تو تمہارا ادھار لوٹا رہا ہوں۔ اور کہانی تو ابھی جاری ہے' غور سے سنتے جاؤ۔"

وہ سننے پر مجبور تھا اس لیے ہمہ تن گوش رہا۔ میں نے کہا "پھر تمہیں خبر ملی کہ ہم ناکے پر پکڑے گئے ہیں۔ تم نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے شادی پلی کا رخ کیا۔ اس طرح تم ایک تیر سے کئی شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف تم پولیس کو اپنے معاملات میں الجھا کر منگل سنگھ وغیرہ کو بحفاظت نکل بھاگنے کا موقع دینا چاہتے تھے اور دوسری جانب ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ڈی ایس پی تمہاری بات پر یقین کرکے ہمارے لیے بے شمار مشکلات کھڑی کردیتا مگر تمہاری چال کامیاب نہ ہوسکی۔ ڈی ایس پی کی رہائش پر ہمارا پلہ بھاری رہا اور ہم وہاں سے بہ حفاظت نکل آئے۔ تاہم ازاں بعد تم نے ایک نئی چال کے تحت ڈی ایس پی کے کان بھر کر ہمیں خطرناک قاتل بنانے کی کوشش کی۔ اور تمہاری یہ کوشش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آرہی۔ اس وقت تم جن حالات کا شکار ہو اور جس حالت میں قاضی سلطان کی حویلی پہنچنے والے ہو' اس کے پیشِ نظر تمہاری کہانی فلاپ اور میری کہانی ہٹ ہوجائے گی۔"

"تمہاری کہانی ہٹ کیسے ہوسکتی ہے؟" اس نے کمزور سا احتجاج کیا "میرا انوا اور منگل سنگھ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ڈی ایس پی مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس علاقے کے تھانے دار سے بھی میری واقفیت ہے۔ کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔"

"یقین اس کی بات کا کیا جائے گا جس کی کہانی میں جان ہوگی۔" میں نے اپنے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "اور میری کہانی بہرحال تمہاری کہانی سے زیادہ طاقت ور ہے کیونکہ میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے!"

میرے آخری جملے پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' لکنت زدہ لہجے میں بولا "تت... تم نے... مم... ممتاز کو منگل سنگھ کی قید سے چھڑایا ہے؟"

"کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟" میں نے مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔

"کیا کہہ رہے ہو!" وہ سٹپٹا کر رہ گیا "میں یہ بات کیسے جان سکتا ہوں؟"

"اب اتنے بھولے بھی نہ بنو؟"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ تمہاری سمجھ اس وقت پاتال کی سیر کو گئی ہوئی ہے۔" میں نے پنچھتے ہوئے لہجے میں کہا "اس لیے اس دنیا کی ہر چیز اور یہاں بسنے والے انسانوں کی ہر بات تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

وہ چڑ کر بولا "تم کیوں میرا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہو؟"

"بخدا' میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا۔" میں نے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا "مجھے تو تم سے شکایت ہے کہ تم بلاوجہ جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ اس بات کو تسلیم کیوں نہیں کرلیتے کہ میں نے ڈاکوؤں کے چنگل سے ممتاز کو آزاد کرانے کے بعد تم سے بھی ایک معرکہ کرلیا ہے۔ تم ڈاکوؤں والے واقعے کے گواہ ہو۔ یوں لاعلمی ظاہر کرنے سے بات نہیں بنے گی چھوٹیرا سائیں؟"

"اگر تم اسی قسم کی بے بنیاد باتیں کرتے رہے تو میرا دماغ پھر جائے گا۔" وہ سلامت ہاتھ میں ہلکی سی جنبش پیدا کرتے ہوئے بولا۔

نتیجے میں تارا کے ہاتھ میں بھی حرکت پیدا ہوئی کیونکہ ان دونوں کے صحیح وسالم بازوؤں کو میں نے ایک دوسرے کے اوپر مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ اس کی جھلاہٹ کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"اگر تمہارا دماغ پھر گیا تو یہ تمہارے لیے بڑی سود مند بات ہوگی۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک اعلیٰ ڈگری مل جائے گی۔ نہ یونیورسٹی جانے کا جھنجٹ اور نہ ہی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کی مصیبت۔"

وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تو کوفت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"چھوٹیرا سائیں! شاید تم میری بات کو سمجھ نہیں پائے ہو۔ میں "پی۔ ایچ۔ ڈی" والی ڈگری کی بات کررہا ہوں۔ کچھ لوگ مذاق میں اسے "پھرا ہوا دماغ" بھی کہتے ہیں۔"

وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔ اس صورتِ حالات سے سب سے زیادہ انجوائے میربخش اور ممتاز کررہے تھے۔ ممتاز نے خود کو بہت ہی سمجھ دار اور معاملہ فہم لڑکی ثابت کردیا تھا۔ میں اس سے منسوب کرکے جھوٹی بچی کہانی سنا رہا تھا لیکن اس نے کسی مرحلے پر مجھے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دوبارہ اکبر سومرو کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ منگل سنگھ اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کے ہمراہ ممتاز کو اغوا کرکے "سامارو" سے آگے جارہا تھا کہ ریلوے کراسنگ پر قاضی سلطان کے آدمیوں سے اس کی مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور ڈاکوؤں کو جان بچانے کے لیے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ وہ ٹویوٹا فورو ویل ڈرائیو کو ریلوے کراسنگ پر چھوڑ کر تو دو گیارہ ہوگئے۔ قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو اپنی گاڑی میں سوار کرایا اور "نبی سر" کی جانب روانہ ہوگئے۔ تمہارے بالتو ڈاکوؤں کی جیپ اسی ریلوے کراسنگ پر کھڑی مل جائے گی۔ اس کے ٹائروں اور باڈی پر گولیاں کے متعدد سوراخ بھی اس کہانی کی سچائی کا ثبوت دیں گے۔" میں نے خاموش ہوکر اکبر سومرو کی جانب دیکھا۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا' قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو تم نے ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے۔" وہ سر کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ اس کی حالت دیوانوں ایسی ہورہی تھی "اور اب تم بتا رہے ہو' قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو ڈاکوؤں کی حراست سے آزاد کروایا ہے۔ کیا یہ کوئی نئی کہانی ہے؟"

"یہ وہی کہانی ہے لیکن اپ سوڈیٹا ہے۔" میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا "کہانی کی یہی خاصیت ہوتی ہے کہ اس میں سے ہر لمحے ایک نئی کہانی جنم لیتی رہتی ہے۔" ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے کہا "اوئے گھامڑ چھوٹیرے! تم مجھے ہی قاضی سلطان کا آدمی کیوں نہیں سمجھ لیتے جس نے ممتاز کو تمہارے ڈاکوؤں سے چھڑایا ہے؟"

"تم قاضی سلطان کے آدمی کیسے ہوسکتے ہو؟"

"کیوں' اس میں کیا خرابی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا "تم تو اپنی ساتھی دھنو (ساحل) کے ہمراہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ تمہارا نام وجدان ہے۔ میں ڈی ایس پی کو تمہاری اصلیت بتا چکا ہوں۔ تم پر انڈین ایجنٹ ہونے کا شبہ کیا جارہا ہے۔ تمہارے نام وجدان سے بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان!"

"تم تو میری حقیقت بلکہ اصلیت سے واقف ہو نا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے اس مہمان تارا اور اس دوست چوہدری نوازش علی نے تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' تم قاضی سلطان کے آدمی نہیں ہوسکتے۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا "تم خوامخواہ اپنی شخصیت کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کررہے ہو!"

میں نے کہا "میں بندہ صرف خدا کا ہوں' آدمی کسی کا بھی ہوسکتا ہوں اور کان کھول کر سن لو۔ میری تندرست اور توانا کہانی کے مطابق میں قاضی سلطان کا آدمی ہوں۔ میربخش میرا ساتھی ہے۔ ہم دونوں نے ممتاز کو' ڈاکوؤں سے زبردست مقابلہ کرکے حاصل کیا ہے۔ ہم "سامارو" کے قریب پہنچنے ہی والے تھے کہ تم ٹویوٹا ہائی لکس میں ہماری راہ روکنے آن پہنچے۔ ہمارے درمیان ایک زبردست معرکہ ہوا جس کی یادگار کے طور پر تم دونوں کا ایک ایک بازو شدید زخمی ہوگیا۔ تمہاری رف ڈرائیونگ کی وجہ سے تمہارا گارڈ گاڑی الٹنے کے باعث ہلاک ہوگیا۔ بہرحال' میں نے تم دونوں کو اپنی گاڑی میں ڈال کر قاضی سلطان کے پاس پہنچا دیا۔ دی اینڈ! کہو' یہ کہانی کیسی ہے؟"

"مجھے لگتا ہے' تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔

میں نے اس کے مجروح بازو کو یک ٹک دیکھتے ہوئے کہا "مجھے بھی یہی محسوس ہورہا ہے اور یاد رکھو' جب میرا دماغ خراب ہوتا ہے تو میں فوراً گھائل اعضا کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔" میری نظر ید ستور وڈیرے کے بائیں بازو پر لگی تھی۔

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا "تمہاری کہانی میں ٹویوٹا ہائی لکس الٹ گئی تھی مگر وہ تو وہاں ریت میں سیدھی کھڑی ہے۔ اس کا کیا کرو گے؟"

میں نے خوابناک لہجے میں کہا "جو شخص الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کرسکتا ہے اس کے لیے سیدھی گاڑی کو الٹانا کون سا مشکل کام ہے!"

"وہاں تو تمہاری جسمانی طاقت کام آئی تھی۔" تارا نے کہا "میں نے سنا ہے' شاؤلن ٹیمپل میں تم نے وزنی اشیا اٹھانے کی بہت پریکٹس کی ہے مگر اتنے فاصلے سے تم اس بدھ مت ہائی لکس کو کیسے الٹا سکتے ہو؟"

میں نے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں کہا "تمہاری معلومات انتہائی ناقص اور تمہاری سوچ بے حد لاغر ہے۔ تمہیں ایک طویل عرصے تک کسی نفسیاتی اسپتال میں اپنا علاج کروانا چاہیے۔ میں نے تمہاری ہائی لکس کو جسمانی طاقت سے سیدھا نہیں کیا تھا۔"

"پھر تم نے کون سی صلاحیت آزمائی تھی؟" وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگا۔

میں نے کہا "یہ باریک بات تمہاری موٹی عقل میں نہیں آئے گی۔ تم خوامخواہ اپنے دماغ کو تھکانے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے ہی تمہارے سر پر بہت سی چوٹیں آچکی ہیں اور تم نہیں جانتے' آیندہ ان چوٹوں کا اسکور کیا ہوگا۔"

اس نے مجھے گھورنے پر اکتفا کیا۔ کچھ بولتا تو سراسر گھاٹے میں رہتا۔

میں نے دانستہ تارا کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر میں چاہتا تو "چی" کی قوت اور اس کی کرشمہ کاریوں پر اسے ایک طویل لیکچر دے سکتا تھا مگر میں خوامخواہ اس قوت کو اپنے دشمنوں کی موجودگی میں زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا تھا۔ مخالفین سے اپنے گن چھپا کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے!

یہ حقیقت ہے کہ میں نے الٹی ہوئی ٹویوٹا ہائی لکس کو "چی" کی قوت کے طفیل سیدھا کیا تھا ورنہ جسمانی قوت کے بے تن تنہا وہ کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سیدھی گاڑی کو چھوئے بغیر' دور بیٹھے بیٹھے بھی الٹایا جاسکتا تھا۔ اور وہ بھی "چی" ہی کی مدد سے۔ "چی" بڑی نزاکت انگیز اور پراسرار قوت ہے۔ اس کے منتشی کے لیے فاصلے کی کوئی قید نہیں۔ وہ دنیا کے ایک حصے میں بیٹھ کر دوسرے حصے میں واقعات وقوع پذیر کرسکتا ہے۔ میں "چی" کے منتشی کی بات کررہا تھا۔ اس درجے پر پہنچنے کے لیے کڑی ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی فن کی انتہا تک پہنچنا آسان کام نہیں۔ میں بہرحال اس فن کا منتشی نہیں تھا۔ میں اپنے ہی ماحول میں' چھو کر اور چیزوں کو چھوئے بغیر واقعات تخلیق کرسکتا تھا۔ ویسے شاؤلن ٹیمپل میں ماسٹر ہینگ

ہزاروں ماہرینِ طب کی آرا
گارنٹی میں مرتب کردہ کتاب
مٹاپا
اور
اس کا سدباب
ایک لاکھ افراد پر تجربہ کیا گیا
قیمت 45 روپے ✣ ڈاک خرچ 23 روپے
مٹاپا..... دل سے دشمنی
مٹاپا..... زندگی کا خاتمہ
کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔
تو پھر جلدی کیجیے.....
ہماری مرتب کردہ کتاب
"مٹاپا اور اس کا سدباب" کا مطالعہ ضرور کیجیے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس پر عمل کرکے آپ ایک متناسب اور سڈول جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں
ملنے کا پتا:
C-63 فیز II ایکسٹینشن D.H.A مین کورنگی روڈ کراچی
kitabistan1970@yahoo.com

پائی اور ان کے شاگرد ماسٹر لیشی یان نے مجھے "چی" کی ایڈوانس مشقوں کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ جب بھی مجھے وافر مقدار میں فرصت میسر آتی' میں ان مشقوں کو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ کوئی ہنسی کھیل میں کی جانے والی مشقیں نہیں ہیں۔ انسانی دماغ پر پائے جانے والے مخصوص گلینڈز پر باقاعدگی سے ارتکازِ توجہ کی پریکٹس کرنا ہوتی ہے۔ پینیل گلینڈ (PINEAL GLAND) دماغ کے سامنے والے حصے میں پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین اسے باطنی آنکھ یا تیسری آنکھ بھی کہتے ہیں۔ اس غدود کی مدد سے دماغی صلاحیت اور سوچ کی قوت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا تھا۔ گویا یہ انسانی دماغ کا (SEND) ہے۔ ایک اور اہم غدود پیچیوٹری گلینڈ (PITUITARY GLAND) ہے جو دماغ کے عقبی زیریں حصے پر پایا جاتا ہے۔ اس گلینڈ کی مدد سے باہر کی معلومات کو اپنے دماغ تک لایا جاسکتا ہے۔ اسے آپ انسانی دماغ کا (PICK) کہہ سکتے ہیں۔ "PICK" اور "SEND" کے دو بٹنوں کو اگر استعمال کرنا آجائے تو انسان بڑا صاحبِ کمال ہوجاتا ہے... اور یہ دسترس حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا' اگر کبھی زندگی نے مہلت دی تو میں ان غدود کی مشقوں کو ضرور کروں گا۔ یہ غدود یا گلینڈز عام حالت میں انسانی جسم کے مختلف افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔

تارا کی بے بسی نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ تاہم وڈیرا سوال کرنے سے باز نہ آیا۔ اس نے پوچھا "وجدان! ایک طرف تم کہتے ہو' قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو ڈاکوؤں کی قید سے رہائی دلائی ہے' دوسری جانب تم قاضی سلطان کے آدمیوں کی جگہ خود کو اور میر بخش کو رکھتے ہو۔ تمہاری اس من گھڑت اور جھوٹی کہانی پر کون یقین کرے گا؟"

"تم سمیت سب یقین کریں گے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"مم۔ میں... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"جب پولیس والوں کے جوتے پڑیں گے تو یہ بھی ممکن ہوجائے گا چھوٹیرا سائیں!"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "میں ڈی ایس پی صاحب کو تمہاری اصلیت بتا چکا ہوں۔"

"تم اپنے حرامی ڈی ایس پی کو میری اصلیت بتاؤ یا فرضی جرائم گنواؤ' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا "جب "ایس پی" میری کہانی کو مان لے گا تو سب کی چھٹی ہوجائے گی۔ ایس پی' مغویہ ممتاز کا ماموں ہے اور تمہارے دشمن قاضی سلطان کا سالا ہے۔ تم نے سن رکھا ہوگا۔ ساری خدائی ایک طرف' جورو کا بھائی ایک طرف۔ قاضی سلطان کی جورو کا بھائی بہت طاقتور ہے۔ اسی کے احکامات پر ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ہورہی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے مرتشی ڈی ایس پی کا بھی "صاحب" ہے۔ وہ لپیٹ کر رکھ دے گا تم سب کو۔ تم ڈاکوؤں کے پشت پناہ ہو' میں اس کیس میں "نجات دہندہ" کا کردار ادا کررہا ہوں۔ بولو' ہم میں سے کس کی بات کو توجہ سے سنا جائے گا؟ تمہاری یا میری؟ اور کس کی بات کو رد کیا جائے گا؟ تمہاری یا میری؟"

"تم نے ایک شیطان کا دماغ پایا ہے۔" وہ بے ساختہ میری تعریف کرنے پر مجبور ہوگیا "تمہارے ذہن نے بہت ہی خطرناک کہانی بنی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی کہانی فائنل نہیں ہوئی۔ میں نے تو تمہیں "ون لائن" سنایا ہے۔ ضرورت پڑنے پر حالات کے تقاضے کے مطابق اس میں ترمیم و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور گویا کلین بولڈ کرنے کی کوشش کی "وجدان! ایک بات کو تم بالکل بھولے بیٹھے ہو۔ تمہاری اس فرضی کہانی میں دھنو (ساحل) کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟"

"کچھ تجسس بھی تو رہنے دو۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "قاضی سلطان کی حویلی پر پہنچ کر تمہیں باقی باتیں بھی معلوم ہوجائیں گی۔"

اس موقع پر میر بخش خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے براہِ راست وڈیرے پر حملہ کیا "سائیں! اپنے وجدان صاحب اس کہانی کے لکھاری ہیں۔ وہ کسی بھی کردار کو ان یا آؤٹ کرسکتے ہیں۔ تم کیوں فکر میں پڑتے ہو؟"

اپنے سابق اونی غلام کی اس جسارت پر وڈیرا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ پجارو کے اندر عملی طور پر میر بخش کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے زبان کا استعمال کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

"تم اپنی چونچ بند رکھو نمک حرام! تم نے ایک بہت پرانی سندھی کہانی کو سچ کر دکھایا ہے۔"

"روایتی کہانیاں اور کہاوتیں سچی ہی ہوتی ہیں۔" میر بخش گویا اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا "بہت سے سچے واقعات اور حقائق کو نچوڑ کر بڑے بزرگ کوئی کہاوت' قصہ کہانی یا روایت بناتے تھے۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے وڈیرا اکبر سومرو سے پوچھا "تم کس سندھی روایتی کہانی کی بات کررہے ہو؟"

"کلہاڑی اور درخت والی کہانی۔" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "تم بھی سنو گے؟"

میں نے کہا "سنا دو' کیا حرج ہے۔ آخر میں نے بھی تو نہیں ایک سنسنی خیز کہانی سنائی ہے نا!"

"تم نے جو کچھ بیان کیا وہ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"تمہارا بیان شروع ہو تو اندازہ لگاؤں' تم کیا فرمانے والے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد مجھے ایک سندھی پرانی روایتی کہانی سنادی۔ وہ درخت اور کلہاڑی سے منسوب ایک کہانی تھی جس کے مطابق' ایک روز کسی نے درخت سے آکر کہا' لوہار کی دکان میں تمہارا دشمن تیار کیا جارہا ہے۔ درخت نے پوچھا' کون سا دشمن۔ کیا نام ہے اس کا؟ درخت کو بتایا گیا' وہ دشمن لوہے کی ایک کلہاڑی ہے۔ درخت نے پوچھا' کلہاڑی کو لوہے سے بنایا جارہا ہے۔ وہ میرا کیا بگاڑ لے گی۔ مجھے کلہاڑی کی پروا نہیں۔ کہنے والے شخص نے کہا' اس کلہاڑی سے تمہیں کاٹا جائے گا۔ درخت بولا' یہ ممکن نہیں۔ تم مجھے خوامخواہ ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ میں کسی کلہاڑی و لہاڑی سے خوف زدہ ہونے والا نہیں۔ چند روز بعد اسی شخص نے درخت کو اطلاع دی' کلہاڑی تیار ہوچکی ہے۔ بس اب تمہاری خیر نہیں۔ درخت نے کلہاڑی کی شکل و شباہت کے بارے میں استفسار کیا۔ اسے یہ معلومات بہم پہنچادی گئیں۔ درخت نے کہا' کلہاڑی کو خالص لوہے سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں لوہے سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ دو روز بعد وہ شخص پھر درخت کے پاس آیا اور اسے سنسنی خیز اطلاع دی' کلہاڑی کو بنانے کے لیے اس میں دستہ فٹ کردیا گیا ہے۔ درخت نے پوچھا' یہ دستہ کیا ہوتا ہے؟ اسے بتایا گیا' دستہ کسی درخت سے کاٹی گئی ایک موٹی شاخ ہوتی ہے۔ دستے کو ہاتھ میں تھام کر کلہاڑی سے وار کیا جاتا ہے۔ اب تم کٹنے کے لیے تیار ہوجاؤ! درخت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور شکست خوردہ انداز میں بولا' تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔ اب واقعی مجھے کشمکش میں مبتلا ہوجانا چاہیے کیونکہ میرا اپنا دشمن سے جاکر مل گیا ہے۔ اگر درخت کی شاخ کلہاڑی کا دستہ نہ بنتی تو وہ لوہے کا ٹکڑا میرے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد وڈیرے نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا "وجدان! اگر میرے کیمپ کا آدمی میر بخش تمہارے کیمپ میں نہ چلا جاتا تو اس وقت صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔ تم اور تمہارے ساتھی میرے قدموں پر پیشانیاں رگڑ کر التجائیں کررہے ہوتے۔" پھر اس نے ایک شکست خوردہ آہ بھری اور بولا "وقت وقت کی بات ہے۔ اس وقت تمہارا پلّہ بھاری ہے۔ کل یہ موقع مجھے بھی مل سکتا ہے۔ میں اس وقت اس تخم بد میر بخش کو بھوکے کتوں سے نچواؤں گا اور اس کی کٹی پھٹی لاش کو اپنے بنگلے کے سامنے بانس پر ٹنگواؤں گا تاکہ آئندہ کوئی شخص غداری کی جرات نہ کرسکے۔"

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "تمہاری یہ ناپاک خواہش' حسرتِ ناتمام بن جائے گی۔"

میر بخش نے کہا "وڈیرا سائیں! ہم کنری کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ یہاں سے اپنی منزل "بی سر" زیادہ دور نہیں۔ تم حوصلہ جمع رکھو۔ وہاں تمہارے ساتھ درخت اور کلہاڑی والی کہانی دہرائی جائے گی۔ تمہارے سر پر اتنے ڈنڈے برسائے جائیں گے کہ کلہاڑی کو بھول جاؤ گے۔"

ساحل نے میر بخش سے کہا "اب تم اس بے چارے کو اتنا بھی نہ ڈراؤ کہ یہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی آخری سفر پر روانہ ہوجائے۔ آخر وہ تمہارا "باس" رہا ہے۔ کچھ تو لحاظ کرو۔"

ساحل کی دیکھا دیکھی ممتاز نے بھی لب کھول لیے۔ وہ ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اکبر سومرو جیسے بھوتار وڈیروں سے جتنا بھی برا سلوک کیا جائے' وہ کم ہے۔ یہ ایک مرتبہ میرے بابا کے پاس پہنچ جائے پھر وہ اسے مزہ چکھائیں گے۔ کیوں وجدان! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

آخری جملہ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ادا کیا تھا اور اس کے لہجے میں خاصی بے تکلفی اور بے باکی پائی جاتی تھی۔ وہ خاصی دیر سے خاموش تھی۔ اچانک اس کے بولنے کا سبب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اب اس کی حویلی بہت نزدیک آگئی تھی یعنی ہم بہت جلد اس کے گھر پہنچنے والے تھے۔

میں نے ممتاز کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "بالکل' بالکل۔ تمہارے بابا قاضی سلطان تو وڈیرے کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں گے اور جب انہیں میری زبانی یہ پتا چلے گا کہ تمہارے اغوا کے پیچھے اسی مردود کا ہاتھ ہے تو ان کی "خوشی" ہزار چند ہوجائے گی۔ وہ ایک طویل عرصے تک اس کی "خاطر داری" میں لگے رہیں گے۔" پھر میں نے وڈیرے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "سائیں! تمہارے تو مزے آگئے۔

کُھلا کھاؤ اور جان بناؤ!"

وڈیرے نے میرے طنزیہ کوئی تبصرہ یا تنقید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے اپنا اور اپنے مہمان دوست تارا کا انجام صاف نظر آنے لگا تھا۔ دونوں نے چپ سادھنے ہی میں عافیت جانی۔ ممکن ہے' ان کا خیال ہو کہ خاموش رہ کر وہ اپنے بچاؤ کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتے ہیں۔

ہم کنڑی سے ہوتے ہوئے نبی سر کی جانب بڑھنے لگے تو ممتاز نے کہا "وجدان! تھوڑی دیر پہلے وڈیرے نے تمہارے بارے میں کہا تھا کہ تم نے شیطان کا دماغ پایا ہے لیکن میں یہ کہوں گی کہ تم بے حد ذہین اور معاملہ فہم ہو۔ تم نے منگل سنگھ وغیرہ سے جس طرح مجھے آزاد کرایا ہے' وہ قابلِ تعریف ہے پھر وڈیرے اور اس کے ساتھی تارا کو تم اب تک جس انداز میں کنٹرول کیے ہوئے ہو وہ بہت بہادری کا کام ہے۔ میں نے وہ منظر نہیں دیکھا جب تم نے ایک بھاری بھرکم الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کیا تھا لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس کارنامے پر تمہیں ایک غیر معمولی انسان کا ٹائٹل ملنا چاہیے۔"

"تم میری تعریفوں میں اپنی توانائی صَرف نہ کرو۔" میں نے کہا "میں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی ٹائٹل وائٹل کی ضرورت نہیں۔ جب مجھ پر کوئی وقت پڑا تو تم بھی میری مدد کردینا۔ یہ دنیا "گیو اینڈ ٹیک" کے اصول پر کام کرتی ہے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر تم واقعی ایسا سمجھتی ہو تو یہ تمہارا بڑا پن ہے۔"

وہ میرے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوگئی۔ سنجیدگی سے بولی "اللہ نہ کرے کہ تم پر کبھی برا وقت آئے۔ اگر خدانخواستہ کبھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پیش آگئی تو میں جی جان سے تمہارے کام آؤں گی۔ تم اس مشن کے ہیرو ہو۔"

ممتاز' صاحبِ ثروت شخص قاضی سلطان کی اکلوتی اولاد تھی' تعلیم یافتہ بھی تھی اس لیے اس میں بے پناہ اعتماد موجود تھا پھر میں نے جان پر کھیل کر اسے جس طرح منگل سنگھ اینڈ کمپنی کے چنگل سے نکالا تھا' میرے اس عمل نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ مجھے ہیرو کا درجہ دینے لگی تھی۔ میں اس کے جذبات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ممتاز کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر ساحل اچانک خاموش ہوگئی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ساحل! تم کافی دیر سے چپ ہو۔ خیریت تو ہے۔ کہیں تمہارے سُننے کا درد پھر تو نہیں جاگ اٹھا؟"

میں نے ساحل کو مخاطب کیا تو وڈیرا چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ دھنو کے نام سے ساحل کو جانتا تھا۔ میں نے اس کے چونکنے کی پروا کیے بغیر اپنا دھیان ساحل کی طرف ہی رکھا۔ اس نے کہا۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔ میں تو اس درد کو بھول ہی گئی تھی۔ واقعی۔"

اس نے حیرت بھرے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "اگر تم خیریت سے ہو تو پھر خاموش کیوں ہو؟"

"کیا جو لوگ ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں وہ مسلسل بولتے رہتے ہیں؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کردیا۔

اس کے انداز میں ناراضی نہیں بلکہ شرارت چھپی تھی۔ ساحل ایک شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں' عارضی قیام کے دوران میں ہمارے درمیان بڑی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں۔ والدین کی موت نے اسے کچھ عرصے کے لیے دل شکستہ اور ملول کردیا تھا۔ تاہم اب اس کی فطری شوخی اور چنچل پن دھیرے دھیرے واپس آگیا تھا۔ آج کل وہ بالکل اپنے فطری مزاج کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ صحت مند لوگ ہر وقت بولتے رہیں مگر یہ ضروری ہے کہ تم بخیریت ہونے کی صورت میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتیں۔"

"میں تو اس لیے چپ تھی کہ ممتاز تم سے بات کررہی تھی۔"

"ہوں!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ بولی "ایک وقت میں آدمی ایک طرف ہی توجہ دے سکتا ہے نا! اب دیکھو' میں بول رہی ہوں تو ممتاز خاموش بیٹھی ہے۔"

اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو کیموفلاج کرنے کے لیے بڑی برمحل مثال دی تھی جس سے اس کی ذہانت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ساحل بالکل نارمل انداز میں بات کررہی تھی لیکن میں نے لاشعوری طور پر یہ محسوس کیا تھا کہ ممتاز کا بے تکلفی سے مجھ سے بات کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ممکن ہے' ایسی کوئی بات سرے سے ہی نہ ہو۔

ممتاز نے ساحل کی حمایت کرتے ہوئے کہا "ساحل کی دلیل معقول اور جان دار ہے۔ یہی آدابِ گفتگو کا تقاضا بھی ہے۔"

ممتاز نے یہ بات کہہ کر تصدیقی انداز میں گردن موڑ کر

میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں ممتاز! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

چند لمحات تک پجارو میں خاموشی رہی پھر میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟ تم نے وہاں سامارو کے نزدیک اپنے سابق آقا سے بھی خاصی "دل لگی" کی ہے۔ کہیں زخم کی تکلیف بڑھ تو نہیں گئی؟"

"ٹھیک ہے سائیں۔" وہ جلدی سے بولا "تھوڑا درد ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے پوچھا "تمہیں ڈرائیونگ میں کوئی دقت تو محسوس نہیں ہورہی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلادی۔ میں نے کہا۔

"کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آجاتا ہوں۔" ان رستم خان کے پٹھوں سے تو جو پوچھنا تھا' وہ میں نے پوچھ لیا۔" اس نے کہا "سائیں! اب تو ہم "نبی سر" کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ آپ اطمینان رکھو۔ میں خیریت سے گاڑی کو ممتاز کی حویلی تک پہنچادوں گا۔"

میر بخش کے تسلی بخش جواب نے مجھے مطمئن کردیا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہونے لگی۔ اس بات چیت میں ممتاز نے بھی بھرپور حصہ لیا۔

کچھ دیر بعد ہماری پجارو نبی سر میں داخل ہوگئی۔

قاضی سلطان کی حویلی کے گیٹ پر مسلح محافظوں نے ہمارا "استقبال" کیا۔ وہ تعداد میں دو تھے ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں نظر آرہی تھیں۔ ایک اجنبی مجروح پجارو کو حویلی کے گیٹ کے سامنے رکتے دیکھ کر ان کے چہرے تن گئے اور وہ بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی کی جانب بڑھے۔ شاید وہ ہمیں اپنا کوئی دشمن سمجھے تھے۔

لیکن پجارو کے نزدیک پہنچتے ہی مسلح محافظوں کے تیور بدل گئے۔ انہوں نے پسنجرز سیٹ پر اپنی چھوٹی مالکن ممتاز کی جھلک دیکھ لی تھی۔ ان کے چہروں کے تناؤ نے حیرت آمیز خوشی کی شکل اختیار کرلی۔ وہ چشم زدن میں باادب' باملاحظہ' ہوشیار ہوگئے۔ ممتاز اپنی جانب والی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر احکام صادر کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم حویلی کے اندر تھے۔

پجارو سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہماری آمد کی خبر حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی تھی۔ قاضی سلطان بہ نفسِ نفیس وہاں پہنچ گیا۔ مغویہ بیٹی کو اپنی نگاہ کے سامنے دیکھ کر وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند پجارو کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں ممتاز اپنی جانب والا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آگئی تھی۔ فرطِ جذبات سے قاضی سلطان نے بیٹی کو سینے سے لگالیا۔

وہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ ایک ان ہونی' ہونی میں بدل گئی تھی۔ قاضی سلطان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ اس کی گمشدہ بیٹی خود بخود اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ بے خودی کے ریلے سے وہ باہر آیا تو ہماری جانب اس نے توجہ کی۔

اس دوران میں' میں' میر بخش اور ساحل پجارو سے باہر نکل آئے تھے۔ البتہ وہ دونوں ابنِ مرود پجارو کے پچھلے حصے میں موجود تھے۔ ہم تینوں قاضی سلطان کے لیے بالکل نا شناسا تھے۔ تاہم وڈیرا اکبر سومرو پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ اس نے حیرت زدہ سوالیہ نظر سے ممتاز کی طرف دیکھا۔

ممتاز نے کہا "بابا جانی! میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاتی ہوں۔ پہلے ان محسنوں کو آرام سے حویلی میں پہنچایا جائے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے ہماری جانب اشارہ کیا۔

میں نے اور میر بخش نے آگے بڑھ کر خوش دلی سے قاضی سلطان سے مصافحہ کیا۔ ساحل نے صرف سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ اس سلام سے میری مراد باقاعدہ "السلام علیکم" نہیں بلکہ آپ اسے آسانی کے لیے "آداب" یا "ہیلو ہائے" کہہ سکتے ہیں۔

قاضی سلطان نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ ہمیں عزت و احترام کے ساتھ مہمان خانے میں پہنچایا جائے۔ اس نے ایک بازو میں ممتاز کو لپیٹ رکھا تھا۔ ملازم کو ہمارے بارے میں حکم دینے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر وڈیرا اکبر سومرو اور تارا کی جانب الجھی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اس الجھن میں سیکڑوں سوال تھے۔

میں نے اس کی الجھن کو ایک مخصوص راہ پر ڈالتے ہوئے کہا "قاضی صاحب! ان دونوں کی حیثیت اس وقت مجرموں کی سی ہے۔ انہیں گاڑی سے نکلوا کر بحفاظت کسی محفوظ مقام پر بند کروادیں۔ ان سے بعد میں پوچھ گچھ ہوگی۔"

قاضی سلطان نے اکبر سومرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو تو میں فوراً پہچان گیا۔ دشمن کو میں بھلا کیسے نہیں پہچانوں گا مگر۔" اس نے تارا کی جانب انگلی اٹھائی "مگر یہ شخص کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ اکبر سومرو کا دوست تارا ہے' کئی روز سے اس کے گھر مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ دشمن کا دوست' دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس رشتے سے تارا بھی آپ کا دشمن ہے۔ ان دونوں دشمنوں کو آپ فوراً اپنی تحویل میں لے لیں۔"

"یہ دونوں یہاں کس لیے آئے ہیں؟"

"یہ آئے نہیں' لے آئے گئے ہیں۔" میں نے قاضی سلطان کو بتایا۔

اس نے پوچھا "کس سلسلے میں؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ممتاز نے اپنے باپ کا بازو کھینچتے ہوئے کہا "بابا جانی! آپ اندر چلیں۔ میں نے کہا نا' میں آپ کو پوری کہانی سناتی ہوں۔"

قاضی سلطان نے متذبذب نظر سے بیٹی کو دیکھا پھر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جاتے جاتے وہ اپنے ملازمین کو اکبر سومرو اور تارا کے بارے میں خصوصی احکام دے گیا۔ ہماری پجارو جب حویلی کے اندر پہنچ کر ایک مخصوص مقام پر رکی تھی تو مسلح گارڈز کے علاوہ تین چار بٹے کٹے ملازم بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لیے وہ پجارو کی جانب بڑھے۔

جب اکبر سومرو اور تارا کو پجارو سے باہر لایا جا رہا تھا تو وہ دونوں بڑے خوفناک انداز میں مجھے گھور رہے تھے۔ اگر اس وقت ان کا مجھ پر بس چلتا تو وہ مجھے کچا چبا ڈالتے۔ میں نے انہیں جس مضحکہ خیز انداز میں باندھا تھا' وہ قاضی سلطان کے ملازمین کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے انہیں کھینچ کھانچ کر گاڑی سے باہر نکال لائے۔ ان کے سلامت بازو ایک دوسرے کے اوپر دو بانسوں کے مانند بندھے تھے۔ جو بازو آزاد تھے وہ اعضائے معطل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ دونوں اس وقت بے بسی کی انتہا سے گزر رہے تھے۔

جن دو صحت مند ملازمین نے تارا اور اکبر سومرو کو پجارو سے باہر نکالا' ان میں سے ایک سے میں نے کہا "سائیں! یہ دونوں بہت خطرناک مانو ہیں۔ ان کو بہت ہی حفاظت والی جگہ پر رکھنا۔ کہیں یہ فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائیں!"

"جو حکم سائیں!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دوسرے ملازم نے کہا "سائیں! میں اس خطرناک بھوتار وڈیرے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کرو۔ قاضی سائیں کے دشمن کو ہم گن پوائنٹ پر رکھیں گے۔ ویسے آپ ان دونوں کو جس حالت میں یہاں لائے ہو' اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' یہ فرار ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ تو اپنے ٹوٹے پھوٹے بازوؤں کو حرکت دینے کے قابل بھی نہیں ہیں۔"

"پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے "تارا اینڈ کمپنی" کو کسی بندی خانے میں لے جانے لگے۔

ہم تینوں قاضی سلطان کے ملازم کی راہنمائی میں مردانے میں واقع ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ اس کمرے کی وسعت اور آرائش و زیبائش سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ قاضی سلطان صاحبِ ثروت ہی نہیں بلکہ صاحبِ ذوق بھی تھا۔ اس ڈرائنگ روم کو سجانے کے لیے لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہوں گے اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ تمام سجاوٹ بڑے ماہرانہ اور فنکارانہ انداز سے کی گئی تھی۔ رقم کو خوامخواہ ضائع نہیں کیا گیا تھا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان صوفوں کو دیواروں سے خاصا ہٹا کر لگایا گیا تھا۔ ہر دیوار میں بڑے سائز کی ایک کھڑکی موجود تھی جس پر قیمتی ریشمی پردے لٹکے نظر آ رہے تھے۔ کمرے کا فرش دبیز' بیش قیمت گلدار قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ صوفوں کے آگے گلاس ٹاپ میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر لگی تصاویر سے اعلیٰ ذوق جھلکتی تھی۔ الغرض وہ ایک عالی شان نشست گاہ تھی جہاں بیک وقت پچاس افراد بیٹھ سکتے تھے۔

ملازم ہمیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہم پھیل کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ دیوار گیر کلاک بھی بہت آرٹسٹک اسٹائل کا تھا۔ ہم لگ بھگ پچھلے چوبیس گھنٹے سے ایمرجنسی کی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ اس دوران میں کہیں ڈھنگ سے ہمیں کچھ کھانا پینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں نے اور ساحل نے کل دوپہر کا کھانا عمر کوٹ کے ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میر بخش ہمارے پاس آ گیا تھا۔ جب سے اب تک ہمیں نہ تو آرام کا موقع ملا تھا اور نہ ہی باقاعدہ کھانا کھانے کا۔ شادی پلی کے تھانے میں اور ڈی ایس پی کے بنگلے پر صرف چائے' بسکٹ وغیرہ سے ہماری رسمی تواضع کی گئی تھی۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ ڈی ایس پی اپنی حریصانہ نظر ہم پر لگائے بیٹھا تھا۔ میری دولت اور ساحل کے حسن و جوانی پر!

اس وقت ہم تینوں تھکن کے ساتھ ساتھ بھوک بھی محسوس کر رہے تھے۔ نیند بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمیں پچھاڑنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ گزشتہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی ہماری آنکھ نہیں لگی تھی۔ ہم پچھلے چوبیس گھنٹے میں پیش آنے والے سنسنی خیز حالات کے بارے میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے کہ وہی ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جو ہمیں یہاں پہنچا کر گیا تھا۔

اس نے مخصوص سندھی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے نستعلیق و نزار اردو میں کہا "سائیں! آپ لوگ نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔"

میر بخش نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "ہمارے پاس تو پہننے کے لیے اور کوئی لباس بھی نہیں ہے۔ کیا نہانے کے بعد ہم یہی میلے کپڑے دوبارہ پہنیں گے؟"

کل رات سے لے کر اب تک میر بخش اور میں خاصی مارا ماری میں مصروف رہے تھے اور ہمارے لباس اس قابل نہیں رہے تھے کہ نہا دھو کر انہیں دوبارہ جسم پر سجایا جاتا۔

میر بخش نے سندھی میں اس ملازم سے ڈاک خانہ ملایا۔ دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد میر بخش نے مجھے بتایا "وجدان سائیں! ڈرائنگ روم سے تھوڑے ہی فاصلے پر مہمان خانے والا حصہ ہے جہاں مہمانوں کے قیام کے لیے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ملازم ہمیں ایک کمرے میں لے جانا چاہتا ہے۔ وہاں ہمارے لیے صاف ستھرے لباسوں کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔"

میں نے حیرت سے اس ملازم کو دیکھا اور پوچھا "قاضی سلطان کہاں ہے؟"

"وہ حویلی کے اندر ہیں سائیں!" اس نے بتایا۔

"اور ممتاز؟"

"چھوٹی مالکن ان کے ساتھ ہی ہیں۔"

"وجدان سائیں!" میر بخش نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ملازم نے بتایا ہے کہ ہم نہا دھو کر فارغ ہو جائیں تو ہمارے لیے کھانا لگایا جائے گا۔ اس کے بعد ہی قاضی صاحب سے ہماری ملاقات ہوگی۔"

میں نے کندھے اچکائے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساحل اور میر بخش نے میری تقلید کی اور ہم تینوں ملازم کی پیروی میں ڈرائنگ روم سے نکل کر ان کمروں کی جانب بڑھ گئے' میر بخش نے جن کا ذکر کیا تھا۔ حویلی کا مہمان خانہ ایک ڈرائنگ روم اور چند بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم سے اٹھا کر کسی بیڈ روم کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً میر بخش اور ساحل کا بھی یہی حال ہوگا۔ ہم تینوں حالات کی ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ میں نے سوچا' مذکورہ کمرے میں پہنچ کر ملازم سے پانی کے بارے میں کہوں گا۔

مجھے اس ملازم سے ایک بھی لفظ نہیں کہنا پڑا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ایک دیوار کے ساتھ موجود ڈریسنگ ٹیبل نما میز پر مجھے پانی کا ایک بلوری جگ رکھا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی تین گلاس بھی موجود تھے۔ گلاسوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے لیے ہی وہاں رکھے گئے تھے۔ وہ جگ اور گلاس کسی قیمتی امپورٹیڈ واٹر سیٹ کا حصہ تھے۔ ان کی نفاست اور نزاکت میں کوئی کلام نہیں تھا۔

کمرے میں تھوڑے سے فاصلے پر دو بیڈ لگے تھے۔ گویا وہ ایک بیڈ روم تھا جہاں دو مہمان بیک وقت قیام کر سکتے تھے۔ دیوار کے ساتھ رکھی ڈریسنگ میز کے قریب ایک صوفہ پڑا تھا۔ اس پر تین افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ملازم ہمیں بیڈ روم میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" ساحل نے ایک دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

اس دیوار میں ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا "تمہیں کس بات کا یقین نہیں آ رہا؟"

"اس دور دراز علاقے میں اٹیچڈ باتھ روم کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔" اس نے کہا۔

"تمہیں یقین کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا "یہ دروازہ واقعی باتھ روم کا ہے۔" یہ بات میں نے دروازہ کھولنے کے بعد کہی تھی "تم یہ کیوں بھول رہی ہو' یہ گھر گاؤں میں رہنے والے کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ ایک طاقت ور شخصیت قاضی سلطان کی حویلی ہے۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! سارا پیسے کا کھیل ہے۔ جب شارجہ جیسے ریگ زار میں سرسبز و شاداب اسٹیڈیم بنایا جا سکتا ہے تو یہاں ملحقہ باتھ روم کیوں نہیں بن سکتا۔ پورے سندھ میں جو لوگ دولت مند ہیں انہیں ہر قسم کی آسائشیں حاصل ہیں۔ آپ ٹی وی ڈراموں میں دیکھ لیں۔ جب وڈیروں کی حویلیوں اور بنگلوں کے اندرونی مناظر دکھائے جاتے ہیں تو وہاں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے؟ اصل چیز ہے قوت خرید۔ جس کی جیب میں نوٹ ہیں' وہ بازار میں فروخت ہونے والی ہر شے کو خرید سکتا ہے۔ سندھ کے تمام وڈیروں اور صاحبِ حیثیت افراد نے اپنی رہائشوں کو ہر سہولت سے سجا رکھا ہے۔ ملحقہ باتھ روم تو عام سی بات ہے۔"

جس دوران میں میر بخش یہ معلوماتی لیکچر دے رہا تھا' میں نے باتھ روم کے اندر نگاہ ڈال کر وہاں کا سرسری جائزہ لے لیا۔ وہ ایک مکمل داش روم تھا۔ ایک جانب دیوار پر نصب کھونٹیوں پر تین جوڑے کپڑے ٹنگے تھے جن میں دو مردانہ اور ایک زنانہ سوٹ تھا۔ ساحل کے لیے سندھ کا روایتی

لباس مہیا کیا گیا جو یقینی طور پر ممتاز کا ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کے لیے شلوار سوٹ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک بات میں نے ان کپڑوں کو دیکھتے ہی محسوس کرلی اور وہ یہ کہ وہ تینوں جوڑے بالکل کورے تھے۔ ابھی تک انہیں کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

کپڑوں کے علاوہ بھی ضرورت کی ہر شے واش روم میں موجود تھی۔ ہمارے لیے خصوصی طور پر نئے ٹوتھ برش بھی وہاں رکھ دیے گئے تھے۔ یقیناً یہ سارا انتظام ممتاز کے کہنے پر کیا گیا ہوگا۔ میں نے سندھ کی روایتی مہمان نوازی کے بہت سے قصے سنے تھے، عملی مظاہرہ اب دیکھنے میں آرہا تھا۔

میں نے میز کی جانب بڑھتے ہوئے کہا "ساحل! پہلے تم فریش ہوجاؤ۔ ہم بعد میں نہالیں گے۔"

"میں پہلے ایک گلاس پانی پیوں گی۔" وہ میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے بولی۔

میں نے جگ میں سے ایک گلاس بھر کر ساحل کی جانب بڑھادیا۔ پانی پینے کے بعد وہ واش روم میں گھس گئی۔ میں اور میر بخش اپنے خشک حلق تر کرنے کے لیے پانی سے انصاف کرنے لگے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہم تینوں نہا دھو کر تیار ہوگئے۔ ساحل کے بدن پر سندھی لباس بہت جچ رہا تھا۔ وہ لباس لمبائی کی پیمائش میں معمولی سا چھوٹا تھا۔ ممتاز کا قد پانچ فٹ دو انچ کے قریب تھا جبکہ ساحل کی ہائیٹ پانچ فٹ دس انچ تھی۔ تاہم اس لباس نے ساحل کے حسن کو دوبالا کردیا۔ میر بخش تو شلوار قمیص پہننے کا عادی تھا مگر میرے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ساری زندگی پینٹ سوٹ، پینٹ شرٹ یا جینز وغیرہ استعمال کی تھی۔ مارشل آرٹس کی ٹریننگ کے دوران میں ہمیں جو یونی فارم پہننے کو دیا جاتا تھا، وہ بھی خاصا لوز ہوتا تھا مگر شلوار قمیص کی بات دوسری تھی۔

"مجھے تو شدید نیند آرہی ہے۔" ساحل نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا۔

میر بخش بولا "میں بھی بہت تھک گیا ہوں سائیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھائل بازو کو آہستہ سے دبایا۔

جب میر بخش نہانے کے لیے واش روم کا رخ کر رہا تھا تو میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے بازو کے زخم کو گیلا ہونے سے بچائے۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا "تمہارا زخم تو پانی سے بچا ہوا ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں نے کوشش تو پوری کی ہے سائیں لیکن قمیص اتارتے ہوئے مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ قمیص کا کپڑا زخم کے ساتھ چپک گیا تھا۔"

"زخم سے خون تو نہیں نکلا؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں سائیں! میں نے بہت احتیاط سے قمیص کا کپڑا الگ کیا ہے۔"

میں نے کہا "بہرحال، تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگرچہ تمہارا زخم سنگین نہیں لیکن پھر بھی انفیکشن کا ڈر موجود ہے۔ اس امکان کو بھی ختم ہوجانا چاہیے۔ میں قاضی سلطان کے آدمی سے بات کرتا ہوں۔"

"وجدان!" ساحل بوجھل آواز میں بولی "مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے کوئی نشہ آور شے کھالی ہو۔ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جارہی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ساحل۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "کم و بیش میرا بھی یہی حال ہے۔ شدید تھکن اور بے آرامی کے بعد اگر گنگناتے پانی سے ہاتھ لیا جائے تو جسم کے تمام مسل ریلیکس ہوجاتے ہیں جن میں دماغ کے مسل بھی شامل ہیں۔ ہماری کیفیات میں تو نیند اور بھوک بھی شامل ہے۔ کھانا کھالینے کے بعد تو نیند سے ہمارا برا حال ہوجائے گا۔"

"وجدان سائیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میر بخش نے کہا "جیسے ہی ہمارے خالی معدوں میں خوراک اترے گی، ہم پہلی فرصت میں سونے کی کوشش کریں گے۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے میر بخش سے پوچھا "تم نے وہ پچاس ہزار روپے والی نوٹوں کی گڈی پجارو کے ڈیش بورڈ سے نکالی تھی یا...؟"

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میر بخش نے کہا "سائیں! پجارو میں سے میں نے کوئی بھی شے باہر نہیں نکالی۔ نہ اسلحہ اور نہ ہی رقم کی گڈی۔ سب کچھ وہیں ہے۔"

میں نے استفسار آمیز نظر سے ساحل کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی "ریوالور وغیرہ بھی وہیں پجارو ہی میں ہیں۔ میں خالی ہاتھ باہر آئی تھی۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "چلو، فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت ہم دوستوں میں ہیں۔ ہمیں یا ہماری کسی چیز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔"

میں نے بات ختم ہی کی تھی کہ وہی ملازم ایک مرتبہ پھر

دھماکا۔ اس مرتبہ وہ ایک ہلکی دستک کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی اطلاع دی۔

"سائیں! آپ لوگوں کے لیے کھانا لگادیا گیا ہے۔"

میں نے بے اختیار پوچھا "کھانا کہاں لگایا گیا ہے؟"

"کھانے کے کمرے میں۔" ملازم نے بتایا۔

ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ قاضی سلطان کا مہمان خانہ ایک مکمل گھر تھا۔ ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم اور بیڈ رومز کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا تاکہ فوری طور پر اگر کسی چیز کو گرم کرنا ہو تو حویلی کے اندرونی حصے میں نہ جانا پڑے۔ وہ کچن ملٹی پرپز تھا۔

ملازم کی معیت میں ڈائننگ روم کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا "میرا یہ ساتھی میر بخش زخمی ہے۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہے۔ تم ہمیں کھانے کے کمرے میں پہنچا کر فوراً اپنے قاضی سائیں سے کہو کہ میرے ساتھی کی باقاعدہ مرہم پٹی کے لیے کسی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ کو ہمارے پاس بھیجے۔"

"جو حکم سائیں!" ملازم نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

دونوں ہاتھ جوڑ کر بات کرنے کا انداز اس خطے کی روایت ہے چنانچہ میں ہر کسی کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ہر علاقے کی اپنی مخصوص رسوم و روایات ہوتی ہیں جو باہر سے آنے والوں کو عجیب سی لگتی ہیں مگر مقامی لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں اس لیے اعتراض برائے اعتراض سے کشیدگی نہیں پیدا کرنا چاہیے۔ البتہ میر بخش اب چونکہ میرے ساتھیوں میں شامل تھا اس لیے میں نے اسے سختی سے منع کردیا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس عادت کو بھولنے کی کوشش کرے گا۔

قاضی سلطان کے مہمان خانے کا ڈائننگ روم جدیدیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک جہازی سائز ڈائننگ ٹیبل لگی تھی جس کے چاروں طرف ڈائننگ چیئرز سجی نظر آرہی تھیں۔ اس نیم بیضوی ٹیبل پر بیک وقت تیس افراد بیٹھ کر کھانا کھاسکتے تھے۔ میز کے اوپر ہمارے لیے کھانا چن دیا گیا تھا۔

ملازم ہمیں ڈائننگ روم میں پہنچانے کے بعد بولا "سائیں! آپ لوگ آرام سے کھانا کھاؤ۔ میں دروازے کے پاس باہر موجود ہوں۔ اگر کسی شے کی مزید ضرورت ہو تو آپ مجھے حکم کردینا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" میر بخش نے سندھی میں ملازم سے کہا "ہم تمہیں بتادیں گے۔"

ہم تینوں ڈرائنگ ٹیبل کے قریب پہنچ گئے۔ ساحل نے اور میں نے کرسی کھینچی تو میر بخش فوراً ہماری مدد کو لپکا۔ اس کا انداز خادمانہ تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ کیا کر رہے ہو میر بخش؟"

"سائیں! آپ دونوں آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔"

"کیا مطلب!" میں نے چونک کر کہا "صرف ہم دونوں ہی کیوں۔ کیا تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟"

ساحل بھی حیرت بھری نظر سے میر بخش کو دیکھنے لگی۔

وہ سادہ سے لہجے میں بولا "سائیں! میں بھی کھاؤں گا مگر آپ لوگوں کے بعد۔"

"بعد میں کیوں بھئی؟"

"سائیں! اچھا نہیں لگتا۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا "کیا اچھا نہیں لگتا؟"

"سائیں! آپ مالک ہو..."

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ اس وقت مجھے میر بخش کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پناہ عقیدت جھلکتی نظر آئی۔ میں اس کے مسئلے کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے اپنا آقا سمجھ رہا تھا اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے کو شاید وہ کوئی گستاخی تصور کرتا تھا اسی لیے ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا "میر بخش! بہتر یہ ہے کہ تم ابھی سے اپنا راستہ الگ کرلو۔"

"سائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!" اس کا چہرہ فکرمندی کا اشتہار بن گیا "مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوگئی سائیں؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "میر بخش! تم ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہو رہے ہو۔"

"سائیں! اللہ سائیں کے واسطے، مجھے میری خطا بتا دیں۔" وہ گڑگڑانے والے لہجے میں بولا "مجھے یاد نہیں آرہا کہ مجھ سے کون سی کوتاہی ہوئی ہے!"

میں چند لمحات تک خاموش نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں کہا "میر بخش! میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا اور اب بھی تم پر واضح کر رہا ہوں۔ اگر تم نے میرے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں اپنی چاکرانہ ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔ میں کوئی آقا ہوں اور نہ ہی تم میرے غلام۔ ہم صرف ساتھی ہیں، دوست ہیں۔ تمہاری اس قسم کی ملازمانہ حرکتیں مجھے پسند نہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا

چاہیے۔ نوکر باہر کھڑا ہے۔ اب تم وڈیرا اکبر سومرو کی ملازمت میں نہیں ہو بلکہ میرے ساتھیوں میں شامل ہو چکے ہو۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔"

"سائیں! میں جو کچھ بھی کرتا ہوں' آپ کی عقیدت میں کرتا ہوں۔" وہ جذباتی ہو گیا۔

میں نے کہا "عقیدت کو دل میں دبا کر رکھنا چاہیے۔ اس کا اظہار کسی آزمائشی مرحلے پر کرنا چاہیے۔ دوستوں میں جتنی زیادہ بے تکلفی ہو' محبت اتنی ہی بڑھتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے... تکلف علامت ہے بے گانگی کی' نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ۔"

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا "معافی سائیں! آئندہ آپ کو اس سلسلے میں' میں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"وجدان!" ساحل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "بس بہت ہو گئی۔ اب کھانے پر ٹوٹ پڑو۔ میرے پیٹ میں تو چوہے ریس لگا رہے ہیں۔"

اس موقع پر مجھے اپنی ایک آنجہانی ساتھی یاد آ گئی۔ ڈاکٹر جانکی دیوی سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور بھوک کی کیفیت میں وہ اسی قسم کی بے تابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھی جیسا ساحل نے کیا تھا۔

جانکی کے خیال نے مجھے افسردہ کر دیا۔ اس لڑکی نے میری خاطر بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں' اپنا بہت کچھ قربان کیا تھا اور بالآخر ایک معرکے میں اپنی جان بھی قربان کر دی تھی۔ میری زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں جانکی دیوی خاصے نمایاں مقام پر رہی تھی۔

ساحل کا اشتہا انگیز جملہ مکمل ہوتے ہی ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ڈائننگ ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ وہ کسی غریب شخص کا دسترخوان نہیں تھا کہ اچانک آ جانے والے مہمانوں کی وجہ سے گھر میں افراتفری مچ جاتی اور پر تکلف کھانا دسترخوان تک پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قاضی سلطان اس علاقے کا ایک دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ اس کے گھر کے مہمان خانے کو دیکھ کر میں نے اس کی حیثیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہٰذا ڈائننگ ٹیبل پر نصف درجن ڈشوں کی موجودگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

وہ مقامی کھانے تھے۔ ان میں سے بیشتر ڈشوں سے میں ناواقف تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ کھانے میں سندھی بریانی' شامی کباب' جھینگے کا سالن' چکن تورمہ' چپاتی' خوبانی کا میٹھا اور کسٹرڈ وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی ڈش میں مٹر پلاؤ بھی موجود تھا۔

میں یہ بات جانتا تھا کہ انڈو پاک کے لوگ بہت چٹورے ہوتے ہیں۔ وہ کھانے کی اشیا میں بہت تیز مرچ مسالے استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں تو میں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا تھا اور ایک آدھ مرتبہ تجربہ بھی۔ میں نارمل کھانا کھانے کا عادی ہوں۔ نہ ہی روکھا پھیکا اور نہ ہی بالکل دھواں دھار ہندوستان میں زیادہ تر فاسٹ فوڈ یا کین کی پر گزارہ ہوتا تھا یا پھر میں "انتہائی محفوظ" گھریلو کھانے کا انتخاب کرتا تھا۔

میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے میر بخش سے استفسار کیا "ان میں سب سے زیادہ محفوظ ڈش کون سی ہے؟"

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور بولا "سائیں! یہ سب ہی محفوظ کھانے ہیں۔ قاضی سلطان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر کھائیں۔"

یہ بات یقینی تھی کہ وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ ساحل بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے میرے سوال کی وضاحت کر دی۔

"اچھا! اچھا' آپ یہ پوچھ رہے تھے۔" وہ نادم سا ہو کر بولا "وجدان سائیں! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ مٹر پلاؤ اور میٹھے پر ہی گزارہ کریں۔ ہلکے پھلکے اسپائسی کا موڈ ہو تو شامی کباب چکھ لیں۔"

ساحل کے لیے میری بہ نسبت کھانے کا مسئلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ نیپال چونکہ ہندوستان سے بہت قریب ہے اس لیے وہاں بھی ایک حد تک مرچ مسالے کا استعمال ہوتا ہے۔ میں نے اس روز مٹر پلاؤ اور خوبانی کے میٹھے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ فروٹ کسٹرڈ بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ملازم نے مودبانہ انداز میں دریافت کیا "سائیں! آپ لوگ چائے یہیں پیو گے یا کمرے میں؟"

ساحل نے دو ٹوک انداز میں فیصلہ سنا دیا "میں تو چائے یا کافی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ اس وقت تو میری شدید خواہش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگا لوں۔ میرے پپوٹے ایک ایک من کے ہو چکے ہیں۔"

"سائیں! میں بھی تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میر بخش نے دبی زبان میں کہا۔

میر بخش کے آرام کی بات سن کر مجھے اس کا زخمی کندھا یاد آ گیا۔ میں نے ملازم سے پوچھا "میں نے تم سے ایک

ضروری کام بولا تھا؟"

"وہ ڈاکٹر والا کام سائیں۔" وہ تصدیقی انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا "میں نے قاضی صاحب تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔"

"قاضی سائیں نے کیا کہا ہے؟"

"انہوں نے کہا ہے' ڈاکٹر کا فوراً بندوبست ہو جائے تو ٹھیک۔" ملازم نے بتایا "آپ کھانے سے فارغ ہو جائیں تو ڈاکٹر کو آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ میں ابھی جا کر ان کو بتاتا ہوں کہ آپ لوگوں نے کھانا کھا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم بیڈ روم میں چلتے ہیں۔ تم قاضی سائیں سے کہو کہ ڈاکٹر کو بھیج دیں۔"

"سائیں! آپ لوگ چائے کمرے میں پیو گے نا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے کہا "چائے صرف میں ہی پیوں گا۔" اس کے ساتھ ہی میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا کیونکہ اس نے واضح طور پر انکار نہیں کیا تھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے چائے پینے سے صاف انکار کر دیا۔

اس ملازم کا نام فقیر علی معلوم ہوا۔ مہمان خانے والے حصے میں اس کے علاوہ بھی کئی ملازم کام کرتے تھے۔ فقیر علی ہمیں کمرے میں پہنچا کر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

"فقیر علی! قاضی سائیں سے کہنا' میں فوراً ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ "جی سائیں" کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اب زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ممتاز اپنے والدین کے پاس پہنچ گئی تھی۔ قاضی سلطان اپنے دیرینہ دشمن اکبر سومرو سے جو بھی سلوک کرتا' مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں تو پہلی فرصت میں سندھ کے ریگ زار سے جان چھڑا کر کراچی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ آئندہ کے لیے پلاننگ کر سکوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کراچی پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر ہے۔ میں وہاں آرام و سکون سے کچھ عرصہ قیام کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر نے ہمارے کمرے میں آ کر میر بخش کے زخمی بازو کا معائنہ کیا۔ تارا کے پسٹل سے نکلنے والی اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی گولی نے میر بخش کو سنگین نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ گولی میر بخش کے دائیں کندھے کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر ساحل کا اسکارف اس کے گھائل بازو پر باندھ دیا تھا جو شادی پلی کے پولیس والوں نے اتار دیا۔ اس وقت تک خون کا رساؤ بند ہو چکا تھا ورنہ بہت مصیبت ہو جاتی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد میر بخش کے زخمی بازو پر بڑے ماہرانہ انداز میں پٹی باندھ دی۔ اس سے پہلے اس نے زخم کو صاف کر کے ایک اینٹی سیپٹک' ہیلر آنٹ منٹ بھی لگا دی تھی۔ مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے میر بخش کو ایک انجیکشن دیا اور ایک خوراک دوا کی دیتے ہوئے بولا۔

"سائیں! اس پڑیا کو ابھی پانی سے نگل لو۔ زخم تشویشناک نہیں۔ بس ایک ہی خوراک کافی ہو گی۔ ویسے میں نے احتیاطاً انجیکشن بھی لگا دیا ہے۔ دو دن کے بعد پٹی تبدیل کروا لینا۔"

میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ ملازم فقیر علی نے ڈاکٹر کا ایمرجنسی میڈیکل باکس اٹھا لیا پھر جب وہ وہاں سے جانے لگے تو میرے پوچھنے سے پہلے ہی فقیر علی نے کہا۔

"سائیں! میں نے آپ کا دوسرا پیغام بھی قاضی سائیں تک پہنچا دیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو بلائیں گے۔"

ان کے جانے کے بعد میں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تاکہ میر بخش کو پانی سے وہ دوا کھلا سکوں۔ میں ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے پانی لینے آیا تھا۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی پڑیا میں صرف دو گولیاں تھیں۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ ان میں ایک پین کلر اور دوسری کوئی سپلیمنٹ ٹیبلٹ تھی۔ میں نے وہ دوا میر بخش کو کھلا دی۔

وہی ملازم ایک مرتبہ پھر ہمارے کمرے میں آیا۔ اس مرتبہ اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس ٹرے میں چائے کا تھرماس اور تین پیالیوں کے علاوہ کچھ بسکٹ اور اسنیکس بھی نظر آ رہے تھے۔ چائے کا ارادہ صرف میں نے ظاہر کیا تھا مگر ہم تینوں کے لیے بھیجی گئی تھی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پھر کیا پروگرام ہے۔ ایک پیالی ہو جائے؟"

"نہیں وجدان۔" وہ نفی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "میں ایک آدھ گھنٹا سونا چاہتی ہوں۔ اس دوران میں تم قاضی سلطان سے ملاقات کر لو پھر آئندہ کا پروگرام بنائیں گے۔ میں اس ریگستان سے بہت وحشت محسوس کر رہی

ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم آرام اور بے فکری سے سوجاؤ۔" میں نے کہا۔

میر بخش بھی چائے سے انکار کرچکا تھا۔ مرہم پٹی کرانے اور دوا کھانے کے بعد وہ آنکھیں بند کرکے نیم دراز ہوگیا تھا۔ میں اور میر بخش اس وقت صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں نے اس کا صحت مند کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم دوسرے بیڈ پر آرام سے لیٹ جاؤ۔"

اس نے آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "سائیں! اور آپ۔"

"میں چائے پینے کے بعد قاضی سلطان سے ملنے جاؤں گا۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "اس دوران میں تم دونوں تھوڑا آرام کرلو۔ پتا نہیں، آنے والے صبح و شام ہمارے لیے کیا لے کر آتے ہیں!"

میر بخش نے متذبذب نظر سے بیڈ پر لیٹی ساحل کی جانب دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے۔ وہ ایک بیڈ روم میں ساحل کے ساتھ تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں دل ہی دل میں میر بخش کی سادگی آمیز معصومیت اور شرافت پر مسکرا اٹھا۔

میں نے کہا "میر بخش! میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں۔ خیر، میں کوئی اور بندوبست کرواتا ہوں۔"

"بہت مہربانی سائیں۔" وہ ممنونیت آمیز انداز میں بولا۔

مشرق بہت عجیب و غریب دنیا ہے اور خاص طور پر "انڈوپاک"۔ یہاں کی عورتیں اور مرد اپنی ایک مخصوص سوچ رکھتے ہیں۔ وہ مثبت ہوں یا منفی، ان کا انداز جداگانہ ہے۔ یہاں کی روایات، رسوم و رواج اور طرزِ فکر دنیا کے کسی اور خطے سے نہیں ملتا۔

میں یہی سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ ملازم جب چائے کے برتن اٹھانے کے لیے آیا تو میں نے اس سے کہہ کر میر بخش کے لیے مہمان خانے کا دوسرا بیڈ روم کھلوا دیا۔ ویسے بھی اس بیڈ روم میں صرف دو بیڈ بچھے تھے یعنی وہ کمرا دو افراد کے قیام کے لیے تھا۔ میر بخش مطمئن ہو کر ملازم کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے سوچا، جب تک قاضی سلطان کا بلاوا آتا، میں بھی ذرا کمر سیدھی کرلوں۔ میں صوفے سے اٹھا اور بیڈ کی جانب قدم بڑھائے تو واش روم کے سامنے سے گزرنا پڑا۔ واش روم کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نگاہ واش روم کے اندر چلی گئی۔ سامنے وہ دیوار تھی جس پر کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں نصب تھیں اور ان کھونٹیوں کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہم نے نہانے کے بعد لباس تبدیل کیے تھے اور ہمارے میلے لباس انہی کھونٹیوں پر ٹنگے تھے مگر اب مجھے وہاں ایک بھی کپڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فقیر علی وہاں آن موجود ہوا۔ اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا "سائیں! آپ کو قاضی سائیں نے بلایا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فقیر علی سے پوچھا "ادھر باتھ روم میں ہمارے میلے کپڑے ٹنگے تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہے۔ کیا کسی نے وہ کپڑے وہاں سے ہٹا دیے ہیں؟"

"جی سائیں! آپ کے کپڑے دھونے کے لیے وہاں سے اتارے گئے ہیں۔" فقیر علی نے جواب دیا "ایک گھنٹے کے اندر آپ لوگوں کے کپڑے صاف ستھرے استری شدہ مل جائیں گے۔"

"صرف ایک گھنٹے میں؟" میں نے حیرت سے دہرایا "کیا اس حویلی میں کوئی کوئیک سسٹم لانڈری بھی موجود ہے؟"

وہ پتا نہیں، کس حد تک میری بات کو سمجھ سکا! اس نے بتایا "سائیں! قاضی سائیں کی حویلی میں ایک بہت بڑی واشنگ مشین ہے۔ وہ صرف کپڑے دھوتی ہی نہیں بلکہ انہیں سکھاتی بھی ہے اور اگر چاہیں تو اس میں استری کا بندوبست بھی موجود ہے۔"

میں سمجھ گیا، قاضی سلطان کی حویلی میں تھری سسٹم واشنگ مشین موجود تھی۔ میں فقیر علی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت تک ساحل نیند کی وادی میں اتر چکی تھی۔

کمرے سے باہر آکر میں نے فقیر علی سے پوچھا "اب کس طرف جانا ہے؟"

"حویلی کے اندر سائیں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے تو سن رکھا ہے، مہمانوں کو مہمان خانے تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔" میں نے کہا "یہ یہاں کی بہت پرانی روایت ہے۔"

وہ بولا "آپ نے بالکل ٹھیک سن رکھا ہے سائیں مگر جو قاضی سائیں کے خاص مہمان ہوتے ہیں ان کا درجہ رشتے داروں کے برابر ہوتا ہے۔ وہ حویلی کے اندرونی حصوں میں بھی آجاسکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، ہم قاضی سائیں کے خاص مہمان

ہیں؟"

"بالکل سائیں! یہ بات تو حویلی کے سارے ملازموں کو معلوم ہو چکی ہے۔" وہ بڑے احترام بھرے لہجے میں بولا "آپ نے چھوٹی مالکن کو بچا کر قاضی سائیں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ ممتاز نے اپنے باپ کو ہمارے بارے میں کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بتا دیا تھا جبھی ہماری یہ خاطر مدارت ہو رہی تھی۔ ہم مختلف راہ داریوں سے گزرتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے جہاں قاضی سلطان سے میری ملاقات ہونا تھی۔

میں اس حویلی کو جس حد تک اندر سے دیکھ سکا اس کے لیے صرف ایک لفظ "شان دار" ہی کافی ہے۔ ملازم مجھے قاضی سلطان کے پاس پہنچا کر واپس چلا گیا۔ قاضی سلطان نے ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مصافحہ کیا اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ دوسرے صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کمرا اپنی ساخت اور ترتیب کے لحاظ سے لونگ روم تھا۔

قاضی سلطان کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی جس میں گندم کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس نے کلف دار بے داغ سفید شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس پر ویسٹ کوٹ کی موجودگی اس کی شخصیت کو مزید نکھار رہی تھی۔ گھنی مونچھیں اور بولتی ہوئی ذہانت سے معمور آنکھیں اس کی شخصیت کا خاصہ تھیں۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی گونج دار رعب و دبدبہ پایا جاتا تھا۔ قاضی سلطان بلاشبہ متاثر کن پرسنالٹی کا مالک تھا۔

ہمارے درمیان چند رسمی باتیں ہوئیں پھر وہ اصل موضوع کی طرف آگیا۔ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "برخوردار!" اتنا کہہ کر اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا "کیا تمہیں میرا برخوردار کہنا برا تو نہیں لگا۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو تم بیس بائیس سال سے زیادہ کے نہیں ہو۔ اگرچہ تمہاری صحت اور جوانی تمہیں پچیس کا ظاہر کرتی ہے مگر میری تجربہ کار آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "سائیں! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں آپ سے عمر میں آدھا بھی نہیں ہوں۔ آپ مجھے برخوردار کہہ سکتے ہیں۔"

"تم صرف برخوردار ہی نہیں بلکہ فرماں بردار بھی ہو۔" اس نے تو صیفی انداز میں کہا۔

میں نے زیرِ لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولا "وجدان! ممتاز نے مجھے اپنے اور تمہارے احسان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے اغوا کی کہانی میں سن چکا ہوں اور جس طرح تم نے اسے ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے وہ بھی میں جان چکا ہوں۔ ممتاز نے تمہارا کارنامہ تو بتا دیا لیکن وہ تمہارے اور تمہاری ساتھی ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی۔ میر بخش کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہوگئی۔ وہ پہلے اکبر سومرو کا چاکر تھا، اب تمہارا وفادار ہے۔"

میں پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا، جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "اور اب آپ ہماری حقیقت جاننا چاہتے ہیں، ہماری اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں؟"

"تم میری بات کو کوئی غلط رنگ نہ دینا۔" وہ متحمل لہجے میں بولا "میں صرف اس لیے تم دونوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ آئندہ کی کہانی مکمل کرنے کے لیے مجھے اس معلومات کی ضرورت ہے۔ تم دونوں میرے لیے عظیم محسنوں کی حیثیت رکھتے ہو۔ کہیں مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہ ہوجائے جس سے تم لوگوں کی پوزیشن خراب ہو۔ آخر مجھے

سگریٹ نوشی چھوڑیے
جینا شروع کیجیے
قیمت 25 روپے
فالصورت 23 روپے
تمباکو نوشی اور دیگر بری عادات سے چھٹکارا حاصل کیجیے
اس کتاب کو پڑھنے کی خواہش ہی
سگریٹ چھوڑنے کی پہلی کڑی ہے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر، ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں
خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفیسات
Email: kitabiat1970@yahoo.com

اکبر سومرو سے بھی تو نمٹنا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں خود بھی اس سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا کیوں کہ ہم خود کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتے۔ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں حالات کو ٹیکل کریں۔"

"اسی لیے تو میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بولنے سے پہلے اپنے دماغ میں خیالات کو مجتمع کر رہا ہوں۔ قاضی سلطان پوری دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگا پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے چونکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"وجدان! تم خوا مخواہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتائے بغیر تمہاری پجارو کی تلاشی کروائی ہے اور....."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا "وہ پجارو آپ کے دیرینہ دشمن کی ملکیت ہے۔ میں نے تو اسے ایک نجات دہندہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔"

"اوہ!" اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور بولا "بہرحال' اس گاڑی کی تلاشی کے دوران ہمیں چند اہم چیزیں ملیں ہیں جن میں پچاس ہزار روپے کی رقم' دو کلاشنکوفیں' ایک ریوالور اور ایک پستول شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک بجھا ہوا موبائل فون بھی ملا ہے۔"

میں نے قاضی سلطان کی بات کے جواب میں کہا "پچاس ہزار روپے کی رقم ہماری ہے۔ باقی اسلحہ وغیرہ اکبر سومرو اور تارا کا ہے۔" میرے گراں خوں بات کی تھی۔

اس نے کہا "تم اور وہ امانت میرے پاس محفوظ ہے۔ جب تم یہاں سے جانے لگو تو میں پچاس ہزار روپے کی گڈی تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ وہ رقم وڈیرا اکبر سومرو کی تھی۔ کلاشنکوفس میں ایک وڈیرے کے محافظ کی تھی اور دوسری اے ایس آئی عبدالرزاق سے میر بخش نے چھینی تھی جب کہ ریوالور ڈی ایس پی کا تھا اور پسٹل تارا کا۔ میں نے تھانا جھوٹ دانستہ بولا تھا۔ اگر بعد میں بات کھل جاتی تو میں کوئی اور جواز پیش کر دیتا۔ اس وقت میں برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے